بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

شورش کاشمیری

بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

(سوانح و افکار)

جلد اوّل

شورش کاشمیری

مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ

۸۸۔میکلوڈ روڈ، لاہور (مغربی پاکستان)

اشاعتِ اوّل

جولائی ۱۹۷۲ء

تعداد	۲ ہزار
مطبع	چٹان پرنٹنگ پریس لاہور
ناشر	مطبوعات چٹان لاہور
قیمت	پندرہ روپے

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

(سوانح و افکار)

جلد اوّل

شورش کاشمیری

مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ

۸۸۔ میکلوڈ روڈ، لاہور (مغربی پاکستان)

لمحۂ فکریہ

● میں کیا اور میرے سوانح کیا؟
یہ کہانی صرف اس لئے لکھ دی ہے
کہ دوسروں کو عبرت ہو ———

شورش کاشمیری

ہے آج جو سرگذشت اپنی

کل اس کی کہانیاں بنیں گی

فہرس

مستقبل کے نام

——— شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

جدوجہد میں

- خواہش بہترین نتائج کی کرو
- اُمید کمترین نتائج کی رکھو
- اور تیار بدترین نتائج کیلئے رہو

(اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

خاندان

ہمارا خاندان بھی عام انسانوں ہی کی طرح کا ایک خاندان ہے، اپنی نمائش کے لیے کہانیاں بنانے اور خاندان کی آرائش کے لیے افسانے گھڑنے سے مجھے طبعی نفرت ہے میری کہانی مجھی سے شروع ہوتی ہے، کئی پشتوں سے ایک شجرہ چلا آ رہا تھا جو دادا مرحوم تک محفوظ رہا، پھر جانے کس طرح تلف ہو گیا، وطن ہمارا کشمیر اور گوت ڈار ہے جو کشمیری برہمنوں کی ایک شاخ ہے، کہا جاتا ہے کہ ڈار اصلاً در ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ ڈار راجپوتوں کا ایک قبیلہ ہے۔

ہم لوگ کب مسلمان ہوئے؟ بعض خاندانی روایتوں کے مطابق چھٹی پشت ہے کہ ہمارے ایک جد کسی درویش کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، نتیجتاً انہیں سخت ابتلا کا سامنا کرنا پڑا، اور وہ خاندان سے کٹ کے رہ گئے، یہ ایک متوسط درجے کا خاندان تھا، گلاب سنگھ نے کشمیر خریدا تو بہت سے خاندان اپنی جگہ سے ہل گئے ان میں ہمارا خاندان بھی تھا۔

پردادا سری نگر سے اٹھ کر امرتسر آ گئے لیکن ان کا انتقال دادا کی نو عمری ہی میں ہو گیا۔ خاندان کی اور بھی شاخیں تھیں لیکن دادا تقریباً تنہا رہ گئے، کاروبار اکھڑ چکا تھا، ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں تھا، یہی زمانہ تھا جب کشمیری مسلمان گھر بار چھوڑ کر پنجاب میں چلے آ رہے تھے، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ میں ہزاروں خاندان بس گئے جن میں متوسط الحال خاندان پشمینہ اور شال بیچتے تھے، انہی میں ہمارا خاندان بھی تھا بعض خانگی

بدمزگیوں کے باعث دادا مرحوم لاہور آگئے، یہاں کشمیریوں کے سینکڑوں گھر تھے لیکن باقرخانی اور قلچہ نہ تھا، قلچہ، باقرخانی اور نمکین چائے کشمیریوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے، ایک روڈ پر تنور لگایا، کاریگر ملازم رکھے، دنوں میں وارے نیارے ہوگئے، خوب پیسا کمایا، خوب اڑایا، انہی کے سامنے انارکلی بازار جوان ہوگیا، تب انارکلی میں کسبیاں بیٹھتی تھیں بلکہ اُس بازار سے لے کر پرانی انارکلی کے جین مندر تک انہی کے ڈیرے تھے، کوڑیوں کے بھاؤ جائدادیں بکتی رہیں۔ وہ چاہتے تو بڑی جائداد پیدا کرسکتے تھے لیکن ان کی جوانی نے غور نہ کیا، ساری کمائی سفینۂ غزل اور صراحی مئے ناب کی نذر ہوگئی، ہوش آیا تو زمانہ بہت آگے جاچکا تھا، امرتسر میں دو مکان خرید کیے تھے انہیں باقی رکھا، لاہور میں جو تھوڑی بہت جائداد بنائی تھی مہاجنوں کے ہتھے چڑھ گئی پھر اس کا چھڑانا مشکل ہوگیا، آخر بک گئی

دادا جان کے دو بیٹے تھے ایک تایا ایک میرے ابّا، تایا جس سال دسویں جماعت میں پڑھتے تھے ابّا جان تیسری میں تھے، ناگہاں تایا کو ٹائیفائڈ ہوا اور وہ دیکھتی آنکھوں رحلت کر گئے، دادا مرحوم کو بیٹے کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔ ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس کی موت کتابوں میں گھُسا رہنے کی وجہ سے ہوئی ہے، اب صرف ایک ہی بیٹا تھا، بیٹی تھی نہیں، دادا جان نے انہیں اسکول سے اٹھا لیا، پندرہ سولہ سال تک گھر کے عیش پر رکھا، خوشحالی کمزور پڑنے لگی تو ایک دوست کی خواہش پر اس کے ہمراہ کر دیا جو کسی کارخانہ میں ٹین کے کاریگر تھے، سال بھر میں ہاتھ رواں ہوگیا اور وہ اپنے کام میں اُستاد ہوگئے، تھوڑے دنوں بعد ریلوے ورکشاپ میں چلے گئے۔ وہاں کئی سال رہے، جس سیٹھ کے ہاں کام سیکھا تھا اس کے اصرار پر واپس آگئے اور جب تک صحت پر قابو رہا اسی کے ہاں ملازم رہے، گھر بار، خویش و اقارب، سب امرتسر میں تھے، امرتسر ہی میں ان کی شادی ہوئی۔

میرے ننہیال کی دو شاخیں تھیں، ایک گھرانا امرتسر میں تھا ایک انبالہ میں دونوں

شال اور پشمینہ کے تاجر تھے، نانا مرحوم ہی سب سے پہلے کشمیر سے آتے تھے، نانی مرحومہ برہمن تھیں، ان کے والد نے اسلام قبول کیا تو یہ قبولِ اسلام ان کے لیے آفتِ جان ہوگیا، جان بچاکر سیالکوٹ پہنچے، سیالکوٹ سے امرتسر، ایک شاخ امرتسر میں رہ گئی، دوسری نے انبالہ منتخب کیا اور اسی کے ہوگئے۔

ہم کُل چھ بہن بھائی تھے، میں اپنے والدین کا دوسرا لڑکا تھا۔ میں سال بھر کا تھا کہ بڑا بھائی انتقال کرگیا، والدہ واصل بحق ہوئیں تو میں سات یا آٹھ برس کا تھا، ہم جانتے ہی نہیں تھے کہ ماتا کیا ہوتی ہے، والد کے ذہن میں ہماری تربیت کا سوال تھا، انہوں نے ہماری چھوٹی خالہ سے شادی کی لیکن یہ شادی دو چار برس ہی میں ٹوٹ گئی، اس حادثہ کے بعد ہم ننہال رہ گئے لیکن جس عظیم عورت نے اس جانکاہ پریشانی میں ہماری نگہداشت کی وہ دادی اماں تھیں، انہوں نے احساس ہی نہ ہونے دیا کہ ہم ماں سے محروم ہیں، اس نیک خاتون نے وہ سب کچھ دیا جس کی ماں سے توقع کی جاتی ہے، اس کا پیار لازوال تھا، ہم اس کے اکلوتے بیٹے کی نشانیاں تھے، آج ان کی موت کو ۴۹ سال گزر چکے ہیں لیکن ان کی تصویر اب بھی آنکھوں میں پھر رہی ہے، اس بوڑھی عورت نے ہمیں اس طرح پالا جس طرح ایک مصور اپنے شہ پاروں کی حفاظت کرتا ہے، یا بادِ صبحگاہی خوشوں کو لہلہا دیتی ہے۔
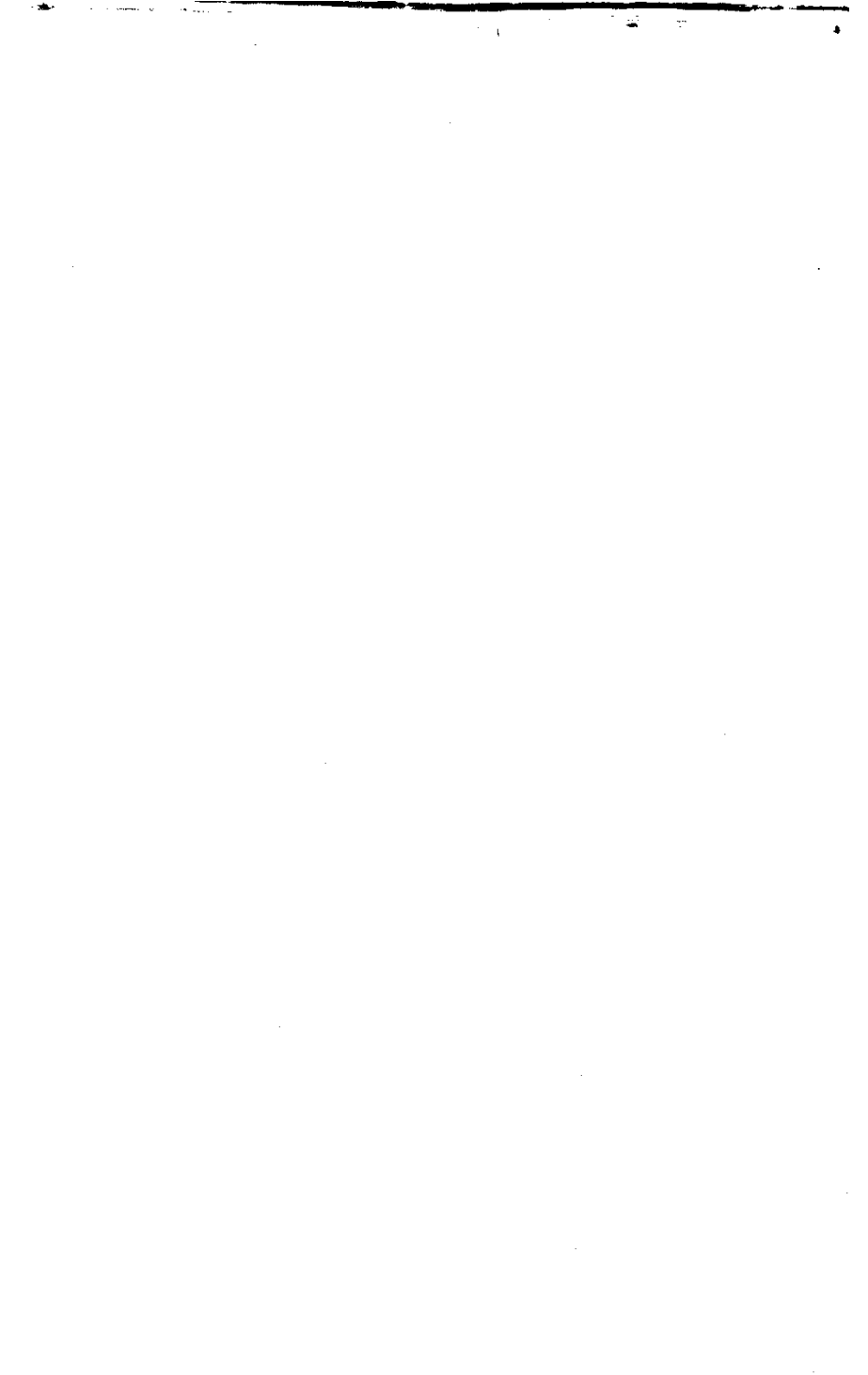
اسکول کی یاد

لاہور اور امرتسر ایک دوسرے کے ہم زلف شہر تھے، ہمارا اصل گھر تو امرتسر میں تھا لیکن دادا اور آبا اکثر و بیشتر لاہور ہی میں رہے، انارکلی میں ایک سہ منزلہ مکان کرایہ پر لے رکھا تھا، اس کی بغل میں ست گھرا تھا، اس ست گھرے میں دیو سماج ہائی سکول تھا، تب اسکولوں میں داخلہ کے لیے کوئی دقت نہ تھی بلکہ طلبہ لانے کے لیے استاد تحریک کرتے، جو طلبہ اپنے ساتھ مزید طالب علم لاتے انہیں کئی رعایتیں دی جاتی تھیں۔ چونکہ اسکول گھر سے قریب تھا لہٰذا دادا نے وہیں داخل کرا دیا، گرد و پیش کی آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے کوئی ستر فیصد کے لگ بھگ مسلمان طلبہ تھے۔ ہندو شاذ ہی داخل ہوتے، وجہ یہ تھی کہ سناتن دھرمیوں اور آریہ سماجیوں کے اپنے بہت سے اسکول تھے، دیو سماج ہندوؤں کا سب سے کم عمر فرقہ تھا یہی ڈیڑھ دو لاکھ افراد ہونگے ضلع فیروزپور کی ایک تحصیل موگا ان کا مرکز تھا! ان کے گرو بھی غالباً اسی علاقے کے باشندے تھے دیو سماج کے بانی نے ہمالیہ کی پہاڑیوں میں برسوں تپسیا کی، آخر کار ناستک ہو کر نکلے، ان کا دھرم یہ تھا کہ خدا کا وجود نہیں، جو کچھ ہے نیچر ہے یا آواگون، جو لوگ اچھے عمل کرتے ہیں انہیں اگلے جنم میں اچھی شکل ملتی ہے اور جو بُرائی کرتے ہیں وہ دوبارہ جانوروں میں جنم لیتے ہیں؛ ان لوگوں میں انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، ایک مشنری کے طور پر کام کرنے اور اپنے دھرم کے انتھک سیوک تھے، جو بچہ پہلی جماعت میں الف بے پڑھتا وہ طبیعتہً کچا

ہوتا ہے ، جیسا سانچا ہوگا ویسا ہی ڈھلے گا ، ہیڈ ماسٹر طلبہ کو سلام کے جواب میں" ست دیو کی جے" کہتا اور ان سے جواباً یہی خواہش کرتا ، بلکہ ترغیب دیتا ، ہماری زبانوں پر بھی ست دیو کی جے" چڑھ گیا ، اسکول کا معمول تھا کہ صبح کلاسوں میں جانے سے پہلے تمام طلبہ میدان میں اکٹھے ہوتے ، وہاں دو چار خوش آواز لڑکے ہندی میں کوئی بھجن گاتے باقی طلبہ بول دُہراتے ، آخر میں ست دیو کی جے کا نعرہ لگتا اور طلبہ اپنی اپنی جماعت میں چلے جاتے ، پہلا پیریڈ وعظ و نصیحت کا ہوتا ، ان کی زبان میں اس کو نیتی کہتے - پندرہ منٹ کے اس پیریڈ میں اچھائیوں کی تلقین کی جاتی ، مثلاً ہمیشہ سچ بولو ، جھوٹ نہ بولو ، گالی نہ دو ، کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ ، دوسروں کی سیوا کرو وغیرہ ، یہ عہد بھی لیا جاتا کہ گوشت نہ کھاؤ ، میں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا ، زبان پر ست دیو کی جے چڑھ گیا ، دادا نے سُنا تو ٹپٹا کے رہ گئے ، فوراً وہاں سے اٹھا کر ایک دوسرے اسکول میں بھیج دیا -

وہاں سارا عملہ مسلمان تھا لیکن استاد طبیعتہً سخت تھے ان کی عادتیں بھی کسی حد تک گدایانہ تھیں ، مثلاً پہلی جماعت کے مولوی صاحب کا وتیرہ تھا کہ طالب علم کھانے کے لیے جو شے لاتے پہلے اُن کی نذر کرتے پھر خود کھاتے ، ایک روز مجھ سے خست ہوگئی ، میں نے ایک پیسہ کے چنے اور ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں ، چنے تو مولوی صاحب کو پیش کیے ، ریوڑیاں چھپالیں ، مولوی صاحب ذرا کانے تھے ، طلبہ کو پیٹنے کے لیے ان کے پاس آٹھ دس فٹ کا ایک لمبا سا بید تھا ، کرسی پر بیٹھے بیٹھے پیٹتے اور بیدردی سے پیٹتے مجھے چوری چھپے ریوڑیاں چباتے دیکھا تو غصہ میں آگئے ، وہیں سے بید اٹھایا اور پیٹنا شروع کیا ، میں بچہ تھا ، چہرے پر نشان اور بدن پر نیل پڑ گئے ، گھر پہنچا ماں سے ذکر کیا ، وہ اور دادی اماں دونوں بے چین ہوگئیں ، ابّا جان غصّہ سے لال پیلے ہوگئے ، اگلے روز دادا اسکول پہنچے ، مولوی صاحب کو جھنجھوڑا ، ہیڈ ماسٹر سے شکایت کی ، دونوں نے معافی مانگ لی لیکن میرا دل اکھڑ چکا تھا - دادا نے دوبارہ دیو سماج اسکول ہی میں بھیج دیا ،

مسلمان طلبہ کے والدین کی شکایت پر ہیڈ ماسٹر نے "ست دیو کی جے" پر اصرار چھوڑ دیا لیکن خود ست دیو کی جے ہی کہتا رہا، اب طلبہ کو ترغیب یا تلقین نہیں کرتا تھا۔ چند روز بعد اس کا تبادلہ ہو گیا اور اُس کی جگہ ایک سندھی ہیڈ ماسٹر آ گئے وہ دیو سماج ہی کے تھے لیکن ہاتھ اٹھا کر آداب کہتے اور سلام کا جواب سلام سے دیتے، میں تیسری یا چوتھی میں تھا کہ سکول دو حصوں تقسیم ہو گیا، ابتداءً مڈل تک کا حصہ اِسی عمارت میں رہا باقی حصہ گھوڑا ہسپتال کی طرف سانده روڈ کے نزدیک چلا گیا لیکن وہاں بھی پانچویں سے لے کر دسویں جماعت تک انتظام کیا گیا، اُردو ہندی کا وہ قضیہ بالکل نہیں تھا جو بعد میں دو قومی مسئلہ ہو گیا۔ پنجاب میں تقریباً سبھی اسکول اُردو پڑھاتے۔ ہندو طلبہ کے لیے ہندی اختیاری مضمون تھا لیکن سو میں سے بمشکل دو چار طالب علم ہندی پڑھتے تھے۔ چھٹی تک اُردو کے استاد سبھی ہندو تھے اور ان میں سے اکثر مکتبوں کے پڑھے ہوئے تھے۔ نصاب انتہائی معیاری تھا، چھٹی جماعت تک ہم خوشخطی کے لیے تختی لکھتے رہے، املا پر بہت زور دیا جاتا اور الفاظ کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا، میں ایک محنتی لڑکا تھا ہمیشہ اچھے نمبروں میں پاس ہوتا، استاد مجھے شفقت کی نگاہ سے دیکھتے، چوتھی جماعت ہی میں مجھے "زمیندار" پڑھنے کا چسکا پڑ گیا، گھر میں صرف زمیندار آتا، دادا مرحوم مولانا ظفر علی خاں کے شیدائی تھے، دادی اماں پڑھی لکھی خاتون تھیں "زمیندار" پڑھ کر سنایا کرتیں مجھے پڑھنے کے لیے کہتیں اور غلطیوں کی تصحیح کیے جاتیں، میری اس استعداد پر میرے استاد بھی خوش تھے۔

میری طبیعت کا رُخ چھٹی جماعت سے بدلنا شروع ہوا، سیاسی مذاق نے کیونکر راہ پائی اس کا ذکر آگے آئے گا، لیکن طالب علمی کے ان دنوں کی بعض یادیں ابھی تک لوحِ حافظہ پر محفوظ ہیں۔

۱۔ مجھے یاد ہے آٹھویں نویں جماعت تک میں ایک شرمیلا طالب علم تھا، انتہائی کم آمیز ساتھی طلبہ میں دو ایک ہی سے میرا دوستانہ رہا۔ اسکول سے گھر اور گھر سے اسکول میرا شعار

شیوہ تھا۔

۲۔اس زمانے میں طلبہ کی سیرت بنانے پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ والدین کا احتساب بڑا سخت تھا۔استاد بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ہمارے اسکول میں بے شمار طلبہ تھے لیکن صرف دسویں جماعت میں تین طالب علم تھے جو چوری چھپے سگریٹ پیتے، کسی کو استاد کے سامنے تو ایک طرف رہا کھلے بازار سگریٹ پینے کا حوصلہ نہ ہوتا۔حقہ نوشی یا سگریٹ نوشی طلبہ میں عیب سمجھی جاتی، ہمارے اسکول میں سگریٹ نوشی کے خلاف باقاعدہ وعظ ہوتا اور طلبہ سے حلف لیا جاتا تھا۔

۳۔میری عادتوں پر اسکول کی اخلاقی فضا نے خوشگوار اثر ڈالا، ہر عیب سے بچا رہا، آج تک ہر نشہ سے محفوظ ہوں، تمباکو نوشی سے مجھے گھن آتی ہے۔ایک زمانہ تھا کہ تمباکو نوشوں کے ہاتھ سے کھانا نہیں کھاتا تھا۔مجھے اب بھی ان کی انگلیوں سے بُو آتی ہو تو یہ بدبُو میرے دماغ کو چکرا دیتی اور بسا اوقات مجھے نزلہ ہو جاتا ہے۔

۴۔میری کم آمیزی کہہ لیجیے یا اسکول کی ذہنی فضا کہ اس ابتدائی منزل میں دل و دماغ بُرائی کے ہر تصور سے خالی رہے، واقعہ یہ ہے کہ دسویں تک مجھے گناہ اور اس کی آلودگیوں کا اندازہ ہی نہ تھا، میرا وجدان ان کے تصور ہی سے خالی تھا۔

میں ہاکی ضرور کھیلتا تھا لیکن کبھی کبھار۔ آوارہ کھیلوں سے جی چراتا۔ مجھے لڑکوں کے ساتھ پھرنے، گلی ڈنڈا کھیلنے، تاش کی بازی لگانے، پتنگ اڑانے وغیرہ سے طبعی نفرت تھی، میں آج تک سائیکل چلانا بھی نہیں جانتا، حالانکہ تب اس کا جاننا ضروری تھا، اسکول گھر سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر تھا، کئی طلبہ سائیکل پر آتے۔ دادا جان مجھے سائیکل لے دینے پر رضامند تھے لیکن میں صرف اس لیے سائیکل سیکھنے سے محروم رہا کہ اس کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت تھی اور میں ساتھیوں سے مجتنب رہتا تھا۔

۵۔ہمارے اساتذہ شرافت کی تصویریں تھے اور پڑھانا جانتے تھے۔وہ سبق

رٹانے سے زیادہ سبق کا شوق پیدا کرتے۔ میں نویں، دسویں جماعت میں نصاب کے علاوہ عام کتابوں کا کیڑا ہو رہا تھا، اخبار باقاعدہ دیکھتا، نویں اور دسویں جماعت میں زمیندار بلاناغہ پڑھتا اس سے مجھے اتنا فائدہ پہنچا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔

۶۔ فارسی اور اُردو کے استاد مولوی محمد نیاز نعمانی ضلع فیروز پور تحصیل موگا کے تھے، اللہ بخشے، برعظیم کے بٹوارے میں شہید ہو گئے۔ ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا اُردو میں استعداد بڑھانے کے لیے کیا پڑھنا چاہیے؟ فرمایا "زمیندار" پڑھتے رہو اور کیا چاہیے؟ حقیقت یہ ہے کہ زمیندار کے مطالعے نے مجھے اپنی عمر سے آگے کر دیا تھا۔

۷۔ میرا عقیدہ ہے کہ اُستادوں کی نگاہ اور دعا دونوں اثر کرتی ہیں، دھرم رتن سکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے، سندھی نژاد، انتہائی خلیق، نیک دل، شریف اور وضعدار، ان کی بیوی نہایت خوبصورت اور کچھ زیادہ عمر کی نہ تھیں، کالج میں پڑھتی تھیں ہم لوگ گھر لوٹتے تو کالج سے واپس آ رہی ہوتیں، راستہ میں آمنا سامنا ہوتا "بھلے مانس حیا کرو" ماسٹر دھرم رتن کا تکیہ کلام تھا۔ وہ طلبہ کو بدنی سزا دینے کے خلاف تھے۔ بڑے سے بڑے قصور پر ڈانٹ ڈپٹ کر کے چپ ہو جاتے۔ ہماری جماعت کے تین طلبہ بے قابو تھے۔ ان تینوں نے ان کی اہلیہ کو چھیڑنا شروع کیا، وہ گزر رہی ہوتیں تو یہ "بھلے مانس حیا کرو" کا آوازہ کستے، قہقہے لگاتے اور وہ کنی کترا کر نکل جاتیں، آخر ایک دن خاوند سے شکایت کی، ماسٹر صاحب نے اگلے روز مولوی محمدؐ نیاز کو علیحدہ بلوا کر سارا قصّہ بیان کیا، وہ چاہتے تو ان طلبہ کو اسکول سے خارج کر سکتے تھے لیکن ان کی شرافت نے عفو سے کام لیا اور تو ان کے نزدیک یہ علاج بھی نہ تھا، مولوی صاحب نے ان تینوں کو بلا کر دوستانہ انداز میں سمجھایا اور یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کے بارے میں اس سے کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں ہوتا، بظاہر تو ان تینوں نے آیندہ باز رہنے کا وعدہ کر لیا لیکن ہفتہ بعد پھر وہی مصرع طرح اور اس پر گرہ لگنے لگی، جب پانی سر سے گزر گیا تو ماسٹر دھرم رتن نے بھری جماعت

میں ڈانٹا لیکن ان کے چونچلوں کا ترشح جاری رہا۔ ماسٹر دھرم رتن کا جی کھٹا ہو گیا، تو تینوں کو اکٹھا کیا اور طلبہ کے روبرو کہا کہ جس نے استاد کی عزت پر ہاتھ ڈالا وہ ہمیشہ بدقسمت رہا۔ یاد رکھو ایم اے بھی کر لو گے تو عزت و توقیر کبھی حاصل نہ ہو گی، استاد کی بددعا خالی نہیں جاتی، ان تینوں میں سے ایک نے ایم اے کیا، خوار ہی رہا۔ تمام گھناؤنی عادتیں اس میں سرایت کی ہوئی ہیں، دوسرا نوجوان جو ایک انسپکٹر پولیس کا لڑکا تھا اس حالت کو پہنچا کہ چانڈو خانوں میں اس کی زندگی گزر رہی ہے، کبھی صاحب جائداد تھا آج ٹکے ٹکے کا محتاج ہے۔ آوازہ کسنے میں یہی پیش پیش تھا، تیسرا نوجوان بی اے کرنے کے بعد کٹا ہوا پتنگ ہو گیا، آج تک سکون سے محروم ہے۔

۸۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر پنڈت رام نارائن دیو سماج کے بانی کے داماد تھے، کئی شرافتیں ان میں ڈھلی ہوئی تھیں، ان کی زبان بُرے الفاظ ہی سے نا آشنا تھی عمر بھر کسی لڑکے کو بدنی سزا نہیں دی، سخت لفظ نہ کہا، ان کی شخصیت کا اثر اتنا گہرا تھا کہ طلبہ بے ادب ہونے سے ڈرتے تھے، ان کی تنبیہ کے بول دل پر نقش ہو جاتے تھے۔

(ا)، ان کا بڑا بیٹا سوشیل کمار میرا کلاس فیلو تھا، ہم دونوں پانچویں سے دسویں تک اکٹھے رہے! وہ دھان پان تھا، سرخ و سپید گویا کرشن مراری کی شہنائی کے بول اُس کا جُثہ بن گئے ہوں، شرمیلا پن نویں جماعت تک تھا، دسویں میں قدرے کھل گیا لیکن بے حجاب نہیں تھا، شاعری کے میلان نے طبیعت میں قدرے چُلبلا پن پیدا کیا تو ہم کسی حد تک بے تکلف ہو گئے۔ پنڈت جی انگریزی پڑھاتے تھے۔ ایک دن اُنکے پیریڈ کی گھنٹی بجی تو ہم کلاس میں ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے، پنڈت جی نے دیکھا، بدمزہ ہوتے، فرمایا:

"سوشیل کمار! تم تین دن تک میرے پیریڈ میں بنچ پر کھڑے رہا کرو۔ اور ہاں، عبدالحکیم سبق شروع کرو" ——— تین دن نکل گئے، ایک دن پھر یہی مذاق ہو رہا تھا

کر پنڈت جی آ گئے۔

"سوشیل کمار تم علیحدہ سیٹ پر بیٹھا کرو، اور ہفتہ بھر کھڑے رہو۔ مجھے آپ کے بھی کچھ نہ کہا، وہی "عبدالکریم سبق شروع کرو۔

یہ دن بھی اڑ گئے، ہفتہ عشرہ بعد پھر وہی چوچلے، پنڈت جی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ سوشیل کمار، پانچ روپے جرمانہ اور اس سیکشن سے دوسرے سیکشن میں چلے جاؤ؛ میری طرف دیکھا،

"اور ہاں عبدالکریم تمہیں شرم کرنی چاہیے۔"

یہ سات لفظ میرے دل میں ترازو ہو گئے۔ آج تک ان کا اثر اتنا قوی ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ مَیں نے ان الفاظ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس فقرے نے میری زندگی پلٹ دی، جب کبھی پنڈت جی کا لہجہ اور ان الفاظ کی تاثیر میرے حافظہ میں تازہ ہوتی ہے تو ایک عجیب سا کیف پیدا ہوتا ہے۔ زندہ باد پنڈت جی زندہ باد۔

(ب) پنڈت جی کا بنگلہ اسکول سے قریب ہی تھا، سوشیل کبھی کبھار مجھے گھر لے جاتا، اور پُوریاں کھلاتا، ایک دن دروازے تک پہنچے ہی تھے، دیکھا کہ اندر سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ دوڑ کر اندر گئے تو پنڈت جی کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ سوشیل کمار نے گھبرا کر پُوچھا:

"پاپا جی کیا ہُوا؟"

اِدھر مَیں بھی سُن ہو گیا" پنڈت جی ہُوا کیا؟"

رُومال سے آنسوؤں کو پُونچھتے ہوئے کہنے لگے:

عبدالکریم! مَیں نے ساری زندگی کسی طالب علم کو نہیں مارا۔ کوئی خرابی پیدا ہوئی تو زبانی سمجھا دیا، اور وہ طالب علم کے لیے کافی ہوتا، آج نویں جماعت کے ایک طالب علم کو اس کی ایک فحش حرکت پر مَیں نے ہتھیلی پہ دو چھڑیاں ماری ہیں، میرا جی ڈول رہا ہے کہ میرا

عہد ٹوٹ گیا، دل سے جو عہد کیا تھا آج پچیس سال بعد اس شیشہ میں دراڑ آگئی ہے"۔

ان الفاظ میں کیا جادو تھا، قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن آج کے اُستادوں کی عظیم اکثریت ان اوصاف سے محروم ہو چکی ہے۔

(ج) ایک اور اُستاد دیو سماجی ہندو تھے، آٹھویں میں اُردو پڑھا رہے تھے۔ جلم کا تلفظ غلط پڑھا اور معنی غلط بتائے، مَیں نے جسارت کی اور ٹوک دیا۔ تلفظ بھی ٹھیک کیا اور معنی بھی صحیح کیے، انہوں نے سُبکی محسوس کی، زنّاٹے کے دو چار تھپڑ رسید کیے اور کلاس سے نکال دیا۔ مَیں کلاس سے باہر پھر رہا تھا، پنڈت جی آگئے۔

"باہر کیوں پھر رہے ہو؟"

ماجرا بیان کیا، دفتر میں ساتھ لے گئے، چپراسی کو بھیج کر ماسٹر کو بلوایا۔ واقعہ یہی تھا اور ماسٹر کے پاس کوئی جواب نہ تھا، پنڈت جی نے اس سے استعفاء لیا، منتظمہ کے سیکرٹری کو رپورٹ کی اور رخصت کر دیا۔

طبیعت کا میلانؑ

طبیعت کا رُخ شروع ہی سے سیاسی ہو گیا تھا، میرا یومِ پیدائش ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء ہے، پہلی جنگِ عظیم کا دور، اسی زمانہ میں جنگ کے آثار و نتائج سے معاشرہ کا پہلا سانچہ ٹوٹا اور دوسرا بنا، جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہوا، پنجاب میں مارشل لا لگا، تحریکِ خلافت کا دریا چڑھا اور ایک طوفان اُمڈ آیا، قومی تحریک نے راہ پائی، ملک بھر میں عدمِ تعاون کے ہنگامے برپا ہوئے، لیڈر شپ کا انداز بدلا، پُرانے سیاسی چہرے جھڑ گئے، ان کی جگہ نئے سیاسی رہنما آ گئے، یہ زمانہ گاندھی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور سیکڑوں دوسرے رہنماؤں کا تھا، سارا ملک کروٹ لے چکا تھا، ہمارا گھر بھی اس سے متاثر ہوا۔ مَیں آوازآشنا ہوا تو یہ چیزیں میرے ذہنی آب و گِل میں تھیں۔ گویا دماغ بعض خفی و جلی سیاسی اثرات سے تیار ہو رہا تھا۔ غرض یہ زمانہ ہی سیاسیات کا تھا، آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے میرا شعور ناپختگی کے باوجود سیاسی ہو چکا تھا، تحریکِ خلافت کا تو مجھے ہوش نہیں لیکن ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں لاہور کے ہندو مسلم فسادات کی بعض یادیں میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہیں۔ جہاں ہندوؤں کا زور ہوتا کسی اکا دکا مسلمان مسافر کو مار دیتے۔ جہاں مسلمانوں کا غلبہ ہوتا وہ کسی ہندو یا سکھ کو ہلاک کر ڈالتے۔ ایک موت سارے اخباروں کی شہ سرخی ہوتی، فریقین کے اخبار واویلا کرتے۔ اخباری شاعری میں ایک دوسرے کو للکارا جاتا، "پرتاپ" کے جہاشہ نارتنک لڑاتے۔ مولانا ظفر علی خان بدیہہ گوئی کے شہنشاہ تھے، ان کی ایک نظم "دم مست قلندر دھر رگڑا" فساد کا محور ہو گئی۔ اس نظم کو اتنی شہرت ہوئی کہ

بچہ بچہ کی زبان پر آگئی، محفلوں میں تو اس کا ذکر تھا ہی، چانڈو خانوں میں بھی چرچا ہو گیا، گھڑا بجتا، دھیمی دھیمی سُریں اور اس کے مصرعے سلفہ کی اُڑانوں میں گھلے جاتے، مولانا ظفر علی خان کی طبیعت کا جوہر انہی ہنگاموں میں کُھلتا تھا۔

راجپال دشنامِ رسولؐ، میرے سامنے قتل ہوا، اس کی دکان سے علم دین کو خنجر گھونپ کر نکلتے دیکھا، کچھ آگے لکڑیوں کا ایک ٹال تھا، علم دین اس میں گھس گیا، ٹال کا مالک ہندو تھا، اس نے گھیرا ڈالا، اتنے میں پولیس آگئی، علم دین کو گرفتار کیا اور لے گئی، دنوں تک مقدمہ چلتا رہا، سیشن کورٹ نے موت کی سزا دی، جو ہائی کورٹ میں بحال رہی۔ آخر ایک دن علم دین کو میانوالی جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا، حکومت نے اعلان کیا کہ ان کی نعش اسلامی رسومات کے مطابق میانوالی ہی میں دفن کر دی گئی ہے۔ مسلمانانِ لاہور بھڑک اُٹھے، حکومت نے ہنگامہ و ہیجان سے خوفزدہ ہو کر نعش کو حوالے کر دیا، لاہور میں نعش کا جتنا بڑا جلوس نکلا، اتنا بڑا جلوس شاید ہی کبھی نکلا ہو۔ میّت کو کندھا دینے کے لیے بڑے بڑے بانس لگائے گئے، بیک وقت ہزار ڈیڑھ ہزار آدمی کندھا دے رہے تھے۔ ہر خیال کے مسلمان رہنما جنازے میں شریک تھے، سر محمد شفیع بھی تھے، اور مولانا ظفر علی خان بھی، ایک چھوٹی سی بات مجھے اب تک یاد ہے کہ مولانا ظفر علی خان نے قبر میں لیٹ کر اس کی وسعت کا جائزہ لیا تھا۔

انہی دنوں ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا، کمیشن لاہور پہنچا تو زبردست مظاہرہ ہوا، ریلوے اسٹیشن پر سہ طرفہ خاردار جنگلہ لگا دیا گیا۔ پولیس کی بڑی بڑی جمعیتوں نے اسٹیشن اور اس کی سڑکوں کو گھیر رکھا تھا لیکن اس کے باوجود ہزاروں انسانوں کا جلوس لالہ لاجپت رائے، مولانا ظفر علی خان، چودھری افضل حق، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر ستیہ پال وغیرہ کی قیادت میں اسٹیشن کے سامنے مظاہرہ کر رہا تھا، لاہور کے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بہیں جلوس پر ڈنڈے برسائے۔ لاجپت رائے کی چھاتی پر چوٹیں آئیں اور

وہ چند دن بعد اس صدمہ کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ موری دروازہ کے باہر مظاہرہ کی رات کو زبردست جلسہ ہُوا۔ لالہ لاجپت رائے بے نظیر مُقرّر تھے، نوجوانوں کو ہلا دیا، کہا:

"عزیزو! میرے بڑھاپے کی لاج رکھنا، تمہاری جوانی کا فرض ہے
جو لاٹھیاں آج میرے سینہ پر لگی ہیں وہ برطانوی اقتدار کے تابوت میں
آخری میخ ثابت ہوں"۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے انہی الفاظ کی تحریک پر سانڈرس کو قتل کیا اور مرکزی اسمبلی میں بم پھینکا۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو پہلی دفعہ اسی جلسہ میں سُنا، کیا جادو تھا کہ سارا مجمع مسحور ہو گیا، یُوں معلوم ہوتا تھا کہ انگریز جا ہی رہے ہیں، اُس زمانہ میں پولیس آفیسر گھوڑوں پر سوار ہو کر پٹرول کرتے اور گھومتے پھرتے تھے۔ رات گیارہ ساڑھے گیارہ تک جلسہ رہا، سینئر سپرٹنڈنٹ پولیس اور بعض دوسرے آفیسر آخر تک گھوڑوں پہ سوار کھڑے رہے، اس جلسہ سے میرا ابتدائی تأثر یہ تھا کہ لوگوں کے دل سے غیر ملکی حکومت کا خوف نکل چکا ہے۔

۱۹۲۹ء میں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس لاہور میں راوی کے کنارے ہُوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا عنفوانِ شباب تھا، ان کا جلوس نکالا گیا، وہ سفید گھوڑے پر سوار تھے، تمام بازار دُلہن کی طرح سجے ہوئے تھے، سارا صوبہ لاہور میں سمٹ آیا۔ انارکلی واقعی انارکلی ہو گیا، گویا جہانگیر آ رہا ہے اور انارکلی نے سولہ سنگھار کر رکھا ہے یا وہ کسی پدمنی کی طرح ہو گئی ہے، ہم اس زمانہ میں بھلہ شو کمپنی کے ساتھ کوچہ لکشمی نارائن میں رہ رہے تھے، موتی لال نہرو اور ان کی اہلیہ نے بھلہ شو کمپنی کی تیسری منزل سے جلوس دیکھا، دینا رام بھلہ نے جواہر لال پر چاندی کے روپے نچھاور کیے، عجب نظارہ تھا، چاروں طرف عقیدت کا سمندر موجزن تھا۔ بیٹے کی پذیرائی پر ماں باپ کی آنکھیں خوشی سے چھلک گئیں، مولانا ظفر علی خاں نے دفتر زمیندار کے سامنے پنڈت جی کو روک کر مصافحہ کیا،

مولانا اختر علی خاں نے مولانا ظفر علی خاں کی تازہ نظم سنائی، جس میں ہندوستان کی آزادی کا اعلان کیا گیا اور برطانوی ملوکیت کے خاتمہ کی بشارت دی گئی تھی۔ میں ان چیزوں سے غیر ارادی طور پر متاثر ہو رہا تھا، میرے ذہن کی اس غیر ارادی تیاری کے بعض خفی و جلی محرکات تھے، مثلاً:

۱۔ ہمارا گھرانہ ادنیٰ متوسط درجہ ہی کا تھا لیکن اس کا مذاق سیاسی تھا اور وہ احرار سے متاثر تھا۔

۲۔ زمیندار کا بالاستیعاب مطالعہ جو اس زمانہ میں پنجاب کے مسلمانوں میں کانگرس کا ہمنوا واحد اخبار تھا۔

۳۔ مولانا ظفر علی خان کی نظموں کا طبیعت پر فاتحانہ اثر،

۴۔ مولانا ظفر علی خان سے دادا اور ابّا کی والہانہ عقیدت۔

۵۔ دیو سماج اسکول میں طلبہ کا مخلوط ماحول، لیکن یہی ایک ہندو سکول تھا جس کے دیو سماجی کرتا دھرتا حکومت کے ساتھ تھے، تاہم طلبہ کا اپنا ہی مزاج ہوتا ہے، اُن میں آزادی کی لہریں کروٹیں لے رہی ہوتی ہیں۔ تمام مذاہب کے طلبہ کی یکجائی نے اُن تعصّبات کو پیدا ہی نہ ہونے دیا جو ایک ہی فرقے کے اسکول میں عموماً پیدا ہو جاتے ہیں۔

۶۔ انگریزوں سے قدرتی نفرت، جس کی بنیادیں قومی اور مقامی واقعات پر اُستوار ہوتی تھیں۔ مثلاً:

(ا) تحریکِ خلافت کے وہ بول جو کانوں میں آواز کے بغیر بھی گونجتے تھے:

"جان بیٹا خلافت پہ دے دو"

(ب) مارشل لا میں پنجاب کے لوگوں پر بے پناہ مظالم، خود میرے دادا کو صرف اس لیے پکڑ لیا تھا کہ وہ کرفیو کے اوقات میں دُکان سے باہر پیشاب کرنے نکل آئے اور نقد سو روپیہ دے کر چھوٹے تھے۔

(ج) ایک زمانہ تھا جہانگیر کے مقبرے میں بار کا میلہ بڑے ٹھاٹھ سے لگتا تھا، دو دن خوب چہل پہل ہوتی، امرتسر اور گوجرانوالہ کے لوگ منڈلیاں بن کر آتے، اپنے اپنے خیمے لگاتے، رات بھر گاتے بجاتے، صبح کھاتے پکاتے، ابا اور ان کے دوستوں نے بھی ۱۹۲۶ء میں میلہ میں کیمپ لگایا، ہفتہ کی رات کچھ گورے پھرتے پھراتے میلہ میں آگئے اور شاہدرہ کی لڑکیوں کو چھیڑا، اس پر نوجوانوں کو غصّہ آگیا، انہوں نے ان گوروں کو خوب پیٹا، لیکن گوروں کا کالوں کے ہاتھوں سے پٹنا بڑا مہنگا تھا، پولیس کی گاردیں آگئیں، صدر دروازے کے آمنے سامنے جو نظر آیا پکڑ لیا، حجروں کی چھت پر بھی پٹائی شروع کی، سینکڑوں نوجوانوں کو پیٹ ڈالا، بید بھی، جوتے بھی، ٹھڈے بھی اور ڈنڈے بھی۔

ابا کھیت سے واپس آرہے تھے، دروازہ پر دھر لیے گئے۔ دن چڑھ گیا، دھوپ نکل آئی، دس بج گئے، واپس نہ آتے، مَیں بے چین ہوگیا، حتیٰ کہ رونے لگا، ابا کے ایک دوست احمد دین تلاش میں نکلے تو پتا چلا گرفتار ہو چکے ہیں، اتنے میں پھرتے پھراتے دادا جان آگئے، مَیں ان سے لپٹ گیا، بپتا بیان کی، ان کے ایک چچیرے بھائی لوہاری دروازہ کی پولیس چوکی میں تھانیدار تھے، انہیں بلوایا اور اس طرح ابا جان رہا ہو گئے، ابا سے پولیس کی بے تحاشا مار پیٹ کا قصّہ سُنا، ان کے پنڈے پر زخم دیکھے تو جی نڈھال ہوگیا، دادی اماں اپنے بیٹے کی ضربیں دیکھ کر رات بھر بددعائیں دیتی رہیں، اس حادثے نے میرے ذہن کو ہلا دیا، مَیں نے ننھے مُنّے دل میں عہد کیا کہ بڑا ہو کر انگریزی حکومت کے خلاف اس وقت تک لڑوں گا جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتی ہے۔

۷۔ تاریخ کے جس واقعے نے میری نفرت کو پکا کیا وہ معرکہ ارکاٹ (۱۷۵۱ء) میں ہندوستانی سپاہیوں کا کردار تھا کہ خود دیچ پیتے لیکن انگریزوں کو چاول کھلاتے تھے۔

یہ گویا غلامانہ ذہنیت کا منتہیٰ تھا۔

۸۔لاجپت راے کا دیہانت ہو گیا تو شہر میں ہڑتال ہو گئی۔ تمام اسکول اور کالج بند ہو گئے، صرف اسلامیہ ہائی اسکول اور اسلامیہ کالج کھلے رہے، دیو سماجی سرکار پرست ہونے کے علاوہ آریہ سماج کے حریف تھے، لاجپت رائے آریہ سماج کے بھی بہت بڑے لیڈر تھے، دیو سماج کی منتظمہ کے سیکرٹری لالہ جانکی داس نے اسکول بند کرنے سے انکار کر دیا، ہندو طلبہ نے بُرا مانا، ایک وفد بنا کر ہیڈ ماسٹر کے پاس گئے، ہیڈ ماسٹر سیکرٹری ہی کے تابع تھا، مسٹر رام کشن جو ان طلبہ کے لیڈر تھے میرے پاس آئے، ہم نے آپس میں مشورہ کیا، پھر دونوں مل کر ہیڈ ماسٹر اور سیکرٹری کے پاس گئے لیکن وہ راضی نہ ہوئے، ہم نے صلاح کر کے تمام جماعتوں میں ایک نوٹس پھرا دیا کہ ابھی گھنٹی بجنے پر لالہ لاجپت رائے کے سوگ میں اسکول بند کیا جا رہا ہے۔ یہی ہوا، گھنٹی بجی طلبہ کتابیں اُٹھا کر باہر آگئے، ہیڈ ماسٹر بھونچکا رہ گیا، سیکرٹری کے اوسان خطا ہو گئے، استادوں کو طلبہ کے پیچھے دوڑایا، ہم مسلمان طلبہ نے تو واپس آنے سے انکار کر دیا لیکن رام کشن جو ہندو طلبہ کا سرغنہ تھا بعض ہندو طلبہ کو لے کر واپس آگیا، اس کی غدّاری پر ہمیں سخت غصّہ آیا لیکن ہم گھروں کو چلے گئے۔ اگلی صبح ہیڈ ماسٹر نے تمام طلبہ کو ہال میں جمع کیا، سیکرٹری نے دُھواں دھار تقریر کی۔ پنڈت رام نارائن چھٹی پر تھے، ان کی قائمقامی سیکنڈ ماسٹر کر رہے تھے۔ انہوں نے گھنٹی بجانے کے جُرم میں میرے ہاتھ پر دس بید لگاتے، پانچ روپے جرمانہ کیا، بید بھی کھائے، جُرمانہ بھی ادا کیا، لیکن اس کے بعد رام کرشن کو منہ نہ لگایا بلکہ اسکول میں اس کا نام ہی غدّار پڑ گیا ——— یہی رام کرشن تعلیم پانے کے بعد مجسٹریٹ ہو گیا، پھر جیل خانے کی ملازمت میں چلا گیا۔ رائے صاحب بنا، قیدیوں کے لیے اس کا وجود قہر و غضب کی ترت پھرت تصویر تھا میں تو اس کے ساتھ نہیں رہا لیکن جو سیاسی قیدی اس کے ساتھ رہے وہ اس کی بد تعریفی کرتے،

اور نالاں رہے، ہندو سپرنٹنڈنٹ عموماً قومی مزاج رکھتے تھے لیکن رام کرشن کا سہ لیس قسم کا سرکاری افسر تھا، جیل خانہ کی ملازمت اس کی طبیعت کے موافق نہ تھی نتیجتہً الگ ہو کر دوبارہ مجسٹریٹ ہو گیا ——— اس واقعہ نے جو اسکول میں پیش آیا مجھ میں احتجاج کی ایک خُو پیدا کی، میرے اندر حُریت کا احساس بیدار ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی جوہر لندن میں رحلت کر گئے تو مسلمان طلبہ نے ہیڈ ماسٹر سے درخواست کی کہ ہمارے ایک مقتدر رہنما کا انتقال ہو گیا ہے ہم اسکول میں چھٹی چاہتے ہیں وہ مان گئے اور چھٹی ہو گئی، مولانا محمد علی جوہر آخری ایام میں کانگرس سے الگ ہو گئے تھے لیکن گول میز کانفرنس میں ان کی تقریر نے سماں باندھ دیا تھا۔ پرتاپ نے جو کٹر آریہ سماجی اخبار تھا مسلمان اخباروں سے کہیں زیادہ بامعنی سرخی لگائی:

"مشرق کا آفتاب مغرب میں غروب ہو گیا"

۹۔ بھگت سنگھ نے سانڈرس کو قتل کیا تو سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر کے بالمقابل ڈی اے وی کالج میں گھس گئے، پہلو میں دیانند آیورویدک کالج اور اس کا ہوسٹل تھا، اُسے پھلانگتے ہوئے عقبی دروازے سے دیوسماج اسکول کی گراؤنڈ میں آ گئے، بھاگم بھاگ کرشن نگر کی طرف گئے، ہم نوعمر تھے ہم نے اُنہیں دوڑتے دیکھا تو خیال کیا کہ لوگ دوڑا ہی کرتے ہیں وہ آناً فاناً نکل گئے، ہم گھر کو لوٹ رہے تھے کہ بازار میں ضمیمہ بک رہا تھا، سانڈرس کو دہشت پسندوں نے قتل کر دیا ——— نوجوان فائر کر کے بھاگ گئے، پولیس نے ڈی اے وی کالج کا محاصرہ کر لیا۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے تقریباً ہر نوجوان کو متاثر کیا، انہی نوجوانوں میں مَیں بھی تھا، جتیندر ناتھ داس کی بھوک ہڑتال نے سارے ملک کو ہلا دیا جب اس نے جان تیاگ دی تو اس کی ارتھی کا زبردست جلوس نکالا گیا، لاہور سے اس کی لاش کلکتہ بھیجی گئی، انقلابی نعروں نے میری طبیعت کو اور بھی گرمانا شروع کیا، حکومت کے خلاف

انقلابی نعروں کی گونج گرج سے طبیعت میں ولولہ پیدا ہوتا، جی چاہتا ہم بھی انقلابی ہو جائیں، لیکن یہ محض ایک ولولہ تھا، کوئی سانچا نہ تھا، چودہ سال کی عمر میں دل اچھلنے سے جمتا نہیں، "انقلاب زندہ باد" کے نعرے میں بڑی دلکشی تھی، میں ٹیررسٹوں میں شامل ہونا چاہتا تھا لیکن عمر ہی کیا تھی، بہر حال ان چھوٹے بڑے واقعات نے میرے دل و دماغ کا احاطہ کیا اور میں نوعمری ہی میں خیالات کے اعتبار سے "کانگرسی" ہو گیا۔

۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے نمکین ستیہ گرہ کا آغاز کیا، لاہور میں موچی دروازہ کے باغ میں نمک بنایا گیا، اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر کہاں تھے؟ رہنماؤں اور خطیبوں کے گلے ہی لاؤڈ سپیکر تھے، مولانا عبدالقادر قصوری صوبہ کانگرس کے صدر تھے، اُن کی صدارت میں ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو کانگرس کا منشور آزادی پڑھا گیا، ان کا اسٹیج وسط میں تھا، عام جلسہ کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا، اِدھر اُدھر آٹھ منبر بنائے گئے، مولانا ظفر علی خاں، پنڈت کے سنتانم، سردار منگل سنگھ، ڈاکٹر ستیہ پال، چودھری افضل حق، ڈاکٹر عالم وغیرہ نے منشورِ آزادی پڑھ کر سنایا، عجب منظر تھا، اُس وقت مسلمانوں کی کوئی علیحدہ تحریک نہ تھی، لیکن من حیث الجماعت کانگرس میں شامل بھی نہ تھے تاہم کانگرس کے ہمخیال مسلمان زعماء کا عوام پر بڑا اثر تھا اور مسلمانوں کا فعال عنصر مشترکہ جلسوں میں برابر شریک ہوتا تھا۔

گاندھی جی گرفتار ہوئے تو ملک بھر میں ہڑتال ہو گئی، لاہور میں بھی ہڑتال کی گئی، مخلوط بازار تو سب کے سب بند ہو گئے لیکن مسلمانوں کے بازار بھی ایک تہائی بند رہے، کالجوں اور اسکولوں میں بھی چھٹی ہو گئی، لڑکوں نے شہر بھر کو مہاتما کی جے کے نعروں سے گونجا دیا، طلبہ کی ٹولیاں نوجوانوں کے گروہ، دیویوں کے جھرمٹ، مزدوروں کے جمگھٹ، غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، میں کتابیں گھر میں رکھ کر چند دوستوں کے ہمراہ ہڑتال کی سیر کرتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف چلا گیا، میکلوڈ روڈ پر ریلوے پولیس لائن کے عین سامنے نوجوانوں کے ایک گروہ نے ایک ٹانگہ روک رکھا اور ہڑتال پر زور دے رہے

تھے، اچانک ایک ہیڈ کانسٹیبل بیرک سے نکلا اور نوجوانوں پر تڑ تڑ ڈنڈے برسانے لگا، تقریباً سبھی نوجوان بھاگ گئے لیکن ایک لڑکے نے جم کر ڈنڈے کھائے، وہ چار دفعہ گرا اور اُٹھا، آخری بار اسے غش آ گیا، مَیں نے طیش میں آکر ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا، اس نے بائیں گال پر زور سے چانٹا مارا، مَیں بلبلا اُٹھا لیکن وہیں کھڑا رہا، اتنے میں ایک گورا سارجنٹ پولیس لائن کے بنگلہ سے نکلا اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو ڈانٹا اور ہمیں بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا، اُس لڑکے کو کافی چوٹیں آئی تھیں، پیشانی پر ایک زخم سا بن گیا اور ناک سے خون بہہ رہا تھا، میرا گال بھی سُوج گیا، نکسیر پھُوٹی، قمیص پر خون سے گلکاریاں ہو گئیں، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے اس نے میرا نام پوچھا ــــــ "عبدالکریم" سُن کر حیران رہ گیا، غالباً اس کے تصور ہی میں نہ تھا کہ ایک مسلمان نوجوان بھی یہاں ہو سکتا ہے! مَیں نے اتا پتا پوچھا، معلوم ہُوا ڈی اے وی ہائی سکول کا طالب علم ہے، نویں میں پڑھتا اور انارکلی میں رہتا ہے، اور نام ہے اوم پرکاش۔

واقعہ یہ ہے کہ مجھے ٹیررسٹوں میں شامل ہونے کا بیحد شوق تھا لیکن کوئی راستہ نہ سُوجھتا تھا، کوئی رہنما تھا نہ ہمسفر، جی ہی جی میں طوطا مینا اُڑا کر خوش ہوتا، ایک ہم عمر اور ہم جماعت طالب علم کنور سین تھا وہ کہیں سے بم بنانے کا نسخہ اُڑا لایا، اُن دنوں انقلابی کے معنی بھگت سنگھ اور بم پھینکنے کے تھے، ہم دونوں نے راتوں رات پچاس پچاس نسخے لکھے اور اگلے روز موری دروازہ کے باہر جلسۂ عام میں یہ نسخے پھینکے۔ ایک دو کاغذ سی آئی ڈی والوں کے ہاتھ آ گئے۔ اب وہ اشتہار پھینکنے والوں کو ڈھونڈ رہے تھے اور ہم ان کے پیچھے کھڑے اُن کا تماشا دیکھتے رہے، وہ تصور ہی نہ کر سکتے تھے کہ ان لڑکوں کی حرکت ہو سکتی ہے اور کسی مسلمان نو عمر کے متعلق یہ شُبہ ہی ناممکن تھا کہ وہ بھی اس میں شریک ہو سکتا ہے۔
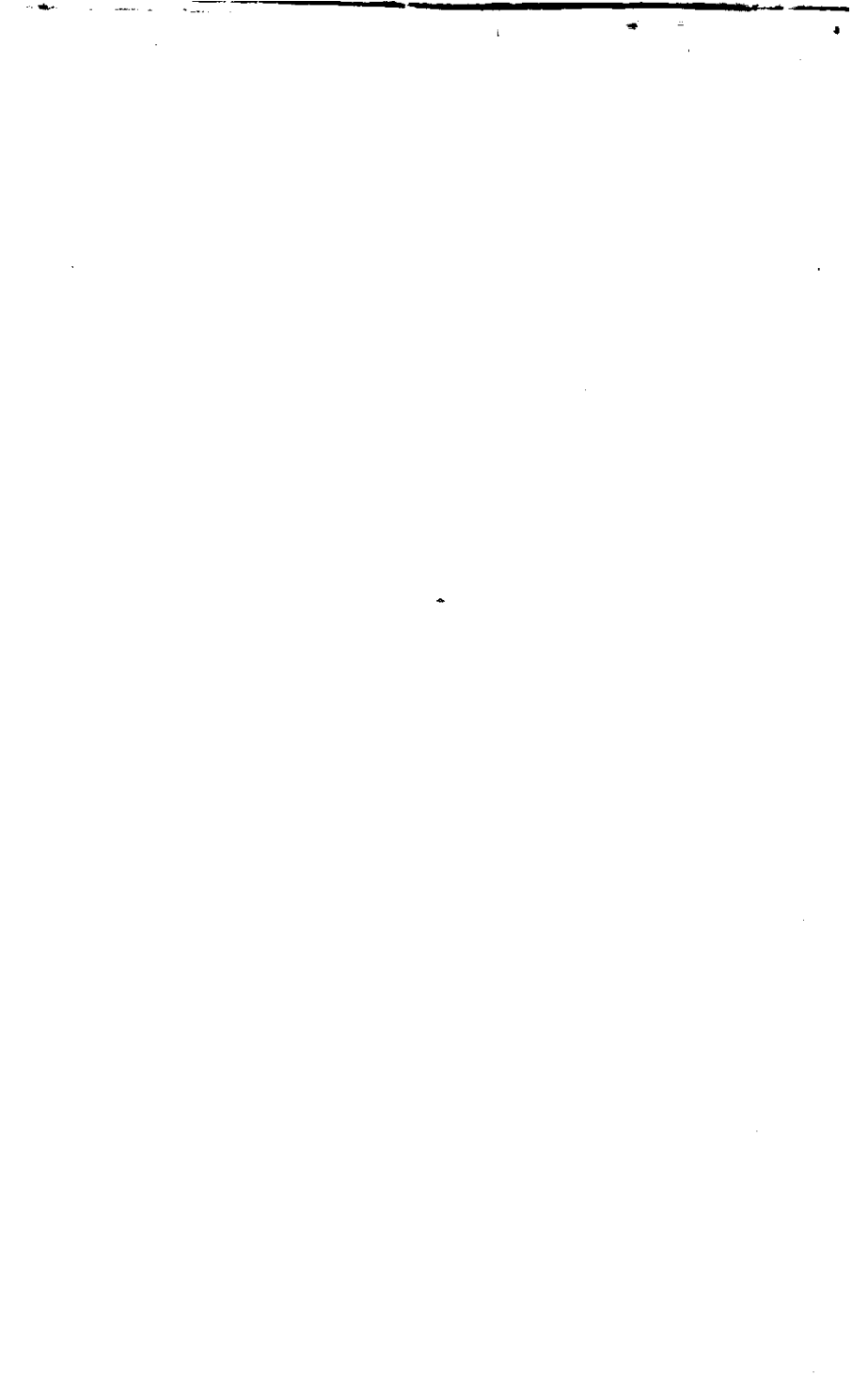
بال بھارت سبھا

پولیس کے تشدّد نے مجھے اور اوم کو یکجا کر دیا۔ ایک روز اوم میرے گھر آیا، ہم نے گلی سے باہر ایک نکڑ میں بیٹھ کر "بال بھارت سبھا" کے نام سے لڑکوں کی ایک جماعت بنانے کا ارادہ کیا، شام کو اس کے ساتھ دو چار لڑکے اور آگئے، چنانچہ موری دروازہ سے باہر باغ میں جمع ہو کر ہم نے بال بھارت سبھا کی بنیاد رکھی، ابتداءً ہم کل چھ لڑکے تھے، تین ہندو تین مسلمان، ہندو نوجوانوں میں اوّلاً اوم پرکاش تھا، ثانیاً ملاپ کے مالک لالہ خوشحال چند خورسند کا چھوٹا بیٹا یش پال، جو اُس وقت غالباً دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ تیسرا کامریڈ دیو دت، جو ان دنوں درزی کی دکان پر سلائی کا کام کرتا تھا، اس کے بعد پنجاب کے نامور کمیونسٹوں میں شمار ہونے لگا۔ مسلمانوں میں ایک میں تھا، ایک نذیر احمد، ہم دونوں اسکول بوائے تھے، نذیر احمد کا والد بھی کانگرسی ذہن کا تھا، تیسرے گنپت روڈ کا ایک چق ساز شہاب الدین تھا، اُس کی آواز میں بڑا رس تھا۔ اکثر انقلابی نظمیں گا کر مظاہروں میں ولولہ پیدا کرتا، اس طرح بال بھارت سبھا قائم ہو گئی، ہم نے موری دروازہ کے باہر بابا کندن شاہ کے مزار سے ملحق سبزے میں کیمپ لگایا، دو چار دن میں رونق پیدا ہو گئی، سینکڑوں نوجوانوں نے نام لکھوایا، ہفتہ بھر میں ایک دو ہزار ممبر بن گئے، کوئی ممبر اٹھارہ برس سے اوپر نہ تھا، دیکھتی آنکھوں جنگل میں منگل ہو گیا، دسیوں چھولداریاں نصب ہو گئیں، ہندو لڑکیاں بھی شریک ہونے

فیس تھی، دودھ، چاول، سبزیاں آٹا، روپیہ پیسہ ہر روز جمع ہوتے، لنگر کھل گیا! ادم کو صدر اور مجھے سکرٹری بنایا گیا ہم بلاناغہ جلوس نکالتے، جلسے کرتے۔ ادم اور میں دونوں نویں جماعت میں پڑھتے تھے اسکول کے بعد ہم سیدھے یہاں پہنچ جاتے، عجب نظارہ تھا کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ پولیس کا ایک سب انسپکٹر چند کانسٹیبلوں کو لے کر کیمپ میں آیا، ایک نوٹس کی تعمیل کرائی، کیمپ اٹھالو، میں نے سکرٹری ہونے کی وجہ سے نوٹس پر دستخط کر دیئے، لیکن باہمی صلاح مشورہ سے یہی فیصلہ کیا کہ کیمپ نہ اٹھایا جائے، دو روز بعد پولیس والوں نے آدھی رات کو چھاپہ مارا، جو رضا کار نوجوان وہاں موجود تھے انہیں گرفتار کر لیا اور سب کچھ اٹھا کر لے گئے، اگلی صبح میرے مکان پر ادم، نذیر، شہاب الدین اور دوسرے ارکان اکٹھے ہوئے اور دوبارہ کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا دن چڑھے باغ میں ہجوم ہو گیا، لڑکوں کا ایک بہت بڑا جلوس بن گیا۔ اس جلوس نے زبردست مظاہرہ کیا، ہندو دیہاتیوں نے کھانے پینے کی تمام چیزیں جمع کرائیں، آناً فاناً اسی طرح خیمے لگ گئے، چہل پہل ہو گئی۔ پہلے صرف لڑکے جمع تھے اب لڑکیوں نے بھی اپنا خیمہ لگا لیا، حکومت کے خلاف بڑے بڑے دستی اشتہار لگا دیئے گئے۔

اگلے روز دوپہر کو لالہ نتھو رام سٹی مجسٹریٹ نوٹس لے کر خود آئے، کہ بارہ گھنٹے کے اندر اندر کیمپ اٹھالو ورنہ پولیس ایکشن لینے پر مجبور ہو گی۔ نتھو رام اکالی تحریک کے دنوں میں کنسٹیبل بھرتی ہوا تھا، گوردوارہ تحریک میں اس نے سکھوں پر بے پناہ مظالم کیے۔ تحریک مدغم ہوئی تو سی آئی ڈی میں چلا گیا، وہاں سے حسن خدمات کے صلہ میں مجسٹریٹی میں آگیا، ان دنوں لاہور میں سٹی مجسٹریٹ تھا، گورہ رنگ، لانبا قد، چہرہ پر چیچک کے چٹاخ، بظاہر نرم لیکن اندر سے آہن، کوئی ایک بجے شب پولیس کی ایک بڑی جمعیت لے کر اس نے کیمپ پر چھاپہ مارا، اب کے رضا کار بہت زیادہ تھے سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، وہ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانا چاہتے تھے لیکن ان سب کا گلا گھونٹا گیا جس نے آواز نکالی اس کو اٹھا کر میونسپل کمیٹی کی نہر میں پھینک

دیا گیا، غوطوں پر غوطے دیئے گئے، بعض لڑکوں کے چہروں پر دانتوں سے کاٹا گیا اور یہ سب کچھ منصور رام کی موجودگی میں ہوتا رہا، غرض کیمپ اور اس میں جو کچھ بھی تھا پولیس اٹھا کر لے گئی اور وہاں ایک گارد بٹھا دی تاکہ صبح کیمپ نہ لگ سکے۔

جن لڑکوں کو پیٹا گیا ان میں اسکول کا ایک طالب علم راجپال بھی تھا، وہ بہت ہی خوبصورت بچہ تھا، ڈی اے وی ہائی سکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، اس نے مزاحمت کی تو پولیس اٹھا کر سٹی کوتوالی میں لے گئی وہاں اس کے ساتھ فعلِ شنیع کیا گیا اور وہ تاب نہ لا کر مر گیا۔ شاہ عالمی دروازہ کے باہر رتن چند کا تالاب تھا، راتوں رات اس میں اس کی نعش کو پھینک دیا گیا، دن بھر اس کے والدین کو تشویش رہی، پریشان تھے کہ رات کیمپ میں تھا، اب کہیں نہیں۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کہاں ہے؟ اچانک بعد دوپہر اس کی لاش پانی کی سطح پر آ گئی، کہرام مچ گیا، پھول سا چہرہ سیاہ ہو چکا تھا، رخساروں پر دانتوں کی کاٹ کے نشان تھے، تمام شہر آگ بھبوکا ہو گیا، محلہ جلوٹیاں میں ان کا مکان تھا، وہاں سے ارتھی کا جلوس نکالا گیا، نوکر شاہی کا ماتم ہوتا رہا انقلاب زندہ باد، برطانوی راج مردہ باد، اپ اپ دی نیشنل فلیگ، ڈاؤن ڈاؤن دی یونین جیک کے فلک شگاف نعرے گونجتے رہے، ڈاکٹروں نے رپورٹ دی کہ راجپال کی موت بدفعلی کے تواتر سے ہوئی ہے۔

پولیس ادم کی تلاش میں تھی وہ احتجاجی جلوس سے لوٹ رہا تھا، سی آئی ڈی کے اہلکار تعاقب میں تھے اس کو پکڑ لیا۔ اور اس کے ساتھ بھی کوتوالی میں وہی سلوک کیا گیا[1]۔

اگلی صبح ادم پرکاش میرے پاس آیا تو اس کا حال پتلا ہو رہا تھا، مجھے گھر سے اٹھا کر موری دروازہ کے باہر نہر پر لے گیا، ایس پی ایس کے ہال کے عقب میں ہم دونوں بیٹھ گئے، وہاں اس نے رُوداد سنائی کہ شب بھر اس پر کیا بیتی، اور کیسے بیتی؟

---

[1] "پسِ دیوارِ زنداں" میں اس کی یہ کہانی تفصیل سے آگئی ہے۔

اس کا پاجامہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ یہ اس کے رستے ہوئے زخم کا خون تھا، اس کی موٹی موٹی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں، وہ سولہ برس کا ایک خوبصورت کھلونا تھا اس کا بلیح رنگ ہردوار کی گمشدہ سُروں سے تیار ہوا تھا، ویدوں کے زمانہ کا ایک گیت تھا جس کو صدیوں کی روایتوں نے اس کے پیکر میں ڈھال دیا تھا۔

ادم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"یہ لو میرا قلم اور پچاس روپے، میراجی اب زندگی سے اُچاٹ ہو گیا ہے، اب میں جینا نہیں چاہتا، میراجی گواہی دے رہا ہے کہ میری زندگی ختم ہو چکی ہے" اس کے رخساروں پر ٹپ ٹپ آنسو بہہ گئے۔

"قلم اور پچاس روپے کس لیے"؟ میں نے اس سے پوچھا،

"قلم میرا تحفہ ہے یادگار"!

اس کا مکان انارکلی میں گردھاری لال فوٹو گرافر کی گلی میں تھا۔ میٹی کلاتھ ہاؤس سے متصل اس کے چچا بھولا رام نے شراب کا ٹھیکہ لے رکھا تھا، کانگرس نے اس دکان پر پکٹنگ کیا، سینکڑوں رضاکار گرفتار ہوئے، مولانا ظفر علی خان نے اس بھولا رام ہی کے بارے میں کہا تھا:

دخترِ انگور تھی گو پہلے دن ہی سے شریر
پڑ کے بھولا رام کے گھر اور نٹ کھٹ ہو گئی

ادم پرکاش بیمار پڑ گیا، تو اس کے پتا لالہ دولت رام اس کو گاؤں لے گئے، کچھ دنوں مقعد سے خون آتا رہا۔ پھر خون کی قے ہونے لگی، چند دن بعد اس کا شعلۂ حیات ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

راجپال کے حادثے اور ادم پرکاش کی موت کے بعد بال بھارت سبھا کا شیرازہ بکھر گیا، یشپال قید ہو گیا، نذیر احمد ایک جلوس میں پکڑا گیا لیکن ضمانت ہو گئی، شہاب الدین

محلّہ کے ایک آنریری وفادار رئیس کی سرزنش پر کچھ سے کچھ ہوگیا، اس کے بھائی نے اس رئیس کی دوکان کرایہ پر لے رکھی تھی جہاں وہ چھتیں بنتا تھا تب مسلمان غریبوں میں امیروں کے سامنے ٹھہرنا تو ایک طرف رہا بولنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا، شہاب الدین مُصلّی تھا، اس میں حوصلہ کہاں سے آتا؟ آنریری رئیس نے اس کو پولیس کا مخبر بنا دیا، جب تک کیمپ رہا وہ لڑکوں میں گُل کھلاتا رہا، کیمپ اُجڑا تو اس نے پولیس کی شہ پر ایک ٹولی بنائی جس کا کام کانگرس کے جلسوں میں پتھراؤ کرنا اور گندے منہ سے گیت گاناتھا۔

ان آنریری رئیس نے میرے والد کو تھانے میں بُلوایا جہاں انہیں سخت سُست کہا۔ ابّا ایک کامل شریف انسان تھے، بُرے الفاظ انہیں خنجر کی طرح چبھے، ایک سال سے ہم پر بیپری وقت تھا، تمام خوشحالیوں سے ہم محروم ہو چکے تھے، غربت کا ایک عجیب سا عالم تھا، ابّا نے تھانے سے واپس آتے ہی مجھے بے تحاشا پیٹنا شروع کیا، مَیں لہولہان ہوگیا، آنریری رئیس "وفاداری بشرطِ اُستواری" کا تماشا دیکھتے رہے جب انہیں یقین ہوگیا کہ اب مجھے کان ہوگئے ہیں اور مَیں آیندہ اس قسم کی غلطی نہیں کرونگا تو وہ فاتحانہ انداز میں ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ چلے گئے۔

میرے والد نے مجھے کبھی نہیں پیٹا تھا بلکہ کبھی سخت سُست الفاظ بھی نہیں کہے تھے لیکن اس دن وہ مجبور ہوگئے تھے، ایک تو اچھے دنوں کی گمشدگی کا انہیں شدید احساس تھا اور وہ عُسرت کے جانگسل ایّام گزار رہے تھے، دوسرے جس بات کا انہیں صدمہ پہنچا وہ تھانے دار کی گالیاں تھیں۔ ابّا لہُو کے گھونٹ پی کر چلے آئے تھے، گھر میں بوڑھی دادی تھیں جن کی نحیف آواز میں ان وفاداروں کے لیے بددعا کے سوا کچھ نہ تھا، دادا جان مشتِ اُستخواں رہ گئے تھے، مَیں نے اپنے والد کو بڑی سے بڑی اِبتلا میں بھی روتے نہیں دیکھا تھا وہ بڑے دل گُردے کے انسان تھے لیکن مجھے پیٹنے کے بعد ان کا جی لرز گیا، وہ اشکبار ہوگئے، دیر تک تخلیہ میں لحاف لے کر روتے رہے انہیں اپنی عُسرت کا انتہائی صدمہ تھا

وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی غریبی کے باعث ہوا ہے ـــــ اگلے روز معلوم ہوا کہ نذیر کو بھی اس کے والد سے پٹوایا گیا ہے، یہ مسلمان پولیس آفیسروں کا کردار تھا، بالخصوص وہ لوگ جو سی آئی ڈی میں خدمات انجام دیتے تھے، ہندو لڑکوں کو لاعلاج سمجھتے تھے، کوئی ہتھے چڑھتا تو اوم پرکاش اور راجپال کی طرح کا سلوک کرتے مسلمان نوجوانوں کو شہاب الدین بنانے کی کوشش کرتے یا پھر ان کے والدین کو بے عزت کرتے تھے۔ سٹی کوتوال اس زمانے میں ایک قادیانی تھا جس کا ذوق عجمی تھا، اس غرض سے اس نے ایک عدد مخلص گنہگار دلال رکھ چھوڑا تھا، جس نے اس کی سفلی خواہشوں کو غذا مہیا کرنے کے لیے اپنی بیوی تک پیش کرنا چاہی تھی، اس عفیفہ نے عذر کیا تو بے غیرت شوہر نے اس کو زندہ جلا ڈالا۔ اوم پرکاش اور راجپال اس کوتوال ہی کے عجمی ذوق سے مجروح ہو کر ہلاک ہوئے تھے۔

بال بھارت سبھا اور سول نافرمانی کی تحریک نے مجھ پر بیحد اثر ڈالا۔ ہم مسلمانوں کو احساس تھا کہ ہم ہندوؤں سے زیادہ بہادر رہیں، ہندو صرف دال بھات کھاتے اور ہم سمو چاؤ نبہ ہضم کر جاتے ہیں، لیکن بال بھارت سبھا میں ان لڑکوں نے جس دلیری کا ثبوت دیا، ہندو کنیائیں جس پامردی سے قید ہوتی رہیں اور جس بیباکی سے نوکر شاہی کو رگیدا، وہ سب واقعات میرے لیے حیرت انگیز تھے، صبح شام انقلاب زندہ باد کے نعرے گونجتے جلسے ہوتے، جلوس نکلتے، سیاپا کیا جاتا، جھنڈے لہرائے جاتے، لاٹھی چارج ہوتا، سر پھٹتے، گرفتاریوں پہ گرفتاریاں ہوتیں، شراب اور بدیسی کپڑے کی دوکانوں پہ پکٹنگ کیا جاتا، ستاروں کی تنویر اور پنکھڑیوں کے خمیر سے بنی ہوئی کنیائیں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر قانون کی دھجیاں بکھیرتیں، اپنے خون سے رضاکاروں کے ماتھے پر قشقہ لگاتیں، پولیس حلقہ باندھ کر راستہ روکتی لیکن وہ اپنے بے خوف خرام سے ہر حلقہ توڑ دیتیں، ان میں بلا کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا وہ ہنستی ہنساتی جیل چلی جاتیں، گویا دلہن سسرال جا رہی ہو، میں ان کے

جبیں چہروں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ دیکھتا تو میرا دل دھک دھک کرتا، مجھے محسوس ہوتا
پنکھڑی تلوار ہوگئی ہے، اشلوک خنجر بنتے جا رہے ہیں، ہندوستان جاگ اٹھا ہے، واقعی
ہندوستان جاگ اُٹھا تھا ——— ان دو شہزادوں میں لاڈو رانی زتشی کی بیٹیاں اپنی تلوار
تھیں، انہوں نے پولیس کو زچ کر رکھا تھا، ان کی بڑی بیٹی جنک کماری زتشی نے گورنمنٹ
کالج کے دروازے پر پولیس کی لاٹھیاں ڈٹ کے کھائی تھیں، اس کا سر پھٹ گیا تو اندر سے
طلبہ نے ہلہ بول دیا، مسٹر ہارڈنگ سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک بھاری جمعیت لے کر آگئے،
طلبہ پر لاٹھی چارج کیا، طلبہ نے گورنمنٹ کالج کے ٹاور پر چڑھ کر یونین جیک پھاڑ ڈالا،
مسٹر ہارڈنگ کالج کے کمپاؤنڈ میں گھس گئے، مسٹر ایچ ایل اوگیرٹ کالج کے پرنسپل تھے فوراً
اپنے دفتر سے نکلے، سپرنٹنڈنٹ پولیس کو انتہائی غصہ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"کالج کمپاؤنڈ خالی کر دیں اور دروازے سے باہر چلے جائیں۔ میرے ہوتے
ہوئے ان طلبہ پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا، ایک تعلیمی ادارے میں پولیس کا اس طرح گھس آنا
کالج کی ہتک اور تعلیم کی اہانت ہے"۔ ہارڈنگ پولیس کی جمعیت لے کر باہر چلا گیا، طلبہ نے
قہقہے لگائے، تالیاں پیٹیں، آوازے کسے، لیکن اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے یا طیش میں آ کر
لوٹنے کا حوصلہ تک نہ کیا۔ زتشی بہنوں کی بہادری اور قربانی سے پورا صوبہ متاثر ہوا تھا'
وہ حسن و شجاعت کی چلتی پھرتی تصویریں تھیں ——— دوسرا کنبہ جس کی بیٹیوں نے
اس تحریک میں جان پیدا کی، وہ پنجاب کے معمر دیش بھگت سورگباشی لالہ پنڈی داس کی
بیٹیاں تھیں، سودیش، آدرش، ستیہ اور سوراج، ان چاروں بہنوں نے چیتے کا جگرا اور شاہیں
کا تجسس پایا تھا، سودیش نے گورنمنٹ کالج پر ترنگا لہرانا چاہا تو پولیس کے لاٹھی چارج سے
اس کا سر پھٹ گیا، اس کے بالوں سے خون ٹپکنے لگا، چہرہ خون کی لکیروں سے دھاری دار
ہوگیا لیکن سودیش نے اپنے ہاتھ سے ترنگا نہ چھوڑا، انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتی
رہی، لوگوں میں جوش پھیل گیا، زنانہ پولیس نے آ کر گرفتار کر لیا اور اس طرح ایک گھنگھور گھٹا

جس کے برسنے کا امکان تھا ایکا ایکی کھُل گئی، انگریز چلے گئے، انہیں جانا ہی تھا لیکن ان کے نظام کا یہ مزاج ہو چکا تھا کہ قانون کو سختی سے نافذ کرتے اور جب قانون اُن کے خلاف فیصلہ دیتا تو فوراً جھک جاتے تھے۔

اِسی فضا میں میرا ذہن تیار ہوتا رہا، اُس زمانہ میں جیل خانے کو کانگرس کے رہنما سوراج مندر کہتے تھے، مجھے بھی اس کی یاترا کا شوق تھا، لیکن اُن دنوں خالی خولی شوق ہی تھا۔ گاندھی اروِن میثاق ہو گیا تو کانگرس کے تقریباً سبھی رہنما، کارکن اور رضا کار رہا ہونے لگے، ان کا زبردست خیر مقدم کیا جاتا، ہر روز جلوس نکلتا، لوگ انہیں ہاروں سے لاد دیتے بعض غریب کارکنوں کو روپوں کی تھیلیاں پیش کی جاتیں، مجھے اپنے شوق کے جوان ہونے کی تو خوشی تھی لیکن دل میں ملال سا تھا کہ قید ہونے کی حسرت ہی رہی ہے۔

ایک روز لاہور کے تمام بڑے بڑے رہنماؤں کا جلوس نکالا گیا، انہی میں مولانا ظفر علی خاں بھی تھے، جگہ جگہ ان کی موٹریں روک کر سپاسنامے پیش کیے گئے اور وہ تقریریں کرتے رہے، کئی مرحلوں میں مولانا نے اپنا وہ کلام سنایا جو جیل میں لکھا تھا، مولانا ظفر علی خاں کی عزت افزائی سے مجھے قدرتی خوشی ہوتی، میرا ذہنی جھکاؤ ان کی طرف تھا اور مَیں اس عمر میں ذہنی طور پر انہیں اپنا پیشوا سمجھتا تھا۔

درمیانی مُدّت

گاندھی اردن میثاق ہوگیا تو کانگرس کا اگلا سالانہ اجلاس کراچی میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کے زیرِ صدارت منعقد ہوا، اجلاس کچھ زیادہ گرم جوش نہ تھا، لیکن سردار بھگت سنگھ وغیرہ کے پھانسی پاجانے کی وجہ سے نوجوان خاصے برہم تھے۔ اِدھر پنجاب پالیٹکس میں کئی دھڑے بن گئے، احرار نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کرلی، اور مجلسِ احرارِ اسلام کے نام سے اپنی تنظیم کی بنیاد رکھی، گو ۱۹۲۹ء ہی میں وہ ذہنی طور پر اس کا نقشہ بنا چکے تھے لیکن ۱۹۳۱ء میں انہوں نے حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں اپنا پہلا اجلاس منعقد کیا، مظہر علی اظہر استقبالیہ کے صدر تھے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدر بنائے گئے، پہلی دفعہ احرار زعماء کو میں نے اسی کانفرنس میں دیکھا۔

گو سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو ایک دفعہ پہلے سُن چکا تھا لیکن وہ کمسنی کا زمانہ تھا، اب سنا تو ساحر معلوم ہوئے، جو سنتا انہی کا ہو جاتا، شیخ حسام الدّین چودھری افضل حق، مولوی حبیب الرحمٰن غرض ایک ایک احرار رہنما کو اس کانفرنس میں سنا، اور دیکھا، خطابت کا جوہر گویا ان پر ختم تھا ——— مولانا ظفر علی خاں سرے سے اس کانفرنس میں شریک ہی نہ ہوئے۔ وہ مدراس کے دورے پر تھے، آخر پتہ چلا کہ احرار رہنما انہیں پسند نہیں کرتے، سبب یہ کہ ان کی طبیعت میں تلوّن ہے، مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر شیخ محمد عالم پکے نیشنلسٹ تھے۔ وہ احرار سے بیزار اور احرار ان سے بیزار دونوں

ایک دوسرے سے متخاصم تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے "میری کہانی" میں احرار کی علیحدگی کا سبب ڈاکٹر عالم کو قرار دیا ہے کہ گاندھی جی نے صورتِ حال کا اندازہ نہ کیا اور ڈاکٹر عالم کو ورکنگ کمیٹی میں نامزد کر دیا۔ چودھری افضل حق نے "تاریخ احرار" میں اس کو افسانہ قرار دیا لیکن یہ لکھا ہے کہ مولانا عبدالقادر قصوری نے ڈاکٹر عالم کو ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنوانے میں غلطی کی۔ اس وقت کانگرس ہائی کمانڈ نے احرار کی بات نہ مانی لیکن نتیجہ ٹھیک وہی نکلا جس سے احرار زعماء نے ہائی کمانڈ کو مطلع کیا تھا، ڈاکٹر عالم تمام قابلیتوں کے باوجود ابن الوقت تھے، نفع کی موہوم سی امید پر عزت تک گنوا دیتے، چنانچہ کچھ عرصہ بعد مجلسِ عاملہ سے استعفاء دے دیا۔ اس سے پہلے کانگرس ہائی کمانڈ ایک اور غلطی کر چکا تھا۔ ڈاکٹر ستیہ پال ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے، گاندھی ارون سمجھوتے کے بعد گاندھی جی اس کوشش میں تھے کہ بھگت سنگھ، سکھدیو اور راج گورو کی سزائے موت ٹل جائے۔ انہوں نے لارڈ ارون سے ذکر کیا وہ راضی ہو گئے کہ آپ اسے مطالبے کی شکل نہ دیں کچھ دنوں بعد وہ سزائے موت عمر قید میں بدل دیں گے۔ گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی میں یہ کیفیت بیان کر دی اور تاکید کی کہ افشا نہ ہو۔ ڈاکٹر ستیہ پال جذباتی مقرر تھے، لاہور میں موری دروازہ کے باہر جلسۂ عام تھا۔ نوجوانوں نے شور مچایا کہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو رہا کراؤ، ڈاکٹر ستیہ پال نے جذبات اور جوش میں آ کر افشا کر دیا۔ پنجاب پولیس جھنجلا گئی، سرونسنر کے چیفس نے لارڈ ارون کو استعفاء بھیج دیا کہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی سزا میں رعایت کی گئی تو وہ ملازمت چھوڑ دیں گے، لارڈ ارون گھبرا گئے، چنانچہ دو ایک روز ہی میں تینوں نوجوانوں کو قاعدہ کے خلاف شام کے وقت پھانسی دے دی گئی، لاشوں کے ٹکڑے کیے گئے، گورہ فوج نے ٹرک میں ڈالا اور فیروزپور سے قریب ستلج کے کنارے بٹر ول ڈال کر تینوں کو جلا دیا۔ ملک میں آناً فاناً خبر پھیل گئی، لاشوں کا تعاقب کیا گیا۔ آخر ان کی جلی ہوئی انگلیوں اور ہڈیوں کو ڈھونڈ کر لاہور میں ان کا

جلوس نکالا گیا، ایک لاکھ سے زیادہ مجمع تھا، جلوس نے سارے شہر میں چکر لگایا، بنٹو پارک گراؤنڈ میں جلسۂ عام ہوا، مولانا ظفر علی خاں واحد مقرر تھے جنہوں نے اس جلسہ کو خطاب کیا دہیں پہلی دفعہ ان سے فارسی کا یہ شعر سنا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ڈاکٹر ستنیہ پال اور ڈاکٹر عالم کے پے بہ پے تجربوں کے بعد کانگرس ورکنگ کمیٹی میں کبھی کوئی پنجابی ممبر نہ لیا گیا، برعظیم کی تقسیم تک ہائی کمانڈ کا یہی شعار رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک دلچسپ فقرہ یاد آگیا۔ ۱۹۴۰ء میں وہ سرحد جا رہے تھے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر نوجوانوں نے اصرار کیا "پنجاب میں بھی تشریف لائیے، یہاں کانگرس کے حالات حد درجہ خراب ہیں۔ مولانا نے فرمایا "میرے بھائی، جو وجہ یہاں آنے کی ہے، وہی نہ آنے کی ہے۔"

گاندھی جی کانگرس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے کراچی پہنچے تو نوجوان بھارت سبھا کے نوجوانوں نے منشی احمد دین کی قیادت میں انہیں ریلوے کے پلیٹ فارم پر سیاہ پھول پیش کیے، یہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے پھانسی پا جانے پر احتجاج تھا، گاندھی جی ان تمام نوجوانوں سے واقف تھے، انہوں نے بہتیری کوشش کی کہ نوجوان سیاہ پھول لوٹا لیں لیکن وہ نہ مانے، ان کی زبانوں پر ایک ہی نعرہ تھا کہ آپ تنہا کیوں آئے ہیں؟ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟

اسی زمانے میں ڈاکٹر عالم نے پنجاب مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کی بنیاد رکھی، مولانا ابوالکلام آزاد کو صدارت کے لیے مدعو کیا، ان کے نام کا اعلان ہوتا رہا، لیکن وہ اجلاس میں نہ آ سکے، ان کی جگہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تشریف لائے، ملک برکت علی ایڈووکیٹ استقبالیہ کے چیئرمین تھے، ملک لال خان کی رہنمائی میں رضاکاروں کا انتظام تھا، ڈاکٹر صاحب

کا لاہور ریلوے اسٹیشن سے جلوس نکالا گیا، جلوس لنڈا بازار، دہلی دروازہ، کشمیری بازار اور ڈبی بازار سے ہوتا ہوا تا ڈاکٹر عالم کے بنگلہ ایبٹ روڈ پر ختم ہوا، اس جلوس کے خلاف شروع سے آخر تک زبردست مظاہرہ کیا گیا، کالی جھنڈیاں دکھائی گئیں، ڈاکٹر انصاری "گو بیک" کے نعرے گونجتے رہے، غرض مسلمانوں نے من حیث الجماعت ان کا خیر مقدم خوشدلی سے نہ کیا۔ بعض نوجوانوں نے جن میں ایک نوجوان واقعتہً پولیس کا دست پناہ تھا گالی گفتار کی حد کر دی، اس پر ملک لال خان کے رضا کاروں کو تاؤ آ گیا، انہوں نے مظاہرین کو ڈنڈوں سے پیٹا، اور وہ اس مرمت کے مستحق تھے۔

روزنامہ سیاست مرحوم کے ایڈیٹر خان محمد اسحاق خاں علیگ شراب میں دھت مظاہرین کے سرغنہ تھے، اُن کا کلمۂ احتجاج تھا" مَیں نے اس لیے پی رکھی ہے کہ گاندھی کہتا ہے شراب نہ پیو۔ ڈاکٹر انصاری گاندھی کے ہمنوا ہیں لہٰذا مردہ باد، پولیس کے گماشتہ کا تو رضا کاروں نے ڈنڈے مار مار کر سر کھاڑ دیا، اور وہ لہولہان ڈاکٹر صاحب کی موٹر پر سوار ہو گیا بلکہ ان کی اچکن کے بازو پر اپنا خون مل دیا، رضا کاروں نے اڑنگا دے کر نیچے گرایا وہ پھر چڑھ گئے، خوب دھینگا مشتی ہوئی، پولیس کے کاسہ لیس بھی ان مظاہرین میں پیش پیش تھے اور یہ سلوک اس انصاری کے ساتھ ہو رہا تھا جو ہندوستان سے ترکوں کے لیے جنگ بلقان میں طبی وفد لے کر گیا تھا، جس نے اُن کے زخموں کو اسلام کے زخم سمجھ کر دھویا تھا، جس کی فیاضیوں سے دہلی کے غرباء، یتامیٰ اور بیوائیں مستفیض ہوتی تھیں، جس کی سخاوت کے دُور دُور تک چرچے تھے، جس کے گھر سے اس کی قید کے دنوں میں بھی ان سینکڑوں اسیروں کو ماہانہ امداد پہنچتی تھی جو معاشی طور پر بدحال تھے، جس کے دامن پر کوئی داغ نہ تھا، جس کے مطب میں غریبوں کا علاج مفت ہوتا تھا، اور غالباً واحد مسلمان تھا جس کا روپیہ کانگرس کی ضرورتوں پر صرف ہوتا رہا۔ اس نے لینا نہیں دینا سیکھا تھا، وہ آل انڈیا کانگرس کا صدر رہا، ورکنگ کمیٹی کے اجلاس اسی کے مکان پر ہوتے،

گاندھی جی دہلی جاتے تو اُسی کے ہاں ٹھہرتے، وہ اجمل خاں کے بعد دہلی کی سب سے بڑی متاع تھا، مظاہرین جو سلوک اس کے ساتھ کر رہے تھے اتنا شرمناک تھا کہ آج بھی اس کے تصور سے طبیعت لرز جاتی ہے۔ ڈاکٹر انصاری شرافت کی تصویر تھے، ان کے چہرے پر شکن تک نہ تھی۔ مَیں شروع سے آخر تک یہ دیکھ رہا تھا اور بے بس تھا، نویں کا امتحان دے چکا اور دسویں میں جا رہا تھا، اس عمر میں میرے لیے مظاہرین کا یہ ناٹک عجیب سا تھا، تاہم مَیں نے محسوس کیا کہ ایک مظلوم کا جلوس کوفہ کے بازاروں میں سے گزر رہا ہے' یہی ڈاکٹر انصاری جب وفات پاگئے تو دہلی ماتم کدہ ہوگئی، سارے ملک میں ان کا ماتم کیا گیا، مظاہرین میں جو لوگ شامل تھے اور جن کی زبانیں بے قابو تھیں مَیں نے احرار سے ہمسفری کے زمانے میں انہیں وہاں کبھی نہیں دیکھا، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس مظاہرے کی تمام تر ذمہ داری احرار پر ڈالی گئی۔ اگلے روز احرار نے دہلی دروازہ کے باغ میں ایک جلسۂ عام کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ نے بڑی دردناک تقریریں کیں۔ اِس مظاہرہ کی مذمت کرتے رہے، انہوں نے کہا کہ جو کچھ ڈاکٹر انصاری کے خلاف یہاں ہوا ہے اس کے بعد وہ دہلی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، دونوں نے ڈاکٹر انصاری کا قصیدہ پڑھا ان کے اوصاف گنوائے، خوبیوں کا تذکرہ کیا، شاہ جی کا آخری فقرہ تھا کہ تم نے مجھ سے اُن کے سامنے ہونے کا حوصلہ چھین لیا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں ابھی مدراس کے دورے پر تھے کہ لاہور میں مغلپورہ انجنیئرنگ کالج کا ہنگامہ چھڑ گیا، طلبہ کی روایت کے مطابق کالج کے پرنسپل مسٹر وِیکر نے سرورِ کائنات کی شان میں گستاخی کی تھی، مسلمان طلبہ نے ہڑتال کر دی، جلسے اور جلوس شروع ہو گئے، احرار نے کالج پر پکٹنگ کیا، پولیس نے لاٹھیاں برسائیں، دو چیزوں نے میرے دل پر گہرا اثر کیا، ایک تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر جو رات ساڑھے نو بجے شروع ہو کر صبح اذان

کے وقت ختم ہوئی، انہوں نے حاضرین جلسہ سے کہا کہ اسی وقت مغلپورہ کالج کی طرف مارچ کریں۔ ہزار ہا لوگ نکل کھڑے ہوئے۔ وہاں پولیس نے زبردست لاٹھی چارج کیا، بیسیوں کے سر پھٹ گئے۔ دوسری چیز جس نے مجھے پولیس کے احترام سے خالی کر دیا اور میں پنجاب پولیس کے مسلمان افسروں کا اپنے دل میں کبھی احترام پیدا نہ کر سکا وہ انگریزوں سے ان کی "وفاداری بشرطِ استواری" کا جذبہ تھا، مولانا ظفر علی خاں دوسرے تیسرے روز مدراس کے دورے سے واپس لاہور پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر عقیدت مندوں نے ان کا استقبال کیا اور ایک مختصر سے جلوس کی شکل میں انہیں دفتر زمیندار لایا گیا، آخر ان کی مداخلت سے مغلپورہ کالج کا قضیہ ختم ہو گیا، وٹیکر نے معافی مانگ لی۔ احرار نے بھی صاد کیا، ان کے سامنے مغلپورہ ایجی ٹیشن سے کہیں بڑا کام کشمیر کا مسئلہ تھا جہاں ان دنوں ڈوگرہ شاہی کا تشدد چل رہا تھا اور کشمیری مسلمان انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ تحریک کشمیر نے سارے صوبہ کو ہلا دیا، پنجاب سے باہر بھی نعرہ ہائے رستاخیز بلند ہو رہے تھے، دہلی اور اجمیر سے بھی رضاکار آ آ کر گرفتار ہوتے، چالیس ہزار مسلمان رضاکاروں کا والہانہ انداز میں قید ہونا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، گول میز کانفرنس لندن میں اس کا اعتراف کیا گیا۔

میں ان دنوں میٹرک کر رہا تھا۔ چونکہ مزید تعلیم کی استطاعت سے محروم تھا، اس لیے اپنے مستقبل کی ویرانی کے خوف سے پریشان، فقر و فاقہ کے دن تھے، بارہا سوچا رضاکاروں میں شامل ہو کر قید ہو جاؤں لیکن والدے کے باوجود حوصلہ نہ کیا، دوسرے وجوہ کے علاوہ ایک وجہ یہ تھی کہ میری طبیعت کا سیاسی میلان صرف شاعری کی طرف تھا۔ پہلے میں سامع یا قاری قسم کا سیاسی آدمی تھا، اب میں شاعری کے خم و پیچ میں الجھا ہوا تھا اور میرے مزاج کا ایک خاص گوشہ نمایاں ہو کر طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ اسی دوران میری دادی اماں دفعتہً بیمار پڑ گئیں، بیمار تو وہ ایک مدت سے چلی آ رہی تھیں لیکن اب کے ان کی بیماری شدید ہو گئی۔ میں ڈرنے لگا، مبادا ہم اس سے محروم ہو جائیں، اس کا وجود ہمارے لیے بے شمار رحمتوں اور لاتعداد عطوفتوں کا سرچشمہ تھا۔ وہ ایک وجود تھا حدیث قدسی کے مطابق جس کے پاؤں تلے جنت تھی۔

دادی اماّں کا انتقال

موت سے کس کو رُستگاری ہے ــــــ بالآخر دادی اماں کا انتقال ہو
گیا۔ میرے لیے یہ گھر میں پہلا سانحہ تھا، تحریک کشمیر کے روزمرّہ جلوسوں سے نپٹ کے گھر
پہنچا تو وہ کل کی نسبت ہشاش بشاش تھیں، ان کی ایک مُنہ بولی بہن جو اُنہی کی ہم عمر تھیں پاس
بیٹھی تھیں، ہم انہیں بھی اماں کہتے، وہ کئی روز سے تیمار داری کر رہی تھیں، آج دادی اماں
کو قدرے بہتر پایا تو وہ ایک دن کے لیے گھر جانا چاہا، دادی اماں نے اجازت دے دی۔
ہم دو بھائی، دو بہنیں اور ابّا دادی اماں کی چارپائی سے قریب بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں
کرتے رہے، محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بیماری کے شکنجے سے نکل آئی ہیں، اور اب صحت
کی شاہراہ پر ہیں، سردیوں کے دن تھے رات نو بجے تک محفل لگی رہی، کوئی سوا نو بجے
میں سو گیا اور بہنوں کی آنکھ بھی لگ گئی۔ گیارہ بجے آنکھ کھلی تو دادی اماں نڈھال تھیں،
ابّا نے ان کا سر گود میں لے رکھا تھا، ان کی حالت دگرگوں ہوتی گئی وہ درد سے اس
طرح کراہ رہی تھیں گویا ان کی رگیں سمٹ رہی ہیں، اور جاں کنی کے لمحوں نے اپنا خنجر ان
کی شہ رگ پر رکھ دیا ہے، چہرے کی بوڑھی شکنیں عالمِ نزع کے نرغے میں تھیں۔ بار بار پانی
مانگتیں، فرماتیں "مجھے اٹھا کر بٹھا دو"، ابّا اٹھا کر بٹھا دیتے، پھر کہتیں "اچھا لٹا دو"، وہ لٹا
دیتے۔ عجیب کشمکش تھی۔ درد و حسرت کا ایک عجیب عالم تھا، ماں مر رہی تھی، بیٹا بچا رہا
تھا اور موت تعاقب کر رہی تھی ــــــ میں ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ رات تا یہ کمر آ پہنچی تو

میں دوبارہ سوگیا، پو پھٹنے سے ایک گھنٹہ پہلے جاگا تو دادو (ہم انہیں اسی طرح پکارا کرتے تھے اور یہ دادی اماں کا مخفف تھا) کا اضطراب شدت کے آخری نقطے پر تھا، ان کا جسم بے چینی کی انگیٹھی میں سلگ رہا تھا، توے پر سپند کی طرح بیکل تھیں، آبا کئی رات سے جاگ رہے تھے، کبھی اٹھانا، کبھی بٹھانا ایک لمحہ کے لیے چین نہ تھا، ان کی آنکھیں سوج گئیں اور انہیں شب بیداری کے ساتھ شب بیزاری سے گزرنا پڑ رہا تھا، وہ دیکھ رہے تھے کہ شفقت کی بھرپور گود اور رحمت کا عظیم سایہ اُن کے سر سے اٹھ رہا ہے، کسی پہلو چین نہ تھا پانچ دس منٹ کے لیے اٹھ کر رفع حاجت کی غرض سے باہر گئے تو دادو کی چیخ پکار سن کر سب کی نیندیں اڑ گئیں اور ہم بستروں سے اُٹھ کر اُن کے پاس آگئے، عجب عالمِ یاس تھا —— عسرت کی گھڑیاں، نزع کی ہچکیاں، غربت کی تنہائیاں، دو برس سے بے پناہ افلاس ایک کلبۂ احزان، جس میں بمشکل تین چار پائیاں سما سکتی تھیں، تین چوڑائی اور ایک لمبائی کی طرف، بڑی چارپائی کو اینٹوں اور مٹی کے پائے دے کر یالا کیا تھا کہ اس کے نیچے ایک اور چارپائی تھی جس پر دونوں بہنیں سوتی تھیں، میں اُوپر کی چارپائی پر سوتا یہی میز، یہی کرسی، اسی پر لکھنا، یہیں پڑھنا، بے بسی کی انتہا تھی، بے کسی کا "عنفوانِ شباب"! دادی اماں پا بہ رکاب تھیں، وہ جاتی دنیا کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھیں، موت نے ایک ایسے گھر کو منتخب کیا تھا جس کے بغیر بھی اس کا گزارہ ہو سکتا تھا ان آخری لمحوں میں دادو نے مجھ سے کہا، "پانی"!

"ڈاکٹر نے صرف دودھ دینے کے لیے کہہ رکھا تھا" میں نے تامل کیا، انہوں نے دوبارہ ٹوٹتے ہوئے حروف کے ساتھ پانی مانگا۔

"پ ان ی —— اتنے میں ابا آگئے اور پانی پلا دیا، میں نے ڈاکٹر کی ہدایت یاد دلائی، کہنے لگے سب ہدائتیں بیکار ہیں، دادو کا آخری وقت ہے ان کی زندگی ختم ہو گئی ہے، یہ کہہ کر ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، ہم بھی اشکبار ہو گئے بلکہ شروع

سے اشکبار تھے، کتنا درد تھا جو ہمارے دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔

دادی اماں نے ابا سے کہا "مجھے اٹھاؤ" ابا نے کہا "امی سو جاؤ"

"سو جاؤں؟ دادی اماں نے پلٹ کر پوچھا،

"ہاں" ابا نے جواب دیا،

"اچھا تو میرا سر زانو پہ رکھو"

ابا نے سر زانو پر رکھ لیا۔ بولیں:

"عبدالکریم کو بلاؤ" میں سامنے ہی تھا۔

"اقبال کو بلاؤ" وہ پیچھے کھڑا تھا۔

زبیدہ اور اقبال کو بلاؤ وہ پائینتی کی طرف جھکی بیٹھی تھیں۔

ہم چاروں ایک قطار میں کھڑے ہو گئے، ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہیں، کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکیں، صرف ایک دفعہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں ابا کا نام پکارا —— "نظام" لیکن اس کے حروف بھی جانکنی کی اَنی سے مجروح ہو کر رہ گئے۔

ابا کا ہاتھ پکڑ کر اشارہ سے کہا "مجھے اٹھاؤ"

ابا نے کہا "اماں سو جاؤ"۔

اچھا تو سو جاؤں؟

کوئی ایک منٹ تک آنکھیں بند کیے رکھیں، ابا کا ہاتھ ان کی نبض پر تھا، آنکھیں کھولیں اور کہا:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

ابا نے جلدی سے آنکھیں بند کر دیں۔ گاؤتکیہ پر امی کا سر رکھ دیا۔ ماں کی آخری ہچکی، بیٹے کی چیخ اور صبح کی اذان ایک ساتھ بلند ہوئیں، اِدھر مؤذن پکار رہا تھا اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اُدھر دادو ہمیشہ کی نیند سو گئی تھیں، گھر میں کہرام مچ

گیا، ابّا پچھاڑیں کھانے لگے، بہنوں نے چلّانا شروع کیا کہ ہماری امّاں تو آج مری ہیں
میں روتے روتے ہلکان ہو گیا ——— دادو، دادو، دادو۔

لیکن ہماری دادو بہت دُور جا چکی تھیں، مَیں روتا پیٹتا بابا کی دکان پر گیا کہ
کلبۂ احزان میں جگہ نہ تھی اور وہ دکان ہی پر سو رہتے تھے، جونہی مَیں نے بابا کو بتایا کہ
دادو مر گئی ہیں تو وہ اس طرح ہو گئے جیسے ان کے دل میں کوئی تیر ترازو ہو گیا ہو،
ان کی آنکھیں بھیگ گئیں، تہمد کے پلّو سے پلکوں کا نم پونچھتے ہوئے کہا "مجھے پہلے ہی
یقین تھا کہ بچے گی نہیں، اس کا سفر پُورا ہو چکا تھا" بابا کے سرخ و سپید لیکن جھُریوں
کی چُنت سے پُر گالوں پر آنسوؤں کے قطرے ٹپکتے رہے، ان چند آنسوؤں میں عمر بھر
کی رفاقت کا افسانہ تھا، ایک ایسا افسانہ کہ ہم سب اس شاخ کے پھول تھے۔

اس سے پہلے جنازے دیکھے ضرور تھے لیکن اٹھائے نہیں تھے مجھے موت سے
خوف آتا تھا، میں اس سے بری طرح ڈرتا تھا لیکن دادی اماں کا جنازہ میرے لیے
ایک عجیب منظر تھا، مَیں خیالات میں گُم سُم لیکن سر جھکائے جنازے کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا
تھا ہم سے وہ دولت بچھڑ گئی تھی جس سے بڑی دولت شاید کوئی نہ تھی ——— دادی
اماں کا جنازہ، انتھاہ محبّت کی لاش، عمیق شفقت کی میّت، کہ اس سے پہلے مَیں نے کبھی
اتنا پُرعظمت جنازہ نہیں اٹھایا تھا ؏

اک جنازہ جا رہا تھا دوش پر تقدیر کے

قبر میں اُتارنے سے پہلے دادا نے اس میں لیٹ کر اس کا طول و عرض دیکھا۔ دو منٹ
لیٹے رہے، کروٹیں بدلیں، سوچتے ہوں گے کہ قبر کے غار اور عروسی کی سیج میں کتنا فاصلہ ہے؟

زخم تو ہمیشہ مندمل ہو جاتے ہیں، یہ زخم بھی آخر کار مندمل ہو گیا، لیکن مَیں برسوں
ان کی قبر پہ جاتا رہا، مٹی کے اُس ڈھیر کو پہروں تکتا، گھنٹوں سوچتا، جگانے کی کوشش کرتا،
لیکن قبرستان میں سونے والے کچھ اس طرح سوتے ہیں کہ اُٹھتے ہی نہیں، انہیں کوئی سی جانی

پہچانی آواز اُٹھا نہیں سکتی، ان کی عیدیں، ان کی شبراتیں، ان کے تہوار ان کے میلے ٹھیلے، عزیزوں کی خوشیاں، اور صدمے سب یونہی گزر جاتے ہیں، وہ سو کر اٹھتے ہی نہیں اور ہم انہیں جگا نہیں سکتے۔ قیامت کو قبروں کے دریچے کھُل جائیں گے اور وہ اٹھیں گے لیکن انہیں جگانے کے لیے جانے کتنی صدیوں کی مسافرت باقی ہے، کتنی نسلوں کو ان کے پیچھے پیچھے جانا ہے اور کتنی پُشتوں کو انہی قبروں میں سونا ہے۔

دادو کی قبر کے آس پاس جتنی قبریں تھیں میں اُن کے سنگی کتبوں اور پختہ حاشیوں پر عموماً سوچا کرتا، ان پر کندہ عبارتیں پڑھتا، اشعار دیکھتا، قرآن کی آیتیں، وفات کی تاریخیں، متوفیوں کے نام، لواحق کی عقیدتوں پر نگاہ ڈالتا اور سوچا کیا میں بھی اپنی دادو کی قبر کو پختہ بنا سکتا اور اس پر کتبہ لگا سکتا ہوں؟ پھر ایک طویل آہ بھر کر چپ ہو رہتا، اپنی تہی دامنی پر لہو کے گھونٹ پی کر لوٹ آتا، یہ وہ دن تھے جب اُجڑا اُجڑا گھر فاقوں کے دن گزار رہا تھا اور وہ بڑے ہی کڑے دن تھے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

چودھری اللہ دتا لاہور میونسپل کمیٹی کے باغبان تھے۔ وہ سیاسیاتِ عالم پر ہر روز اپنا مجہول تبصرہ کرتے۔ ہم سُنتے اور سر دُھنتے تھے۔ دادا جان سے آشنائی تھی۔ میں ان سے پھول لے کر دادو کی قبر پہ چڑھا آتا، عاجزی کی انتہا تھی۔

سال بھر تو یہی معمول رہا، پھر ناغہ ہونے لگا، ناغہ ایک طویل وقفہ ہو گیا۔ آخر وہ قبر چھوٹ گئی، زمانہ لد گیا تو اس کا نام و نشان بھی نہ رہا، گورکنوں کو قبروں سے اُسی وقت تک دلچسپی رہتی ہے جب تک ان کی مٹھی گرم ہوتی رہے، جونہی اعزہ نے ہاتھ کھینچا قبریں بیں سوراخ ہو جاتے اور ان کے سینے پھٹنے لگتے ہیں، اور اگر سال بھر خویش و اقارب غافل رہیں تو قبر ہی پیوندِ زمین ہو جاتی ہے حتیٰ کہ نام و نشان تک نہیں رہتا، کوئی مرجاتا ہے تو گورکنوں کی عید ہوتی ہے۔ نعش دفنانے کے بعد اُس کے ورثاء پر چیلوں کی طرح جھپٹتے ہیں، رقم میں کسر ہو تو قبر کے پھُول چُرا لیتے اور پھکیروں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

تحریکِ کشمیر کے برگ و بار

کشمیر بلاشبہ جنّت نظیر ہے۔ قدرت نے اپنے حُسن کی تمام لطافتوں اور اپنے شباب کی تمام نزاکتوں سے اس کو مالا مال کیا ہے، ڈوگرہ شاہی نے اس خطہ کو جہنم بنا دیا۔ مہاراجہ کشمیر نے پچھتر لاکھ میں خرید کیا تھا، چالیس لاکھ انسان، (اپنے دو روپے فی کس) فرداً فرداً احد کے رحم و کرم پر تھے، ان کے ساتھ بھیڑوں سے بدتر سلوک ہوتا، پچانوے فی صد آبادی کو نالۂ نیم شبی بلند کرنے کا بھی حق نہ تھا۔ اس جنت نظیر میں رہ کر کسی مسلمان کے لیے اُبھرنا گویا پیدائشی جُرم ہو گیا تھا، ہزاروں خاندان ہجرت کر کے پنجاب اور ہندوستان کے بعض دوسرے علاقوں میں آباد ہو گئے، ان خاندانوں نے بڑا نام پایا، ان کے افراد ملک کے عبقری اور نابغہ بن گئے، فکر و نظر اور سیاست و سیادت کے مختلف گوشوں میں ان کا طوطی بولنے لگا، ایک خاص دَور میں تو یہ لوگ ہندوستان کی آبرو رہے، کوئی شعبہ ان سے خالی نہ رہا، سیاست میں علّامہ اقبالؒ، پنڈت موتی لال، پنڈت جواہر لال، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، سر تیج بہادر سپرو، اسی کان کے ہیرے تھے۔ خطابیات میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا ہم پایہ آج تک پیدا نہ ہو سکا، ان کے اجداد بھی کشمیر ہی سے آئے تھے، علّامہ انور شاہؒ کا ہم مرتبہ فنِ حدیث میں اب تک دیکھا نہیں گیا۔ پہلوانی میں رستمِ زماں گاماں اور ان کا خاندان، غلام خاں، کلّو اور ان کے اخلاف، ڈرامہ میں آغا حشر، افسانہ میں منٹو، کہانی میں کرشن چندر، نظم آزاد میں میراجی، یہ سب اسی لڑی کے موتی ہیں۔

فنونِ لطیفہ میں جن لوگوں نے نام پیدا کیا ان میں بھی بیشتر تعداد اس خطّے ہی کے لوگوں کی ہے، لیکن یہ تمام لوگ کشمیر سے نکل کر جب برِعظیم کے مختلف شہروں اور علاقوں میں بس گئے تو ان کا جوہر کھلا، کشمیر تو ان کے لیے دوزخ بنا ہوا تھا، وہاں رہ کر ان کے بال و پر ہی نہ اُگتے تھے مسلمانوں کے لیے اس جنّت نظیر میں رہنا صرف مذہب کی وجہ سے مشکل ہو گیا تھا، ان کے طائفے ہزاروں کی تعداد میں سردیوں کا موسم ہندوستان میں گزارتے اور جگہ جگہ محنت مزدوری کر کے گزر بسر کرتے تھے، ان کی حالت باربرداری کے جانوروں کی سی تھی۔ کوئی ہندو مسلمان نہیں ہو سکتا تھا، ذبیحہ گاؤ کی سزا عمر قید تھی، بیگار عام لی جاتی، برہمنوں کو خدائی حقوق حاصل تھے، راجپوتوں کے سر پر چترِ شاہی دھرا تھا، مسلمانوں کے لیے جینا دُوبھر ہو چکا تھا، عام ہندو اپنے آپ کو ان سے افضل سمجھتے اور رڈوگرے خود کو دیوتاؤں کی اولاد گردانتے۔ ظلم کی رسّی اکثر دراز ہوتی ہے اور اُسے کھل کھیلنے کے مواقع ملتے ہی رہتے ہیں، لیکن اندر ہی اندر انسانی ضمیروں میں اس کے خلاف چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں اور ایک دن احتجاج کی روح کسی انسان میں متشکل ہو کر عوام کی تحریک بن جاتی ہے ——

کشمیر کے چناروں میں احتجاج کے شرارے اندر ہی اندر شعلوں کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ آخر آفتاب نکل آیا، بظاہر سیاسی کھیل بڑے پُراسرار ہوتے ہیں، اکثر تحریکیں اپنے طبعی تقاضوں سے پیدا ہوتی ہیں لیکن ان کی عنان مختلف الطبع لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ بعض تو واقعی عوام کے لیے آگے بڑھتے اور اُن دنوں کی اندھیری راتوں میں روشنی کا مینار بن جاتے ہیں، لیکن کئی مصلحتوں کی شہ پر آتے اور غرضوں کی راہ سے اُبھرتے ہیں۔ انہیں تحریک سے زیادہ اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے، وہ قوم کے نام پر اپنے وجود کی نمائش کے لیے اُٹھتے ہیں، ان کا نصب العین قومی سے کہیں بڑھ کر حزبی ہوتا ہے، تحریکِ کشمیر کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا، حالات آخری منزل پہ پہنچ چکے تھے۔ شیخ عبداللہ اس وقت نوجوان تھے وہ کشمیری مسلمانوں کے عام داخلی اضطراب کا مظہر ہو گئے، ان کے ساتھ بعض ممتاز رہنما بھی تھے

ان کی عمریں بھی ان سے زیادہ نہیں لیکن شیخ عبداللہ کا نمایاں ہونا ان کا مقدر ہو چکا تھا، ریاست کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ باہر کے مسلمانوں کی امداد کے بغیر کسی اثباتی تحریک کا پیدا ہونا یا زندہ رہنا ناممکن تھا، آخر اُونٹ نے کروٹ لی، ڈوگرہ فوج نے مسجد میں گولی چلا دی۔ اس پر ایک لاوا بہہ نکلا، پنجاب کے مسلمان بیقرار ہو گئے، اچانک قادیانی جماعت کے امام میرزا بشیرالدین محمود احمد سامنے آ گئے، انہوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ پہلے خود صدر بنے، پھر علّامہ اقبال کو صدر بنوایا، کمیٹی کا اصل نظم اپنے پاس رکھا، ان کا منشا یہ تھا کہ علامہ اقبال صدر تو رہیں لیکن سبھی کچھ ان کے اپنے ہاتھ ہو، میرزا بشیرالدین اس ساری تحریک اور اس سارے ہنگامے میں مذہبًا راسپوٹین اور سیاستہً کرنل لارنس ثابت ہو رہے تھے، علّامہ اقبالؒ اصل حقیقت کو فورًا بھانپ گئے، انہوں نے استعفا دے دیا، اور اس طرح کشمیر کمیٹی اپنی وسعت و تنوّع کے اعتبار سے غفرلہٗ ہو گئی، میرزا بشیرالدین محمود احمد جو کچھ کر رہے تھے انگریزوں کے ایما پر تھا، ان کی پُشت پناہی حکومتِ ہند کا سٹیٹس ڈیپارٹمنٹ کر رہا تھا، میرزائیوں کا وجود ہی برطانوی سرکار کا مرہونِ منّت ہے۔ انگریزوں نے اس جماعت کو اپنے استعماری مقاصد کے لیے جنم دیا، پروان چڑھایا، میرزا غلام احمد کی نبوّت نے انگریزی حکومت کی مُضطربانہ خواہش پر تنسیخ جہاد کو "ربّانی سند" مہیّا کی۔ میرزائیوں نے مسلمانوں کے کسی بھی ابتلاء میں کبھی شرکت نہیں کی۔ ان کے لیے دنیائے اسلام کا وجود دائرۂ اسلامؐ سے خارج رہا۔ ہمیشہ ملک کے اندر اور باہر انگریزی حکومت کے آلۂ کار ثابت ہوتے، سی آئی ڈی کے اہلکار رہے، بظاہر مسلمان کہلا کر مسلمانوں کی حکومتوں کو دھوکا دیا، پہلی جنگِ عظیم میں عربوں اور ترکوں کے ملکوں میں جا کر برطانوی استعمار کے لیے جاسوسی کرتے رہے، ایک مُہرے کی حیثیت سے کام کیا، ۱۸۵۷ء سے آج تک مسلمانوں پر اس برِّعظیم کے اندر اور اس برِّعظیم سے باہر ایشیا اور افریقہ میں آزمائش کے بڑے بڑے دور آئے لیکن میرزائیوں کا وظیفۂ نبوت اور وظیفۂ خلافت انگریزوں کی خدمت گزاری رہا، ان کی پُوری تاریخ مسلمانوں

کے معاملات میں سرد مہری کا ایک مرقع اور دسیسہ کاری کا ایک المیہ ہے، لیکن کشمیر کے مسئلے کو ہاتھ میں لینا اور آج تک کشمیر کے سوال پر ان کا مضطرب رہنا اصلاً مسلمانوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں میرزا غلام احمد کا دعویٰ مسیحیت اور اس ضمن میں ان کے الہامات ہیں، میرزا غلام احمد کی اس روایت کو اس کے بیٹے میرزا بشیر الدین محمود احمد نے اپنی بشارتوں سے اپنے پیروؤں کے لیے اتنا ناگزیر بنا دیا کہ ان کے نزدیک کشمیر کا حصول گویا میرزا غلام احمد کی الہامی صداقت کا جواز ہو کر رہ گیا ہے، میرزا غلام احمد نے سب سے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ مسیح ناصری کا مدفن کشمیر میں ہے، اپنی مسیحیت کے لیے انہوں نے کشمیر کو محور بنانا چاہا، ان کے جانشینوں نے ہمیشہ اس مخفی خواہش کو دل میں رکھا کہ ریاست ان کی خلافت کا مرکز بن جائے، ان کا خیال تھا کشمیری مسلمانوں کی ضعیف الاعتقادی کے باعث اُنہیں شکار کرنا مشکل نہ ہوگا، میرزا بشیر الدین نے اپنے الہامات سے اسے اور تقویت دی، وہ کشمیر کو میرزائیت کی ریاست بنانے کے متمنی تھے، انہوں نے اپنے پیروؤں سے بارہا کہا کہ "حضرت مسیح موعود" فرماتے تھے کشمیر میری ہی اُمت کے ہاتھوں فتح ہوگا، چنانچہ پاکستان میں شروع سے ۱۹۶۵ء کی جنگ تک میرزائی پیش پیش رہے، چودھری ظفر اللہ خاں بڑے سے بڑے عالمی اعزاز تک پہنچے لیکن کسی معرکہ میں خدا نے انہیں برکت نہیں دی۔ مقدمے بہت سے لڑے لیکن قدرت نے کسی قومی یا ملکی مقدمہ میں انہیں فتحیاب نہیں کیا، جنرل اسمبلی اور سکیورٹی کونسل میں جب بھی انہوں نے کشمیر کے مسئلے پر لمبی لمبی تقریریں کیں یا وکیلانہ خطابت کے جوہر دکھائے، نتیجہ یہی نکلا کہ معاملہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا۔ بظاہر وہ پاکستان کے نمائندے تھے لیکن بباطن ان کے ذہن میں "مسیح موعود" "اور مصلح موعود" کی نمائندگی کا جذبہ کام کرتا رہا، غرض اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ میرزائی اُمت برطانوی استعمار کی داشتہ رہی، اور اس نے اپنے نبی کی آڑ میں انگریزوں کے مقاصد و مصالح کی پشتیبانی کا فرض ادا کیا۔ تحریک کشمیر میں، احرار کی مداخلت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ کشمیری مسلمانوں کو میرزائیوں کی الہام گردی سے بچانا چاہتے تھے، احرار نے کشمیری مسلمانوں

کو باہر سے زبردست طاقت بہم پہنچائی، اگر اس وقت ہندوستان کے سرکاری مسلمان بالخصوص پنجاب کے سرکاری بزرجمہر احرار سے غداری نہ کرتے اور تحریک کشمیر ان لوگوں کے شخصی اغراض پر قربان نہ ہوتی تو بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آج صورتِ حال مختلف ہوتی اور وہ معمّا جس کا حل کرنا ہمارے لیے مشکل ہو رہا ہے وہ معمّا ہی نہ ہوتا، پنجاب کے دامن پر یہ داغ ہمیشہ نمایاں رہا کہ یہاں کے مسلمان عوام مسلمان خواص کے قبضہ میں رہے اور مسلمان خواص برطانوی حکومت کے آلۂ کار، جب تک احرار کا محاذ، ریاست کے خلاف بندھا رہا سرکاری مسلمانوں نے احرار کی ہمنوائی کی، لیکن جونہی برطانوی حکومت کی مداخلت شروع ہوئی اور جواب آں غزل کے طور پر احرار نے برطانوی حکومت کو ہدف بنایا، سرکاری مسلمان فُفروٗ ہو گئے، اور جب سرکار نے چاہا کہ اُس کی ڈھال بن کر سامنے آئیں تو احرار کے خلاف گز بھر کی زبانیں لے کر نکل کھڑے ہوئے، خلوت، وجلوت میں احرار کی بُرائی کرنا ان کا شعار ہو گیا، چنانچہ انگریزی حکومت کے دستر خوانوں کا زلّہ خوار ہونے کی وجہ سے ان لوگوں نے تحریک کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا، ان کا ایک ہی مسلک رہا کہ جب کبھی ان کے ذاتی مفادات یا حزبی مقاصد کو خطرہ ہوتا اسلام بھی معرضِ خطر میں رہتا جونہی ان کے مقاصد و مصالح پُورے ہوتے اسلام کا حقیقی خطرہ بھی ٹل جاتا، ان لوگوں کے وجود نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ نوجوان پود کو اپنے اعمال و افکار کی بدولت ایسی سوچ میں مستغرق کر دیا کہ اسلام مسلمانوں کے لیے واقعی کوئی فعّال نصب العین ہے؟ یا مدۃ العمر سے استحصال پسند مسلمانوں کے ہاتھ میں خنجر بّراں بنا ہوا ہے؟ کئی صدیوں سے مسلمان عوام کو اسلام سے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا فائدہ مسلمان خواص نے اسلام سے اٹھایا ہے۔

بہرحال تحریکِ کشمیر میں احرار کے شمول سے بعض چیزیں واضح طور پر محسوس کی گئیں، مثلاً:

(۱) تحریکِ خلافت کے بعد یہ پہلا عظیم الشان عملی مظاہرہ تھا جسے ایک مسلمان جماعت

نے تنہا اپنی قیادت کے بل پر اس کمال تک پہنچایا کہ دنوں ہی میں وہ مسلمانوں کی قومی زندگی کا مظہر ہو گیا۔

(۲) یہ پنجاب سے پہلی سیاسی تحریک تھی جس میں مسلمان من حیث الجماعت شریک ہوتے، اور اس کی گونج پورے ہندوستان میں سُنی گئی۔ سرحد اور یو پی کے بعض اضلاع سے بھی کچھ لوگ آ آ کے قید ہوتے لیکن اصل مرکز پنجاب ہی رہا۔ نتیجۃً ایک حقیقت آشکارا ہو گئی کہ ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

(۳) تحریک کی چال ڈھال سیاسی لیکن مزاج مذہبی تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان عوام میں اسلام کے نام پر متحرک ہونے کا جذبہ والہانہ حد تک موجود ہے۔

(۴) پنجاب ہی نہیں ہندوستان بھر کے ہندوؤں کا "نیشنلزم" بے نقاب ہو گیا کہ وہ عوام کے مقابلے میں ایک استبداد کے صرف اس لیے طرفدار ہیں کہ ہندو ہے، حتیٰ کہ گاندھی جیسے عظیم رہنما بھی احرار کی تحریک کو فرقہ وارانہ قرار دے کر اُس کی حمایت سے پہلو تہی کی بلکہ معنوی لحاظ سے مخالف رہے،

(۵) ریاستوں کے استبدادی نظام کے خلاف پہلی تحریک تھی اس سے پہلے کسی ریاست کے خلاف کبھی کوئی تحریک نہیں اٹھی تھی۔

(۶) اِس تحریک سے احرار مسلمانانِ پنجاب کی واحد قومی تنظیم ہو گئے جس کی رہنمائی نچلے طبقے کے ہاتھ میں تھی، شہری زندگی میں احرار کا رسُوخ بڑھ گیا، دیہاتی زندگی کے ایک بڑے حصّہ میں بھی احرار کا نام اور کام پہنچ گیا۔ لوگوں کی طبیعتیں ان کی طرف راجع ہو گئیں جس سے مسلمان خواص نے اپنے طور پر خدشہ محسوس کیا، خود حکومت پریشان ہوئی کیونکہ اس کے نزدیک پنجاب برطانوی عملداری کا بازوئے شمشیر زن تھا اور یہاں کسی عوامی سیاسی تحریک کا پنپنا اُس کی منشا کے خلاف تھا۔

(۷) مہاراجہ ہری سنگھ اور انگریزی حکومت میں سمجھوتا ہو گیا تو صورتِ حال بدل

گئی، پنجاب کے جتھے اپنے ہی شہروں میں گرفتار ہونے لگے، پہلے مورچہ تھا سیالکوٹ سے سوچیت گڑھ اور راولپنڈی سے بارہ مولہ، اب پنجاب کے ہر شہر میں پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ:

(الف) سرکاری مسلمان آقایانِ ولی نعمت کی شہ پاتے ہی نو دو گیارہ ہو گئے۔

(ب) اَحرار نے تحریک کا رُخ بدل دیا، شراب پر پکٹنگ، بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ، بیرنگ خطوط وغیرہ یہ وہ ہتھیار تھے جنہیں مہاتما گاندھی اپنی تحریکوں میں استعمال کرتے رہے تھے، سرکاری مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، حکومت کی منشا کے مطابق مسلمان عوام میں پراپاگنڈا شروع کر دیا کہ اَحرار گاندھی اور کانگرس کی معاونت پر آ گئے ہیں، نتیجۃً تحریک کے اثرات کو سہ رُخا نقصان پہنچا، انگریزوں کے لیے اَحرار استعمار کے باغی تھے، ہندوؤں کے نزدیک اُن کا وجود "فرقہ واریت" کا خطرناک اشتہار تھا، اور وہ انہیں ایک آزاد تنظیم کے طور پر دیکھنے سے خائف تھے۔ مسلمان کاسہ لیسوں نے اسے اپنے وجود کی راہ میں مزاحم پایا تو مسلمان عوام میں ان کی بھَد کرنے لگے۔ یہی حکومت کی خواہش تھی، مسلمان عوام محض سیاسی جدوجہد کے مزاج نا آشنا تھے، نتیجۃً تحریکِ کشمیر کسی عظیم نتیجہ کے بغیر ایک عظیم مظاہرۂ ایثار پر ختم ہو گئی۔

مَیں تحریک کے مظاہر سے متاثر ضرور تھا لیکن تحریک میں شامل نہ تھا، ہر جلسہ بہ التزام سُنتا، اَحرار رہنماؤں کو ذوق و شوق سے سُنا اور دیکھا، دل میں ان کے لیے اخلاص پیدا ہو گیا۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی جادو بیانی کے تیوروں سے طبیعت مسحور ہوتی، پھر انہی پر کیا موقوف، اَحرار کا ہر رہنما خطیب تھا۔ ایک کا اُسلوب دوسرے سے مختلف لیکن ہر ایک میں جادو کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، احرار کارکن قربانی و استقامت کے پُتلے تھے، اَحرار کے ایک شاعر احمد یار زخمی نے انارکلی بازار میں جس مردانگی سے گرفتاری کا مقابلہ کیا اور جس حوصلہ سے پولیس کی لاٹھیوں سے سر پھڑوایا وہ تصویر اب بھی میرے

سامنے ہے، پولیس کانپ اٹھی لیکن زخمی کا دل نہیں ہلا، اس نے ایثار کی لاج رکھ لی، وہ تشدد کے خلاف عدم تشدد کا صحیح احتجاج تھا۔

پنجاب کے ہندو اخباروں نے اس تحریک کو اس طرح مسموم کیا کہ ان کی رنگ آمیزی سے صوبہ بھر میں فرقہ وارانہ فساد کا ذہنی آلاؤ بھڑک اٹھا، لاہور میں حالات اور بھی مخدوش ہو گئے، یہاں ہندوؤں نے مہاراجہ کی حمایت میں جلوس نکالا، انارکلی بازار میں فساد ہو گیا۔ نور محمد نام کا ایک نوجوان کہ چمڑے کی ایک دوکان میں ملازم تھا، شہید ہو گیا۔ میں اس وقت قریب ہی تھا، ممکن تھا خنجر میرے سینہ میں بھی پیوست ہو جاتا لیکن قاتل خنجر بھونک کر اوجھل ہو گیا، اس کے بعد آگ بھڑک اٹھی، لیکن احرار رہنماؤں نے فساد روک لیا اور مزاحم ہو گئے، مولانا حبیب الرحمٰن نے رات کو جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا: انگریزی حکومت کے فرستادہ چاہتے ہیں کہ تحریک کشمیر ہندو مسلم فساد کی نذر ہو کر ختم ہو جائے، ہمارا فرض ہے کہ حکومت کو اس کے ارادے میں کامیاب نہ ہونے دیں ——— یہ بات مسلمان عوام کے دلوں میں اتر گئی۔

تحریک کشمیر کے ابتدائی دنوں میں ایک عجیب "حادثہ" پیش آیا، مولانا ظفر علی خاں صوبہ سے باہر تھے، مولانا اختر علی خاں نے مہاراجہ کشمیر کے اے ڈی سی کی حیثیت سے ملازمت کر لی، لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی اور وہ پہلے ہی مہینے واپس آ گئے، مولانا ظفر علی خاں لوٹے تو احرار رہنماؤں نے شکایت کی، اس کے بعد زمیندار تحریک کا پشتیبان اور احرار کا ترجمان ہو گیا، اس کے بہت سے شمارے ضبط کیے گئے، حتیٰ کہ منصور سٹیم پریس بھی ضبط ہو گیا، لیکن ایک چیز جوان دنوں مشاہدہ و مطالعہ میں آتی رہی وہ احرار اور مولانا ظفر علی خاں کا باہمی بُعد تھا، مولانا اس کا ذکر نہ کرتے لیکن ان کے دل پر بعض رنجشیں مرتسم رہتیں، احرار اس کا ذکر کرتے اور عام کارکنوں کو زمیندار سے پرہیز کراتے لیکن یہ لڑائی کیسے شروع ہوئی، کیونکر پروان چڑھی اور اُس نے عصبیتوں کا درجہ کس طرح حاصل کیا؟ یہ ذاتی نوعیت

کا جماعتی المیہ تھا یہی اختلاف تھا جو احرار اور مولانا کے درمیان مستقل جدائی کا باعث ہو گیا اور اس کا بدلہ تحریک شہید گنج کے دنوں میں چکایا گیا، مولانا ظفر علی خان نے اپنے قلم کے زور سے احرار کو اتنا نقصان پہنچایا کہ اس کی تلافی ناممکن ہو گئی۔

انہی دنوں موچی دروازہ کے باغ میں جلسۂ عام منعقد ہوا جلسے سے پہلے جلوس نکالا گیا جو سارے شہر سے ہوتا ہوا موچی دروازہ کے باغ میں ختم ہوا، علامہ اقبال صدر جلسہ تھے اور انہیں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا مسلمان جس جوش و جذبے کے ساتھ نعرہ ہائے تکبیر بلند کر رہے تھے وہ علامہ اقبالؒ کے سُرخ و سپید چہرے پر بہجت و انبساط کی لہریں لے رہا تھا، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے تقریر کی، علامہ مبہوت ہو کر سنتے اور سر دُھنتے رہے معلوم ہوتا تھا ایک عظیم کھلاڑی چوگان کھیل رہا ہے، لوگوں کی عقلیں ان کی خطیبانہ مُٹھی میں تھیں وہ تقریر کر چکے تو لوگوں نے شور مچایا، علامہ اقبال بولیں، شاہ جی نے معذرت کی کہ علامہ بیمار ہیں، اور ان کا گلا خراب ہے، لوگ کہاں مانتے؟ غل مچا، شعر ہونے چاہییں، آوازیں تھیں کہ فضا کو ہلا رہی تھیں، عوام کا اصرار بڑھتا ہی گیا، جب کوئی سا اعتذار یا انکار کام نہ آیا اور لوگوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا تو علامہ مسکراتے ہوئے اٹھے اور مُٹھی کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:

لا الٰہ گوئی بگو از روئے جان

لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است

تمام جلسہ سبحان اللہ، جزاک اللہ، اللہ اکبر کے نعرہ ہائے فلک شگاف سے گونج اٹھا، جو فارسی جانتا تھا وہ عالمِ سُرور میں تھا اور جو نہیں جانتا تھا وجدان کے زور پر جُھوم رہا تھا، گویا شخصیت نے جادُو جگا دیا تھا۔ غالباً اس جلسہ کے بعد ہی باری علیگ نے زمیندار کے کشمیر نمبر میں ایک مضمون لکھا تھا ——— بخاری اور اقبال ۔ آغاز کچھ اس قسم کے فقروں سے تھا:۔

"میرے شب و روز کی رفیق میری کتابیں ہیں" (اقبال)

"میں نے عمر بھر اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی" (بخاری)

کش مکش کے اڑھائی سال

۱۹۳۲ء میں میٹرک کیا، اِسی سال سیاسی ہنگاموں کا مطلع صاف ہو گیا، تحریک کشمیر بھی ختم ہو گئی، لارڈ ولنگڈن نے گاندھی ارون میثاق پر پانی پھیر دیا، گاندھی جی گول میز کانفرنس سے لوٹے، ساحل پر اُترتے ہی گرفتار کر لیے گئے، پنڈت جواہر لال نہرو اس سے پہلے گرفتار ہو چکے تھے، ملک بھر میں گرفتاریوں کی ایک لہر چل رہی تھی، لیکن عوامی تحریک کی امنگ اور ترنگ پیدا نہ ہو سکی، حتیٰ کہ یہ شعلہ کچھ دنوں بعد کجلا گیا، مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں گویا اس میں کوئی ذہنی حصّہ نہیں لے رہا۔ فی الجملہ ع اب طبیعت ادھر نہیں آتی ——— سارے ملک کو معاشی بحران اور اقتصادی درماندگی نے گھیر رکھا تھا، ہمارا معاملہ تو بالکل ہی خاکستر ہو گیا، دادا جان اپنی دکان چھوڑ بیٹھے اور کاریگر خود دکاندار ہو گئے ابا جان جو کچھ کماتے گھر میں نان نفقہ کا ذریعہ تھا، اس سے سُوکھی پھیکی روٹی چلتی، مشکلیں اتنی تھیں کہ انہیں بیان کرتے ہوئے اب خوف آتا ہے، اصل صدمہ یہ تھا کہ حالات ایکا ایکی بے وفا ہو گئے، یہی گھر تھا جہاں خوشحالی کا دَور دورہ تھا ہم نے کبھی تنگدستی اور تُرشی کا مُنہ نہیں دیکھا تھا، کھانا پینا کھلے سے کھُلا اور رہنے سہنے کا ڈھنگ اچھے سے اچھا۔ مَیں نے بال بھارت سبھا میں آ کر کھدر پہننا شروع کیا، اس سے پہلے بوسکی کی قمیص پہنتا اور سونے کے بٹن لگاتا تھا، گرد و پیش جو لوگ بھی تھے ہم اُن سب میں نمایاں تھے، تنگی کا سایہ تک نہ تھا، محسوس یہ ہوتا تھا کہ ہم شاہانہ مزاج کے بچّے ہیں۔ پھر جو پانسہ پلٹا تو افلاس کے سوا دامن میں کچھ نہ رہا، سونے کو اٹھائیں تو مٹی ہو جاتے، وہ ٹھاٹھ ہی جاتا رہا۔ اب

ایک کلبۂ احزان تھا اور ہم تھے بسا اوقات فاقوں پر نوبت آجاتی، چیزیں انتہائی سستی ہو کر بھی ہمارے لیے مہنگی ہو گئی تھیں، دادا بیمار ہو گئے، والد بھی علیل ہی رہتے، ایک محدود سی آمدنی پر گذارہ تھا مصیبت میں کوئی دوست نہیں ہوتا، جانی دوست بھی دستکش ہو جاتے ہیں ذرا اُس انسان کی حالت کا اندازہ کیجیے جو طبعاً شریف ہو لیکن اس کے اچھے دن طوطا چشم ہو گئے ہوں اور اُن دنوں کی یاد دل میں حسرت بن کر بیٹھی ہو، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا اس کے لیے عار ہو، یہ معاشی بحران بلکہ اقتصادی تپ مُحرقہ چھ سات برس رہا لیکن اڑھائی برس انتہائی سنگینی کے تھے، بہتیرا چاہا کہیں نوکری مل جائے لیکن اُن دنوں گریجوایٹ بازاروں میں بوٹ پالش کرتے اور قلیوں میں نوکر ہو رہے تھے، سوچتا رہا کیا کروں، کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا؛ بہت سے دفتروں کی خاک چھانی طبیعت کا میلان مدرسی کی طرف تھا لیکن اپنی تعلیم ہی کیا تھی؛ کبھی کبھار ابتدائی جماعت کے بچوں کی ٹیوشن مل جاتی لیکن ان کے والدین ماہانہ دو روپے بھی نہ دے سکتے تھے، قسطوں میں ادا کرتے کبھی آٹھ آنے کبھی چار آنے، اور کبھی روپیہ؛ خود بے پناہ شوق تھا کہ پڑھوں لیکن کہاں؛ اکثر ہم جماعت کالجوں میں داخل ہو گئے تھے اور اب کالجیٹ ہونے کے غرور میں تھے، ان پر حسرت کی نظریں ڈالتا، ہوسٹلوں کے چکر کاٹتا، ان کی کتابیں دیکھتا، اورینٹل کالج کی ماہانہ فیس تب دو روپے تھی، چاہا "منشی فاضل" میں داخل ہو جاؤں لیکن اس سے بھی محروم رہا، دادی اماں زندہ تھیں تو "زمیندار" خرید کے پڑھتا، اور یہ معمول ہو گیا تھا وہ مجھے بلاناغہ کھانے پینے کے لیے دو آنے دیتیں، میں ایک آنہ میں زمیندار خریدتا اور ایک آنہ میں صبح کا ناشتہ کرتا، اب دو آنے ایک طرف رہے دو پیسے بھی نہ تھے، ایک ہی جوڑا تھا جسے مدتوں خود ہی دھوتا اور پہنتا رہا، ایک دفعہ سوچا کسی اخبار کے دفتر میں سرمۂ مفت نظر کے طور پر کام کروں لیکن حالت ایسی تھی کہ اپنے ہی وجود سے نفرت ہونے لگی، سال بھر انہی سوچوں میں گزر گیا، طبیعت میں شروع سے شرمیلا پن تھا اور وہ ابھی تک چلا آرہا تھا۔

دو چار دروازوں پر ملازمت کے لیے دستک دی لیکن بے سُود، سارا دن ریڈنگ روم

اور پنجاب پبلک لائبریری میں گزارتا رہا جب تک ان کے دروازے بند نہ ہوتے بیٹھا رہتا اسی زمانہ میں قمرالدین نام کے ایک نوجوان سے آشنائی ہوگئی، وہ اُن دنوں ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا، اس کی طبیعت میں اُبھرنے کا مادہ تھا، اس نے طبیہ کالج لاہور سے حکیم حاذق کیا، ہمارے ساتھ دوستانہ علاقہ رکھنے کے باعث خالد تخلص کرنے لگا، پڑھا لکھا تو کچھ زیادہ نہ تھا لیکن فہیم و زیرک ضرور تھا، تقریریں کرنے کا بھی اسے شوق تھا، ورکشاپ کی نوکری ترک کرکے بمبئی چلا گیا، وہاں کاروبار کیا، تقسیم کے بعد کراچی میں آگیا، آج کل کراچی میں سپیئر پارٹس کی دوکان کر رہا ہے، قدرت نے اسے ہر طرح سے مطمئن زندگی دی ہے، ان حکیم قمرالدین کی بدولت مجھے شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی کے کتبخانہ (اندرون بھاٹی گیٹ) میں کلرکی مل گئی، پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ شمس الاطبا خود تو اللہ کو پیارے ہو چکے تھے لیکن ان کے بیٹے ایم محمود اپنے والد کی طبی کتابیں فروخت کرتے اور یہ ایک بڑا کاروبار تھا، افسوس کہ حال ہی میں ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے،

ایم مسعود سی ایس پی محمود ہی کے چھوٹے بھائی اور شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی کے سب سے چھوٹے بیٹے ہیں، مسعود اُس زمانہ میں پڑھتے اور مولانا غلام مرشد کے درس میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے، طبیعت کا سانچہ غایت درجہ مذہبی تھا، نوجوانوں کو سگریٹ پینے سے روکتے اور بے پردہ خواتین کو پردہ کی تلقین کرتے، ہمیشہ کلاس میں اوّل آتے، سبھی امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیے، ایل ایل بی میں صوبہ بھر کا ریکارڈ توڑا، آئی سی ایس ہو کر بمبئی میں تعینات ہو گئے، پاکستان بنا تو یہاں آگئے۔ ہاری کمیٹی کی رپورٹ لکھ کر بڑی شہرت پائی، کئی عہدوں پر فائز رہے۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں ـــــ ان کے کتب خانہ میں کوئی پانچ چھ ماہ ملازمت کی، پھر ان کا مستقل منشی آگیا تو مجھے علیحدہ ہونا پڑا، بہت چاہا کوئی اور ملازمت مل جاتے، کامیابی نہ ہوئی، البتہ بعض کتب خانوں سے لکھا پڑھی کا تھوڑا بہت کام ملنے لگا، جس سے پندرہ بیس روپے مہینہ کی یافت ہوتی اور یہ رقم زندگی گزارنے کے لیے غنیمت تھی۔

ان اڑھائی سالوں میں ایک چیز فطرت کا جزوِ غیر منفک ہوگئی اور وہ کتب بینی کا والہانہ ذوق تھا، صبح و شام پڑھتا اور بہت کچھ پڑھتا، شعروادب کا چسکا لگ چکا تھا، شاعری کے سبھی دیوان کھنگال ڈالے، افسانہ و ناول سے تو کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا لیکن نثر کا بہت بڑا ذخیرہ حافظہ میں اُترتا رہا، نثر نگاری سے پہلے شعر گوئی کا شوق تھا اور شاعری اسکول ہی میں شروع کر دی تھی لیکن ابتدائی مشقیں کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھیں۔ داغ کے انداز میں شعر کہتا۔ پہلے عشق فرض کیا جاتا پھر شاعری کی جاتی۔ یہ داستان آئندہ صفحات میں آ رہی ہے، اس عرصے میں اتنا ضرور ہوگیا کہ زمیندار اور سیاست میں نظمیں چھپنے لگیں، کبھی کبھار نثر بھی لکھتا لیکن مشق کا ایک دَور تھا جس کو افلاس جھنجوڑتا اور عُسرت لوریاں دیتی رہی ان دنوں ایک تجربہ ضرور ہوا کہ ان حالات میں اعزہ بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں، افلاس کو رُسوا کرنے سے بہتر ہے کہ چھپایا جائے، کیونکہ ان حالات میں رستگاری تو شاذ ہی ہوتی ہے لیکن عام دوستوں کے لہجے سے احترام اُڑ جاتا ہے۔

ادبی صُحبتیں

اسکول میں اُردو فارسی کے اُستاد مولوی محمد نیاز نے میرے ادبی ذوق کو سہارا دیا۔ زمیندار کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ ذوق منجھ گیا۔ میں کوئی اڑھائی سال تک بیکار رہا تو مطالعے کی وسعت نے طبیعت کو ادبی سانچہ میں ڈھال دیا۔ لاہور میں جتنے نامور اہلِ قلم تھے ان کا قرب حاصل رہا، شاعروں کی مصاحبت سے مستفیض ہُوا، لاہور اُن دنوں شاعروں اور مشاعروں کا مرکز تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے باقاعدہ حلقے بنے ہوئے تھے، ان میں اکثر مقابلہ رہتا، طرفین رسالوں، اخباروں اور مشاعروں میں ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے اور چٹکیاں لیتے بسا اوقات جانبین میں دلچسپ معرکے ہوتے، ان معرکوں سے ادبی نکتہ آفرینیوں کا خرمن تیار ہوتا اور قارئین و سامعین خوشہ چینی کرتے۔

بظاہر لاہور میں دو حلقے تھے، ایک حلقہ نیاز مندانِ لاہور کا تھا جس میں تاثیر، بطرسؔ، سالک، مجید ملک، تبسم، ہری چند اختر، حفیظ جالندھری وغیرہ شامل تھے، یہ کوئی باقاعدہ حلقہ نہ تھا، دوستوں کا ایک مجمع تھا جن کا شیوہ اہلِ زبان سے اُلجھنا تھا، ان کی پشت پناہی اُنقلابؔ کرتا۔ دوسرا حلقہ علامہ تاجور نجیب آبادی کا   تھا، علامہ زبان کے یگانہ اُستاد تھے اور صاحبِ طرز، ان کے حلقے میں بظاہر نامور لوگ نہیں تھے لیکن ان کے قلم میں نیاز مندانِ لاہور کی بہ نسبت زیادہ جان تھی، انہیں اُبھرنے کا موقع نہ ملا کیونکہ ان کے پاس وسائل کم تھے، اور وہ اکٹھے ہو کر بھی نیاز مندانِ لاہور کی تاب نہ لا سکتے تھے، اِس حلقے میں وقار

انبالوی، فاخر ہریانوی، روش صدیقی، اختر شیرانی، احسان دانش وغیرہم شریک تھے لیکن علامہ تاجور فی نفسہٖ چونچ لڑانے میں طاق تھے۔ ادبی دنیا اور شاہکار میں انہوں نے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔

لاہور سے دو عظیم رسالے نکلتے تھے، ایک نیرنگِ خیال، دوسرا عالمگیر۔ دونوں اصلاً دو مختلف مکاتبِ خیال کے ترجمان تھے۔ نیرنگِ خیال میں جدید و قدیم دونوں رنگ تھے لیکن مزاجاً وہ ایک نئے ادب کی رہنمائی کر رہا تھا۔ تاثیر، پطرس، مجید ملک وغیرہ انگریزی خیالات کو اردو میں سمو رہے اور یورپی شعر و انشاء کو اردو کا جامہ پہنا رہے تھے، اردو زبان کو اس موڑ پر لانا ہی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اس کا سہرا ان کے سر پہ باندھا جا سکتا ہے، ورنہ جہاں تک ان کے رشحاتِ قلم کا تعلق ہے ان میں زندہ رہنے کی علامتیں کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیازمندانِ لاہور کا پورا گروپ بعجلت تمام محو ہو چکا ہے، ان کی عمارت کسی علم و فن پر نہیں محض ادبی شعبدہ بازی پر قائم تھی۔ "عالمگیر" تاثیر و تاجور گروپ سے الگ تھلگ قدیم ادب اور ان کے نمائندوں کا ترجمان تھا، گو اس میں نوجوان بھی لکھتے تھے لیکن زیادہ تر وہی لوگ تھے جن کی گذر بسر پرانے خیالوں اور متقدمین کے افکار پر تھی۔ "عالمگیر" لاہور سے نکلتا لیکن اس کے اوراق عموماً پنجاب سے باہر کے ادیبوں اور شاعروں سے مزین ہوتے۔ نیرنگِ خیال چغتائی آرٹ پیش کرتا، عالمگیر اللہ بخش کے آرٹ کو اچھالتا اور اجالتا، عالمگیر میں زیادہ تر حیدر آباد دکن، لکھنؤ، آگرہ اور دہلی کے اہلِ قلم شریک ہوتے، جلیل مانکپوری، نوح ناروی، شوق قدوائی، صفی لکھنوی، بیدل شاہجہانپوری اور اس عمر و ذوق کے دوسرے شعراء۔ سالنامہ یا خاص نمبر کا سر آغاز سلطان دکن کے استاد جلیل مانکپوری کے کلام بلاغت نظام سے ہوتا ان سے ہٹ کر علامہ تاجور نوجوان اہلِ قلم کی ایک نئی پود پیدا کر رہے تھے۔

میاں بشیر احمد کا ماہنامہ ہمایوں تنقید و شعر کی نئی نئی راہیں نکال رہا تھا۔ ایک غیر جانبدار مجلّے کے طور پر ثقہ حلقوں میں اس کی بڑی توقیر تھی، جوش ملیح آبادی، اختر حیدر آبادی، روش

صدیقی، جگر مُراد آبادی، فانی بدایُونی وغیرہ اس کے خاص شعراء تھے، ہمایوں نے پنجاب میں جدید شاعری، جدید ادب اور جدید تنقید کی پُشتیبانی انتہائی متانت سے کی ــــــــ مولانا ظفر علی خاں نیاز مندانِ لاہور کو اہمیت ہی نہ دیتے تھے "انقلاب" سے ان کا یُدھ ہوتا رہا لیکن نیاز مندانِ لاہور کو کسی ادارہ یا تحریک کے طور پر کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ سالک نے مولانا پر "افکار و حوادث" میں قلم درازیاں کیں، لیکن مولانا ان مصرع ہائے طرح پر کبھی گرہ لگا کر چھوڑ دیتے اور کبھی خارج از بحر قرار دے کر نظر انداز کر جاتے، تاثیر و حفیظ نے قلمی نام رکھ کر مولانا پر بہت سے حملے کیے لیکن وہ ان حملوں کو اپنے حملۂ ترکانہ کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے تھے، کبھی کبھار نمک کے طور پر علاّمہ تاجور اور اختر شیرانی بھی ادبی نقاب اوڑھ کر نیاز مندانِ لاہور کی تواضع کرتے اور انہیں آڑے ہاتھوں لیتے ــــــــ اختر شیرانی نے پہلے خیالستان نکالا پھر ماہنامہ "رومان" جاری کیا۔ دونوں کا ایک خاص مزاج اور ایک خاص اسلوب تھا، جو اختر شیرانی سے شروع ہُوا اور اُنہی پر ختم ہو گیا۔

یُوں تو ملک بھر میں رسالوں کی بھرمار تھی لیکن اس زمانے میں صرف لاہور ہی سے اتنے ادبی ماہنامے اور سیاسی ہفتہ وار نکل رہے تھے کہ شاید سارے ہندوستان کے اردو جرائد بھی مجموعی تعداد میں ان سے کم تھے۔

نیرنگِ خیال کے باقیات میں سے اگر کسی ادبی شہ پارہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور آج تک وہ شہرت قائم ہے تو قاضی عبدالغفار کے قلم سے "لیلیٰ کے خطوط" ہیں، یا پھر مُلا رمُوزی کی گلابی اردو کا بہت دنوں چرچا رہا۔ آگرہ کے ل احمد کے افسانے بھی خاصی شہرت پا گئے، عظیم بیگ چغتائی کے افسانوں کو بڑی عمر ملی، لیکن نیاز مندانِ لاہور کے قلم سے کوئی ایسی چیز نہ نکلی جس کو دوام ہو، حفیظ جالندھری "نیاز مندانِ لاہور" کے محتاج نہ تھے، انہیں شاہنامے نے اٹھایا، گیتوں نے معروف کیا، غزلوں نے جلا بخشی، آواز نے بال و پر دیئے، سالک صاحب مترجم خوب تھے لیکن ان کا ادب اخباری تھا، پطرس کی مزاح نگاری کا

طول وعرض صرف گنے چُنے مضمون تھے جن میں لاہور کا جغرافیہ خاصے کی چیز ہے، یہ لوگ لطافت قلم سے کہیں زیادہ زبان درازی کے ہیرو تھے، ان کی محفلوں میں خاص قسم کے لوگ بیٹھتے، ان سے کسی نوجوان کی تربیت نہ ہو سکی، اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج ان کی ادبی آرائشوں کے مرکز تھے۔ اکثر و بیشتر اُن نوجوانوں کی سرپرستی کرتے جو نک سک کے اعتبار سے جاذب ہوتے، سب سے پہلے تعلیمی اداروں میں تاثیر، بطرس اور تبسّم ہی نے طلبہ کو ہم نشینی کا شرف بخشا اور وہ فاصلہ ختم کر دیا جو اُستاد اور طالب علم کے درمیان تھا، ان کی محفل میں ہر کوئی بار نہیں پا سکتا تھا، بار پانے کے لیے خوش چہرہ ہونا ضروری تھا، ایسا کوئی شخص نہیں ملے گا جو ان کا صحبت یافتہ ہو، یا جسے شاگرد کہہ سکیں (الا ماشاءاللہ) اور جو تھے وہ شعلہ مستعجل نکلے۔

اسلامیہ کالج لاہور سے ان دنوں میرزا ادیب اُبھر رہے تھے ان کا ادبی سفر شاعری سے شروع ہوا۔ مولانا عبداللہ دیو بندی (ایک بازو) اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں اُستاذ تھے، میرزا کی طبیعت کا شاعرانہ اُبھار دیکھ کر انہیں اختر شیرانی کے ہاں لے گئے اور اُن کے حلقۂ تلمذ میں دے دیا۔

میرزا ادیب اُس زمانے میں طویل نظمیں لکھا کرتے جو لاہور کے تقریباً سبھی مسلمان روزناموں میں چھپتی تھیں، تاثیر کے قرب سے اس لیے محروم رہے کہ ان کا نک سک اچھا تھا، اور ان میں دلکشی کا کوئی پہلو نہ تھا، میرزا نے بہتیرا چاہا کہ تاثیر ملتفت ہو لیکن محروم رہے۔ سالک صاحب کا معاملہ بطرس، تاثیر اور تبسّم سے مستثنیٰ تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اخبار نویس تھے، احمد ندیم قاسمی انہی کے شاگرد ہیں، اِس شاگردی کا باعث مولانا غلام مُرشد تھے جو قاسمی صاحب کے رشتہ میں بھائی ہیں۔

احسان دانش کاندھلہ سے لاہور آتے تو اُن کے ہاں کے بعض لوگ داداجان کی دوکان میں ملازم تھے، احسان بھی چند روز اسی دکان میں ٹکے رہے۔ پھر اپنا ٹھکانا بنا لیا،

اور بازار پیسہ اخبار میں ایک کمرہ کرایہ پر لے کر رہنے لگے، ابتداءً معماروں کے ساتھ گارا ڈھوتے رہے کچھ پیسے جمع ہو گئے تو اپنی چند نعتیں چھپوالیں، ہر روز شام کو گنپت روڈ (انارکلی) کے نکڑ پر گا کر فروخت کرتے، آواز میں جادو تھا، بلا کا تیکھا پن، غضب کا لوچ، چار ورق، ٹکا قیمت، سو پچاس قصے روزانہ بک جاتے۔ ان کی ایک نعت تھی "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے" اس نے بڑا رنگ باندھا، ہزاروں کی تعداد میں بک گئی لیکن ایک دن احسان صاحب اچانک "غائب" ہو گئے۔ پتا چلا کہ شملہ پہاڑی میں چوکیداری کر رہے ہیں۔ وہاں سے گورنمنٹ ہاؤس کے مالیوں میں چلے گئے پھر معماروں کی ٹکڑی میں پانی ڈھوتے رہے، مشکیزہ اٹھانے، گارا بنانے، پہلا مشاعرہ انہوں نے اس حال میں پڑھا کہ لاہور کے ایس پی ایس کے ہال میں شیخ عبدالقادر کے زیر صدارت مشاعرہ ہو رہا تھا بڑے بڑے شاعر موجود تھے۔ احسان نے رقعہ بھیجا کہ اپنا کلام سنانا چاہتا ہوں، موقع دیا جائے، شیخ عبدالقادر نے بلوا لیا، دیکھا کہ پھٹے حالوں ایک شخص جس کے پاس مشکیزہ ہے اور گھٹنوں تک نکر پہنے ہوئے ہے، اسٹیج پر آرہا ہے، سامعین متحیر تھے کہ احسان نے جادو بھری آواز میں مطلع اٹھایا اور مشاعرہ لوٹ پوٹ ہو گیا، جو لوگ چند سکنڈ پہلے استہزائی قہقہے لگا رہے تھے ایکا ایکی مبہوت ہو گئے، اب جو احسان غزل پڑھ کر اسٹیج سے اترے تو گویا مشاعرہ ساتھ لے گئے، گودڑی میں لال، حفیظ جالندھری بھی مشاعرے میں موجود تھے، ان کی آواز کا طوطی بولتا تھا سر عبدالقادر ساری زندگی ان کے سرپرست رہے لیکن احسان نے سب کا رنگ پھیکا کر دیا۔ اس مشاعرہ کے بعد احسان پھر غوطہ مار گئے، کئی ماہ بعد روزنامہ "سیاست" میں نظر آتے، کلام اتنا پختہ کہ دنوں ہی میں ڈنکا بجنے لگا، پہلے صفحہ پر بڑے اہتمام سے ان کی نظمیں چھپتیں، ایک دن پتا چلا کہ لوہاری دروازہ کے اندر گیلانی بک ڈپو میں ملازم ہو گئے ہیں اور یہ کام مزاج کے عین مطابق تھا، غرض آٹھ دس برس تک ادنیٰ سے ادنیٰ محنت کی، لیکن اردو اور فارسی ادب کا اہم ذخیرہ کھنگال ڈالا۔ آپ ان کا طلوع ہونا تھا کہ چھا گئے، اصلاً یہ زمانہ جوش کی انقلابی شاعری کا تھا، نئی پود میں ان کا تتبع عام ہو گیا، پرانے

اساتذہ میں بھی ان کی ریس ہونے لگی، سیماب نے اُستاد ہونے کے باوجود ان کی راہیں اختیار کیں
سارا ملک ان کی لے سے گونج اٹھا اُدھر غزل گو شاعروں میں جگر، فانی، اصغر وغیرہ کا زور
بندھا ہوا تھا، اختر شیرانی کی شاعرانہ معراج کے بھی یہی دن تھے، احسان ان سب کی مشترکہ
چھاپ کے علاوہ اپنی انفرادیت لے کر اُبھرا اور چھا گیا۔ جس مشاعرہ میں جاتا اپنے مصائب
کے دنوں کی تصویریں اجتماعی رنگ میں اس طرح پیش کرتا کہ بڑے بڑوں کی ہچکی بندھ جاتی، وہ
جوش کے پیرو کی حیثیت سے اٹھا لیکن اب اس سے شانہ ملا کر چل رہا تھا، جوش نے ادب میں
گھن گرج پیدا کی۔ اس کے تاثر اور گداز سے انکار ناممکن ہے لیکن مزدور کے بارے میں اس کا
تاثر آپ بیتی نہیں تھی، مشاہدہ یا مطالعہ تھا، احسان جو کہتا اس میں آپ بیتی کی کسک اور جگ بیتی
کا تاثر تھا۔ نقاشی اور عکاسی دونوں کا حسن اس کے کلام میں لودیتا ہوا محسوس ہوتا، حفیظ اُلوالاثر
تھے لیکن ان کے ذہن میں بھی چشمک جاگ اٹھی تھی، نیاز مندانِ لاہور نے سیماب کو بھگا دیا تھا،
ساغر نظامی کی آواز میں جادو تھا وہ پڑھتے تو لوگ سر دھنتے لیکن نیاز مندانِ لاہور کی تاب نہ لاکر
سیماب و ساغر دونوں پنجاب چھوڑ کر چلے گئے البتہ ان کا لگاتار مقابلہ علّامہ تاجور نے کیا یا اب
احسان ڈٹ گئے تھے۔

سیّد سلیمان ندوی نے اپنے کسی نوٹ میں تاثیر کو جدید ادب کا عظیم المرتبت نقاد لکھ دیا۔
نتیجتًہ ادب کا ایک خاص حلقہ ان سے مرعوب تھا۔ احسان نے اپنا ابتدائی مجموعۂ کلام حدیثِ
ادب، تاثیر ہی کو نظرثانی کے لیے دیا۔ مدتوں ان کے پاس پڑا رہا۔ قلم لگایا تو اس کے اچھے
شعروں کو مجروح کر دیا۔ اس قسم کی ادبی سینہ زوریاں انکے ہاں عام تھیں۔ ان لوگوں کو جس نے زچ
کیا وہ مولانا ظفر علی خان تھے اور جو ان سے مقابلہ کرتا رہا وہ علّامہ تاجور تھے اور جس کی آواز
ان کے سب سے بڑے شاعر کے لیے پریشانی کا باعث ہوئی وہ احسان تھے۔

میں پہلی اور دوسری جماعت میں احسان صاحب سے پڑھتا رہا اور وہ سکول سے باہر
میرے ٹیوٹر تھے۔ پھر غائب ہو گئے تو یہ ساتھ جاتا رہا، اب ان کا آفتاب نصف النہار پر تھا،

تو مَیں بھی شاعرانہ ذوق لے کر حاضر ہو گیا لیکن وہ شاعروں کی بنیادی کمزوری کا شکار تھے چہرۂ خوش ان کے لیے سب سے بڑی متاع تھا، میرے ایک دوست ان کی نگاہ میں جچ گئے، احسان صاحب نے آنِ واحد میں تخلص دے کر شاعر بنا دیا، ان کے نام پر اس پائے کی نظمیں اور غزلیں لکھیں کہ برسوں مشق کے بعد ایسی پختگی پیدا ہوتی ہے، اس واقعے سے کشیدہ خاطر ہو کر میں الگ ہو گیا، یہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہو گا، ستر ہ سال تک میرے اور ان کے درمیان واجبی سی علیک سلیک رہی۔ انہی دنوں میرزا ادیب کی معرفت اختر شیرانی سے نیاز حاصل ہوا، صبح گیارہ بجے ہوں گے کہ وہ "صبوحی" پی رہے تھے، یہ سلسلۂ نیاز اُن سے آخر وقت تک رہا۔ انہی دنوں لاہور میں لانبے قد کے ایک بزرگ فہیم بیگ چغتائی رہ رہے تھے ——— فہیم گوالیاری کے نام سے غزل کہتے، نثر بھی لکھتے۔ اہلِ زبان تھے اور زبان پر قابو تھا، سراج الدین ظفر انہی کے شاگرد ہیں، اُستاد شاگرد میں ٹھن گئی تو شاعری میں دست و گریباں ہو گئے، آخراً اُستاد پنجاب چھوڑ کر چلے گئے، ایک دفعہ روزنامہ سیاست میں مقبول انور داؤدی نے ان کی کسی کتاب کے محاوروں پر گرفت کی، دنوں تک ادبی چونچیں ہوتی رہیں، ان کے اہلِ زبان ہونے میں شک نہیں تھا لیکن مقبول انور نے آڑے ہاتھوں لیا، فہیم کو اپنے قلم اور زبان دونوں پر ناز تھا، عموماً یہی کہتے صاحب! پنجابی ہماری زبان پر انگلی رکھتے ہیں ہم نے تو راجوں مہاراجوں کے کان کترے ہیں، زبان تو ہمارے گھر کی لونڈی ہے، ایک صاحب کیف مُرادآبادی لاہور میں نازل ہوئے، السنہ شرقیہ کے کسی پرائیویٹ کالج میں پروفیسر رہے تھے، انہیں بھی زبان پر بڑا عبور تھا لیکن پنجابی گروپ نے ان کے چراغ بھی ٹھنڈے کر دیئے۔ اس زمانہ میں مشاعروں کا بڑا رواج تھا، جدید طرز کے ادبی حلقے نہیں تھے البتہ تاثیر نے اسلامیہ کالج میں مجلسِ فروغِ اُردو قائم کر رکھی تھی، احسان دانش نے اپنے طور پر انجمن تعمیرِ ادب، علامہ تاجور نے اردو مرکز اور ہم نوجوانوں نے بزمِ ادب، ابتداءً میرزا ادیب اس کے صدر اور میں سکرٹری تھا۔

شاعروں کی اتنی کثرت تھی کہ نیا تخلص ڈھونڈھنا مشکل ہوگیا تھا، طلبہ میں بھی شاعری ہی کا چرچا تھا، ہر شخص کی خواہش تھی کہ شاعر بنے اور اس کے ساتھ ایک عدد تخلص ہو، احسان صاحب نے تو اپنا کلام اس طرح لٹایا جس طرح نکاح میں چھوارے بٹتے ہیں، ان کے شاگردوں میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے، اُمراء کے بچوں سے احسان وہ کام لیتے جس سے ان کی عزتِ نفس مجروح ہو لیکن وہ شاعری کے شوق میں احساس کیے بغیر بجا لاتے مثلاً میاں! ذرا بوٹ پالش کرا لانا، دکان میں جھاڑو دے دو وغیرہ، اُن کا کہنا تھا کہ "اپنی غریبی کا انتقام لے رہا ہوں۔ مَیں شملہ پہاڑی میں چوکیدار تھا تو یہ مجھ پر قہقہے لگا کر گذر جاتے، ان کی چال میں دولت کا گھمنڈ ہوتا۔" احسان اُمراء کے بچوں کی اصلاح بھی نہ کرتے، ان کے اشعار پھاڑ دیتے، خود غزل یا نظم لکھ کر دے دیتے، میں نے ایک دفعہ ٹوکا تو کہنے لگے انہیں شاعر بنا کر اپنے آپ کو غارت کرنا ہے، ان دنوں روزانہ کوئی سوا ایک شعر کہہ لیتے تھے۔ پھر طاق شعروں میں تقسیم کرتے، مطلعے اور مقطعے بنا کر اپنے لگاؤ کے مطابق مختلف نوجوانوں میں بانٹتے، شاعر کیا سلسبیلِ شعر تھے، ہر تشنہ لب ان کے ہاں اپنی پیاس بجھانے چلا آتا، ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک ان کی بدولت سیکڑوں نوجوان ادبی ستارے بن کر چمکے لیکن آخر کار ڈوب گئے، ان کے ڈوب جانے سے ادب یا شاعری کو نقصان نہیں پہنچا، لیکن دو نقصان واقعی نقصان تھے، اوّلاً جن کی طبیعتوں میں واقعی کوئی جوہر تھا، وہ جوہر کی نشوونما نہ کر سکے، ثانیاً احسان کے کلام کا بہترین حصّہ ان لوگوں میں بٹ کر غارت ہو گیا کہ اب اس کی تلاش ہی ناممکن ہے اور اگر وہ ہزاروں اشعار مل ہی جائیں تو احسان کو راضی کرنا مشکل ہوگا کہ انہیں اپنا لیں۔

علّامہ تاجور میں بھی یہی نقص تھا، انہوں نے اپنے کلام کا ایک حصّہ تو اپنے شاگردوں کی ہونہاری کو پروان چڑھانے کے لیے بانٹ دیا۔ بیشتر حصّہ بعض افسروں کے تخلص کی نذر ہو گیا۔

تاثیر بھی شاعرگری میں مشتاق تھے لیکن ان کا مذاق بورژوائی تھا، سیماب تھوک کے

بیوپاری تھے، اس دوران میں جو چیز میں نے حاصل کی یہ تھی کہ شعر کہنے کا ملکہ تو مکمل نہ ہو سکا لیکن تمام بڑے بڑے شاعروں کے کلام کا بیشتر حصہ حافظہ پر نقش ہو گیا، اور بعض گمنام شاعروں کے تیر و نشتر ذہن میں کندہ ہو گئے۔

شاعروں کے متعلق میرا حسنِ ظن ہمیشہ کمزور رہا ہے، میرے تجربے اور مشاہدے میں ظفر علی خاں واحد شخص تھے جن کی نگاہ اور نفس نے کبھی خیانت نہ کی، اور وہ اس اعتبار سے شرافت کا ایک پیکرِ متحرک تھے، تمام شاعروں پر اس قسم کا الزام لگانا بھی بجائے خود ایک جرم ہے۔ اسی کوچہ سے حسرت موہانی بھی نکلے ہیں، کہ بہ قول سید سلیمان ندوی اس عہد میں مشرق کا آفتاب ان سے زیادہ کسی بے نفس شخص پر نہیں چمکا، لیکن شاعروں کی اکثریت ایسی رہی ہے کہ نفس کی آلودگیاں ان کی فطرت کا حصہ رہی ہیں، غزل نے امرد پرستی کو بڑا سہارا دیا، اس شاعری کے ہاتھوں بیشتر طلبہ داغدار ہو گئے، جہاں تک شراب کا تعلق ہے اکثر شاعر اسی کے ہو گئے لیکن اس زمانے میں ایک بات تھی کہ شراب اور اختلاط پر فخر نہیں کیا جاتا تھا، شاعر واعظوں پر طعن کرنے کے باوجود عیب چھپ کے کرتے تھے، آج ہر عیب صواب سے زیادہ آبرومند ہو گیا ہے۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں ایک وارثی فقیر حیرت شاہ، جالندھر سے لاہور وارد ہوئے، ان سے جمالیاتی ذوق کی مطابقت کے باعث تعلقِ خاطر ہو گیا، جون کے اواخر میں ان کے مرشد حضرت بیدم وارثی لاہور میں تشریف لائے، اور موچی دروازہ کے اندر حافظ معراج دین کے مکان پر قیام کیا، بیدم ایک فقیر منش انسان اور بڑے نغز گو شاعر تھے، آج بھی خانقاہوں اور قوالوں میں ان کے کلام کا چرچا ہے، خود اٹاوہ کے رہنے والے تھے لیکن جب سے زرد احرام باندھا تھا دیوا ہی کے ہو گئے تھے، جو ضلع بارہ بنکی میں صوفیٔ حق آگاہ حضرت حاجی وارث علی کی آخری آرامگاہ ہے، لاکھوں لوگ ان کے مرید ہیں۔ ملک غلام محمد مرحوم بھی اسی آستانے سے وابستہ تھے اپنی گورنر جنرلی کے زمانے میں وہاں حاضر ہوئے تھے۔ وارثی فقرا پیلا احرام

باندھتے، ننگے پاؤں اور ننگے سر رہتے، فرش پر بیٹھتے اور سوتے، سماع پر جان دیتے بلکہ جو کچھ پاس ہو لٹا دیتے ہیں، سماع میں عجیب وغریب رسمیں ادا کرتے اور نگا رنگ آوازیں نکالتے ہیں۔

اِس زمانے کے اکثر شعراء حاجی وارث علی سے بیعت تھے، مثلاً سیماب اور جوش بھی شروع میں وارثی کہلاتے رہے، جگر کے متعلق بھی یہی روایت سُنی گئی۔ اصغر گونڈوی کے بارے میں بھی یہی کہا گیا لیکن بیدم ظاہر و باہر اور کلام وبیان میں وارثی ہو گئے تھے۔ ان کی ہم نشینی سے یوپی کے فقراء کی تہذیب کا اندازہ ہوا، مَیں نے اُن سے ایک غزل پر تبرکاً اصلاح بھی لی ——— غرض یہ سن وسال اور خط وخال تھے، جن سے میرا ادبی ذوق اُستوار ہوتا رہا۔ رومانی داستانیں میری طبیعت میں رچ بچ گئیں۔ حُسن پر فریفتگی کی حس تیز ہو گئی، دل عشق کا نشیمن ہو گیا، لیکن میری ذہنی تربیت ہی ایسی تھی کہ مَیں شاعرانہ الّلے تلّلوں میں شریک ہونے سے معذور رہا۔ خوبصورت چہروں کو دیکھتے ہی دل تھا کہ پھڑ پھڑ دھک دھک کرتا اور خون تھا کہ اس کی گردش تیز ہو جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ حُسن کی تاثیر اور تعزیر دونوں ہی سخت ہیں۔

شہید گنج

لاہور کے لنڈا بازار میں شہید گنج کے نام سے ایک مسجد تھی، کب بنی؟ کیونکر بنی؟
کس نے بنوائی؟ اس پر کیا بیتی؟ مسجد سے گردوارہ کیسے ہوئی؟ سکھوں نے اس پر کس
طرح قبضہ کیا؟ انہدام سے پہلے لاہور کے غالباً ننانوے فی صد مسلمانوں کو معلوم نہ تھا،
شروع جولائی ۱۹۳۵ء میں ایک دن ہنگامہ برپا ہوگیا کہ سکھ اس مسجد کو گرا رہے ہیں گنبد
وغیرہ ڈھائے جا چکے ہیں، باقی عمارت پر گینتیاں چل رہی ہیں، پورا شہر بھڑک اٹھا، مسلمان
جوق در جوق جمع ہو گئے، اتفاق سے اس روز جمعہ تھا، جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمانوں
نے شہید گنج کا رُخ کیا، ہزارہا مسلمان نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے ہوئے شہید گنج کی طرف روانہ
ہو گئے۔ سینکڑوں لوگ مسلح تھے، بعض نوجوانوں نے تیزاب کی پچکاریاں بھری ہوئی تھیں،
میں بھی تماشائی کے طور پر ساتھ ہو گیا، جلوس شہید گنج کے چوک میں پہنچا تو سکھ مسجد کی چھت ڈھا
رہے تھے، مسلمان اور بھی مشتعل ہو گئے۔ سکھوں کا مجمع کچھ زیادہ نہ تھا، یہی سو دو سو ہونگے،
ان کے پاس کرپانیں ضرور تھیں، مسلمان آگ بگولا ہو گئے، فساد ہوتا تو لازماً اس وقت
مسلمان مسجد پر قابض ہو جاتے اور اُن سکھوں کو آن واحد میں ختم کر ڈالتے۔ لیکن چند ہی
منٹ کے اندر اندر گھڑ سوار پولیس آ گئی۔ دیکھتی آنکھوں پیادہ پولیس کا ڈھیر لگ گیا۔
نریندر سنگھ نام کا ایک سکھ لاہور میں سٹی مجسٹریٹ تھا۔ اُس نے آتے ہی مسلمانوں پر لاٹھی
چارج کا حکم دے دیا اور اس طرح بھڑکتی ہوئی آگ پر تیل ڈالا، مسلمانوں نے لاٹھی چارج

کی مطلقاً پروا نہ کی، اتنے میں مولانا ظفر علی خان، ان کے صاحبزادے اختر علی خان، سیّد حبیب، ملک لال خان وغیرہ پہنچ گئے، انہوں نے مسلمانوں کی یلغار کو بازوؤں کی زنجیر بنا کر روکا، مولانا اختر علی خان نے ماسٹر تارا سنگھ کو ہاتھ جوڑے کہ مسجد کا انہدام روک دیں لیکن ماسٹر تارا سنگھ نے انتہائی درشت لہجہ میں انکار کر دیا۔ اُدھر اکالی بھی کرپانیں سونت کر کھڑے ہو گئے، انہیں معلوم تھا کہ سٹی مجسٹریٹ ان کا سکھ بھائی ہے، لاہور کا ڈپٹی کمشنر مسٹر ایس پرتاپ بھی پیدائشی طور پر سکھ تھا لیکن مذہباً عیسائی ہو گیا تھا۔

مولانا ظفر علی خان نے ایک پُرجوش تقریر کی، لوگوں سے کہا کہ ہم حکام سے گفتگو کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے مسجد کا انہدام رُک جائے، فی الحال آپ چلے جائیں، کل صبح تک کوئی نتیجہ نکل آئے گا، مسلمان واپس ہونے لگے تو سکھوں نے شہید گنج کی بالکونی سے "راج کریگا خالصہ" کے نعرے بلند کیے۔ مسلمان پھر رُک گئے، مولانا ظفر علی خان آڑے آ گئے۔ سردار نریندر سنگھ کا رویہ بظاہر یہ تھا گویا فساد چاہتا ہے، وہ کُھلم کُھلا سکھوں کی حمایت کر رہا تھا لیکن مسلمان رہنماؤں کے تدبّر سے فساد ٹل گیا۔ مسجد شہید گنج بدستور گرتی رہی اور گرا دی گئی۔ پاس ہی شاہ کاکو کا مزار تھا، وہ بھی برابر کر دیا گیا۔ نتیجتاً اگلی صبح مسجد کا نام و نشان ہی نہ رہا۔

شہید گنج کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ مسجد ہے اور واقعی مسجد تھی، ایک دفعہ جہاں مسجد بن جائے شرعًا اور اسلامًا ہمیشہ مسجد رہتی ہے۔ سکھوں کا بیان تھا کہ اورنگ زیب کے گورنر معین الملک عرف میر منو نے یہاں سکھوں کو قتل کیا تھا، یہ اُن کے شہیدوں کی یادگار ہے اور اسی نسبت سے گوردوارہ شہید گنج کہلاتی ہے۔ لطف یہ کہ سکھوں کا دعویٰ تاریخی طور پر غلط تھا، اورنگ زیب کی وفات کے بہت عرصہ بعد احمد شاہ کے زمانہ میں میر منو پنجاب کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ ۱۷۶۵ء میں جب تین مِسلوں کے سکھ رئیس لاہور پر قابض ہوئے تو بعض دوسری مسجدوں کے علاوہ میر منو کے مقبرے

اور اس مسجد پر بھی قبضہ کر لیا۔

پھر جس زمانہ میں سکھوں نے گوردوارہ تحریک چلائی اور ان کی بے مثال قربانیوں کے بعد گوردوارہ ایکٹ بنا تو گوردوارے مہنتوں اور گیانیوں سے لے کر گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کیے گئے۔ اسی فہرست میں شہید گنج کو شامل کیا گیا، نواب مظفر خاں نے سکھوں کا یہ حق تسلیم کیا۔ اور انہی کے دستخطوں سے شہید گنج سکھوں کو ملی تھی۔ مسلمان اپنا دعوی ہار چکے تھے۔ اب گیارہ بارہ سال بعد ان کا دعوائے ملکیت اور وہ بھی ایکا ایکی برطانوی قانون کے نزدیک بے معنی تھا۔ اس انہدام کے پس منظر میں :۔

ا۔ سکھوں کے دو گروپ تھے۔ ایک سرکاری جس کے رہنما سردار سندر سنگھ مجیٹھیا تھے۔ دوسرا اکالی جس کا پربندھک کمیٹی پر قبضہ تھا، ماسٹر تارا سنگھ اس کے پردھان تھے، اس گروپ کے بھی کئی دھڑے تھے، مثلاً جاٹ جس کی قیادت گیانی کرتار سنگھ کر رہے تھے وہ ماسٹر تارا سنگھ کو کھتری سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ ہندو سے سکھ ہوئے تھے، اب ۱۹۳۷ء میں صوبجاتی خود مختاری کی بنیاد پر انتخابات آرہے تھے تو اقتدار حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مختلف جماعتوں کے علاوہ سکھوں کے مختلف دھڑے بھی اپنے اپنے داؤں پر تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ کی جماعت کو شکست دینے کے لیے سندر سنگھ مجیٹھیا پارٹی نے شہید گنج کے انہدام کی نیو رکھی، ماسٹر تارا سنگھ اس مرحلہ میں مخالفت کرتے تو پٹ جاتے، انہوں نے مجیٹھیا کی تلوار خود اٹھالی، مولانا داؤد غزنوی نے ماسٹر جی کو راضی کر لیا کہ مسجد ڈھوانے سے رک جائیں لیکن سرکاری عناصر نے کوئی پیش نہ چلنے دی۔ سر ہربرٹ ایمرسن اس ڈرامہ کا ہدایت کار تھا۔ جس شخص نے سب سے پہلے مسجد کے گنبد پر گینتی چلائی وہ سی آئی ڈی کا سب انسپکٹر بنتا سنگھ تھا، اور اس کے ہمراہ سادہ لباس میں کچھ سکھ سپاہی بھی تھے۔

۲۔ انگریزوں کو صوبجاتی خود مختاری کے ہاتھوں بجا طور پر خدشہ تھا کہ ہندوستان میں ہندو مہا رٹی کے صوبے ان کے ہاتھ نہیں آسکتے، پنجاب انگریزی حکومت کا بازوئے شمشیر زن

تھا اور وہ کسی شکل میں بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ یہاں کوئی ایسی وزارت بنے جو ان کی منشا و مرضی کے خلاف ہو۔ یونینسٹ پارٹی کا وجود ان کے مقاصد و مصالح کا پشتیبان تھا، چنانچہ اپنی سیاست کو ہر رخنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے پنجاب میں نہ صرف تین قومی (ہندو، مسلمان اور سکھ) مسئلہ پیدا کر رکھا تھا بلکہ شہری اور دیہاتی کی تقسیم بھی کی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شہریوں میں جاندار سیاسی خیالات سرعت سے آچکے تھے بلکہ پنجاب کے شہروں کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ سیاسیات میں نئے نئے ہنگامے پیدا کرتے۔ جلیانوالہ باغ یہاں تھا، مارشل لا یہاں لگا، تحریکِ کشمیر یہاں سے اٹھی، سکھوں نے یہاں مورچہ لگایا، نامور انقلابی یہاں سے ابھرے۔ اُردو کے بڑے بڑے اخبارات یہیں سے نکلتے تھے۔ کانگرس نے یہاں راوی کے کنارے آزادیٔ کامل کا ریزولیوشن پاس کیا۔ خاکسار تحریک یہاں سے اٹھی۔ احرار یہاں سے اُٹھے اور یہی صوبہ اُن کا مرکز تھا۔ مسلم لیگ نے پاکستان کا ریزولیوشن یہاں پاس کیا۔ ناممکن تھا کہ انگریز اس صوبے کو جو سارے ہندوستان میں ان کے استعماری مقاصد کا پشتیبان تھا اُن لوگوں کے حوالے کر دے جو اس کی حکمرانی کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا جانباز سپاہی اس مٹی ہی کی پیداوار ہے۔ اسی میں اُس کا مفاد تھا کہ سکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھے، اور یہ فرض اس کے مُہرے ہی ادا کر سکتے تھے۔ شہید گنج کا انہدام انہی مُہروں کا کرشمہ تھا۔

۳۔ ہندوؤں کے متعلق انگریزوں کو یقین تھا کہ ان پر کانگرس کے اثرات قوی ہیں سکھوں کے بارے میں بھی وہ سمجھتے تھے کہ سندر سنگھ مجیٹھیا پارٹی اتنی نشستیں حاصل نہیں کر سکتی کہ ساری سکھ قوم کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکے کہ وہ انگریزی حکومت کا ساتھ دے گی۔ احرار نے تحریکِ کشمیر میں پنجاب کے شہری اور قصباتی علاقوں میں جو رسوخ حاصل کیا تھا وہ انگریزوں کے لیے پریشان کن تھا۔ اس سے ان کے دیہاتی مہرے بھی ڈرتے تھے، انہیں خوف تھا کہ احرار نے دس فیصد نشستیں بھی حاصل کر لیں تو یونینسٹ وزارت کا بننا دشوار

ہو جائے گا۔

۴ - احرار کو مٹانے، یونی نسٹ وزارت بنانے اور صوبہ کو بحال و تمام اپنے ہاتھ میں رکھنے کی دُھن نے شہید گنج کا قضیہ پیدا کیا، چال یہ تھی کہ احرار حصہ لیں تو پٹ جائیں گے گریز کریں تو مٹ جائیں گے پہلی صورت میں سرکار کے معتوب ہو کر جیل خانے میں جگہ ہو گی دوسری صورت میں مسلمانوں کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر اپنی عزت و شہرت دونوں گنوا بیٹھیں گے، وہی ہوا، احرار چکّی کے اس پاٹ میں پس کر رہ گئے، ان پر اتنی طاقتوں نے مل کر حملہ کیا کہ ان کے لیے سنبھالا لینا مشکل ہو گیا۔

۵ - مولانا ظفر علی خان کے ساتھ کانگرس اور مرحوم خلافت کمیٹی کا وہ سارا گروپ اکٹھا ہو گیا جو احرار سے اختلاف ہی نہیں للّہی بغض رکھتا تھا، یہ لوگ شہید گنج سے اتنے مخلص نہیں تھے جتنا احرار کے خلاف تھے۔

۶ - جب تک مولانا ظفر علی خان اور ان کے رفقاء نظر بند نہ ہوتے لاہور کے سرکاری امراء اور خاندانی کاسہ لیس ان کے گرد و پیش شہید گنج کی بازیابی کے مطالبہ میں شریک رہے لیکن احرار کو پٹوا کر اور عوام کو بھنوا کر یہ پیدائشی حلقہ بگوش اس طرح رُوپوش ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

۷ - مسجد کا انہدام رک سکتا تھا لیکن جن لوگوں نے اس کا بیڑا اٹھایا ان میں سے اکثر صرف احرار کو پٹوانے کے لیے شامل ہوئے تھے، بعض گورنر کے ایجنٹ تھے۔ کچھ سی آئی ڈی کے گماشتے تھے، اور کئی ضلعی حکام یعنی ایس پرتاپ (ڈپٹی کمشنر) اور سردار نریندر سنگھ (سٹی مجسٹریٹ) کے ساتھ ملے ہوتے تھے، مخلصین بہت ہی تھوڑے تھے۔

۸ - مجلس مشاورت میں فیصلہ کیا گیا کہ انہدام روکنے کے لیے حکم امتناعی (STAY ORDER) لیا جائے، اختر علی خان نے ذمہ داری لی لیکن سردار نریندر سنگھ کے جھانسے میں آ گئے۔ راتوں رات مسجد کا صفایا ہو گیا، صبح حکم امتناعی کا تصوّر ہی خارج از بحث تھا۔

اب جو لوگ مسجد شہید گنج لینے نکلے تھے ان کے لیے مسجد کا حصول دیوانے کا خواب تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے اپنے لیے نظر بندی خود تجویز کی تھی۔ نتیجۃً مخلص اور غیر مخلص دونوں مختلف شہروں میں نظر بند کر دیئے گئے۔ مولانا ظفر علی خاں، مولانا اسحٰق مانسہروی، ملک لال خان، سید غلام مصطفیٰ شاہ گیلانی، سیّد محمد شاہ، سیّد حبیب، مولانا اختر علی خانؔ ابو سعید انور، اظہر امرتسری، عنایت محمد پسروری، میر محمد دین وغیرہ یہ سب نظر بند تھے۔ مسجد شہید ہو گئی، رہنما نظر بند کر دیئے گئے اور عوام کا جذبہ بے قیادت گیا، شہر میں ۱۴۴ دفعہ لگا دی گئی۔ اخباروں میں اعلان کیا گیا کہ تمام مسلمان ظہر کی نماز شاہی مسجد میں ادا کریں، مجمع تھا کہ ٹوٹ پڑا، ہزاروں لوگ مسجد میں اکٹھے ہو گئے لیکن کوئی رہنما نہیں تھا، لوگ احرار کی تقریروں کے رسیا تھے، لیکن احرار نے تحریک میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ صاف صاف کہہ رہے تھے کہ ہم مسلمانوں کے خون کی ذمہ داری نہیں لے سکتے، شہید گنج اس طرح نہیں مل سکتی اور اگر مل سکتی ہے تو وہ لوگ کہاں ہیں؟ جو شروع میں سرکاری ڈیروں سے نکل کر بانگ دے رہے تھے۔

ظہر کی نماز ہو چکی تو لوگ اس تلاش میں تھے کہ کون سامنے آتا اور نعرۂ رستاخیز بلند کرتا ہے، مسجد سے باہر مسلح پولیس کا ہجوم تھا، سکھ مسلم فساد کا سخت اندیشہ تھا، گھٹائیں تُلی کھڑی تھیں اور کسی وقت بھی خون خرابہ ہو سکتا تھا، بلکہ اِکّا دُکّا حملے جاری تھے۔

مَیں شامل ہوگیا

یہ ۱۶ر جولائی ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ منٹو پارک (اب یادگارِ پاکستان) کی طرف شاہی مسجد کے کھلے حجروں میں کچھ دوست بزمِ ادب کا سالانہ انتخاب کرنے جمع ہوئے تھے، کئی دوست جا چکے تھے، لیکن میرزا ادیب، بدر مُحیِ الدین، شمس ملک، حفیظ قندھاری اور مَیں آپس میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کر رہے تھے، اُدھر مسجد کے صحن میں ہزارہا آدمیوں کا ہجوم کسی رہنما کا منتظر تھا۔ میرا معاملہ یہ تھا کہ پچھلے اڑھائی تین سال میں سیاسیات کا چسکا مدھم پڑ چکا تھا۔ حالات کی مار نے ہر چیز بُھلا دی تھی، بیدم وارثی کے میزبان حافظ معراج دین جو ان دنوں انجمن فرزندانِ توحید کے جنرل سکرٹری تھے، ہجوم سے نکلے اور میرے پاس آگئے، وہ کسی صدر اور "مُقرر" کی تلاش میں تھے ——— کہنے لگے:

"بھائی اُٹھو، خدمت کا وقت ہے، صرف تین ماہ قید ہے اور وہ بھی اسلام کے لیے۔"

"آپ کا مطلب؟" مَیں نے کہا

کہنے لگے: "لوگ مُضطرب ہیں، اَحرار آئے نہیں، ظفر علی خاں اور اُن کے ساتھی قید ہو چکے ہیں، اَب ہمیں لیڈر بننا چاہیے۔"

"اِس لیڈری کو دُور ہی سے سلام۔" مَیں نے مُسکرا کر عرض کیا۔

انہوں نے تقاضا اور اِصرار کیا۔ مَیں نے پھر کہا کہ "مَیں یہ بوجھ اُٹھانے کے

قابل نہیں، آپ ہی اسے سنبھالیں"۔

بدر محی الدین اور شمس ملک بھی حافظ کے ساتھ شریک ہو گئے، گھر سے کتاب لے کر نکلا تھا اور معمول یہ تھا کہ شاہی مسجد کے حُجرے میں بیٹھ کر پڑھا کرتا۔ میرے ذہن کے کسی دُور افتادہ گوشے میں بھی اس کا تصوّر نہ تھا، یہ گویا ایک حادثہ تھا جو کسی مسافر کو اچانک پیش آ گیا ہو یکایک طبیعت آمادہ ہو گئی۔ حافظ معراج دین نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور تحریک کی:

"حضرات! مَیں اس جلسہ کی صدارت کے لیے پنجاب کے مشہور ادیب
حضرت آغا شورش کاشمیری کا نام پیش کرتا ہوں"۔

چودھری مولا بخش نے تائید کی ——— مَیں نہ تو پنجاب کا مشہور ادیب تھا نہ خطیب، ادب سے محض آشنائی تھی، رہ گئی خطابت تو مَیں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے مبادی کیا ہیں۔ کبھی تقریر کا حوصلہ ہی نہ ہوا تھا، بلکہ دو چار دوستوں میں بھی بولنے سے ہچکچاتا تھا، دو ایک دفعہ بزمِ ادب میں حوصلہ کیا تو قدم لڑکھڑانے لگے۔ الفاظ رہ گئے۔ یہ معرکہ میرے لیے انتہائی سنگین اور یہ مرحلہ فی الواقع ہوش رُبا تھا۔ بہر حال مَیں منبر پر صدر ہو کے بیٹھ گیا اور حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی ابھی مسیں نہیں بھیگی تھیں، سپیدی مائل گندمی رنگ، لمبا تڑنگا، دھان پان، خیال کی طرح نازک یاد ہے کہ مَیں نے خاکستری رنگ کی اچکن پہن رکھی تھی اور سر پر بالوں کی ٹوپی تھی۔ نعرہ ہائے تکبیر سے مسجد کا صحن گونج اُٹھا، حافظ معراج دین نے کلامِ پاک کی تلاوت کی۔ پھر کوئی آدھ گھنٹہ تک پُر جوش تقریر کرتے رہے، یاد تو نہیں کیا کہا، لُبِّ لباب یہ تھا کہ مسلمان مسجد شہید گنج واپس لیے بغیر دم نہیں لیں گے، ان کے بعد حفیظ قندھاری نے تقریر کی اور سکھوں کو خوب جلی کٹی سنائیں، چودھری مولا بخش نے بھی یہی کہا، غازی محمد اسحاق خاکساروں کے سالار تھے، انھوں نے بھی ڈٹ کے تقریر کی۔ دو چار اور نوجوانوں نے بھی تقریریں کیں۔ آخری تقریر میری تھی، مجھے تقریر کی شُد بُد نہ تھی۔ مَیں نے پہلے تو موقع و محل کے مطابق شعر

پڑھا، اس پر خوب داد ملی، پھر ذہن میں چند ادبی فقرے تیار ہو گئے، وہ کہہ ڈالے تحسین و ستائش کے ڈونگرے برسنے لگے، اب جو داد ملنے لگی تو محسوس ہوا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو، گو تمام فقرے جذباتی تھے لیکن زبان سے کلیوں کی طرح جھڑ رہے تھے، میرا ذہن فرقہ داری سے زیادہ قومی تھا، مَیں نے شہید گنج کے گرائے جانے کی ساری ذمّہ داری گورنر (سر ہربرٹ ایمرسن) پر ڈالی، اور یہاں تک کہہ ڈالا کہ مسجد شہید میں تو انشاء اللہ تکبیریں بھی بلند ہوں گی اور بارگاہِ ایزدی میں سجدے بھی کیے جائیں گے، آج نہیں تو کل، لیکن وہ دن بھی قریب آ رہا ہے جب دہلی کے لال قلعہ پر اسلامی پرچم لہرائے گا، اُس کی سُرخ دیواریں ہمارے لُہو کا انتظار کر رہی ہیں۔

مسجد کے گنبد شورش کاشمیری زندہ باد سے گُونج اُٹھے۔ اب مَیں لوگوں کی امیدوں کا مرکز تھا، جلسہ ختم ہوا تو شیدائیوں نے محبّت سے مجھے گھیرے میں لے لیا، مصافحہ پہ مصافحہ، ہاتھ تھک گئے، جن نوجوانوں نے تقریریں کی تھیں سی آئی ڈی کے نگران سپاہی ان کے پیچھے پیچھے ہو گئے، مَیں کچھ دیر تو ہجوم میں رہا پھر بدر اور شمس کی معیّت میں چھوٹے دروازہ سے نکل کر منٹگمری کی سڑک پر آ گیا، خالصہ ہائی سکول کے راستہ موہنی روڈ سے ہوتا ہوا داتا گنج بخش کے عقب میں چلا گیا۔ داتا صاحب کے عقب سے بریڈلا ہال اور بریڈلا ہال سے گھوڑا ہسپتال، وہاں سے پیچ و خم کھاتی ہوئی سانڈہ روڈ پر، غرض کئی راستوں سے الراعی بلڈنگ تک پہنچا اس سے کچھ فاصلہ پر کھیتوں کے بیچوں بیچ دریا کے کنارے ایک دوست کا مکان تھا، جو ضلع کچہری میں ملازم تھا رات اس کے ہاں بسر کی۔ صبح بدر کو شہر بھیجا کہ حالات معلوم کریں۔ وہ خبر لائے کہ سخت احتساب کے باوجود کل کے جلسہ کا چرچا ہے، عوام حسبِ اعلان جو مَیں نے خود کیا تھا آج کے جلسہ میں شامل ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور وہ نوجوان جو کل کے جلسہ میں مقرر تھے راتوں رات گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ میرے ہاں پولیس نے دو دفعہ

چھاپہ مارا لیکن ناکام لوٹی، اب سرگرمی سے تلاش کی جا رہی ہے۔

کوئی ڈیڑھ بجے شب پولیس حافظ معراج دین کے گھر پہنچی، تو حافظ جی نے پولیس کو خاصا پریشان کیا، وہ عورتوں کے کمرے میں چلے گئے، پولیس کو اصرار تھا کہ حافظ جی گھر میں ہیں، لیکن ان کے اعزّہ کہہ رہے تھے وہ آئے ہی نہیں، حکم ہوا کہ عورتیں زنانہ سے نکل کر مردانہ میں چلی جائیں، ایسا ہی کیا گیا، حافظ جی بھی بُرقع پہن کر نکلے۔ سُوءِ اتفاق کہ پاؤں سے گرگابی نکل گئی، پھسلے تو دھڑام سے زمین پر آ رہے، بُرقع اُتر گیا اور حافظ جی بے نقاب ہو گئے، زناٹے کا قہقہہ پڑا، گرفتار کر لیے گئے اور صبح ہوتے ہی جیل بھیج دیئے گئے۔

میں نے بدر سے کہا شہر چلنا چاہیے، وہ اس کے حق میں نہ تھے، ان کا خیال تھا کہ وقت کے وقت سیدھے جلسہ ہی میں چلیں گے۔ اب گئے تو گرفتاری کا امکان ہے، پولیس بڑی دوڑ دھوپ کر رہی ہے۔ میں دفتر "سیاست" جانا چاہتا تھا۔ اس کے عملہ سے میرے تعلقات بڑے ہی دوستانہ تھے۔ اور اس کا باعث بہرہ مطابات کے مدیر مسٹر مقبول انور داؤدی تھے۔ مقبول انور کا مکان ہمارے گھر سے قریب تھا، میں گھر سے باہر تھڑے پر بیٹھا فکرِ شعر کیا کرتا تھا۔ وہ عموماً اُدھر ہی سے گزرتے، مجھ سے تعارف ہو گیا تو میرے شوق کو سراہا، پھر میری نظمیں سیاست میں چھاپنے لگے، مقبول انور بفضلہٖ تعالیٰ حیات ہیں اُن کی تمام عمر قلم کی خدمت میں کٹ گئی۔ فیروز سنز کے لیے سینکڑوں کتابیں لکھیں، آجکل ٹیکسٹ بک بورڈ میں ملازم ہیں، ان سے دوستانہ روابط کی عمر کے چھتیس سال ہو گئے ہیں لیکن یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اسی قسم کے لوگوں کی شرافتیں دل و دماغ کے ویرانوں کو آباد رکھتی ہیں۔ اور انہی لوگوں سے دوستی کی اعلیٰ قدریں جلا پاتی ہیں۔ "سیاست" کے مالک تو سیّد حبیب تھے لیکن طابع و ناشر اُن کے چھوٹے بھائی سیّد عنایت شاہ تھے، وہ اپنے بھائی کے بالکل اُلٹ تھے، شرافت کی چلتی پھرتی تصویر۔ ان کے دو بیٹے سیّد عطاء اللہ ہاشمی اور سیّد عتیق شاہ تھے، ان سے میرے مراسم کا رشتہ بہت گہرا

تھا، انسان تو زندگی کے سفر میں بے شمار ملتے ہیں لیکن عنایت شاہ تمام و کمال انسان تھے، عزیزوں کے لیے قدرت کا عطیہ!

صبح تو ساڑھے نو بجے کے درمیان بدر کوسے کر میں دہلی دروازہ سے باہر دفتر "سیاست" میں پہنچا، تو سید عنایت شاہ حیران رہ گئے، فرمایا اُوپر چلے جاؤ، اوپر چلا گیا تو باہر سے کنڈی لگا دی، کہنے لگے رات سے اب تک سی آئی ڈی اور پولیس کے بیسیوں اہلکار آ چکے ہیں، انہیں شبہ ہے کہ ہم نے تمہیں چھپا رکھا ہے، مرزا معراج دین (سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی) بڑے شاہ صاحب کے ملنے والے ہیں، وہ دو چار دفعہ فون کر چکے ہیں، اُن سے سخت کلامی بھی ہوئی ہے، اب ظہر تک یہیں ٹکے رہو، پھر شاہی مسجد تک پہنچنے کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈیں گے۔ سی آئی ڈی بدستور "سیاست" کے دفتر کا چکر لگاتی رہی، شاہ جی نے اپنے عملے کو بھی نہ بتایا کہ میں یہاں ہوں، یا انہیں میرے متعلق کوئی خبر ہے، البتہ اپنے بڑے بیٹے سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کو بتا دیا یا ظہر سے پہلے مقبول انور کو بتایا اور وہ اس طرح کہ ساتھ لے کر اُوپر آ گئے، مقبول نے مجھے دیکھا تو ششدر رہ گئے، تھوڑی دیر تک تو ہم باتیں کرتے رہے پھر چلنے کی تیاری کی، عطاء اللہ شاہ اور مقبول انور نے نیچے بازار میں جا کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا جب کسی مشکوک آدمی کو اِدھر اُدھر نہ پایا تو مجھے ساتھ لے کر دفتر کے سامنے مز، شاہ محمد غوث کی عمارت میں گھس گئے، عقب سے بر ر(گندہ نالہ) پر چلے گئے، اسے پھلانگ کر اکبری دروازہ کی پیچ در پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے شاہی محلہ تک پہنچ گئے، صوفی لچھمن پرشاد کے مکان کی اوٹ سے دیکھا تو شاہی مسجد کے چاروں طرف پولیس نے دائرہ سا بن رکھا تھا، سی آئی ڈی کے سفید پوش بھی موجود تھے، ہم نے چھوٹے دروازہ سے اندر جانے کا ارادہ ترک کر دیا، بڑے دروازہ کی طرف چلے گئے، اُس کی نصف سیڑھیاں طے کی ہوں گی کہ پیچھے سے آواز آئی: "وہ ہے شورش، پکڑو" ایک باوردی حوالدار دوڑ کر لپکا، میری کلائی تک اس کا ہاتھ پہنچ گیا، میں نے اس زور سے

پھر یری لے کر دھکا دیا کہ پیٹھ کے بل آٹھ کا انگریزی ہندسہ (8) بنا ہؤا سیڑھیوں سے لڑھک کے زمین پہ آ رہا، میں لپے لپے ڈگ بھرتا ہؤا آناً فاناً مسجد میں داخل ہو گیا، پہلے دن سے دوگنا مجمع تھا، لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، نعرہ ہائے تکبیر گونج اٹھے، خطیب کے لیے زندہ باد دو آتشہ ہوتا ہے، زندگی میں یہ دوسری تقریر تھی، لیکن پہلے سے زیادہ رواں اور پُر جوش' میں نے گورنر پر ظالمانہ قسم کی تنقید کرتے ہوئے کہا :

"حکومت کو راستہ سے ہٹ جانا چاہیے۔ ہم سکھوں سے خود فیصلہ کر لیں گے کہ مسجد پر کس کا حق ہے"؟

جلسہ ختم ہؤا تو لوگوں نے آنکھوں پہ بٹھایا، سادہ دل مسلمان ہاتھ چومنے لگے، بوڑھوں نے دعائیں دیں، نوجوانوں نے حلقہ باندھا۔ ان سے کہیں زیادہ دلچسپ باریش اور بے ریش سی آئی ڈی کے مسلمانوں کا "اخلاص" تھا، جو میرے گرد حلقہ باندھ کر پیچھے جا رہے اور "شورش کاشمیری زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے دروازہ کی طرف بڑھے جا رہے تھے، مجھے بھی یقین ہو چکا تھا کہ اب فرار مشکل ہے، جونہی باہر نکلے تو سامنے ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کچھ ہم نسلوں اور ان کی دیسی اولاد سمیت پولیس کی بھاری جمعیت لیے کھڑا تھا، سپرنٹنڈنٹ آگے بڑھا اور کہا "رک جاؤ"، نعرہ ہائے تکبیر تیز ہو گئے۔ سی آئی ڈی کے "عقیدت مندوں" نے اپنا ہالہ اور مضبوط کر لیا، عوام پہ ہلکا سا لاٹھی چارج کیا گیا، لوگ بگڑ گئے انہوں نے مسجد کے حجروں سے روڑے پھینکے، پولیس کا غصہ ہفت افلاک کو پہنچ گیا۔ پھر کیا تھا لاٹھی چارج شدید ہو گیا۔ عوام نے بھی اینٹیں برسانی شروع کیں۔ اتنے میں ایک نوجوان آگے بڑھا، جن پولیس اہلکاروں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ ان میں سے ایک کے جوڑوں پر اس پھرتی سے ٹھڈا مارا کہ وہ بل کھا کے زمین پر گر گیا۔ ایک چھننہ دار سب انسپکٹر کہ والدین کا رکھا ہؤا نام خان بہادر تھا لیکن سرکار نے خان صاحب کا خطاب مرحمت فرمایا تھا، اس بیخنی سے بھڑک اٹھا، اُس نے نوجوان کو لپک کر دبوچا اور زمین پر پٹخ کر

ہنٹر برسانے لگا، عوام کا پارہ چڑھ گیا، اس کثرت سے پتھر برسائے کہ خان بہادر رنڈی کے ایک چوبارہ میں گھس گیا، نوجوان اڑنچھو ہو گیا، ہم نے مصنوعی عقیدت مندوں کا حلقہ توڑ ڈالا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ نے اس مضبوطی سے میرا بازو پکڑا کہ چھڑانا مشکل ہو گیا، اتنے میں قیدی گاڑی آ گئی مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو اس میں بٹھا دیا گیا، اس سے پیشتر کہ گاڑی چلتی وہی نوجوان پھرتی سے نکلا، ہاتھ میں ایک لمبا سا چاقو تھا، گاڑی کا پہیہ پنکچر کر دیا، سپاہیوں نے پکڑنا چاہا لیکن وہ زقند لگا کر مسجد میں گھس گیا، لوگوں نے تالیاں پیٹیں، نعرہ ہائے تحسین گونج اٹھے۔ سی آئی ڈی کے اہلکاروں کو اب مسجد میں داخل ہونے کا حوصلہ نہ تھا، سپرنٹنڈنٹ نے ہمیں گاڑی سے اتارا اپنی کار میں بٹھایا اور قلعہ کی طرف چلا، اتفاق سے کار میں خلل پیدا ہو گیا اور وہ حضوری باغ کے دروازہ پر رک گئی - وہی نوجوان ایکا ایکی نمودار ہوا، چاقو اس کے ہاتھ میں تھا، وہ کار کے پہیوں کو یقیناً پنکچر کر دیتا لیکن سپرنٹنڈنٹ سامنے آ گیا، دونوں گتھم گتھا ہو گئے، اُس نے سپرنٹنڈنٹ کے مُنہ پر اِس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ بلبلا اٹھا۔ سپاہیوں نے فوراً ہی نوجوان کو دبوچ لیا، اتنا مارا کہ پناہ بخدا، سپرنٹنڈنٹ نے ہمیں فوراً قلعہ میں پہنچا دیا اور وہاں سے گھنٹہ بھر بعد جیل بھیج دیا، دوسرے دن وہ نوجوان جس کی عمر بمشکل سولہ برس ہوگی اور چہرہ گلاب سا، ہمارے پاس آ گیا۔ اُس کی زبانی پتا چلا کہ سپرنٹنڈنٹ تو اسے خوب پٹوانا چاہتا تھا، لیکن بعض مسلمان سپاہیوں کی ذہنی اعانت سے بچا رہا۔ ہفتے عشرے ہی میں اس نوجوان کو رہا کر دیا گیا۔ غالباً پولیس نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ مقدمہ چلانے سے سپرنٹنڈنٹ کی رُسوائی ہوگی، دعویٰ یہی ہوگا نا کہ سولہ سال کے ایک نوجوان سے سپرنٹنڈنٹ پولیس پٹ گیا اور پولیس کی موجودگی میں گاڑی کے ٹائر بیکار کر دیئے گئے۔

افسوس کہ اس نوجوان کا نام حافظہ میں نہیں رہا اور اب تو اُس کی شکل بھی بھول گئی ہے لیکن خیال سا ہے کہ اس کا نام شیر زمان تھا، میانوالی کا رہنے والا تھا، اور یہاں

کسی مسجد میں درویش کے طور پر عربی کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔

لاہور بورسٹل جیل کے سیاہ پھاٹک اس طرح کھلے جس طرح کسی بیسوا کی حیا اُتر جاتی ہے۔ ہمارا نام وغیرہ لکھا گیا، پھر نیو جیل کے اس حصہ میں بھجوا دیا گیا جو بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے لیے بنا تھا۔ میں نے جیل کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی حفیظ قندھاری سے کہا نعرہ لگاؤ، اس نے روکا کہ اب جیل میں ہیں اور یہاں نعرہ لگانا بے معنی ہے، خواہ مخواہ مصیبت مول لینا ہو گی۔

خان عبدالحلیم خوئیداد خاں جیلر تھے جو پنجاب میں جیل خانوں کے قائم مقام انسپکٹر جنرل ہو کر سبکدوش ہوتے۔ طبیعت کے نرم بھی تھے اور سخت بھی، انتہائی دیانتدار۔ اُن کے اسسٹنٹ شہری شکل و صورت کے چودھری نواب دین تھے۔ ایک فوجی انگریز گولڈ فیلڈ بیٹسیاں سپرنٹنڈنٹ تھا ــــــ کلایو کے عہد کا انگریز، سخت خو، سخت طبع، اس ملک سے نفرت اُس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، ہر ہندوستانی اس کے نزدیک مجرم تھا، ماتحت عملہ اس سے اس طرح ڈرتا جس طرح بزدل ہوتے ڈرتے ہیں، عملہ کے دل میں خدا کے خوف سے بھی زیادہ اس کا خوف تھا۔

اندر پہنچے، دیکھا تو بائیس سال سے کم عمر کے بیسیوں نوجوان گرفتار ہو کر پڑے تھے اچھی خاصی چہل پہل تھی، ایک جذبہ نے جو ابھی مرجھایا نہیں تھا ہمارے دلوں میں ایک سرور پیدا کر دیا تھا۔

بے نظیر ایثار

تیسرے روز کچھ اور نوجوان آگئے، ان سے پتا چلا کہ کل سے پولیس اور عوام میں زبردست ہنگامہ ہو رہا ہے، امین الدین صحرائی نے جمعہ کے بعد شاہی مسجد میں پچیس تیس ہزار کے مجمع کو خطاب کیا۔ اُسے گورنر کا حکم ملا تھا کہ وہ کسی جلسے، جلوس یا مظاہرے میں حصّہ نہ لے لیکن اس نے جیب سے نوٹس نکالا اور اس کے پُرزے پُرزے کر دیئے اور اعلان کیا کہ آؤ سب شہید گنج کی طرف مارچ کریں ——— مسجد یا موت،

تمام مجمع جلوس بن کر نکل کھڑا ہوا۔ پانی والے تالاب کے پاس پولیس نے روک لیا۔ جانبین میں جھڑپیں ہوتی رہیں، امین الدین صحرائی پکڑے گئے، ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ دھر لیے گئے۔ ہم آپس میں بیٹھے یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ چند نوجوان اَور آگئے ان کے سر پھٹے ہوئے تھے، بعض کے بازوؤں پر زخم تھے، بعض کے بدن مجروح تھے کپڑے خون میں لت پت تھے، انہوں نے بتایا کہ امین الدین صحرائی کی گرفتاری کے دوران زبردست معرکہ ہوا۔ پولیس نے فائر بریگیڈ منگوا کر منوں پانی پھنکوایا، لیکن لوگ ابھی تک جم کے بیٹھے تھے، اگلی صبح ایک اور ساتھی آگیا اس سے پتا چلا کہ سینکڑوں لوگ سنٹرل جیل میں جا چکے ہیں۔ رات بھر پانی والے تالاب میں یُدھ ہوتا رہا، عشاء کی نماز سڑک ہی پر پڑھی گئی، ہرجن سنگھ کے چوک سے نوگزے کی قبر تک پون میل میں نمازیوں کی صفیں بندھی ہوتی تھیں۔ حافظ محمد یعقوب نے رکعتیں لمبی کر دیں۔

نصف قرآن پڑھ ڈالا، آخر صبح پولیس عاجز آگئی اور پیچھے ہٹ گئی، اس وقت کئی ہزار کا ہجوم دہلی دروازے تک پہنچ چکا ہے، پولیس دروازے سے باہر کسی کو آنے نہیں دیتی۔ شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے لیکن اس کے پرخچے اڑائے جا رہے ہیں، اندرونِ شہر کوئی قانون اور اس کا احترام نہیں، شہر سے باہر سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوث کے پاس مسلح پولیس کھڑی ہے، لنڈا بازار کی طرف پولیس کا پہرہ ہے، ریلوے اسٹیشن کے نکڑ پر پولیس ہی پولیس ہے، مصری شاہ کی طرف مسلح دستوں نے حلقہ باندھ رکھا ہے، دہلی دروازہ اور یکی دروازہ سے مسلمانوں کا ہجوم شہید گنج کی طرف مارچ کرنا چاہتا ہے، دہلی دروازہ کے باغ میں فوجی کیمپ لگا دیئے گئے اور فوج پہنچنے ہی والی ہے۔

اتنے میں ایک مسلمان ہیڈ وارڈر سے خبر ملی کہ نو بجے صبح سے گولی چل رہی ہے، لیکن ابھی تک پولیس مورچہ توڑنے میں کامیاب نہیں ہوئی، بہت سے مسلمان شہید ہو چکے ہیں، قدرتاً اضطراب پیدا ہو گیا، اگلے دن ہمارا مقدمہ تھا۔ مسٹر ٹسل مجسٹریٹ درجہ اول کو مقدمہ کی سماعت کرنا تھی۔ پولیس ہمیں کوتوالی لے گئی، وہاں پہنچے تو ایمپرس روڈ سے ریلوے روڈ اور ریلوے روڈ سے لنڈا بازار جدھر نگاہ اٹھتی پولیس تھی یا فوج، دہلی دروازہ کے باغ میں فوج نے باقاعدہ ڈیرہ ڈال رکھا تھا، ہم پولیس وان ہی میں رہے۔ جالیوں سے باہر جھانکا تو عجب ہنگامہ اور خوفناک منظر تھا۔ ہر طرف پولیس اور فوج کے زخمی سپاہی نظر آ رہے تھے۔ ادھر کوتوالی سے یکی دروازہ اور مصری شاہ کے پل تک ادھر دہلی دروازہ سے لنڈا بازار کے آخری نکڑ تک، گورے سپاہی ٹکڑیوں میں بٹ کے کھڑے تھے، اور ان کی سٹین گنوں کے رخ مظاہرین کی طرف تھے، ادھر شاہ محمد غوث تک بھی فوج ہی فوج تھی، لیکن نوجوانوں کے حوصلے کا یہ عالم تھا کہ دور دور سے سینہ تان کے کھڑے اور باری باری گولی کھا کے شہید ہو رہے تھے، دہلی دروازہ کے باغ میں فوج کے سکھ اور مسلمان سپاہی پڑے تھے اور ان کے درمیان حدِ فاصل

گورہ سپاہی اور انگریز افسر تھے، ایک مرحلہ میں بلوچ اور سکھ رجمنٹ کے مابین تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا، انگریز افسروں نے بیچ بچاؤ کرایا اور دونوں نے ان کے احکام پر سر جھکا دیا۔

شہر کے اندر سے اللہ اکبر کی فلک شگاف صدائیں لگاتار آرہی تھیں، یا پھر گولیوں کی سنسناہٹ تھی کہ غریب مسلمان ماؤں کے غیرت مند بچے شہید ہو رہے تھے اور انہیں اس حالت میں تیسرا دن ہو گیا تھا، اکثر گورے اور ان کے دیسی سپوت جن میں فرزندانِ اسلام بھی تھے، سروں پر پٹیاں باندھے زخم کھائے، لہولہان نظر آرہے تھے، ایک ٹامی غالباً ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا اس کے ماتھے پر چوٹ لگی، بائیں آنکھ پر زخم آیا اور گالوں پر لہو کی دھاریں بہہ رہی تھیں، ہماری گاڑی کے پاس آکر چلایا:

"واپس لے جاؤ، کیوں لائے ہوا نہیں"؟ حوالدار نے بڑھ کر سلوٹ کیا۔

"مقدمہ کے لیے جیل سے لائے ہیں"

"کوئی مقدمہ نہیں، آج واپس لے جاؤ"

ڈرائیور نے گاڑی موڑی تو معاً کسی خلل سے رک گئی، گورہ دوبارہ چلایا۔

"کیوں نہیں جاتا"

"گاڑی خراب ہو گئی ہے سر"

"دوسری گاڑی منگواؤ" — کہتا ہوا کوتوالی کے اندر چلا گیا۔

اس وقت دہلی دروازہ سامنے تھا، وہاں حشر کا سماں تھا، نوجوان کفن باندھے کھڑے تھے، ایک ہی نعرہ، اللہ اکبر، فوجی گورے شست باندھے کھڑے تھے، نوجوان آگے بڑھتا، ایس پی تاپ حکم دیتا، اور وہ کلمۂ شہادت پڑھتا ہوا گولی کھا کر ڈھیر ہو جاتا۔ ایک خوبرو نوجوان جو ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس شوق سے آگے بڑھا کہ موت چار قدم پیچھے ہٹ گئی، اس نے اپنی قمیص کے بٹن کھولے، سینہ پر ہاتھ رکھ کر

للکارا، "اللہ اکبر، یا رسول اللہ یا رسول اللہ، یا علی مدد یا علی مدد"، گورے نے اشارہ پاتے ہی ٹانگ پر فائر کیا، وہ گرا اور اٹھا، "ہاں ہاں ایک اور"، اور اب کے گولی اس کی ران میں لگی وہ سینے پر زور سے مکہ مارتے ہوئے اُٹھا اور چلایا "یہاں مارو" —— پھر زور سے پکارا "یا علی یا علی یا علی —— گولی سن سے اس کے سینہ میں ترازو ہوگئی اور وہ کلمۂ شہادت پڑھتا ہوا ٹھنڈا ہوگیا۔

منظر اتنا دردناک تھا کہ ہم لوگ بے قابو ہو گئے۔ ہمارے اندر بھی شہادت کا ذوق جاگ اٹھا، مسلمان فوجیوں نے انگریز افسروں سے کہہ دیا تھا کہ سکھوں نے گولی چلائی تو وہ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے، لیکن گورے کھلے بندوں مار رہے تھے اور وہ لہو کے گھونٹ پی رہے تھے، مسلمان سپاہیوں اور مسلمان افسروں کی آنکھیں پُرنم ہو رہی تھیں۔ کچھ کانسٹیبل شہید لڑکے کی لاش اُٹھانے کے لیے آگے بڑھے تو ہجوم میں سے بیسیوں نوجوانوں نے بڑھ کے روکا، لیکن پولیس کامیاب ہوگئی اور جب اُس پھول سے چہرے کی نعش وان کے قریب سے گزری تو ہم انگاروں کی طرح دہک رہے تھے، ہماری زبانوں میں بادلوں کی گھن گرج آگئی، اسلام زندہ باد، شہید گنج زندہ باد، شہید نوجوان زندہ باد، برطانیہ مُردہ باد، فوج اور پولیس کی فضا میں ان نعروں سے تھرتھری مچ گئی۔ بڑے بڑے افسر بھدک کر نکل آئے۔

"یہ وان کیوں کھڑی ہے؟"

"خراب ہوگئی ہے" ڈرائیور نے جواب دیا،

"دوسری لاری منگواؤ"

"آ رہی ہے جناب!"

دوسری وان میں بٹھانے لگے تو ہم ڈٹ گئے۔ غازی محمد اسحاق نے گرجدار لہجہ میں کہا: "ہم نہیں جاتے، ہمیں بھی گولی مارو، ہم شہید ہونا چاہتے ہیں"

بندوقوں کے رُخ ہماری طرف پھر گئے، ہم اور بھی بھڑک اٹھے، نعروں کا زور بندھ

گیا۔ برطانیہ مُردہ باد، ڈاؤن ڈاؤن دی یونین جیک، ایس پرتاپ کے چہرے پہ زہر خند پھیل گیا، گورے مسکرائے، گویا ان کی بندوقوں کے لیے غذا آگئی ہے، مرزا محمد باقر لاہور کے کوتوال تھے، فوراً آگئے۔ ہمیں ایک طرف لے گئے، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، کہنے لگے:

"عزیزو، بہت سی زندگیاں ضائع ہو چکی ہیں، حرام خور لیڈر گھروں میں گھسے ہوتے ہیں یا گورنر کی چوکھٹ پر سجدہ کر رہے ہیں، تم بچے ہو اپنے آپ کو ضائع نہ کرو ——"

ہم مان گئے اور لاری میں سوار ہو کر جیل چلے گئے، اب کوئی سو کے لگ بھگ ہم عمر ساتھی آچکے تھے۔

یہ ایثار کا ایک ایسا مظاہرہ تھا کہ پاکستان میں ختمِ نبوت کی تحریک کے سوا اس کی نظیر نہیں ملتی، اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کتنے نوجوان اس تحریک میں قربان ہو گئے۔ تین دن تک لوگوں کا موت کے سامنے ڈٹے رہنا قربانی و استقامت کی ایسی نظیر ہے کہ قرنِ اوّل کے تذکروں ہی میں ایسے واقعات نظر آتے ہیں۔ ہتھیاروں سے لڑنا اور جگرداری کا ثبوت دینا مختلف چیز ہے، لیکن نہتے ہو کر موت سے آنکھیں چار کرنا انسانی فطرت کا معجزہ ہے۔ "ٹریبیون" لاہور کے سٹاف رپورٹر لالہ ابناش چندر بالی نے کہ برِعظیم کی تقسیم کے بعد انبالہ میں اس کے ایڈیٹر ہو گئے تھے، لکھا تھا کہ مسلمانوں نے اس تحریک میں جس تحمل، برداشت اور جاں نثاری کا ثبوت دیا وہ انتہائی قابلِ تعریف ہے، وہ تین دن گولیاں کھاتے رہے لیکن ہندوؤں اور سکھوں کی دوکانیں برابر کھلی رہیں اور کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ پہلے دن پانی والے تالاب میں مورچہ باندھا اور لوگ رات بھر ڈٹے رہے، اگلی صبح دہلی دروازے آگئے، دو دن متواتر گولیاں کھائیں، لپک لپک کر موت کو

بتیک کہا، کوئی لیڈر نہیں تھا، صرف جذبہ لیڈر اور شہادت نصب العین تھا ایکی اور دہلی دونوں دروازوں پر گولی چلتی رہی، جو نوجوان شہید ہوتا لوگ فوراً اس کی لاش اُٹھا کر لے جاتے، شہر میں جلوس نکالتے اور دفن کر آتے، لوٹتے تو وہی مورچہ، وہی گولی وہی نوجوان، وہی شہید، وہی جنازہ، وہی جلوس، وہی جذبہ، وہی قبریں ——،

یکی دروازہ کے جگر دار نوجوانوں نے اکّا دکّا شہادت کو ختم کرنے کے لیے کفن پہن لیے اور درجنوں کی تعداد میں کھڑے ہو گئے، ان کی دیکھا دیکھی دہلی دروازہ کے نوجوانوں نے بھی یہی کیا۔ بزازی کی دوکانوں سے لٹھا نکالا، کفن پہنا اور کھڑے ہو گئے، اس صورتِ حال سے فوج اور پولیس کے مسلمانوں کا متأثر ہونا ناگزیر تھا، گورنر دوڑ کر کوتوالی آگیا، کاسہ لیسوں کو طلب کیا، خاندانی حاشیہ بردار اور پشتینی وفادار حاضر ہو گئے، لیکن کرتے کیا بے بس تھے، ان کی معرفت مولانا اختر علی خاں کو بلوایا، یہ گورنر کا آخری حربہ تھا، ورنہ حکومت اندر سے اتنی کھوکھلی ہو چکی تھی کہ مزید لہو بہانے کا اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ گورنر نے اختر علی خاں کو راضی کر لیا کہ وہ لوگوں کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیں، مظہر علی ان کے ہمراہ ہو گئے، لیکن انہیں حوصلہ نہ ہوا کہ لوگوں سے مخاطب ہوتے، کیونکہ احرار پٹ چکے تھے لیکن اختر علی خاں نے اپنے والد مولانا ظفر علی خاں کا ایک فرضی پیغام دیا کہ "محاذ کو توڑ دو، صورتِ حال بہتر ہو رہی ہے، اس طرح قیمتی خون بہانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا" اختر علی خاں نے اس انداز سے آنسو بہا بہا کر تقریر کی کہ لوگ ان کے مصنوعی پیغام کا فریب کھا گئے اور تین دن کا مورچہ آن واحد میں ختم ہو گیا، گورنر نے مولانا اختر علی خاں سے شیک ہینڈ کیا اور چلا گیا، مسلمانوں کے مادر زاد وفادار بھی "رسیدہ بُود بلائے ولے بخیر گذشت" الاپتے ہوئے اپنی اپنی موٹروں میں اڑ گئے اور اس طرح ایک سفینہ کنارے پہ پہنچ کر غرق ہو گیا——

اختر علی خاں کو نتیجۃً کیا ملا؟ "سیاست" تو سید حبیب کی وجہ سے بند ہو رہا تھا۔ "زمیندار" بھی غیر معیّن عرصے کے لیے بند ہو گیا، مولانا اختر علی خاں کیمبل پور میں نظر بند کر دیئے گئے۔ "انقلاب"

کے سوا مسلمانوں کے سبھی اخباروں پر جھاڑو پھیر دی گئی یا پھر "احسان" چل رہا، جس کے مالک و مدیر میں سے کوئی شخص گرفتار نہیں ہوا تھا لیکن اخبار کی حد تک وہ تحریک کی حمایت کر رہے تھے

مقبول انور داؤدی "سیاست" میں مدیر مطالبات تھے، اُنہوں نے اس قیامتِ صُغریٰ میں خان بہادروں، خان صاحبوں اور بعض سروں کو کئی دفعہ فون کیا کہ دہلی دروازہ کے باہر جو خون بہایا جا رہا ہے، اسے رُکوائیں، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ سب نے رسیور اُٹھا کر رکھ دیئے ہیں۔

ملک فیروز خان نون کو سید عنایت شاہ کے ایماء پر فون کیا تو مل گئے، داؤدی صاحب نے کہا:

"ملک صاحب! دہلی دروازہ کے باہر مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے"
خدا کے لیے تشریف لائیے۔ آپ کے آنے سے یہ قتلِ عام رُک جائے گا
اور اگر آ نہیں سکتے تو گورنر ہی سے احتجاج کیجیے۔

ملک صاحب نے دوٹوک جواب دیا کہ

"دونوں صورتیں ناممکن ہیں، دہلی دروازہ کے باہر پہنچنا میری پوزیشن کے خلاف ہے، اور گورنر سے اس وقت کچھ کہنا اُس کی ناراضی مول لینا ہے۔"

ملک صاحب ایمرسن سے جھاڑ کھا چکے تھے، دہلی دروازہ کے باغ میں فیروزالدین احمد نے جوشِ تقریر میں ایمرسن کا نام امر سنگھ رکھ دیا تھا، گورنر نے صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے وزراء کی میٹنگ بلائی تو اس غصے میں نون کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"مجھے فیروز خان کی ضرورت نہیں جو مسلمانوں میں جانے اور سمجھانے سے گھبراتا ہے۔ مجھے فیروزالدین احمد کی ضرورت ہے جو مسلمانوں میں کھڑا ہو کر گورنر کو گالی دے سکتا ہے۔"

ملک صاحب اپنا سا مُنہ لے کے کر رہ گئے لیکن اس کے باوجود انگریزی حکومت کے نمک خواروں کا یہ شعار تھا کہ دسترخوانِ حکومت کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں ہی اُن کا توشۂ آخرت تھیں ۔

پہلی سزایابی

دہلی اور کیّ دروازہ کا محاذ ختم ہوگیا، تو ہفتے عشرے میں حکومت نے گرفتار شدہ نوجوانوں کو رہا کرنا شروع کیا، تقریباً سبھی رہا کر دیئے گئے، سوائے ان لوگوں کے جنہیں تقریروں کی بنا پہ پکڑا گیا تھا۔

لاہور سنٹرل جیل ہی سے ملحق کورٹ روم تھا، جہاں کبھی انقلاب پسندوں کے مقدمات سنے جاتے۔ یہ کورٹ روم دراصل بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے لیے بنایا گیا اور اس وقت سے چلا آ رہا تھا، شہر کی عام فضا کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارا مقدمہ بھی یہیں سنا گیا۔ ایک اینگلو انڈین مجسٹریٹ ٹیل سماعت کر رہا تھا، اینگلو انڈین انگریزوں کے وفادار تھے۔ انگریز تو پھر بھی حسِ شرافت رکھتے تھے لیکن اینگلو انڈین ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے اور اکثر ناک پر مکھی دھرنے نہ دیتے تھے۔ ٹیل میں ٹمنی کی تمام خصوصیتیں تھیں، مَیں نے تحریری بیان داخل کیا تو اس نے غصہ میں زمین پر دے مارا کہ عدالتی آداب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، ہم نے عدالت میں نعرے لگائے، آگ بگولہ ہو گیا، جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو لکھا۔ وہ خالص انگریز تھا۔ اس نے ہمیں قیدِ تنہائی میں ڈال دیا۔

کئی دن مقدمہ چلتا رہا، استغاثہ کے گواہ حسبِ معمول روایتی اور جھوٹے تھے لیکن واقعہ سچّا تھا کہ ہم نے دفعہ ۱۴۴ کو واقعی توڑا تھا، سنت رام نام کا ایک ہندو انسپکٹر پولیس ہم سے حوالات میں ملا اور پوچھا کہ آپ لوگ کہاں پکڑے گئے؟ مسجد سے کیسے نکلے؟

باہر کیوں کر آئے ؟ پولیس نے کیونکر گھیرا ڈالا اور گرفتاری کس طرح ہوئی ہم نے من وعن بیان کیا! اس نے ہم سے سُن کر عدالت میں بیان دیا کہ میں نے اس طرح پکڑا، کیونکہ یہ لوگ مسجد سے نکلے، پولیس نے یُوں گھیرا ڈالا ، گرفتاری کس طرح ہوئی اور گرفتاری کے وقت ان کے جوش وخروش کا حال کیا تھا ______ شہادت سچی ، گواہ جھوٹا ، ہم مُسکرا دیئے وہ بھی مُسکرایا ، یہ پہلا تجربہ تھا کہ پولیس کیا چیز ہے ؟

ٹیل نے مجھے دو سال قید اور تین سو روپے جرمانہ کا حکم سُنایا ، لیکن میرے ساتھیوں کو ایک ایک سال قید اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے جُرمانہ کی سزا دی ، یہ پہلی سزا پائی تھی، ہم نے نعرے لگائے تو ٹیل بوکھلا گیا ، بولا ہم بید لگوائے گا ہم یہ اور وہ کرے گا۔ لیکن ہم جوانی کے جوش میں تھے ، پرِکاہ وقعت نہ دی اس نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو لکھا کہ ملزموں نے عدالت کی اہانت کی ہے لہٰذا ان کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے ، سٹیمین (سپرنٹنڈنٹ) نے قیدِ تنہائی کے علاوہ چودہ سیر گندم پسائی لکھ دی لیکن خان عبدالحلیم خوئداد خاں (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ) کی رگِ اسلامیت پھڑک اٹھی ، اُس نے نہ ہمیں قیدِ تنہائی میں رکھا ، نہ گندم پسوائی ، ساتھیوں کے ساتھ ہی ایک الگ حصہ میں رکھ دیا ، سپرنٹنڈنٹ ہفتہ وار معاینہ پر آیا تو تاڑ گیا ، لیکن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے ______ غچّا دے کر ہموار کر دیا۔

پاکستان سے پہلے جتنی دفعہ قید ہوا اور قید کے ان ایام میں جو کچھ محسُوس کیا یا جو کچھ جسم وجان پہ گزری اس کی مفصّل رُوداد "پسِ دیوارِ زنداں" کے نام سے الگ لکھی گئی ہے ، لہٰذا وہ تفصیلات اس کتاب سے خارج ہیں ، لیکن مختصراً یہ کہ جو بیتی وہ ایک اندوہناک کہانی ہے ، جیل خانہ کیا ہے ہم نابلد تھے ، البتہ حفیظ قندھاری کچھ واقف تھا کہ ایک دفعہ پہلے رہ چکا تھا ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسلمان ہونے کی وجہ سے مروّت کر رہا تھا ، ہم نے ان رعایتوں کو اپنا پیدائشی یا سیاسی حق سمجھا ، نتیجتہً ہم پر سختی ہونے لگی ، ہوا

یہ کہ میں نے سید عنایت شاہ کے نام ایک خط لکھا جس میں حکومت کی سختیوں کے خلاف بھوک ہڑتال کرنے کا ذکر تھا یہ خط جیل پریس کا ایک بابو لے گیا، خط سنسر ہو گیا۔ سی آئی ڈی نے اس کا متن انسپکٹر جنرل جیل خانہ کو لکھا اس نے بورسٹل جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے جواب طلب کیا، بس پھر کیا تھا قیامت آگئی، وہی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جو ہم پر مسلمان ہونے کی وجہ سے مہربان تھا مسلمان ہونے کی وجہ سے بپھر ہو گیا۔ اب اسے راضی کرنا فرہاد کی ریاضت کو ہ کنی سے کم نہ تھا۔ اس کا ذہنی تشدد بڑھتا گیا، اس نے پہلے تو ساتھیوں کی یکجائی کا شیرازہ منتشر کر دیا اور ہم سب کو مختلف احاطوں میں بانٹ دیا، حتیٰ کہ ہم پر آریہ سماجی ذہنیت کا ایک ہندو اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ لگا دیا، اس کی نفرت کے لیے یہی کافی تھا کہ ہم مسلمان ہیں، اور شہید گنج کی تحریک میں ماخوذ ہو کر سزا یاب ہوئے ہیں۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مصر تھا کہ اس شخص کا نام بتاؤں جو میرا خط باہر لے گیا، یہ تو مان گیا کہ خط میں نے ہی لکھا اور میں نے ہی بھجوایا ہے لیکن کون لے گیا، آخر وقت تک نہ بتایا، جہاں تک ممکن تھا، مجھے پٹوایا گیا۔ بورسٹل جیل کی قصوری چکیاں (قید تنہائی) ہمیشہ جہنم کا نمونہ رہی ہیں۔ وہاں قیدیوں کو پیٹنے کے لیے دو پاگل تھے جن کا یہی کام تھا کہ جو آئے اس کو پیٹ پیٹ کر اَدھ مؤا کر دیں، یا قصوریوں کو صبح و شام دو سے دس تک جوتے لگایا کریں۔ ان پاگلوں نے مجھے خوب پیٹا لیکن اللہ نے مجھ سے ناتجربہ کار میں اتنی ہمت پیدا کر دی تھی کہ آخر وقت تک نام بتانے سے انکاری رہا، چار وارڈر دو دو ڈیڑھ ماہ بلا وجہ معطل رکھے گئے۔ ایک ہیڈ وارڈر کو وارڈر بنا دیا اور دوسرے کی سالانہ ترقی روک لی، جانے کس طرح پریس کے بابو کا نام ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کانوں تک پہنچ گیا۔ اسے بلایا گیا وہ ایک متشرع اور دیندار مسلمان تھا، اس نے صاف انکار کیا۔ دباؤ ڈالا گیا تو اس نے کہا شورش کاشمیری کو میرے سامنے لائیے وہ کہدے تو ناکردہ گناہ ہو کر بھی جرم مان لونگا۔ مجھ پر زور ڈالا گیا۔ ہر سختی جائز ہو گئی لیکن میں نے ایک لحظہ کے لیے بھی تسلیم نہ کیا کہ وہ بابو

میرا خط لے کر گیا ہے۔ یہی کہتا رہا کہ میں نے ایک رہا ہونے والے کو خط دیا تھا۔ القصہ یہ دن بھی نکل گئے اس ایک ماہ کے عرصے میں مجھ سے جو بد سلوکیاں کی گئیں، صعوبتوں کا یہ دور اگرچہ برداشت سے باہر تھا لیکن قدرت دستگیری کرتی رہی۔ نتیجۃً انہی صعوبتوں نے مجھے ایک تجربہ کار قیدی اور مصائب آشنا انسان بنا دیا۔ میرے لیے قید کا خوف گویا خوف ہی نہ رہا، قید ہوا تو دل ہمیشہ جوان رہا، پہاڑ کے سے دن آبشار کے دھاروں کی طرح بہ گئے، یہاں ایک بات کہنا جائز ہوگا کہ بورسٹل جیل اس وقت بوچڑخانہ تھا، بظاہر اصلاح خانہ لیکن معناً قصاب گھر، جہاں نوعمر بچوں کو قتل کیا جاتا، افسر عموماً ظالم ہوتے، فضا باطنی طور پر چکلہ، چار دیواری، مذبح جہاں لڑکوں کے اخلاق کو ذبح کیا جاتا ہے۔

بورسٹل بظاہر ایک انسٹی ٹیوشن تھا جن افسروں کو وہاں لگایا جاتا وہ جیل ہی کے افسر ہوتے لیکن ان کا دماغ اور ان کی طبیعتیں قیدیوں پر حکمرانی و نگرانی کرتے کرتے خود مجرمانہ ہو جاتیں، اس چیز کا مطلقاً خیال نہ کیا جاتا کہ وہ بچوں کی اصلاح و تربیت کے لیے موزوں بھی ہیں یا نہیں؟ بورسٹل میں عموماً وہ قیدی رکھے جاتے جن کی عمریں اٹھارہ سال تک ہوتیں، جیل خانے کے پتھریلے ضابطے کبھی نہیں سوچتے کہ انسان کے ساتھ پیٹ کی بھوک کے علاوہ ایک اور بھوک بھی ہے، اور پندرہ سولہ برس میں اس کی نشو و نما شروع ہو جاتی ہے، عمر کا تفاوت، فضا کی سنگینی، ضابطے کا شکنجہ اور قید کا پنجہ، بورسٹل کے بچوں کو اختلاط کی خواہشوں کا صید بنا دیتا ہے اور جو خراب نہیں ہونا چاہتے وہ بھی خراب ہو جاتے ہیں۔ بڑے قیدی چھوٹے قیدیوں کو اپنی خوراک سمجھتے اور ان کی عادتوں کو سہارا دے کر اپنے شہوانی ذوق کی تسکین کرتے ہیں، جیل خانوں میں (بچوں کے جیل ہوں یا بڑوں کے) شہوانی اختلاط کا مرض اس شدت سے پایا جاتا ہے کہ محفوظ سیرت سرخ گندھک کی طرح کمیاب ہوتی ہے، ملازم وارڈروں کو بھی اس کی لت لگی ہوتی ہے اور شاذ ہی کوئی کم عمر قیدی اُن سے بچتا ہے، جہاں تک قیدی وارڈروں کا تعلق ہے جنہیں

پنجاب کے جیلوں میں نمبردار، سرحد میں شین پوش اور سندھ میں مقدم کہتے ہیں تو ان کا وجود (اِلّا ماشاءاللہ) جیل خانوں کے لیے ایک عذاب ہے، وہ ساتھی قیدیوں پر ظلم کرنے اور ایذا دہی میں ملازموں سے کہیں آگے ہوتے ہیں ——

اُس زمانے میں قیدی سگریٹ کے ایک کش پہ خود سپردگی قبول کرتے اور تمباکو کی ایک چٹکی (بٹیرہ) کے لیے ردیف بن جاتے تھے، ان قیدی نمبرداروں کو ساتھیوں پر اتنے اختیارات ہوتے ہیں کہ انہی اختیارات کا لاینفک جزو گویا بدچلنی بھی ہے۔

جیل خانوں کی غایت اصلاح نہیں سزا ہے، اور سزا بھی انتقام کی حد تک ہے، رحماً! کوئی شخص قیدیوں کو انسان نہیں سمجھتا، انہیں جانور سمجھ کر ہانکتے اور ان سے اس قسم کی مشقت لی جاتی ہے جس سے ان میں عزتِ نفس کا احساس ہی نہ رہے اور وہ خود اپنے آپ کو جانور سمجھیں، جس شخص نے جیل مینول تصنیف کیا غالباً اس کا کوئی بچہ نہیں تھا، لازماً اولاد سے محروم ہوگا، ایک آفیسر کا خیال تھا کہ جیل خانے کی ملازمت یقیناً وہی شخص کرتا ہے جسے ماں باپ کی بددُعا ہو، جیل مینول سے زیادہ بھدی اور بُری کتاب آج تک کسی نے تصنیف نہیں کی، پسماندہ ریاستوں میں اتنے اختیارات، راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور خانوں کو حاصل نہیں رہے، جتنے اختیارات جیل مینول کی رُو سے سپرنٹنڈنٹ اور جیلر کو حاصل ہیں، جیل خانے کے حکّام اپنے ہونٹوں کی ہر جنبش کو قانون سمجھتے اور قیدیوں کو یُوں گردانتے ہیں گویا وہ لوگ کبھی انسان نہیں تھے۔

جیل خانہ میں شہوانیات کے جرائم اتنی بڑی اور کڑی بُرائی نہیں جتنا ایک خط کا چوری چھپے باہر چلے جانا یا سپرنٹنڈنٹ کے سامنے یہ کہنا کہ روٹی کچی ہوتی ہے۔ لاہور سنٹرل جیل میں ایک صاحب کرنل ایس ڈی سوندھی (آئی ایم ایس) سپرنٹنڈنٹ تھے، طبیعت کے سخت، مزاج کے درشت، قیدی ان کے نام سے تھرتھر کانپتے، وہ قیدیوں کو ان کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت پر سخت سے سخت سزا دیتے، بید زنی اور قیدِ تنہائی ان کی مرغوب سزائیں

تھیں، لیکن شہوانی اختلاط پر بشرطیکہ باہمی رضامندی سے ہو، مرتکبین کو اکثر چھوڑ دیتے،
ایک دارو غہ نے ان سے کہا "اس طرح یہاں بدچلنی عام ہو جاتے گی" کہنے لگے:

"یہ ایک فطری خواہش ہے، قانون قیدیوں کی نفسی اعانت سے معذور
ہے، جب دونوں رضامند ہوں تو اس سے جیل خانے کی کونسی دیوار گر
جاتی ہے ــــــــ!"

شہید گنج پریزنرز ڈیفنس کمیٹی نے ہماری اپیلیں دائر کر رکھی تھیں، مسٹر کارنیلیس اُس
زمانہ میں لاہور کے سیشن جج تھے اور اب سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس کی
حیثیت سے ریٹائر ہوتے ہیں، انہوں نے جرمانہ اُڑا دیا اور سزائیں گھٹا کر تین تین ماہ کر
دیں، ساتھی خوش ہو گئے کہ ان کی قید کے دو ہفتے رہ گئے، میرا ابھی دوسرا مقدمہ باقی تھا،
کارنیلیس تبدیل ہو گئے، ان کی جگہ ایک کشمیری پنڈت مسٹر اونکار ناتھ زتشی آگئے، انہوں نے
پہلے ہی دن میرا مقدمہ سُنا اور بری کر دیا، اگلے دو چار دنوں میں ہم سب رہا ہو گئے ــ
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو احساس تھا کہ اُس نے ہمارے ساتھ آخری دنوں میں ناروا سلوک کیا ہے
اور اس کے ہندو ماتحتوں نے اور بھی گل کھلائے ہیں، اُس نے ہمیں پو پھٹتے ہی رہا کر دیا،
باہر نکلے تو وارث روڈ کے موڑ پر ہمارے عزیز آرہے تھے، انہوں نے ہمیں ہاروں سے
لاد دیا اور اس طرح قید کا پہلا سفر ایک ماہ کی حوالات اور تین ماہ کی سزا کے بعد ختم ہو
گیا، میں نے محسوس کیا کہ میری ذہنی فضا پہلے سے مختلف ہو چکی ہے اور طبیعت کی رفتار
کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔

شہید گنج کا المیہ

باہر آکر معلوم ہوا کہ شہید گنج کا ملبہ سرکاری گماشتوں نے نیلام پر رکھ دیا ہے۔ اس معرکہ کا کوئی اثباتی نتیجہ نکل سکتا تھا تو وہ اس دن رہ گیا جس دن مولانا اختر علی خاں نے دہلی دروازہ کا محاذ تڑوایا، اس کے بعد تحریک کے جوش و جذبہ پر قابو پانے کے لیے ناٹک کھیلا گیا۔ عوام کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ آگئی جن میں اکثریت سرکاری شطرنج کے مہروں کی تھی۔

مولانا ظفر علی خاں اور ان کے ساتھی نظر بند تھے۔ ہم لوگ ابھی سیاسی طور پر ادھورے تھے، بلکہ کچھ بھی نہیں تھے، وہ جوش یا جذبہ جو ہمیں آگے لایا ٹھنڈا پڑ چکا تھا، عملاً شہید گنج کا حصول خواب و خیال ہو گیا، تحریکیں پہلے بھڑکتی پھر بھڑکائی جاتی ہیں، اور جب راکھ ہوتی ہیں تو ان سے کوئی شعلہ نہیں اٹھتا، بعض شکست خوردہ سیاسی عناصر نے چند ایک مخصوص کو ساتھ لیا، کچھ پشتینی وفادار بھی ہمراہ ہو گئے ان سب نے مل کر حصولِ مسجد کے نام پر راولپنڈی میں مجلسِ اتحادِ ملت کی بناء ڈالی اور اس طرح بھان متی کا ایک کنبہ تیار ہو گیا۔ پیر جماعت علی شاہ علی پوری اس کانفرنس میں امیرِ ملت بن گئے۔ وہی پیر جماعت علی شاہ جن کے تعویذ پہلی جنگِ عظیم میں برطانوی فوج کے مسلمان سپاہیوں میں تقسیم ہوئے تھے کہ ان تعویذوں کی برکت سے ان پر ترک گولی اثر نہیں کرے گی۔ سر مائیکل اڈوائر کو پنجاب کے مشائخ نے پہلی جنگِ عظیم میں فتحیابی کے بعد جو سپاسنامہ پیش کیا اس پر بھی ان کے دستخط تھے، ان کے مریدوں میں سرکاری اہلکار اور سرکاری ترلہ خوار تھے ہی، اب بعض کانٹیاں سیاستدان

بھی ان سے بیعت ہو گئے۔ مثلاً ڈاکٹر عالم جو مولانا اسحاق مانسہروی کا سہارا لے کر کانفرنس میں شریک ہوئے اور پیر صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے تھے ڈاکٹر صاحب پیری مریدی کے ان سلسلوں سے متنفر تھے، البتہ شخصیات میں غرض کی حد تک کسی کے معتقد تھے تو وہ مولانا عبدالقادر قصوری کا وجود تھا جنہیں پنجاب میں جماعت اہلِ حدیث کا امام سمجھا جاتا تھا۔

پیر صاحب کا اپنے رب سے کیا تعلق رہا، خدا ہی بہتر جانتا ہے یا خود پیر صاحب کو معلوم ہو گا لیکن یہ واقعہ ہے کہ پیر صاحب حصولِ مسجد کی تحریک کا نشان بن گئے تھے، امیرِ ملت منتخب ہو کر لاہور پہنچے تو ان کا فقید المثال جلوس نکالا گیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ لاہور نے اس سے پہلے اتنا بڑا جلوس شاذ ہی دیکھا تھا، پیر صاحب نے اعلان کیا تھا کہ شہید گنج مسلمانوں کے حوالے نہ کی گئی تو وہ شاہی مسجد کے مینار پر چڑھ کر چھلانگ لگا دیں گے، مسلمان جھوم اُٹھے بلکہ دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیئے۔ لیکن شاہی مسجد کے مینار سراپا انتظار کھڑے رہے۔ پیر صاحب نے عذر تراشا کہ شاہی مسجد کا امام وہابی ہے اور وہ آج تک وہابی کی مسجد میں نہیں گئے۔ آخر کئی برس بعد پیر صاحب طبعی وفات پا گئے۔

مجلسِ اتحادِ ملت کے طائفے میں شاذ ہی کوئی شخص ہو گا جس کے متعلق یہ گمان ہو کہ اس کا مطمحِ نظر واقعی شہید گنج کا حصول تھا۔ اور وہ کسی دوسری مصلحت کے تحت شریک نہیں ہوا تھا۔ پیر صاحب سیاسیات کی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔ انہیں اس قسم کی تحریکوں یا ہنگاموں کا مطلقاً تجربہ ہی نہ تھا۔ چونکہ مسجد شہید گنج کے واقعہ نے پنجاب کے مسلمانوں میں ایک ہلچل مچا رکھی تھی لہٰذا اس طوفان کو روکنے کے لیے حکومت نے اپنے ان مریدوں کی معرفت جو پیر صاحب سے بیعت تھے پیر صاحب کو بالواسطہ استعمال کرنا شروع کیا، حکومت کو اندیشہ تھا کہ پیر صاحب عقیدت و ارادت کے طوفان سے متاثر ہو کر کوئی ہنگامہ برپا نہ کر دیں لیکن حکومت کے مہرے اتنے پرانے اور سیانے تھے کہ پیر صاحب انہی کے نرغہ میں تھے۔ اکثر مریدانِ باصفا ہر لحظہ اپنے پیرِ ریا کے گرد جمع

رہتے اور "مخبرِ صادق" بنے ہوئے تھے، پیر مقبول تو گورنر کی سطح پر ترپ کھیلتے لیکن سیالکوٹ کے کرم الٰہی وکیل میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ تک رسائی رکھتے، اور آنریری احکام بجا لاتے تھے، ان لوگوں کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ صبح و شام پیر صاحب کے ساتھ رہ کر حکام کی خوشنودی کے مدارج طے کر رہے تھے، ان سے نچلی سطح پر جو لوگ اتحادِ ملت کے عہدہ دار تھے ان کا معاملہ اور بھی مشکوک تھا۔ وہ سبھی مختلف افسروں کے گماشتے تھے اور کسی ایک پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ان لوگوں میں سے اکثر رحلت کر چکے ہیں، اب ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، لیکن جتنے بھی تھے ان میں سے دو چار کو چھوڑ کر بیشتر سی آئی ڈی کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی تھے۔ ڈاکٹر شیخ محمد عالم اور ان کے ساتھی صرف احرار سے اپنا سیاسی قرض چکانے کے لیے اتحادِ ملت میں آ ملے تھے، ان کے سامنے صرف اور صرف ۱۹۳۷ء کے الیکشن اور صوبائی خود مختاری میں اپنے مقام کا تعین تھا، میں نووارد تھا اور میری کوئی آواز نہ تھی لیکن رہائی کے بعد میں نے جلسۂ عام میں تصریحاً کہہ دیا تھا کہ ان لوگوں سے آپ توقع نہ رکھیں جو سر مائیکل اڈوائر کو سپاسنامہ پیش کر چکے اور برطانوی فوج کے مسلمان سپاہیوں کو تعویذ دیتے رہے ہیں۔ پیر صاحب کے کانوں تک میرے یہ الفاظ پہنچ چکے تھے۔ ایک دن میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا، وہ بھاٹی دروازہ کے اندر کسی مرید کے ہاں فروکش تھے ان کے سامنے مریدوں کا حلقہ دو زانو بیٹھا تھا کسی نے کہا "حضور! یہ ہیں شورش کاشمیری!" "جی ہاں" فرمایا اور چپ ہو گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ڈاکٹر عالم بھی سر جھکائے بیٹھے تھے، پیر صاحب جانے کیا فرما رہے تھے لیکن مریدانِ کہنہ و تازہ جا و بے جا سر ہلا ہلا کے سبحان اللہ کہے جا رہے تھے، کسی کو لب ہلانے کی مجال نہ تھی، جو بولنا چاہتا روک دیا جاتا کہ سوءِ ادب ہے، حضور جو کچھ فرما رہے ہیں سنو اور اطاعت کرو۔

مَیں نے چاہا شہید گنج کے مسئلہ پر کچھ عرض کروں، مُریدوں نے روک دیا اور کہا:
"حضوُر کی طبیعت پر بوجھ ہوگا، غالباً "ویر بھارت" میں ایک نظم چھپی تھی "مِلّت کا جنازہ ہے ذرا دُھوم سے نکلے"۔ اس کا ذکر کرنا چاہا تو میر مقبوُل نے منع کر دیا ——— خلافِ ادب ہے۔

پیر صاحب نے ایک مُرید کو اشارہ کیا وہ دوڑ کر کمبل لے آیا، آپ نے وہ کمبل مجھے عطا فرمایا کہ مدینہ شریف کا تحفہ ہے، ڈاکٹر عالم جب تک بیٹھے رہے سُبحان اللہ، سبحان اللہ کرتے رہے۔

ہم نے مہینہ بھر کوشش کی کہ پیر صاحب شہید گنج کے بارے میں کچھ فرمائیں اُن کا ارادہ کیا ہے وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں یا معرفت میں ڈوب گئے ہیں، لیکن مُریدوں کا حلقہ اپنے داؤں پر تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہید گنج کا ذکر ہو، پیر صاحب ایک سادہ تختی تھے جس پر ان کے حلقہ بگوش اپنے ہی بیل بُوٹے بناتے اور رنگ بھرتے تھے، پیر صاحب ہر سال حج کرتے اور حج کے دن قریب آ رہے تھے۔ آخر پیر صاحب نے مختلف حلقوں کے اصرار پر اتحادِ ملّت کی مجلسِ مشاورت بلائی، امرتسر میں خان بہادر سیّد بڈھے شاہ[1] کے مکان پر میٹنگ ہوئی، تمام سرکاری گماشتے موجود تھے، ہم چند نوجوانوں نے پیر صاحب پر زور دیا کہ ملّت نے آپ کو امیر منتخب کیا ہے، اَب شہید گنج کا حصول آپ کی ذمّہ داری ہے۔
مُریدوں کو اصرار تھا کہ حضور نے عمر بھر حج قضا نہیں کیا، حج پر جانا ضروری ہے، شہید گنج کے لیے آپ کے جاں نثار بہت کچھ کر رہے ہیں، اور کرتے رہیں گے، پیر صاحب ہونہہ ہاں کرتے رہے ہم نے بھی اصرار جاری رکھا ——— حضوُر حج سے جہاد اُولیٰ ہے، پیر صاحب ہماری باتوں سے مُنقبض ہو کر تخلیے میں چلے گئے، فرمایا "مراقبہ کرتا ہوں جو منشائے الٰہی ہوگا بتا

---

[1] ان صاحب کا تذکرہ "پسِ دیوارِ زنداں" میں پڑھیے اس میں ان کے خد و خال کا پُورا نقشہ موجود ہے۔

دُوں گا، شام کے اجلاس میں تشریف لائے، فرمایا،

"مَیں حج پہ جاؤں گا، بُلاوا آگیا ہے۔"

مُریدوں نے سُبحان اللہ کے ڈونگرے برسانا شروع کیے، ہم میں سے کسی نے کہا:

"حضرت! آپ امیرِ ملّت ہیں"! بات کاٹ کر غصّے میں فرمایا، ہمیں ملّت نے امیر نہیں بنایا، خدا نے امیر بنایا ہے۔ ہم ملّت کے پیدائشی امیر ہیں، سیّدوں کو یہ شرف رحمۃ للعالمین کے صدقہ میں رب العالمین نے بخشا ہے، جو شخص ہم سے امیرِ ملّت کا لقب واپس لینا چاہتا ہے وہ اٹھا کر لے جائے، ہمیں دنیوی امارت کی احتیاج نہیں، ہماری امارت تو اللہ نے قائم کی ہے۔

سب ٹھنڈے پڑ گئے، کسی میں بولنے کا یارا نہ رہا، شیخ غلام محی الدین امرتسری بہت پُرجوش نوجوان تھے انہوں نے میر مقبول کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "خان بہادر بڈھے شاہ کے مکان پر اس کے سوا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب امیرِ ملّت کا تاج سر ہربرٹ ایمرسن کے سر پہ رکھ دیجیے وہی اس کے لیے موزُوں شخص ہے۔
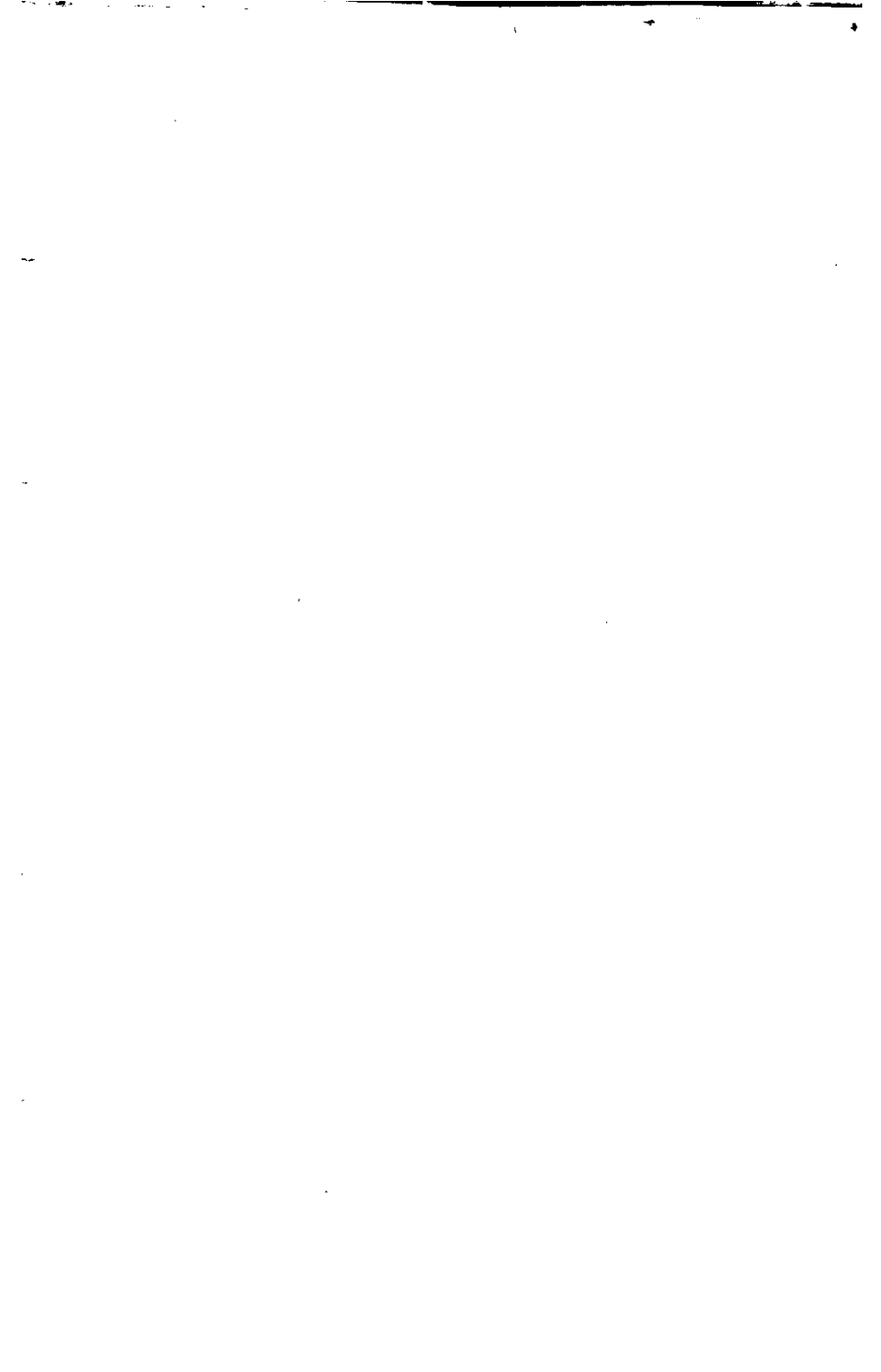
کچھ اور تلخ حقیقتیں

اچانک ایک روز میاں فیروز الدین احمد پیرول پر رہا ہو گئے، کہنے لگے دانتوں میں تکلیف ہے، ڈینٹل سرجن سے مشورہ کرنا ہے، دو چار روز کے لیے آیا ہوں۔ یہی فیروز الدین تھے جنہوں نے گورنر ایمرسن کو سردار رام سنگھ کہا تھا، اور گورنر نے چڑ کر سر فیروز خاں کو ڈانٹا تھا ——— ہندوؤں میں لالہ بیلی رام تیل والا، شاہ عالمی کے سرغنہ سمجھے جاتے اور ہندو مسلم فساد کو ہوا دیتے تھے۔ موچی دروازہ میں میاں فیروز الدین ان کا توڑ خیال کیے جاتے اور مسلمان رؤساء انہیں اپنا دست پناہ سمجھتے تھے، ایک آدھ ریاست سے انہیں وظیفہ بھی ملتا تھا۔ اکثر پولیس کے معززین کی فہرست میں رہے۔ ضلعی حکام میں ان کا رسوخ تھا، پڑھے لکھے تو کچھ زیادہ نہ تھے لیکن بولتے خوب تھے۔ ان کے والد میاں نورالدین نے موچی دروازہ میں قمار خانہ قائم کر رکھا تھا، جہاں ہر روز جوا ہوتا تھا اور وہ نال لیتے تھے۔ نال کو پنجابی میں "کاٹھا" کہتے ہیں، اس رعایت سے ان کا نام نورالدین "کاٹھا" پڑ گیا۔ اور وہ اسی نام سے عوام میں مشہور تھے،

میاں صاحب ہفتہ بھر لاہور میں رہے دانتوں کا علاج کرایا یا نہیں لیکن اپنی نظر بندی کا علاج ضرور کرا گئے، واپس ہوتے، عشرہ بھی نہ ہوا تھا کہ حکومت نے انہیں اور سید حبیب کو غیر مشروط طور پہ رہا کر دیا۔ دونوں کے باہمی تعلقات بھی خوشگوار تھے، دونوں نے رہا ہوتے ہی، سید حبیب نے بالخصوص باقی نظر بندوں کی رہائی کے لیے

کوششیں شروع کیں ——— اسی اثناء میں پیر جماعت علی شاہ دھوم دھام سے حج کو روانہ ہوگئے۔ سیّد حبیب سے پیر صاحب کے تعلقات خاص تھے، ابن سعود کے خلاف دونوں یکجا رہے، ابن سعود کی قبہ شکنی کے خلاف ہندوستان میں جو ہنگامہ اٹھا دونوں اس کے روح رواں تھے، سیّد صاحب روزنامہ "سیاست" میں ہمیشہ پیر صاحب کے ساتھ گز بھر لمبے القابات لکھا کرتے تھے۔ مثلاً قبلۂ عالم و عالمیان وغیرہ ......

پیر صاحب نے اپنے ایک نامور خلیفہ کی معرفت سیّد صاحب کو پیغام بھیجا کہ فلاں دن اتنے بجے وہ لاہور ریلوے اسٹیشن سے گزر رہے ہیں ان سے ضرور مل لیں۔ اتفاق سے اس وقت مَیں شاہ صاحب ہی کے پاس بیٹھا تھا، شاہ صاحب نے انتہائی کرخت لہجہ میں انکار کیا اور کہا "مَیں اس شخص سے کیسے ملوں ؟ جس نے سادات کی روایات کو بٹّا لگا دیا ہو، جائیے اُن سے کہہ دیجیے کہ مَیں نہیں ملنا چاہتا" چنانچہ خلیفہ صاحب اپنا سا مُنہ لے کر چلے گئے۔

افسوس کہ بعض مشاہدات و تجربات نے مجھے سیّد صاحب کے متعلق اچھی رائے قائم کرنے میں مدد نہیں دی، لیکن جہاں تک شہید گنج کے سانحے اور اس سے پیدا شدہ تحریک کا تعلق تھا، میری رائے کے مطابق وہ اس میں مُخلص تھے اور چاہتے تھے کہ مسجد مسلمانوں کو واپس ملے، اور جو خون اس راستہ میں بہا ہے ضائع نہ ہو، اس غرض سے تمام نظر بندوں کو رہا کرانے کی فکر میں تھے کہ اکٹھے ہو کر کوئی حل تلاش کریں ———

اِدھر ان کے ذہن میں یہ تھا، اُدھر ایک نیا تماشا ہو رہا تھا، گورنر صوبہ مسلمانوں سے چڑا ہؤا اور انتقاماً سکھوں کے ساتھ تھا۔ لاہور کے حُکّام سبھی غیر مُسلم تھے، ڈپٹی کمشنر مذہباً عیسائی تھا لیکن نسلاً سکھ، سٹی مجسٹریٹ بھی سکھ تھا، سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس بلیپ ایک انگریز تھا، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھا لیکن سکھ نواز، البتہ سی آئی ڈی کے مسلم سکیشن کا انچارج ایک مسلمان سپرنٹنڈنٹ پولیس میرزا معراج الدین تھا، جو ایک معمولی عہدے سے

اس عہدے تک پہنچا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد حکومت کے ایماء پر ترکی چلا گیا، یہاں سے بنارس کا ایک نوجوان مصطفیٰ صغیر اس کے ہمراہ تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نوجوان کو مصطفیٰ کمال کے قتل کرنے کا مشن سونپا گیا تھا لیکن وقت سے پہلے منصوبہ فاش ہو گیا، مصطفیٰ صغیر پکڑا گیا، اس نے اعتراف کر لیا اور گولی سے اُڑا دیا گیا۔ میرزا معراج الدین مصطفیٰ صغیر کی گرفتاری کے فوراً بعد برطانوی سفارت خانے میں پناہ لے کر واپس آ گیا اور اب پنجاب سی آئی ڈی میں مسلمانوں کے سیکشن کا انچارج تھا۔

ایس پرتاپ اور معراج الدین میں کسی وجہ سے ذہنی کھٹ پٹ ہو گئی، دونوں کے سامنے اپنے مقاصد تھے، پرتاپ گورنر کے مُنہ چڑھا ہُوا تھا، اس کو زعم تھا کہ اس نے اتنی بڑی تحریک کو دبا دیا ہے۔ معراج الدین عبدالعزیز کی طرح ڈی آئی جی ہونا چاہتا تھا، اور اس کے سامنے اپنی ترقی کا سوال تھا۔ بد قسمتی کہیے، دونوں نے تحریک کے رہنماؤں میں سے بعض افراد کو اپنے ساتھ ملا رکھا تھا، جو انہیں ہر قسم کی اطلاعات دینے اور ان کے مہرے کی حیثیت سے کام کرتے تھے، دونوں کے سامنے ایک ہی سوال تھا کہ تحریک کو ختم کرنے کا کریڈٹ لیں، لیکن ان کی چالیں ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں، متصادم تھیں۔

گورنر نے فائرنگ کا محاذ ختم ہوتے ہی ایس پرتاپ کو عصرانہ دیا۔ عصرانہ میں اس کی ندامات کو سراہا گیا۔ ایک گورنر کی طرف سے کسی ڈپٹی کمشنر کے لیے یہ اپنی طرز کا پہلا اعزاز تھا، اس دعوت میں لاہور کے بعض مسلمان اکابر بھی موجود تھے۔ ملک محمد دین جو سالہا سال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہ چکے تھے اور غالباً ان دنوں لاہور میونسپل کے صدر تھے اس دعوت میں شریک ہوئے، انہوں نے ایس پرتاپ کی تعریف میں قصیدہ پڑھا، یہاں تک فرمایا کہ "ایس پرتاپ کی فرض شناسی قابلِ تحسین ہے، ان کی جگہ لاہور میں کوئی اور ڈپٹی کمشنر ہوتا تو لازماً اس سے زیادہ خون خرابہ ہوتا" ملک صاحب

عوام کے لیے بدمزاج اور حکام کے لیے جاسوس تھے، لیجسلیٹو کونسل کے انتخاب میں علامہ اقبال کا مقابلہ کر چکے تھے، آخری انتخاب میں یونی نسٹ پارٹی کا ٹکٹ لے کر لیگی امیدوار میاں امیرالدین کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے۔ میاں صاحب کے کاغذات مسترد کرا دیئے، خود احرار کے ایک رضاکار ملک وزیر محمد سے پٹ گئے، جنہیں میاں امیرالدین کے کاغذات مسترد ہونے پر مسلم لیگ نے اپنا امیدوار نامزد کر دیا تھا۔ یہ ملک صاحب کے طرزِ عمل کا جواب تھا۔

میرزا معراج دین فطرتاً چاہتے تھے کہ شہید گنج کی تحریک کو اپنی ترقی کا زینہ بنائیں انہیں سرکاری مسلمانوں میں ایس پرتاپ کا رسوخ ناپسند تھا، میاں فیروزالدین احمد تو ان کے دوست تھے لیکن سید حبیب سے ان کی پرانی کاچھپنی تھی، اور اب کے سید عنایت شاہ سے ان کی تلخ کلامی نے اسے اور تیز کر دیا تھا، سید حبیب ڈپٹی کمشنر کی معرفت نظربندوں کی رہائی کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے، ایس پرتاپ نے گورنر کو تاثر دینا شروع کیا کہ تحریک میں جان نہیں رہی، نظر بندوں کو رہا کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، میرزا دوسرا تاثر دے رہا تھا کہ تحریک کے جراثیم موجود ہیں اور کسی بھی وقت آگ بھڑک سکتی ہے۔ غرض پرتاپ اور میرزا دو مختلف تاثر دیتے رہے، گورنر کے لیے کوئی فیصلہ کرنا مشکل تھا، ایک مرحلے میں ایس پرتاپ کی یقین دہانی پر گورنر نظر بندوں کو چھوڑنے کے لیے آمادہ ہو گیا، عین اس وقت میرزا معراج دین نے اپنا ایک مہرہ آگے بڑھایا۔ پیسہ اخبار کے ایک گو یہ چودھری مولا بخش اس تحریک میں ہمارے ساتھ قید ہوئے تھے، ان کی طبیعت کا ایک خاص رنگ تھا۔ مولا بخش نے ایک دن مجھے بلا بھیجا اور زور دینے لگے کہ پیر جماعت علی تو دغا کر کے چلے گئے ہیں، ہمیں کچھ کرنا چاہیے، میں نے عذر کیا کہ ہمارے پاس کونسی طاقت اور جماعت ہے کہ اتنی بڑی لڑائی اپنے ذمہ لیں، انہیں اصرار تھا کہ سول نافرمانی کی جائے، میں نے واضح لفظوں میں انکار کیا، میرا بنیادی عذر یہ تھا کہ ہم ذمہ داری اٹھانے

کے اہل ہی نہیں، سیّد حبیب موجود ہیں، ان سے مشورہ کر لو، مولا بخش نے کہا وہ بوڑھے آدمی ہیں انہیں چھوڑ دو، ہم خود ہی کوئی قدم اٹھاتے ہیں، مَیں ان کی کسی دلیل سے قائل نہ ہو سکا، مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ پس پردہ ضرور کوئی ہاتھ ہے؛ اتنے میں امین الدین صحرائی آگئے، انہوں نے بھی یہی راگ چھیڑا، وہاں سے ہم ملک عنایت اللہ صدر مجلسِ اتحادِ ملت لاہور کے ہاں گئے وہ بھی دل میں یہی لیے بیٹھے تھے، ایک اور ساتھی ملک محبوب احمد سے ملے، ان کا خیال بھی یہی نکلا، اتنے میں میرزا شوکت آگئے، ان کے پاس بھی یہی پروگرام تھا، مَیں جانتا تھا کہ ان کے بڑے بھائی میرزا سلطان احمد کیف میرزا معراج الدین کے مقرب ہیں، اب لے دے کے میں ہی تھا جو ان کا ہم خیال نہ تھا، آخر ان کے طعن و تشنیع میں آکر میں بھی ان کا ہم نوا ہو گیا، صلاح ٹھہری کہ اس جمعہ کو تحریک کا آغاز کیا جائے، پہلے ہم سب امرتسر چلیں، وہاں سرپھروں کے مرکز شیخ غلام محی الدین ہیں ان کی معرفت پوسٹر چھپوائیں۔ شیخ صاحب بھی کمر بستہ تھے، فوراً متفق ہو گئے، پوسٹر دیکھ کر حکّام ضلع کے طوطے اڑ گئے، پوسٹر میں اعلان تھا کہ "اس جمعہ سے شہید گنج کی بازیابی کے لیے سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہو رہا ہے، فرزندانِ توحید جمعہ کی نماز شاہی مسجد لاہور میں ادا کریں"، پوسٹر میں کسی شخص کا نام نہیں تھا۔

سیّد حبیب کے بھائی سیّد عنایت شاہ سے میرے مراسم کچھ اس طرز کے ہو گئے تھے کہ ان سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی بھی قدم نہ اٹھاتا تھا لیکن اب کے ان سے پوچھا ہی نہ تھا۔ جب پوسٹر سے کھلبلی مچی تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا "تمہیں کچھ معلوم ہے؟" مَیں نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ وہ ششدر رہ گئے۔ مجھے منع کیا اور کہا "تم نہیں جانتے کیا ہو رہا ہے؟" مَیں نے لاعلمی ظاہر کی، کہنے لگے "یہ ڈرامہ میرزا معراج الدین کھیلنا چاہتا ہے، اس کے سامنے ذاتی مقاصد ہیں، تم جلسے میں ہرگز ہرگز شریک نہ ہونا۔"

مَیں دفتر "سیاست" سے نیچے آیا تو سامنے سی آئی ڈی کا ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر

کھڑا تھا، مَیں اسے پہچانتا ضرور تھا لیکن آشنا نہیں تھا، اس نے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور بعض ایسی باتیں کہہ دیں جو نظر بہ ظاہر راز میں تھیں، مَیں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے کہا "یہاں بات کرنا ٹھیک نہیں کوتوالی چلتے ہیں۔"

مَیں نے کہا "کوتوالی؟"

بولا "ہاں، گھبرانے کی ضرورت نہیں اور نہ کوئی ایسی بات ہی ہے؟"

"ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر میں اُلٹے پاؤں سیاست کے دفتر میں آ گیا اور سیّد عنایت شاہ کو سارا ماجرا کہہ سنایا، وہ پہلے تو جھجکے مبادا گرفتار کر لیں پھر کہنے لگے اچھا جاؤ اور یہ یہ سوالات ان سے پوچھو، اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہنا۔" مَیں کوتوالی گیا تو وہ صاحب دروازہ پر موجود تھے مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، کون بول رہا ہے؟ جواب ملا "مَیں شہر کے اندر سے بول رہا ہوں؟ نام پوچھنے کی ضرورت نہیں، کل جمعہ کو تحریک شہید گنج دوبارہ شروع ہو رہی ہے، فلاں فلاں مقرر تقریر کریں گے۔ پوسٹر امرتسر میں چھپا تھا اور اس مشورہ میں فلاں فلاں لوگ شریک تھے، وہ کاغذ پر لکھے جا رہا تھا، فون بند ہو گیا، تو اس نے مجھ سے کہا ٹھیک ہے؟ مَیں نے پوچھا "کیا ہے؟" اس نے نام سنائے ایک نام غائب تھا، بہر حال مَیں نے صاد کیا اور اُٹھ کر آ گیا، شاہ جی سے سارا قصّہ بیان کیا ——— وہ اور بھی پختہ ہو گئے، کہنے لگے، یہ سارا کھیل ایک سازش کے تحت کھیلا جا رہا ہے، وہ تمام لوگ جو اس ناٹک میں شریک ہیں میرزا معراج الدین کی بساط کے مہرے ہیں۔ تم بالکل حصہ نہ لینا، تماشا دیکھتا ہو تو میرے ساتھ چلنا، عنقریب کُھل جائے گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟

اگلے دن پولیس نے شاہی مسجد کو گھیرے میں لے رکھا تھا، جمعہ کی نماز لوگوں کا بے پناہ سیل، سی آئی ڈی کے ملائکہ بھی موجود تھے۔

مَیں اور سیّد عنایت شاہ ایک کونے میں کھڑے تماشا دیکھتے رہے، چودھری

مولا بخش نے اپنی صدارت میں جلسہ کا اعلان کیا، کوئی مُحرّک نہ مُؤیّد، ان کے سوا اور کوئی مُقرّر نہ تھا، سب غائب۔ مولا بخش نے وہ سارا قصّہ بیان کیا جو اس جلسہ کی تجویز سے انعقاد تک زیرِ غور رہا، پھر گلا کیا کہ جو ساتھی شریک تھے وہ حسبِ تجویز نہیں آئے۔ مسجد شہید گنج [illegible] مولانا بخش پکڑ لیے گئے۔ یہی دو چار گھنٹہ پولیس کی حراست میں رہے ہوں گے کہ میاں فیروز الدین انہیں ضمانت پر لے آتے، کچھ دنوں فضا میں سکون رہا۔ ایک دن اچانک خبر ملی کہ مولا بخش نے جمعہ کی نماز کے فوراً بعد تحریک کا آغاز کر دیا ہے اور آج اُن کی طرف سے پہلا جتھہ گرفتار ہو گیا ہے، تحریک چلتی رہی، لوگ قید ہوتے رہے لیکن وہ لوگ کہاں سے آتے۔ یہ ایک معمّا تھا، ایک دن مولا بخش نے ہم سب کے خلاف زہر اُگلا کہ ہم اسے دغا دے گئے ہیں، میرے خلاف اسے کچھ زیادہ ہی غصّہ تھا، اور مَیں جانتا تھا کہ اس سے یہ سب کچھ کس نے کہلوایا اور کون کہلوا رہا ہے، مَیں نے سیّد عنایت شاہ کو راضی کرنا چاہا کہ مجھے قید ہو جانے دیں تاکہ مولا بخش کا طلسم ٹوٹ جائے، لیکن وہ راضی نہ ہوئے، مولا بخش نے سیّد حبیب کو بھی آڑے ہاتھوں لیا کہ کس طرح قبل از وقت رہا ہو گئے۔ شاہ صاحب بھی جانتے تھے کہ اس سے یہ کلمات کس نے کہلواتے ہیں اور ان کی غایت کیا ہے؟ انہوں نے مولا بخش کو خط لکھا کہ وہ ہر لمحہ جیل جانے کو تیار ہیں جب کہو آ جاؤں لیکن جتھے میں جانے سے پہلے مَیں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں، جس میں بعض ناگفتہ بہ باتوں کا تذکرہ بھی ہو گا، مولا بخش نے جلسہ میں یہ خط تو سُنا دیا لیکن طرح دے گئے کہ ابھی شاہ صاحب کو بلانے کی ضرورت نہیں، ضرورت ہو گی تو ان سے خدمت لی جائے گی، اگلے روز مولا بخش کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا، ہم نے اس موقع کو غنیمت جانا کہ ہم تحریک کا رُخ حکومت کی طرف موڑنے کے خواہاں تھے اور مولا بخش نے صرف سکھوں ہی کو نشانہ بنا رکھا تھا۔

یعسوب مسلمانوں میں ایک اُبھرتا ہوا نوجوان تھا وہ "نوجوان بھارت سبھا" کے انقلابیوں کی معیّت میں رہ چکا تھا اور تحریکوں کے گر گھاٹ سے واقف تھا، تقریر کرنے

میں مشّاق اور اس کا لب ولہجہ بڑا گونجدار تھا، میرے ساتھ اس کے تعلقات بہت پرانے تھے۔ مَیں نے اس کو آگے کیا وہ پہلے ہی پَر تول رہا تھا۔ یکایک میدان میں کود پڑا، اس زناٹے کی تقریر کی کہ لوگ حیران رہ گئے۔ اگلے روز اور بہت سی باتیں کہہ ڈالیں، ابھی وہ یہ اعلان کر رہا تھا کہ کل اس تحریک کے بعض خفیہ گوشے بے نقاب کروں گا، اور سی آئی ڈی کو یہاں سے نکلنا ہوگا کہ چودھری مولابخش کے آنے کا شور مچ گیا، دیکھا تو سچ مچ مولابخش آرہا تھا، اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے منبر پہ قدم رکھا اور صدر بن گیا۔ ع

کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

مولابخش کا دوسری دفعہ رہا ہونا اب راز نہیں رہا تھا، لیکن یہ معما سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسی کو بار بار کیوں لایا اور بڑھایا جا رہا ہے؟ ——— خیر اتنی سی بات ہماری سمجھ میں آگئی کہ مرزا معراج الدین تحریک کو یعسوب کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتا اور جو کچھ اس کے ذہن میں ہے اس کے لیے موزوں مہرہ مولابخش ہی ہے، مولابخش نے بہت چاہا کہ یعسوب تقریر نہ کرے لیکن یعسوب ہر روز تیز ہوتا گیا، آخر ایک روز اس نے مرزا معراج الدین کا نام لے کر تابڑ توڑ حملے کیے۔ اس کے گماشتوں کو بُرا بھلا کہا، سی آئی ڈی کے اہلکاروں کو ذلیل کر کے مسجد سے نکلوا دیا، لوگوں کو پولیس سے برافروختہ کیا، یہ حملہ سی آئی ڈی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، مرزا معراج الدین انتقام پر اُتر آیا، جلسہ مسجد میں ہوتا اور سی آئی ڈی کے ارکان مسجد سے باہر کھڑے رہتے۔

یعسوب نے مولابخش سے کہا ہمیں دوسرا محاذ راولپنڈی میں قائم کرنا چاہیے، مَیں وہاں چلا جاتا ہوں، مولابخش نے بظاہر ہُوں ہاں کی لیکن اندرخانہ معراج الدین کو مطلع کر دیا، نتیجۃً مسجد کے دروازوں پر سی آئی ڈی کا پہرہ اور کڑا ہو گیا، پولیس نے یعسوب کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا اس کا علم یعسوب کو بھی ہو گیا، وہ اسی دن نماز عشاء کے دوران مسجد سے نکل گیا، مولابخش کو حیرت ہوئی اور سی آئی ڈی کو شکست۔ تمام شہر میں چھاپے مارے گئے، اس کے

دوستوں سے پوچھ گچھ ہوتی رہی، اس کے والد کو بار بار کوتوالی بلایا گیا، بھائیوں کو ہراساں کیا جانے لگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یعسوب ان کے علم و اطلاع کے بغیر چلا گیا تھا، اور یہ راز صرف اسی کے سینہ میں تھا ——— یعسوب کے دوستوں میں زاہد بھی تھے اور رند بھی لیکن متقیوں نے تو ٹھہرانے سے انکار کر دیا کہ ظاہر و باطن یکساں رکھنا چاہتے تھے، البتہ ایک طوائف نے اسے پناہ دی جو مسجد کے پہلو ہی میں رہتی تھی ——— میں نے اس سے کہا "تمہاری دلیری بڑی خطرناک تھی"

کہنے لگی: "نامۂ اعمال میں کوئی نیکی بھی تو ہونی چاہیے"

سی آئی ڈی تلاش میں ناکام ہو گئی تو اس نے مولا بخش سے اعلان کروایا:

"میں تحریک کو خفیہ رکھنے کے خلاف ہوں، یعسوب کو مسجد میں آ جانا چاہیے، ان کی اس روش سے ہماری تحریک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے"

مولا بخش کو خود معلوم نہ ہوتا کہ اسے کل کیا کہنا ہے، وہ محض ایک اداکار تھا، ہم نے سوچ بچار کے بعد یہی بہتر سمجھا کہ یعسوب کو واپس بلا لیں۔ یعسوب واپس آ گیا اس دن بڑے زور کا جلسہ ہوا، یعسوب نے خطابت کے جوہر دکھاتے، سی آئی ڈی والوں کا نام لے لے کر رگیدا، وہ کوئی فرقہ وار ذہن کا مذہبی آدمی نہیں تھا لیکن اس نے سی آئی ڈی کا ذکر کرتے ہوئے گلا کیا کہ اس محکمہ میں عموماً ان لوگوں کی اکثریت ہے جو ہر سال حسینؓ کا ماتم کرتے اور یزید پر لعنت بھیجتے ہیں لیکن خود ان کی حالت یہ ہے کہ مسلمانوں ہی کے خلاف جاسوسی کرتے ہیں، ان الفاظ نے سی آئی ڈی کو پریشان کر دیا، اس نے اپنے وہ تمام ہتھیار استعمال کیے جو ان موقعوں پر اس کی کسوت سے نکل آتے ہیں، بالآخر یہاں تک گلفشانی کی کہ یعسوب ہمارا مخبر ہے، نوجوان بھارت سبھا کے انقلابیوں کو پکڑوانے اور دار پر کھنچوانے میں اُن کی مدد کرتا رہا اور وہ اسے کئی سو روپے ماہوار معاوضہ دیتے رہے ہیں، وغیرہ۔ ایک سب انسپکٹر

مسجد سے باہر مجمع میں یہی باتیں کر رہا تھا، میں نے اسے ٹوک دیا۔ اگر یعقوب مخبر ہوتا تو آپ یہ باتیں نہ کرتے، اس طرح آپ کچھ حاصل نہیں کر پائیں گے ۔ عوام نے اس ژاژخائی کو پرکاہ وقعت نہ دی، یعقوب نے اعلان کر دیا کہ آئندہ چار پانچ سو آدمی گھروں کو جانے کی بجائے مسجد ہی میں سویا کریں، اگلے روز ان کی جگہ دوسرے لوگ رہیں گویا ہر شخص ہفتہ میں ایک رات مسجد میں رہا کرے، پولیس بہت گھبرا گئی، کئی مومنانہ صورتیں وہیں ٹک گئیں، دو بزرگوں نے اس سلسلہ میں پولیس کا ہاتھ بٹایا، ایک صاحب نواب سید بن کر اہل اللہ ہو گئے اور اپنے گرد مریدوں کا ایک بڑا حلقہ رکھتے ہیں، دوسرے صاحب موہن لال روڈ پر جلد ساز تھے، ان صاحب نے لنگر کا انتظام سنبھال رکھا تھا، جو لوگ مسجد میں سوتے ان کے لیے ہر روز رات کو چائے بنتی اور اس کے کرتا دھرتا یہی صاحب تھے ۔ انہوں نے ایک شب چائے میں کوئی نشہ آور چیز ملا دی جس سے سبھی سو گئے ۔ مولا بخش نے یعقوب سے کہا ذرا حجرے میں چلو کچھ باتیں کرنی ہیں، اور وہ مسجد سے اٹھ کر حجرے میں آ گئے، دونوں یہی چائے پی چکے تھے، ان پر بھی نیند نے قابو پا لیا، رات نصف گزری ہو گی کہ پولیس کی ایک بھاری جمعیت مسجد میں داخل ہو گئی اور دونوں کو گرفتار کر لیا، یعقوب نے نعرہ لگا کر لوگوں کو جگانا چاہا لیکن پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے گلا دبا دیا، وہاں سے مارتے پیٹتے لاہور چھاؤنی کے تھانے میں لے گئے جہاں میرزا معراج الدین موجود تھا، اُس نے مولا بخش کو اپنے ساتھ کرسی پر بٹھا لیا لیکن یعقوب کو اُلٹا لٹا کر پٹوایا اور جتنی گالیاں پولیس کے لغت میں ہو سکتی تھیں صرف کر دیں، صبح ہوتے ہی دونوں کو جیل خانے بھیج دیا گیا، مولا بخش کو چھ ماہ قید اور بی کلاس دی گئی، لیکن یعقوب کو قید تنہائی میں رکھا گیا، اس کے خلاف کئی مقدمات قائم کیے گئے جن میں ایک مقدمہ ۳۰۲ ۔ ۱۱۷ کا تھا، کہ اس نے اپنی تقریروں میں پولیس افسروں کے خلاف لوگوں کو تشدد پر اُبھارا ہے یعقوب کو ایک عام مقدمہ میں سزا دے کر ابتدا ہی میں قیدی بنا دیا گیا تاکہ مشقت بھی کرتا رہے اور

دوسرے مقدمات کی تلوار بھی اس کے سر پر لٹکتی رہے۔

شہید گنج ہی کے سلسلہ میں ایک مقدمہ دو سوشلسٹ رہنماؤں، کامریڈ مبارک ساغر اور کامریڈ موہن لال کے خلاف مسٹر ایسر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں چل رہا تھا، میں اس میں صفائی کا گواہ تھا، مَیں نے عدالت سے کہا آپ اگر مجھے حفاظت کا یقین دلائیں تو مَیں ان تمام واقعات کو بلاکم و کاست عرض کرنے کے لیے تیار ہوں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسجد شہید گنج حکومت نے گروائی اور اس کے انہدام میں بعض سرکاری افسروں کا ہاتھ تھا۔ ظاہر ہے کہ عدالت کے لیے اس قسم کی ضمانت دینا محال تھا۔ مسٹر ایسر نے کورٹ ڈی ایس پی سے کہا کہ حکومت سے دریافت کرے آیا وہ اس کے لیے تیار ہے؛ جواب نفی میں تھا، ملزموں نے احتجاجاً صفائی چھوڑ دی، ان کا سارا موقف ہی یہ تھا کہ شہید گنج گورنر نے پنجاب کی سیاسی زندگی کو خراب و مخدوش کرنے کے لیے گروائی ہے۔

ادھر صوبجاتی خود مختاری کا زمانہ قریب سے قریب آ رہا تھا، انتخابات سر پر کھڑے تھے، گورنر جنرل صوبے کے گورنر سے ناخوش تھا کہ اس نے معاملات کی شکل بگاڑ دی ہے، بات اتنی آسان نہ تھی جتنی شروع میں سمجھی گئی تھی۔ قائداعظم نے گورنر جنرل سے صوبائی گورنر کی شکایت کی اور گورنر جنرل نے زور دیا کہ قائداعظم اس معاملے کو اپنے تدبّر سے سلجھائیں، حکومت ان سے تعاون کرے گی، قائداعظم لاہور تشریف لائے، صورتِ حال کا جائزہ لیا، گورنر سے ملے، نتیجۃً تمام نظر بندوں کی رہائی کا اعلان ہو گیا، مولابخش اور یعسوب کو قید ہوئے مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہوا تھا، حکومت نے مولابخش کو فوراً رہا کر دیا لیکن یعسوب کو نہ چھوڑا، ہم قائداعظم کے پاس گئے، یعسوب کا سارا قصہ بیان کیا، پولیس نے بہتیرا زور دیا کہ یعسوب کو رہا نہ کیا جائے، کئی تصویریں بنا کر پیش کیں لیکن قائداعظم کہہ چکے تھے گورنر رہا کرنے پر مجبور ہو گیا، اسی اثنا میں ہمیں یاد آیا کہ مبارک ساغر اور موہن لال کا مقدمہ بھی ہے۔ ہم نے پھر قائداعظم سے کہا، انہوں نے سب کچھ بغور سنا کہنے لگے یہ بھی رہا ہو جائیں گے، اسی شام

ان کے خلاف مقدمہ واپس لینے کے احکام جاری ہو گئے۔ قائد اعظم نہ آتے تو یعسوب مدتوں جیل میں پڑا سڑتا اور شاید اس وقت تک رہا نہ ہوتا جب تک میرزا معراج الدین اپنے عہدہ پر فائز رہتے، آخر کار ایک چیز صاف ہو گئی کہ چودھری مولا بخش نے اس اثنا میں جو کچھ کیا اور حسن نیت سے بھی کیا میرزا معراج الدین کے ایماء سے کیا، اس کی تقریروں کے بعض عجیب و غریب اجزا میرزا معراج الدین کے ذہن سے آتے تھے۔

چودھری مولا بخش کی تحریک سے پہلے ہی میرزا صاحب مجھے بلا چکے تھے، گفتگو کے دھنی تھے دیر تک اپنی اسلام دوستی کا ذکر کرتے رہے، شہید گنج کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے، فرمایا دل تمہارے ساتھ ہے لیکن مجبور ہیں، یہاں بیٹھ کر اسلام کی جتنی خدمت ہو سکتی ہے وہ کرتے ہیں ہم نہ ہوں تو یہ ہندو سکھ اور انگریز مسلمانوں کو کھا جائیں، گورنر کی بدمعاشی کا ذکر کیا کہ مسجد کے گرانے کا ذمہ دار وہی ہے، دبے لفظوں میں سول نافرمانی کرنے کی ترغیب دی، میرے طرزِ تقریر کی تعریف میں غلو کیا، تاہم مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، میں جانتا تھا کہ اس کا حال کیا ہے اور راضی کیا رہا ہے؟ مولا بخش نے ہنگامہ برپا کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ ان ہی کا کرشمہ ہے، کئی سال بعد مولا بخش کی سیرت آوارہ ہو گئی اور اس کے خلوتی راز اس سے برگشتہ ہو گئے، تو ہر چیز کھل کے سامنے آ گئی، ایک صاحب پیسہ اخبار میں بک بائینڈنگ کی دوکان کرتے تھے ان کا ذوق علمی تھا، ہم عقیدہ اور ہم محلہ ہونے کی وجہ سے ان کے تعلقات موچی دروازہ کے اُن شیعہ افسروں سے تھے جن کا اس وقت سی آئی ڈی میں طوطی بول رہا تھا، انہی کی معرفت مولا بخش معراج الدین تک پہنچے اور انہی کی روایت کے مطابق پچاس روپے ماہانہ پر مولا بخش سے سودا ہوا، چنانچہ ہر مہینے وہ پچاس روپے مولا بخش کو لا کر دیتے رہے، مولا بخش اور اس میں کسی وجہ سے جھگڑا ہو گیا تو اس نے یہ راز اس کے منہ پر کہہ دیا کہ تم کیا بول سکتے ہو؟ جبکہ سی آئی ڈی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہو، مولا بخش اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

مولا بخش کوئی پڑھا لکھا آدمی نہ تھا، بس مولا بخش ہی تھا، اس کا ضمیر اس کے سامنے تھا اور وہ ایک گمشدہ ورق ہو کر رہ گیا، اس کی باقی زندگی انتہائی کس مپرسی میں گزری۔ سی آئی ڈی نے استعمال کیا پھر چھوڑ دیا، کوئی جماعت منہ لگانے کو تیار نہ ہوئی، انارکلی پولیس نے اپنا معتبر بنا لیا لیکن ایک سکھ انسپکٹر نے رد کر دیا، گوجروں کی انجمن قائم کی، اس کا صدر بن بیٹھا جس سے گذر بسر ہونے لگی۔ لیکن ایک دن جانے کیا سوجھی، یہ کہہ کر لاہور سے بمبئی روانہ ہو گیا کہ "مسجد شہید گنج کے لیے مسٹر جناح نے جو کمیٹی قائم کی تھی وہ سرد خانے میں جا چکی ہے۔ اب وہ بتائیں کہ شہید گنج کس طرح مل سکتی ہے، نہ بتایا تو میں ان کے بنگلہ پر پکٹنگ کروں گا"۔ وہاں ٹامک ٹوئیے مارتا رہا۔ بھوک سے آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں، اتفاق سے ان دنوں احرار، بمبئی میں کانفرنس کر رہے تھے ان کے پاس پہنچا انہوں نے کرایہ دلوا کر لاہور بھجوا دیا۔

انجام کار نقش عبرت ہو کر مارا گیا، خودکشی کی یا کسی شخص نے ہلاک کیا معلوم نہ ہو سکا، صبح دروازہ کھولا گیا تو کپڑے خون سے لت پت تھے اور پیٹ استرے سے چرا ہوا تھا، پولیس کے لیے یہ قتل بھی روزمرہ ہی کا ایک سانحہ تھا جو پیسہ اخبار پولیس سٹیشن کی ضمنیوں میں درج ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

اتحادِ ملّت کا نیا سفر

مولانا ظفر علی خان رہا ہو کر آئے تو انہیں یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ شورش کاشمیری مَیں ہوں، وہ مجھے صرف عبدالکریم اُلفت کے نام سے جانتے تھے، ان کے سامنے آنا شورش کاشمیری ایک قیاسی تصویر تھی، بعض دوسرے نظر بندوں کا معاملہ تو اس سے بھی مختلف تھا، ان سے تعارف ہی نہ تھا۔ میں ان کی غیر حاضری میں اُٹھا تھا، اخباروں نے مجھے خوب اُچھالا اور اُجالا، لطیفہ یہ تھا کہ مَیں نے اب تک کوئی تصویر نہیں کھنچوائی تھی مَیں اِس معاملے میں سخت متشدّد تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات بچپن سے نقش ہو چکی تھی کہ تصویر کھنچوانا مذہباً حرام ہے۔ دسویں جماعت کے طلبہ کو امتحان سے مہینہ ڈیڑھ مہینہ پیشتر تیاری کے لیے چھٹیاں مل جاتی ہیں، اس تقریب میں انہیں پارٹی دی جاتی اور رخصتی تصویر کھنچوائی جاتی ہے، مَیں نے اُس وقت بھی تصویر کھنچوانے سے انکار کر دیا تھا۔

میرے نام کے ساتھ آغا کا استعمال بھی دوستانہ تعلقاتِ خاطر کا نتیجہ ہے، ہمارے ایک دوست چونی لال کاوش تھے، مذہباً ہندو لیکن تہذیباً مسلمان، سب سے پہلے آغا شورش کاشمیری زندہ باد کا نعرہ اُسی نے لگایا تھا، تب سیاست میں مقبول انور راَوری نے آغا شورش کاشمیری لکھنا شروع کیا۔ نتیجۃً تمام اخباروں میں آغا شورش کاشمیری ہو گیا، آغا حشر کے بعد غالباً میں دوسرا کاشمیری تھا جس نے آغا کا لقب اختیار کیا

مدت تک تو میں اس لفظ سے پیچھا چھڑاتا رہا لیکن ناگزیر ہو گیا تو مجھے خود اس سے مناسبت پیدا کر لینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ اکثر ہم عمر نوجوان مدت سے سیاسی اکھاڑے میں تھے میں ان سب کے پیچھے آیا تھا، لیکن بہرۂ خطابت کچھ اس طرح کھلا جیسے کسی سنگلاخ زمین سے دفعتہً چشمہ بہہ نکلا ہو، عوام میں شہرت ہو گئی۔ بعض شہروں سے مجھے بار بار مدعو کیا جاتا، نتیجۃً میں ان سے آگے نکل گیا۔

مولانا ظفر علی خاں نے سب سے پہلے نظر بندوں کو اکٹھا کیا۔ "زمیندار" اور "سیاست" پھر سے جاری ہو گئے۔ پیر جماعت علی شاہ حج سے لوٹے تو گوشہ نشین ہو گئے، مجلسِ اتحادِ ملّت کی تنظیمِ نو کی گئی، پہلا اجلاس مولانا کے زیرِ صدارت دفتر زمیندار میں منعقد ہوا، مولانا صدر منتخب کیے گئے، مولانا کہیں باہر نکلے تو سیّد حبیب کو جنرل سکرٹری بنا دیا گیا مولانا راضی نہ ہوتے اور ملک لال خاں کو جنرل سکرٹری بنوایا۔ شاہ صاحب کو سخت رنج ہوا اور یہ ایک قدرتی امر تھا وہ اُٹھ کر چلے گئے، پھر کبھی دفتر زمیندار کا رُخ نہ کیا بلکہ چند دنوں بعد مولانا ظفر علی خاں کے خلاف لکھنا شروع کیا اور اس تیزی پر آ گئے جو ان کا شیوۂ خاص تھا۔ مولانا نے نوٹس تک نہ لیا، ایک ورکنگ کمیٹی بنا لی جس میں اپنے بھائی چودھری غلام حیدر خان اپنے بیٹے اختر علی خاں اور زمیندار کے اڈیٹر اظہر امرتسری کو بھی نامزد کیا گیا، ان کے علاوہ میاں فیروز الدین، یعسوب الحسن، ابوسعید انور اور مجھے شامل کیا گیا۔ اس طرح مولانا نے مجلسِ عاملہ اپنی مرضی کے مطابق وضع کر لی، مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر عالم بھی عاملہ کے ممبر تھے لیکن مولانا عبدالقادر تو ایک آدھ دفعہ کے سوا کبھی تشریف نہ لائے البتہ ڈاکٹر عالم بہ التزام آتے رہے وہ عاملہ میں تنہا تھے لیکن مولانا کو ہمیشہ اپنے ڈھب پر لے آتے اور مولانا اپنی سادہ دلی کے باعث اکثر ان کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔

قائد اعظم شہید گنج کے قضیہ کو دوستانہ سطح پر حل کرنے کے لیے ہندوؤں سکھوں

اور مسلمانوں کی ایک کمیٹی بنا کر چلے گئے لیکن حالات ہی ایسے تھے کہ اس کمیٹی کے اجلاس کا انعقاد ناممکن تھا، کوئی فریق اپنے دعوی اور ملکیت سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا۔

صوبائی خود مختاری کا آغاز ہو رہا تھا، جنرل انتخابات سر پر کھڑے تھے، ہر شخص جس کے ذہن میں کوئی حلقۂ انتخاب تھا اپنے لیے ایک خواب دیکھ رہا تھا، ڈاکٹر عالم بلاشبہ انتخاب کے لیے آتے تھے انہیں شہید گنج سے رتی برابر بھی دلچسپی نہ تھی، ان کا دماغ بہت اجلا لیکن دل بہت میلا تھا، ایک کامیاب فوجداری وکیل ہونے کی وجہ سے گفتگو کرنے میں نہایت کائیاں تھے جس سے بات کرتے ایک دفعہ اسے مسحور کر لیتے، اعلیٰ پائے کے مقرر تھے لیکن جو لوگ ان کے زخم کھا چکے تھے اُن پر اُن کا جادُو نہیں چلتا تھا، وہ ان سے دُور بھاگتے تھے۔

جن رہنماؤں کے متعلق زمانۂ طالب علمی میں میرا یہ تأثر رہا کہ معجزاتی انسان ہیں یا جنہیں میں اپنے سیاسی خوابوں کا دیوتا سمجھتا تھا اس تجربہ نے میرا وہ تاثر محو کر دیا اور مَیں انہیں عام انسان سمجھنے لگا، مشاہدہ اور بڑھا تو میرے دل میں ان کے متعلق وسوسے پیدا ہوتے گئے، میرا احساس ان کے متعلق زخمی ہوتا رہا، حتیٰ کہ بعض چہرے ارادت کے چوکھٹے سے نکل گئے، مَیں ان چہروں سے نقابیں اٹھانا چاہتا تھا، لیکن حالات قابو سے باہر تھے، مَیں ایک ایسی ناؤ میں سوار تھا جس کا ملاح ٹوٹے ہوئے لنگر سے کشتی کھے رہا تھا۔ میری نفرت میرے دل و دماغ میں تھی لیکن میں اس سے کام نہیں لے سکتا تھا البتہ کڑھتا ضرور تھا کہ شہید گنج کے نام پر شہید گنج کے سوا سبھی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر شخص انتخابات کی فکر میں تھا، اب شہید گنج کا صرف نام رہ گیا کام نہیں تھا اور اتحاد ملت میں سیاسی خوردہ جمع ہو گیا تھا، تمام بڑے رہنما آپس میں مخلص نہیں تھے نہ ان میں کوئی ذہنی اتحاد تھا، اور نہ ان کے سینے ایک دوسرے سے صاف تھے، سبھی اپنے اپنے داؤ پر تھے، البتہ ایک جذبہ اُن میں ضرور مشترک تھا اور وہ احرار دشمنی کا جذبہ تھا، احرار کے

متعلق ہم نوجوان بھی انہی کی زبان میں بولتے لیکن ہمارے سامنے واقعی مسجد شہید گنج کا حصول تھا، دن گزرتے اور تجربے ہوتے گئے، لیڈروں کے متعلق میری ارادت کا قلعہ پاش پاش ہوگیا۔ ایک چیز جو میں نے حاصل کی وہ تقریر کا ملکہ تھا۔ میرا حافظہ بھی شگفتہ ہوگیا اور میری زبان بھی منجھ کر صاف ہوگئی، ہر روز پڑھنا میرا معمول تھا اور مطالعہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو مقرر کے لیے سونے پر سہاگہ ہوتی ہے۔ جہاں جہاں اتحادِ ملت تھی وہاں وہاں میرا نام تھا، مجھے ہر جلسہ میں مدعو کیا جاتا۔ بعض جگہ ہنگامہ ہوتا بڑے بڑے رہنما لوگوں کی برہمی سے دل گرفتہ ہوکر تھک ہار جاتے لیکن میں ان معرکوں کو سر کرلیتا، یہ محض اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم تھا، احرار خطابت کے شہسوار تھے، اُن کے سامنے کسی کا چراغ شاذ ہی جلتا تھا اکثر شہروں میں ان کے جگر دار نوجوانوں نے اتحادِ ملت کے جلسوں کو درہم برہم کیا لیکن میں ایسے ہی جلسوں میں کامیاب رہا اور ہمیشہ مخالفانہ شور وشغب پر قابو پاتا رہا۔

میں نے شہید گنج کے مسئلہ میں اتحادِ ملت کے رہنماؤں سے مختلف انداز اختیار کیا۔ سکھوں کا جتنا قصور تھا وہ ڈھکا چھپا نہیں تھا، میں نے حکومت پر گرفت کی اور اسے مجرم گرداننا شروع کیا، ساتھ ہی ان مسلمان کاسہ لیسوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا جو حکومت کی خوشنودیِ مزاج کے تابع ملازمت کا کشکول اٹھا کر جاسوسی کی بھیک مانگتے تھے، ظاہر ہے کہ اس نکتہ چینی میں میرزا معراج الدین بھی آتے تھے، میاں فیروز الدین احمد جنہیں میرزا معراج الدین سے دوستانہ علاقہ تھا اکثر ان کی برہمی کا ذکر کرتے، انہی سے معلوم ہوا کہ میرزا صاحب مجھ سے بوجوہ ناراض ہیں، مثلاً :۔

۱۔ میں نے مولا بخش کو سیاسی طور پر پنپنے نہیں دیا۔

۲۔ میں نے یعسوب الحسن کی حمایت کی اور سی آئی ڈی کو رگیدنے میں اس کا ہاتھ بٹایا۔

۳۔ میں نے مبارک ساغر اور موہن لال کے مقدمے میں سرکاری راز افشا کرنے چاہے۔

۴۔میری زبان مسلمان پولیس افسروں پر نکتہ چینی کرتے وقت بے باک ہو جاتی ہے۔

میاں صاحب نے بتایا کہ میرزا صاحب میرے خلاف کوئی منصوبہ تیار کر رہے ہیں میں نے اس تہدید کو طاق پر رکھا اور لاہور سے انبالہ تک مختلف جلسوں میں میرزا کو ایسا رگڑا دیا کہ وہ اور برہم ہو گئے، لاہور میں ایک خیاط جلال دین بمبئی کلاتھ ہاؤس کے پہلو میں ٹیلرنگ کی دکان کرتے تھے، درزی ان کا تخلص ہو گیا تھا۔جانے کسی نے مشورہ دیا یا خود جی میں سما گئی، "نیرنگ" نام کا ایک روزنامہ نکالا، یہ روزنامہ مولانا ظفر علی خاں کے خلاف اور بظاہر احرار کی حمایت میں تھا، نیرنگ میں عموماً خلافِ واقعہ خبریں چھپتیں، ایک دن میرے خلاف بھی "نظمِ مرصع" آ گئی، رات کو پیسہ اخبار میں جلسہ تھا میں نے نیرنگ کا ذکر کرتے ہوئے جلال الدّین درزی پر ہلکا پھلکا تبصرہ کیا۔اس کے نوٹ ایک صاحب آغا عبدالرشید سب انسپکٹر سی آئی ڈی نے لیے تھے، آغا صاحب دوسری جنگِ عظیم کے دوران مرکزی پولیس میں سپرنٹنڈنٹ ہو گئے، خان بہادر کا خطاب ملا، ریٹائرڈ ہونے کے بعد راولپنڈی میں ضلع مسلم لیگ (کنونشن) کے صدر رہ گئے، انہوں نے میرزا صاحب کے ایماء پر میری تقریر میں یہ الفاظ ڈال دیئے کہ میں نے جلال الدین درزی کے متعلق تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "جاؤ اور اسے مار دو" میرزا صاحب نے جلال الدین کو بلا کر گٹ پٹ وغیرہ کی اور اس نے میرے خلاف پیسہ اخبار کے تھانے میں رپٹ لکھوا دی کہ اس تقریر کی بنا پر اُسے جان کا خطرہ ہے۔

میں دوسرے یا تیسرے روز گھر سے باہر نکلنے پر تہا رہا تھا کہ سفید کپڑوں میں ایک کنسٹیبل میرے پاس آیا اور کہا چودھری صاحب (تھانے دار) آپ کو یاد کرتے ہیں، میں نے کہا خیریت ہے؟ کہنے لگا بالکل کسی شعر کے معنی پر اختلاف ہو گیا ہے آپ سے مطلب پوچھنا چاہتے ہیں، میں اس کے ساتھ ہو گیا، وہاں پہنچا تو چشم براہ تھا، کرسی پیش کی، اس شعر کے معنی پوچھے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا!

مَیں نے مطلب بتایا، پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، کوئی آدھ گھنٹہ بعد چلنے لگا تو کہا
ذرا رُکیے میں اندر سے فون سن آؤں، لوٹا تو مُنہ بسور کے کہا :

"شورش صاحب، معاف کیجیے ابھی ابھی فون پر تکلیف دِہ حکم ملا ہے
کہ آپ کو گرفتار کر لوُں۔"

میرے لیے حیرانی کا باعث ضرور تھا لیکن تکلیف کا نہیں، بہر حال مَیں حوالات میں
بند ہو گیا، دن چڑھے مجھے دیوان پریم ناتھ کی عدالت میں پیش کیا گیا، ایک ہفتہ کا ریمانڈ لےکر
مجھے لاہور سنٹرل جیل بھجوا دیا۔

دیوان پریم ناتھ اُن برہمنوں میں سے تھا جو اپنے وطن کشمیر سے باہر آکر آباد ہوئے
تھے اور جن میں کشمیری ہونے کی عصبیت بہت گہری تھی۔ سر تیج بہادر سپرو سے قرابت
تھی، راجہ نریندر ناتھ کا بھانجہ تھا، شاعری کا بھی شوق تھا۔

"شورش کاشمیری؟"

کورٹ سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر "میاں اس لڑکے کو کیوں پکڑ لائے ہو؟"

"جناب ۳۰۲ کا مقدمہ ہے۔"

ہمارے وکیل نے کہا "جی نہیں اس کے ساتھ ۱۱ بھی ہے، الزام یہ لگایا گیا ہے
کہ اس نے اپنی تقریر میں ایک شخص جلال الدین درزی کے خلاف پبلک کو اُکسایا ہے۔"

مقدمہ شروع ہوا تو استغاثہ کے گواہوں نے حلف اٹھا کر اور جی بھر کر خوب
جھوٹ بولا، دیوان پریم ناتھ نے ایک دن موقع پا کر مجھ سے اصل واقعہ پوچھا، مَیں
نے سارا ماجرا کہہ ڈالا، انھیں صدمہ ہوا کہ ایک نوجوان اگر سی آئی ڈی کے ہتھے نہیں
چڑھتا تو اسے اس طرح ذلیل و خوار کیا جاتا ہے۔ مجھے تسلی دی کہ بے فکر رہو تمہارے

ساتھ انصاف ہوگا، مقدمہ میری عدالت میں ہے اور یہاں اب سی آئی ڈی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

آغا بیدار بخت ہر پیشی پر موجود ہوتے اور مجسٹریٹ کی مخفی ہدایت پر صفائی کا ڈھانچہ تیار کرتے، ابتداءً مسٹر کے اے حمید[1] پیش ہوتے رہے، آخری بحث خلیفہ شجاع الدین نے کی، دیوان صاحب نے فرد جرم میں ۳۰۲ توڑ کر ۳۲۴ یا ۳۲۳ کر دی اور مجھے دو ہزار کی ضمانت پر چھوڑ دیا، بالآخر مقدمہ تہس نہس ہو گیا، دیوان پریم ناتھ جو بیان لینا چاہتے تھے وہ گھر میں بلوا کر لکھوا دیا تھا۔

میرزا معراج الدین نے محسوس کیا کہ اس کا وار خالی جا رہا ہے تو میاں فیروز الدین کی معرفت کہلا بھیجا، ملنا چاہتے ہو تو مل لو، میرا مقصد سزا دلوانا نہیں، آئندہ احتیاط برتنے کا وعدہ کرو تو اس مقدمہ میں رہائی ہو سکتی ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا، بلکہ چند صلواتیں بھجوا دیں، جانے اُس تک پہنچیں یا نہیں؟ لیکن اس نے ڈپٹی کمشنر کو تحریک کرائی کہ اس مقدمہ میں سزا ضرور ہونی چاہیے۔ جس روز حکم تھا آغا عبدالرشید بھی موجود تھے، انہیں اصرار تھا کہ چھ ماہ قید ضرور ہو گی۔ دیوان صاحب ڈپٹی کمشنر کے پاس دو چار دفعہ گئے، آخری بار چار بجے کے قریب نکلے تو ان کے چہرے پر اعتماد اور مسرت کی جھلکیاں تھیں، مجھے عدالت میں طلب کیا اور کہا:

"میں نہیں چاہتا آپ تقریر کے جوش میں بہک جائیں اور پولیس آپ کو انتقام کا نشانہ بنا کر قانون شکنی کا عادی بنا دے، لہٰذا ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۵۶۲ کے تحت ایک سال کے لیے دو ہزار کی ضمانت داخل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔"

---

[1] غالباً یہی نام تھا۔

پولیس پر اوس پڑ گئی، سردار بھاگ سنگھ ڈی ایس پی تھوتھنی لٹکائے
واپس ہو گئے۔

شہید گنج کانفرنس

مولانا ظفر علی خاں شہید گنج کا قضیہ پنجاب سے باہر مسلمانوں کو سمجھانے کے لیے دورہ پر نکلے تو مجھے ساتھ لے گئے، کلکتہ تک تو میں ان کے ساتھ رہا، پھر لوٹ آیا، وہ کلکتہ سے رنگون چلے گئے وہاں تقریباً سارے برما کا دورہ کیا، دورہ ان کا بہت لمبا ہو گیا، کوئی دو ماہ وہاں رہے، ہم نوجوانوں نے اِدھر لاہور میں شہید گنج کانفرنس رچانے کا فیصلہ کر لیا، تمام لیڈر جو لاہور میں تھے کانفرنس منعقد کرنے کے خلاف تھے اور اس کی وجہ بھی معلوم تھی کہ سرکار سے ان کے مراسم تھے، جو اشارہ ہوتا اتحاد ملّت کی عاملہ کے ارکان وہی کرتے اس کے باوجود ہم کانفرنس کی تیاریوں میں لگے رہے، اور ہم نے ایک نقشہ بنا لیا۔

مولانا ظفر علی خاں برما کے دورے سے لوٹے تو ان سے ہم نے مجلس عاملہ کے بعض ارکان کی بے اتفاقی کا ذکر کیا۔ مولانا دماغاً ادیب قلباً شاعر تھے، ہر شخص انہیں اپنے ڈھب پر لا سکتا تھا، طبعاً جلسہ جلوس کے آدمی تھے، ہم نے کانفرنس کی زبردست تیاریوں کا ذکر کیا تو ہمنوا ہو گئے، ملک لال خاں میاں فیروز الدین اور ڈاکٹر عالم کو بلا کر کہہ دیا اور ان کا کہہ دینا ہی کافی تھا، وہ لوگ بہر حال ان کی شخصیت کے تابع تھے، مولانا اتحاد ملّت کے لیے رنگون سے دس ہزار روپے اکٹھا کر کے لائے تھے، ملک لال خاں جنرل سکرٹری نے وہ روپیہ ماضی کے قرض میں وضع کر لیا، ہم نے کانفرنس کے لیے روپیہ مانگا تو ٹکا سا جواب پایا، حساب کتاب کی اصلیت سے ہم کما حقہ واقف تھے۔ بہر حال ہم نے اپنے طور پر

روپیہ جمع کیا تو ایک دو روز میں خاصی رقم ہوگئی، کوئی چار ہزار کے لگ بھگ، ملک لال خان میاں فیروزالدین کو لے کر ہمارے پاس پہنچے، دونوں جہاندیدہ تھے، یعقوب ان کا شکار ہو گیا اور وہ ساری کی ساری رقم لے گئے، آخر مولانا ظفر علی خاں کو صدر استقبالیہ، ڈاکٹر عالم کو جنرل سکرٹری اور یعقوب کو سکرٹری بنایا گیا، مولانا حسرت موہانی کا نام کانفرنس کی صدارت کے لیے تجویز ہوا، میاں فیروزالدین ان کی منظوری لینے کے لیے کانپور گئے۔ میں ان کے ہمراہ تھا، ہائے کیا انسان تھے، حسرت اپنے کلیہ سے نکلے فیروزالدین کو فوراً پہچان لیا،

"آؤ میاں خیریت ہے کب آئے ہ"

"حضرت آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"

آؤ سامنے مسجد میں چلتے ہیں، ساتھ لے کر مسجد میں چلے گئے، حجرے میں بٹھایا، فرمایا ابھی آتا ہوں، تھوڑی دیر میں ایک چنگیر لے کر آگئے۔

"پہلے کھانا کھا لو، میاں"

"حضرت تکلیف فرمائی آپ نے"

"نہیں میاں! دوپہر ہوگئی کھانے کا وقت ہے مجھے بھی کھانا ہے، اکٹھے کھا لیتے ہیں"

رومال ہٹایا۔ توے کی چھ روٹیاں ہونگی، ایک کٹورہ میں مسور کی دال، دوسرے میں آلو گوشت —— مٹی کا لوٹا پانی سے بھر لیا،

"بسم اللہ کرو میاں"

یہ تھا رئیس المتغزلین اور رئیس احرار کا دستر خوان، فقر و استغنا کا مجسمہ، حسرت واقعی اپنے دور کا ابوذر غفاری تھا۔

میاں فیروزالدین نے مقصد بیان کیا،

کہنے لگے "میاں! مجھے کانٹوں میں کہاں گھسیٹتے ہو، پھر بعض بڑی بڑی مصروفیتوں کا ذکر کیا ــــ اور انکار کر دیا، ان سے مایوس ہو کر دہلی پہنچے۔ وہاں مولانا شوکت علی مل گئے، میاں فیروز الدین ان کے فدائی اور وہ میاں فیروز دین کے شیدائی تھے، مولانا ظفر علی خاں سے فون پر منظوری لیکر مولانا شوکت علی کو صدارت کیلیے آمادہ کر لیا،

کانفرنس شروع ہونے سے دو روز پہلے مجھے آغا عبد الرشید سب انسپکٹر سی آئی ڈی سر راہ مل گئے، آغا صاحب دیوان برہم ناتھ کے مقدمہ میں سرکاری رپورٹر کی حیثیت سے پیش ہوتے اور تب سے واقف تھے۔ لاہور کے تمام جلسوں کی رُوداد شارٹ ہینڈ میں وہی قلمبند کرتے، کہنے لگے آؤ کسی ہوٹل میں چائے پیتے ہیں، مَیں نے پس و پیش کیا، مَیں سمجھتا تھا کہ سی آئی ڈی اور سیاسی نوجوان ہمیشہ ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں، آغا صاحب نے کہا:
"گھبراؤ نہیں، میں انسان ہوں"

مَیں نے انکار کیا، کہنے لگے "تمہیں اپنی ذات پر اعتماد نہیں؟ فلاں فلاں لیڈر سے میرے مراسم ہیں، فلاں فلاں رہنما میرے گھر آتے ہیں، اکثر سیاسی کارکن مجھ سے ملتے اور میرے ساتھ چائے پیتے ہیں، تمہیں کس کا ڈر ہے؟ مَیں تمہیں ایک خطرے سے نکالنا چاہتا ہوں، مسلمان ہوں، نہیں چاہتا کہ تم لوگ اپنی زندگی ضائع کرو، جن لوگوں کو فرشتے سمجھ رہے ہو، فرشتے نہیں، ابلیس ہیں، مَیں نے تھوڑا توقف کیا پھر ان کے ساتھ چائے پینے دہلی مسلم ہوٹل میں چلا گیا ــــ آغا صاحب نے کہا:

"مَیں تمہیں نوجوان ساتھیوں میں سب سے زیادہ مخلص سمجھتا ہوں، میرا ضمیر چاہتا ہے تمہیں خطرے سے روکوں اور اصل حالات بتاؤں، تمہارے خلاف سی آئی ڈی کے دفتر میں شکایتوں کا ایک انبار پڑا ہے، خود تمہارے لیڈر کہہ رہے ہیں کہ نوجوان نہیں مانتے، انہیں سمجھانا مشکل ہو گیا ہے، یقین کرو اگر تم نے ضد جاری رکھی تو سب سے زیادہ

نقصان نہیں ہوگا، ایک طویل عرصے کے لیے جیل چلے جاؤگے اور فائدہ یا نتیجہ کچھ نہ ہوگا۔"

مَیں نے آغا صاحب کی بات کاٹتے ہوتے کہا" آپ مجھے پھسلانا، ڈراتا یا دھمکانا چاہتے ہیں؟"

آغا صاحب نے بیگ کھولا، کاغذوں کا ایک پلندا نکالا اور کہا:

" یہ ہیں وہ قرار دادیں جو ہمارے سپرنٹنڈنٹ میرزا معراج الدین نے تیار کی ہیں، یہی کانفرنس میں پیش ہوں گی۔ اردو ترجمہ کے فلاں لفظ پر حکومت کو اعتراض ہے وہ اس لفظ کی جگہ دوسرا لفظ چاہتی ہے۔"

اس لفظ پر سرخ پنسل سے گول دائرہ بنا ہوا اور حاشیہ پر نیلی پنسل سے متبادل لفظ لکھا ہوا تھا ———

میں حیران رہ گیا، آغا صاحب نے مزید کہا:

" اس سودا بازی میں فلاں لیڈر نے کانفرنس کے لیے دو ہزار روپے لیے ہیں، مَیں یہ ترمیمی مسودہ لے کر اسی کے پاس جا رہا ہوں، کیونکہ حکومت اردو اخباروں میں ترجمہ کے الفاظ اپنی منشا کے مطابق رکھنا چاہتی ہے۔"

یہ سب باتیں میرے لیے اچنبھا تھیں اور پُراسرار بھی، میں گہری سوچ میں ڈوب گیا، آغا صاحب نے رخصت ہونے سے پہلے کہا:

" ڈاکٹر عالم اس قرارداد کو پیش کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے میرا ذکر نہ کرنا، مَیں نے تمہیں مخلص سمجھ کر بتا دیا ہے۔ ان لیڈروں سے بچو، سب بے ایمان ہیں، کسی کے سامنے شہید گنج کے مسئلے کا حل نہیں۔ ان کے سامنے صرف الیکشن ہے۔"

دو روز سخت پریشان رہا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اُدھر کانفرنس کی تیاریاں

زور وشور سے جاری تھیں، موچی دروازہ کے باغ سے لے کر اکبری دروازہ کے باغ تک دونوں طرف بڑے بڑے کیمپ لگائے گئے، پنڈال اتنا خوبصورت بنایا گیا جیسے دربار لگا ہو، رنگون تک کے لوگ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ایک بڑا جلوس نکالا گیا۔ سارا لاہور دلہن کی طرح سجا ہوا تھا، مولانا شوکت علی نے خود فرمایا کہ تحریکِ خلافت کے بعد اتنا عظیم الشان جلوس شاید ہی نکلا ہو۔

ہم سب کے خیمے الگ الگ تھے، میں پبلسٹی کے شعبہ کا انچارج تھا، مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے رہنما جان چکے تھے کہ نوجوانوں کے ارادے گرم ہیں، اور وہ سول نافرمانی کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں، اجلاس سے پہلے بعض رہنما مولانا ظفر علی خاں کو ساتھ لے کر ہمارے پاس آئے، سب نے ہمیں شیشہ میں اُتارنا چاہا، میاں فیروز الدین نے کہا میں ابھی ابھی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی سے مل کر آرہا ہوں، کانفرنس نے سول نافرمانی کا فیصلہ کیا تو راتوں رات ہم سب جیل چلے جائیں گے، تین سو کے وارنٹ کٹ چکے ہیں۔

ملک لال خاں نے کہا، بس گرفتاری کا مرحلہ بیچ میں ہے۔

مولانا اختر علی خاں بولے:

"قیامت سر پر کھڑی ہے، مولانا ظفر علی خان اِس کبرسنی میں قید ہو جائیں، زمیندار بند کر دیا جائے، دفتر میں تالا لگا ہو اور آپ چاہتے ہیں، مولانا کی اولاد وزیر آباد میں کوٹے بیچے؟

ڈاکٹر عالم نے کہا:

"پناہ نہیں ملے گی پناہ، عجب نہیں مارشل لا ہی لگ جائے" مجھے غصہ آگیا میں نے ان سے کہا:

"آپ دستبردار ہو جائیں اور اعلان کر دیں کہ ہمارا تحریک سے کوئی تعلق نہیں، لیکن جس تحریک کو آپ نے خدا اور رسولؐ کے نام پر پیدا کیا،

اس سے دغا نہ کریں ـــــ آپ کو اگر قید کا خوف ہے تو پہلے سوچا ہوتا،
شہیدوں کے خون کو اس خوف کی نذر نہ کریں جو لوگ شہید ہو گئے وہ بھی
تو کسی کے لختِ جگر تھے، انہیں موت کے گھاٹ اِس دن کے لیے اُتروایا
تھا؟ ـــــ یہ اُن سے غداری ہو گی ـــــ'

مَیں نے مولانا ظفر علی خان سے کہا " نوجوان مجھے اجلاس میں اپنے لہو سے دستخط کر کے آپ کو دے رہے ہیں کہ ہماری جانیں شہید گنج کے لیے حاضر ہیں، آپ ان حضرات کے جھانسے میں نہ آئیں یہ لوگ آپ کو ختم کرنا چاہتے ہیں، مولانا ماتھے پر تیوری ڈال کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بات کسی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

رات کھلے اجلاس میں ڈاکٹر عالم نے قرارداد پیش کی، حاضرین سکتے میں آ گئے کہ اب شہید گنج کا حصُول فی الجملہ الیکشن پر موقوف ہو گیا ہے۔

میاں فیروز الدّین نے ہوشیاری کی کہ کانفرنس پر ٹکٹ لگا دیا، عوام کے جذبہ و جوش کا یہ حال تھا کہ پچاس ہزار افراد ٹکٹ خرید کر جمع ہو گئے جس سے بیس پچیس ہزار روپے بھی اکٹھے ہو گئے۔

ڈاکٹر عالم نے خطابت کی مینا کاری کے بڑے جوہر دکھائے لیکن عوام برگشتہ ہو چکے تھے، یعقوب نے مولانا شوکت علی سے اجازت لے کر ڈاکٹر عالم کے خلاف ڈٹ کے تقریر کی، لوگ جوش میں آ گئے، یعقوب نے کہا:

"ڈاکٹر عالم نوجوانوں کے مقدّس لہو کو اپنی انتخابی مہم پر قربان کرنا چاہتے ہیں، شہید گنج کی شکستہ اینٹوں کے ووٹ بنائے جا رہے ہیں، ایسا کبھی نہ ہو گا، ہماری لاشوں سے گزر کر ہی انتخابی چوگان کھیلی جا سکتی ہے"

یعقوب کے بعد مَیں کھڑا ہوا، اب مجمع کے جوش و خروش کو سنبھالنا اور بھی مشکل ہو گیا، اشتعال کا یہ عالم تھا کہ عوام لیڈروں پر حملہ کرنے کے موڈ میں آ گئے، ڈاکٹر عالم کے چہرے

پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ——— مولانا ظفر علی خاں فوراً اسٹیج پر آ گئے، انہوں نے بڑے دھیمے انداز میں تقریر شروع کی، ان کا لہجہ ادبی، مغز سیاسی اور مزاج اسلامی تھا، اُس روز وہ خطابت کی معراج پر تھے، انہوں نے لوگوں کے جوش و غضب کو ٹھنڈا کیا، اس دوران میں ملک لال خان اور ڈاکٹر عالم نے چند پیشہ ور رضاکاروں کی مٹھیاں گرم کر دیں انہوں نے ہمارے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا ——— مولانا ظفر علی خاں نے مندوبین سے قرارداد پاس کرائی اور کانفرنس کا اجلاس شور و غل ہی میں اگلے روز پر ملتوی ہو گیا۔

ہم نے راتوں رات کیمپوں سے رضاکاروں کے سالار جمع کیے اور لیڈروں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا، ہمارا ارادہ تھا کہ سارے پنڈال کو آگ لگا دیں، اس غرض سے معتمد رضاکاروں کی ڈیوٹی لگا دی لیکن ایک ساتھی نے جا کر مولانا ظفر علی خاں کو بتا دیا اور وہ فوراً ہی میاں فیروزالدین وغیرہ کو لے کر آ گئے، جس سے سارا پلان ہی غارت ہو گیا۔

ذہنی کش مکش

مَیں اس وقت بیس سال کا ہو چکا تھا اور اکیسویں سال میں جا رہا تھا، ان تجربات سے میرا دل ٹوٹ گیا، مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام کے نام پر بہت سے فریب دیئے جاتے ہیں، اور جو چندہ اکٹھا کیا جاتا اس کا بڑا حصّہ لیڈر یا ان کے حاشیہ نشین کھا جاتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں میں انسانی کمزوریاں ضرور تھیں لیکن اس کے باوجود میرا دل ان کے لیے شیشہ تھا البتہ جو لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے، مَیں انہیں شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، گو میری قوتِ فیصلہ ابھی کمزور تھی لیکن میں شہید گنج کے متعلق مختلف انداز میں سوچنے لگا۔ —— کیا مسجد کے انہدام کا درد ہم رندانِ تہی کیسہ ہی کے لیے ہے؟ جو لوگ مسجدوں کی روٹیاں توڑتے ہیں وہ کہاں ہیں آخر اُن علماء کی جماعت کدھر ہے جو منبر و محراب کے وارث ہیں؟ کیا اُن پیشوایانِ مذہب کی زبانوں کو لونی لگ گئی ہے جن کے نزدیک عوام کالانعام نہیں اور انہیں مذہبی مسائل میں گفتگو کرنے کا حق ہی نہیں، سب سے بڑا صدمہ جس سے میرا دماغ ہل گیا تھا وہ شہید گنج کے نام پر الیکشن کا سٹنٹ تھا۔

مَیں ذہنی طور پر "مستعفی" ہو کر گھر میں بیٹھ گیا، ایک روز مولانا ظفر علی خاں تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ دفتر زمیندار میں لے گئے، پند و نصائح کا ایک دفتر کھول دیا۔ فرمایا، ابھی بچے ہو اور یہ نشیب و فراز کی دنیا ہے، جوش کے ساتھ ہوش نہ ہو تو معاملات سنورتے نہیں، بگڑتے ہیں، سر فضل حسین کا بھی یہی خیال ہے کہ حالات ناموافق ہیں فی الحال

تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ مسٹر بنیٹ انسپکٹر جنرل پولیس کا ذکر کیا کہ وہ تمہاری تند و تیز تقریروں سے سخت خفا ہے میں نے عرض کی "بنیٹ ہمارے لیے کوئی حجت نہیں کہنے لگے ٹھیک ہے لیکن چند نوجوان تو اس مہم کو سر نہیں کر سکتے، ہوا کو مٹھی میں تھامنا مشکل ہے"
اتحادِ ملّت کے جلسوں کا نزلہ احرار پر گرتا، جو اٹھتا احرار کو رگیدتا کہ ان کی وجہ سے شہید گنج ڈھے گئی ہے، مولانا اسحاق مانسہروی نے وزیر آباد کے ایک جلسۂ عام میں یہاں تک کہہ دیا کہ شیطان سے اتحاد ہو سکتا ہے احرار سے نہیں، ہم خود نادانی کی اس لہر میں بہ رہے تھے لیکن دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا کہ احرار کی وجہ سے تحریک رہ گئی ہے تو انہیں گالی دینے کا مطلب کیا ہے؟ طاقت ان کی ہے تو ان سے رابطہ پیدا کرنا چاہیے نہ کہ ان پر سبّ و شتم کیا جائے اور انہیں مجرم ٹھیرایا جائے، میں اس شیوہ بیانی کے فہم سے قاصر تھا کہ مسلمانوں کی ہر کامیابی سرکاری مسلمانوں کی مرہون ہے اور ان کی ہر ناکامی کے ذمہ دار احرار ہیں، تمام ملک میں احرار کے خلاف گالی گفتار اور ہجو و طعن کا بازار گرم تھا، آخر کار احرار مدافعت پر اُتر آئے، انہیں اپنی کھیتی کے ویران ہونے کا سخت ملال تھا لیکن جس ٹھسے کی گالیاں احرار کو اتحادِ ملّت کے خطیب دے رہے تھے اس کی مثال نہ تھی۔

ایک چیز جس سے مجھے ہر حالت میں نفرت رہی وہ فرقہ وار فسادات تھے، میں اُن لوگوں میں رہا جن کا یہ خیال ہمیشہ پختہ سے پختہ ہوتا گیا کہ فرقہ وار فسادات برعظیم کے دل کا ناسور اور ہندوستانی قوم کے دماغ کا سرطان ہیں، یہ بات میرے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ میں آتی رہی کہ ان فسادات کا مطلع حکومت اٹھاتی ہے اور یہی اُس کے مفاد میں ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیں لڑتی رہیں، آغاز میں حکومت نے مصرع طرح دیا، پھر ہندوستانی قوموں نے غزل اور دوغزلہ کہنا شروع کیا، شہید گنج کے دنوں میں بھی فسادات ہوتے رہے، لیکن ان دنوں ایک بڑا فساد محلہ ستیاں بھاٹی دروازہ سے شروع ہوا اور

سارے شہر میں پھیل گیا۔

۱۹۳۶ء کے رمضان کا ذکر ہے، مَیں سحری کھا کے حسب معمول داتا گنج بخش کے مزار پہ چلا گیا، وہاں فجر کی نماز پڑھی، لوٹ رہا تھا کہ راستہ میں چند نوجوانوں نے گھیر لیا، کہنے لگے وہ سامنے گندے نالے کے پار محلّہ سمیاں میں سکھوں نے فساد برپا کر رکھا ہے، وہاں گوردوارہ ہے اس میں وہ جوق در جوق جمع ہو رہے ہیں، مَیں نے عذر کیا، نوجوان بگڑ گئے، کیونکہ مسلمانوں کا بگڑنا اور منّا بے اعتبار سا ہے، سید عنایت شاہ کو فون کیا، کہنے لگے سیدھے دفتر چلے آؤ، فساد میں جانا حماقت ہو گی، اتنے میں کچھ اور نوجوان آ گئے ——— "شورش صاحب! ہمارے ساتھ چلیے، موقعہ دیکھیے، سکھوں کے ٹڈی دل جمع ہو رہے ہیں، مسلمانوں کا محلہ ہے، سب کی آبرو اور جان خطرے میں ہے، طوعاً یا کرہاً محلہ سمیاں پہنچا، گوردوارے کے باہر پولیس کا مجمع تھا، ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس دونوں موجود تھے، مَیں نے ڈپٹی کمشنر سے رجوع کیا وہ مجھے گوردوارے میں لے گیا، گوردوارہ اینٹوں اور روڑوں سے اٹا پڑا تھا گرنتھی نے بیان دیا کہ مسلمان رات بھر اپنے مکانوں سے خشت باری کرتے رہے ہیں، اب جو یہ چالیس پچاس سکھ آتے ہیں تو گوردوارے کی حفاظت کے لیے آتے ہیں۔

مسلمانوں سے پوچھا تو کہنے لگے اینٹوں اور روڑوں کا انبار انہوں نے خود لگایا ہے تاکہ مسلمان مجرم ثابت ہوں۔ ابھی آپس میں گفتگو ہو رہی تھی کہ گندے نالے کے اُس پار باغ کی روش پہ غل غپاڑہ ہونے لگا، سکھوں کا ہجوم کرپانیں سونتتے چلا آ رہا تھا، آن واحد میں سکھ باغ کی روش اور مسلمان نہر کی پٹری پہ اکٹھے ہو گئے، نعرہ بازی ہونے لگی، مسلمان مقابلۃً بہت زیادہ تھے، ان کے نعروں کا زور بھی زیادہ تھا، اس طوفان کے درمیان پولیس نے صف بندی کی، مسلمان غیر مسلح اور ہزارہا، سکھ سو سوا سو، لیکن مسلح! ڈپٹی کمشنر نے مسلمانوں کو مشتعل پایا تو چڑ گیا، اتنے میں میاں فیروزالدین احمد، حاجی غلام جیلانی اور حافظ معراج دین بھی آ گئے، میاں صاحب نے قضیہ سلجھانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود، مسلمانوں کو اصرار

تھا کہ سکھ واپس چلے جائیں، سکھ کہتے تھے گوردوارے میں جانا ہمارا حق ہے ۔ گھنٹہ بھر کھینچا تانی رہی ۔ بالآخر ڈپٹی کمشنر اڑ گیا کہ سکھوں کو گوردوارے سے روکنا ان کے دھرم میں مداخلت ہے ۔ ان کے جتھے کا سردار ایک ایسا نوجوان تھا جو میرے ساتھ بال بھارت سبھا میں رہا تھا میں نے ہاتھ باندھے اور اس سے کہا خدا کے لیے چلے جاؤ، نہ مانا، جب فضا مخدوش ہوگئی اور میرا اصرار بڑھا تو وہ راضی ہوگیا، جانے ڈپٹی کمشنر کے ذہن میں کیا سمائی کہ اس نے بندوقوں کے رُخ مسلمانوں کی طرف پھیر دیئے، مسلمانوں کا پارہ تیز ہوگیا، میں نے ڈپٹی کمشنر سے کہا آپ نے یہ کیا کیا ؟ کوئی جواب نہ دیا بلکہ لوٹتے ہوئے سکھوں کو روک لیا، میں نے کہا اس طرح فساد ہوجائے گا ؟ جواب دیا" ہوجائے، کوئی پرواہ نہیں" سکھ بھی شیر ہوگئے، میں اُس وقت بیچ میں کھڑا تھا، ایک سکھ نے کرپان لہرا کر سب سے پہلے میرا سر اڑانا چاہا لیکن ایک دوسرے سکھ نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور کہا کہ اس طرح قتل کرنا سکھی دھرم نہیں، سکھوں نے کرپانیں لہرائیں، مسلمانوں نے پتھراؤ کیا، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، جب مسلمان نہیں مانتے تھے تو سکھ کیا مانتے ! ڈپٹی کمشنر نے سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہا ——

گولی چلا دو ۔ سپرنٹنڈنٹ نے اتفاق نہ کیا، لاٹھی چارج کیا جس سے مجمع اِدھر اُدھر ہوگیا، پلمپ نے پرتاپ سے کہا " بہتر یہی ہے کہ سکھوں کے ہجوم کو واپس کر دیا جائے، ہم ان کے ساتھ حفاظتی پولیس کر دیتے ہیں ۔

—— پرتاپ بھی مان گیا لیکن فساد کا لاوا بہنا چاہتا تھا، بہ کے رہا ۔ ٹکسالی کے باہر دو سکھ ہلاک کر دیئے گئے، مسلمانوں کے ایک ہجوم نے سرکلر روڈ سے موچی دروازہ کا رُخ کیا، راستہ میں ملاپ کا دفتر تھا اس پر سنگباری کی، لوہاری اور شاہ عالمی کے درمیان ایک آدھ دکان لوٹ لی، شاہ عالمی کے باہر طرفین میں مڈبھیڑ ہوگئی ۔ خالص ہندو علاقہ تھا، ایک نوجوان نے مسجد شہید کے پہلو میں واقع مندر کی مورتیاں توڑنے کے لیے اندر گھسنا چاہا تو مندر کا نوکدار جنگلہ اس کے پیٹ میں کھُب گیا، آنتیں باہر آگئیں اور وہ بیچارا وہیں واصل

بحق ہوگیا، اتنے میں بیلی شاہ تیل والا اپنے سورماؤں کو لے کر آگیا، خوب پتھراؤ ہُوا، آدھ گھنٹہ آمنے سامنے لڑائی ہوتی رہی، جب اشوں کی اینٹیں ختم ہوگئیں تو مسلمانوں نے پیش قدمی کی، دست بدست لڑائی ہونے لگی، آخر بیلی شاہ کی فوج بھاگ گئی لیکن اپنے پیچھے ایک آدھ سر چھوڑ گئی ـــــ فساد ہو رہا تھا کہ ناگہاں میاں فیروزالدین احمد آگئے، مجھے ساتھ لیا، موچی دروازے پہنچے، بلمپ سپرنٹنڈنٹ پولیس باغ کے نکڑ پر کھڑا تھا، میاں صاحب نے اس سے کہا "شاہ عالمی کے باہر سخت فساد ہو رہا ہے"، کہنے لگے "کون مار رہا ہے"؟ میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا:

"مسلمان"

مُسکرایا، "تو اچھا تھوڑی دیر اور مار لینے دو۔"

میں ششدر رہ گیا، اُدھر باغ میں مولانا عبدالقادر قصوری کے چھوٹے بھائی مولانا عبداللہ قصوری لوگوں کو سمجھا رہے تھے کہ فساد منشائے ایزدی کے خلاف ہے، لیکن کوئی شخص اُن سے یہ سننے کو تیار نہ تھا۔

ہر طرف طیش اور اشتعال پھیلا ہُوا تھا، جانبین جی بھر کے لڑ چکے تو ڈپٹی کمشنر نے دفعہ ۱۴۴ کے ساتھ کرفیو لگا دیا اور حکم دیا کہ جہاں پانچ سے زیادہ کا مجمع ہوگا گولی مار دی جائے گی۔
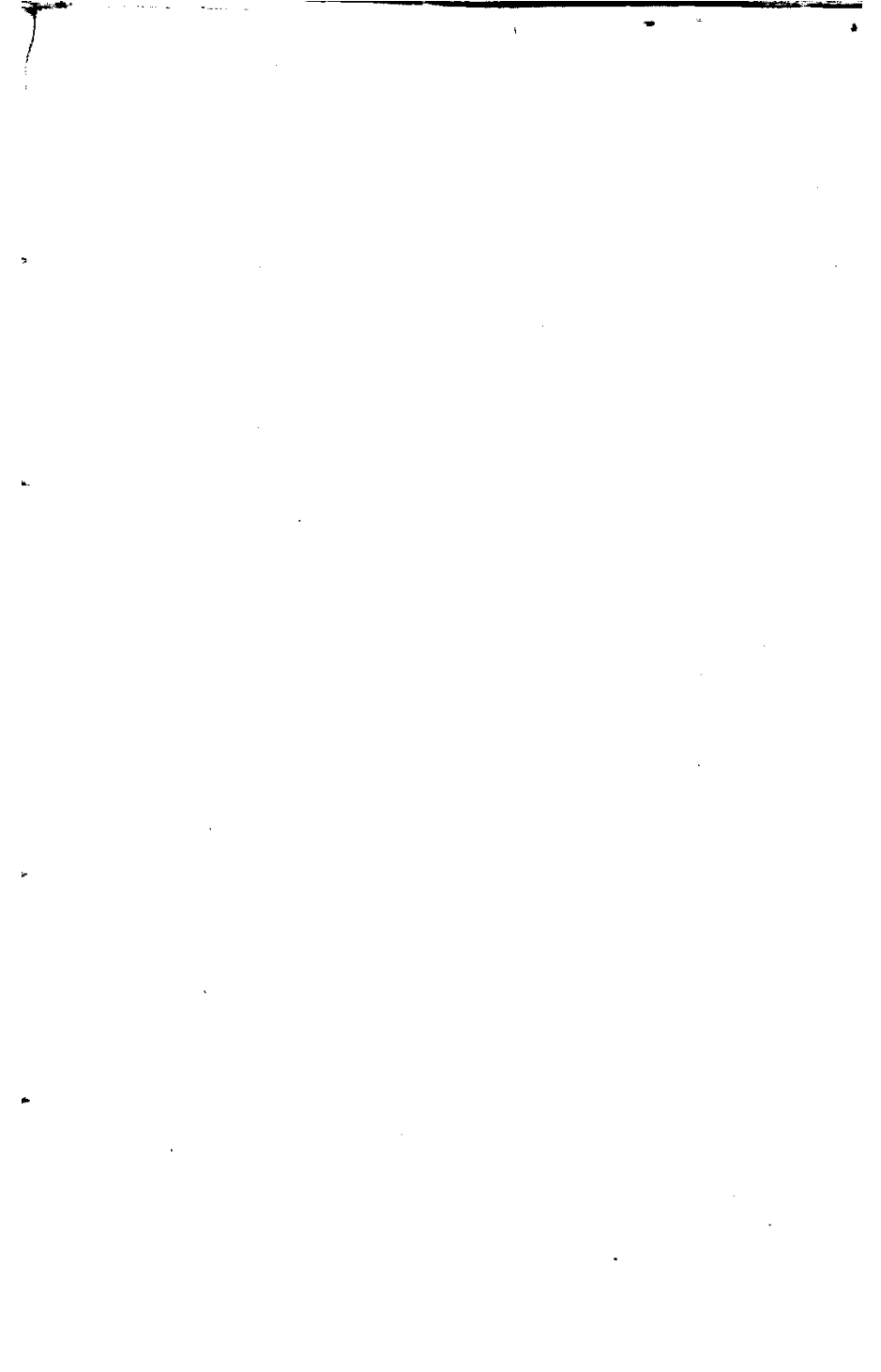
۱۹۳۷ء کے انتخابات

صُوبجاتی خود مختاری کے انتخابات سیاسۃً بڑے ہی پہلُودار تھے، یہ پہلا موقع تھا
کہ ہندوستانی صوبے برطانوی حکومت کے تابع آزادی کی پہلی قسط کا پہلا تجربہ کر رہے تھے،
کانگرس اور لیگ دونوں نے انتخابات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا، انگریز نہیں چاہتے
تھے کہ مسلمان اکثریّت کے صوبوں میں کانگرس یا لیگ کو طاقت حاصل ہو، انہوں نے مسلمان
صُوبوں میں اپنی چھاپ کی شخصیتیں اور اپنے مفاد کی جماعتیں کھڑی کی ہوئی تھیں، لیکن سرحد
سرخپوشوں کی بے پناہ قربانی کے باعث سرکاری تصرّفات سے نکل چکا تھا، بلوچستان خود
مختاری سے محروم تھا، سندھ اپنے ہی مزاج کا ایک صوبہ تھا، جس کا پالیٹکس کبھی عوام کے
تابع نہیں رہا، بنگال میں یورپین ممبروں کو وزارت سازی کا توازن حاصل تھا اور مسلمانوں
کے بعض بڑے رہنما حکومت کے اثر میں تھے ان میں کئی ایک خانہ زاد بھی تھے، ہندوستان
میں عسکری اعتبار سے برطانیہ کی اصل طاقت پنجاب کا صوبہ تھا، اور وہ کسی قیمت پر بھی
اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا، ہندوستان میں انگریزی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے میں پنجاب
نے خود سپردگی کا ایک ایسا نقش جما یا تھا کہ برطانوی امپیریلزم کے لیے پنجاب ریڑھ کی
ہڈی ہو گیا، اس صوبہ نے وفاداری کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے، پہلی جنگِ عظیم
میں برطانوی حکومت کے ہندوستانی فرزند اسی مٹی سے اٹھے، یورپ کے میدانوں اور عثمانی
ملکوں میں پنجاب کے روایتی مسلمانوں نے اپنا لوہا منوایا، دوسری جنگِ عظیم میں بھی پنجابی

فوج پیش پیش رہی، لیکن جونہی پنجاب کی فوج سے شاہنواز، سہگل اور ڈھلوں نکلے اور آزاد ہند فوج کی تشکیل ہوئی تو انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان میں ان کے قیام کا آخری ستون ٹوٹ گیا ہے اور اب وہ اس سے کوئی سی فوج بنا نہیں سکتے، نتیجۃً وہ ہندوستان کو چھوڑ کر چلے گئے۔

صوبجاتی خود مختاری، اختیارات کی منتقلی کا ایک مسمریزم تھا لیکن انگریز نہیں چاہتے تھے کہ پنجاب میں ان لوگوں کا اثر ہو جو برطانوی ملوکیت کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور ان کی شہ رگ پر ہاتھ رکھ سکتے ہیں۔

تمام ہندوستان میں دو قومی مسئلہ تھا ——— ہندو اور مسلمان، لیکن پنجاب میں تین قومی مسئلہ تھا، ہندو، سکھ اور مسلمان ——— ہندو، کانگرسی ذہن کی گرفت میں تھے سکھ اپنے حقوق میں سخت قسم کے فرقہ پرست اور اپنے مقاصد و مصالح کے لیے اکٹھے ہو کر قربانی دے سکتے تھے، البتہ مسلمانوں کا معاملہ دگر گوں تھا۔

ہندوستان کی قومی جدوجہد اور سیاسی تگ و دو میں پنجاب کی انقلابی چھاپ بڑی نمایاں تھی، کیونکہ اہم سیاسی فیصلے لاہور ہی میں ہوتے تھے، گاندھی، محمد علی جوہر، ابو الکلام، نہرو، جناح، سبھاش کے ہم پایہ لیڈر پنجاب کبھی پیدا نہ کر سکا، کوئی رہنما اٹھا تو بوجوہ پیچھے رہ گیا، مسلمانوں میں آزادی کی اجتماعی لہر بہ التزام رکی ہوتی تھی، برطانوی استعمار کے خلاف پنجاب سے کوئی تنظیم یا جماعت اٹھتی تو مسلمانوں کے سرکاری گروہ اسے تہس نہس کر دیتے، ہندو بھی نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں کوئی استعمار دشمن تنظیم طاقتور ہو، سکھوں کا مفاد بھی اسی میں تھا، انگریزوں کا آخری وقت تک یہی شعار رہا، مسلمانوں کے جن کاسہ لیس خاندانوں کا پنجاب کے عوام کی اکثریت پر سیاستہً قبضہ تھا وہ سرکار کی خوشنودی اور اپنی بقا کے لیے مسلمانوں کے استعمار دشمن عناصر کی بیخ کنی یا رسوائی کا سر و سامان اٹھانا اپنا فرض سمجھتے تھے، مغربی پنجاب کے اضلاع برطانوی حکومت کی عسکری کان تھے، ادھر مسلمانوں

میں پیر پرستی راسخ کی گئی۔ اُدھر تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ کی ملوکانہ تفسیر مسلمان عوام کے دماغ پر نقش کی گئی، تقدیر کا ظالمانہ تصور اُن کے دلوں میں بیٹھ گیا، ان کی معیشت جاگیرداروں کو دے دی گئی، جاگیرداروں میں عوام سے بالا ہونے کا گھمنڈ پیدا کیا، انہیں اور ان کے ٹکے بندھوں کو فوج اور پولیس میں بھرتی کر کے ترغیب و تحریص کے دام میں پھانسا، اپنوں پر ظلم کرنا سکھایا، میں خود پنجابی ہوں اور مجھے اپنے پنجابی ہونے پر فخر ہے، لیکن مجھے اس کے تصور ہی سے شرم آتی ہے کہ انگریزوں کو اپنے استعمار کی خدمت گزاری اور اپنے موقف کی وفاداری کے لیے بہترین سپاہی اور بدترین جاسوس پنجاب ہی سے ملے، حتیٰ کہ مسلمانوں کی وحدت کو تاراج کرنے کے لیے میرزا غلام احمد کو بھی اسی مٹی سے اٹھایا گیا، میرزا نے محمد عربی کی اُمت میں نقب لگا کر ایک استعماری اُمت پیدا کی، اس اُمت نے دنیائے اسلام میں انگریزوں کے لیے جاسوسی کے برگ و بار پیدا کیے، اور ان پر فخر کیا بغرض مسلمانوں کے ہاں پوری تاریخ میں قادیانی اُمت ہی واحد جماعت ہے جس نے انگریزوں کی غلامی کا جواز پیدا کیا اور اُس کی خاطر اتنے شرمناک کارنامے انجام دیئے کہ اس عظیم غداری کی مثال نہیں ملتی ہے ——

میرزا بشیر الدین محمود احمد نے اپنے زمانۂ خلافت میں سیاسیات میں وہی حیثیت اختیار کرنی چاہی جو ہندوستان کے اسلامی پالیٹکس میں آغا خان کی رہی، لیکن مسلمانوں کے ہمہ گیر تعاقب نے اس کو پنپنے نہ دیا، آغا خان بہر حال مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی جماعت کو مسلمانوں سے نہ الگ کیا اور نہ الگ کرنا چاہا، میرزا بشیر الدین محمود احمد مسلمانوں میں سیاسی طور پر رہنا چاہتے لیکن مذہبًا ان سے الگ ہو گئے تھے، انہوں نے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور اس طرح اپنے پیروؤں میں مسلمانوں سے غداری کی بنا رکھی، حقیقت یہ ہے کہ میرزا بشیر الدین محمود احمد اسلام میں کرنل لارنس اور معاشرہ میں راسپوٹین کی حیثیت رکھتے تھے، اگر ان کے پیروؤں کی تعداد سکھوں جتنی ہو جاتی تو وہ مسلمانوں سے اُسی طرح الگ ہو جاتے جس طرح

سکھ حقوق کے مسئلہ میں ہندوؤں سے الگ تھے۔

غرض پنجاب کے مسلمان استعمار کے اِس حصار میں گھرے ہوئے تھے وہ ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف تھے ہی کہ ان دونوں قوموں نے عملاً ان کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کر رکھا تھا لیکن انگریزی حکومت سے نبرد آزما مسلمانوں کی رسوائی اور پٹائی بھی ان کے ہاتھوں ہوتی رہی، نتیجہ معلوم کہ پنجاب کا مسلمان اپنی بے نظیر شجاعت کو مسلمانوں کی اجتماعی بہبود میں صرف کرنے سے محروم رہا۔

اس پس منظر میں صوبائی خود مختاری کے ثمرات نہ تو انگریز ان لوگوں کے حوالے کرنے پر آمادہ تھا جو اُن کے آزمودہ کار یا وفادار نہیں تھے اور نہ وہ لوگ ہی گوارا کر سکتے تھے جو سمجھتے تھے کہ پنجاب ان کی جاگیر ہے۔

تمام سرکاری مسلمان یونی نسٹ پارٹی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے، مسلم لیگ کو اس وقت شہری عوام کے سوا اور کہیں رسوخ حاصل نہ تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے بانی سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے ممبری کی میعاد پوری کر کے لاہور آ گئے، وہ ملکی سیاست میں قائد اعظم کے حریف تھے اور صوبہ کو اپنی سیاست و قیادت میں رکھنا چاہتے تھے جہاں تک ان کی ذہانت، تجربے، قابلیت، سوجھ بوجھ اور فہم و ذکا کا تعلق تھا وہ مسلمانوں کے چند بڑے آدمیوں میں سے تھے۔

ان کا سیاسی آغاز صوبہ کانگرس کی صدارت سے ہوا تھا، لیکن حکومت سے تعاون کیا تو پھر اسی کے ہو گئے اس کے باوجود وہ کاسہ لیس نہیں تھے، ان میں ایک عظیم الشان انسان کی خوبیاں پائی جاتی تھیں، ان کی موت پر جواہر لال نے بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان لیکن انگریزوں کے مقابلہ میں ہندوستانی تھے، انگریز افسر اُن سے واقعی خوف کھاتے تھے وہ کسی انگریز سکرٹری کو آسانی سے کرسی نہیں دیتے تھے انہوں نے پنجاب کی سیاسیات کا میدان صاف کرنے اور آئندہ وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر فروکش ہونے

کے لیے اپنا راستہ صاف کیا، چودھری ظفر اللہ خاں کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں بھجوا دیا، ملک فیروز خان نون کو لندن میں ہائی کمشنر بنوایا، سکندر حیات ریزرو بنک کے ڈپٹی گورنر ہو گئے۔ یونی نسٹ پارٹی اب ان کے ہاتھ میں تھی، اور صرف میاں صاحب ہی تھے جو صوبہ کے وزیر اعظم ہو سکتے تھے۔ احرار الزام دیتے تھے کہ شہید گنج ان کے اغماض سے گری اور احرار کو مٹانے کے لیے ڈھائی گئی، ایک الزام ان کے خلاف یہ بھی تھا کہ چودھری ظفر اللہ خاں جیسے قادیانی کو انہی نے ایگزیکٹو کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی دلوائی ہے، زمیندار بھی یہی الزام دھر رہا تھا۔ حقیقت کیا تھی، خدا جانتا ہے یا خلوتیانِ راز، لیکن یہ بات ثقہ اور متعلقہ حلقوں کی بیان کی ہوتی ہے کہ ۱۹۳۰ء میں قصہ خوانی (پشاور) میں فائرنگ ہوئی تو حکومت نے اس قتلِ عام پر پانی پھیرنے کے لیے وضعدار ٹوڈیوں کو تیار کیا۔ مولوی شفیع داؤدی (بہاری) کی سرکردگی میں انکوائری کمیٹی بنائی۔ لیکن ایک غیر سرکاری کمیٹی سردار وجے ٹیل پریذیڈنٹ سنٹرل اسمبلی کی صدارت میں تشکیل دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ کانگرسی تھے۔ سر فضل حسین نے اپنا ذاتی معتمد بھیج کر مولوی شفیع داودی کی کمیٹی کا بائیکاٹ کرایا اور سردار پٹیل سے تعاون کا اشارہ کیا، نتیجۃً فائرنگ کا المیہ اپنے صحیح خد و خال سمیت سامنے آ گیا۔

جنرل انتخابات سے پہلے ہی پنجاب میاں صاحب سے محروم ہو گیا، وہ دمہ کے مریض تھے، بیماری نے طول کھینچا، موت نے بہانہ تلاش کیا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، حقیقت یہ ہے کہ سرکار دوست آدمیوں میں سب سے زیادہ جری، قابل اور دُھن کے پکے انسان تھے، مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں ان سے بہت فائدہ پہنچا، اگر وہ قبل از وقت رحلت نہ کر جاتے تو ممکن تھا کہ ملکی سیاست کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ لیکن دنیا کے کام انسانوں کی منشا سے نہیں، مشیتِ ایزدی سے چلتے ہیں۔

سر فضل حسین کے جانشین سکندر حیات ہو گئے، انتخابات ہوتے، یونینسٹ پارٹی نے غیر معمولی اکثریت حاصل کی، چودھری چھوٹو رام جیسا ہندو شدہ دماغ اس کے ساتھ تھا،

اس کے علاوہ سر منوہر لال اور سندر سنگھ مجیٹھیا بھی اس میں شامل تھے، مسلم لیگ کو صرف ڈیڑھ سیٹ ملی، ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی! راجہ صاحب تو منتخب ہو کر فوراً یونینسٹ پارٹی میں چلے گئے۔ وہ اسی شرط پر منتخب ہوئے تھے کہ پہلے سے پارٹی کو لکھ کر دیا تھا کہ اس میں شامل ہو جائیں گے۔ ملک برکت علی آخر وقت تک لیگی رہے، لیکن ان کے انتخاب میں بھی شہید گنج کے اثرات کا حصہ تھا، اور وہ لیگ کے علاوہ شہید گنج کا ٹکٹ لے کر کامیاب ہوئے تھے ——— اتحادِ ملت نے شہید گنج کی اینٹوں کا بہت تذکرہ کیا لیکن ڈاکٹر عالم کے سوا سب ہار گئے، مولانا اختر علی خاں کو شکست ہوئی، ملک لال خاں پٹ گئے، سید زین العابدین رہ گئے، امرتسر میں ڈاکٹر کچلو جیت گئے، تو شیخ محمد صادق نے پٹیشن کر دی، وہ منظور ہو گئی، دوبارہ الیکشن ہوا، چودھری افضل حق اور ڈاکٹر کچلو دونوں ہر گئے، شیخ محمد صادق جیت گئے، پھر پٹیشن ہوئی، شیخ محمد صادق کا الیکشن کالعدم ہو گیا، تیسری بار ان کے بڑے بھائی شیخ صادق حسن کھڑے ہوئے اور کامیاب ہو گئے۔ میاں عبدالحی نے لدھیانہ میں شہید گنج کی اینٹوں کا سہارا لیا اور جیت گئے، چودھری افضل حق کو ہرانے کے لیے یونینسٹ پارٹی نے بڑا زور لگایا۔ لاہور سے عجیب و غریب لوگ ان کے حلقۂ انتخاب میں گئے، جی بھر کے جھوٹ بولا، ایک صاحب ملک محمد عمر ٹنڈا کسی حادثے میں بازو کٹوا چکے تھے انہوں نے چودھری صاحب کے حلقہ میں لگا تار پراپاگنڈا کیا کہ ——— اس کا بازو چودھری صاحب نے کٹوایا تھا، وہ شہید گنج کو جا رہا تھا کہ پولیس نے روکا، چودھری صاحب نے اشارہ کیا، فائر ہوا، بازو میں گولی لگی، اپریشن میں بازو کٹوانا پڑا۔

ڈاکٹر عالم کے مقابلہ میں سید حبیب تھے، سید حبیب کو سردار سکندر حیات نے یونینسٹ پارٹی کا ٹکٹ دے رکھا تھا لیکن اندر خانہ وہ ڈاکٹر عالم کی حمایت کر رہے تھے، ڈاکٹر صاحب واہ جا کر سردار صاحب سے بعض سفارشی خط بھی لائے تھے انہیں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا لیکن اخراجات سے بچنے کے لیے شاہ صاحب کے کاغذات مسترد کروا

دینا چاہتے تھے، جہلم کا ڈپٹی کمشنر مسلمان تھا، اس کے والد سے نواب شاہنواز ممدوٹ کے مراسم تھے، ڈاکٹر صاحب نے ان کے نام سفارشی خط لیا کہ وہ اپنے بیٹے کو لکھیں کہ شاہ صاحب کے کاغذات مسترد کر دیئے جائیں لیکن اُن صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان کے خاندان میں بیٹے کو خط لکھنے کا رواج نہیں البتہ ایک آدمی ساتھ کر دیا، جہلم پہنچے تو ڈپٹی کمشنر موجود نہ تھا، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں سماعت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑا زور دیا کہ شاہ صاحب کے کاغذات مسترد ہو جائیں، دو ڈھائی گھنٹہ قانونی موشگافیاں کرتے رہے لیکن کچھ نہ بنا، شاہ صاحب نے کہا مجھے ان کے خلاف کوئی اعتراض نہیں، انتخاب لڑ کر دوسروں سے فیصلہ کرالیں۔

سید حبیب انتخاب ہارنے کے بعد سکندر حیات کے سخت مخالف ہو گئے، مخالفت اس حد تک سنگین ہو گئی کہ آخری وقت تک صلح نہ ہو سکی بلکہ بدمزگی بڑھتی گئی۔ ڈاکٹر عالم منتخب ہوتے ہی تبدیل ہو گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو تار بھیجا کہ آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں، انہوں نے جواب دیا آج سے تیسرے دن بنگال جا رہا ہوں، جس تاریخ کو آپ آنا چاہتے ہیں، اُس دن یہاں نہیں ہونگا، ڈاکٹر صاحب نے دوسرا تار بھیجا، میں ابھی اپنی کار میں روانہ ہو رہا ہوں اور کل شب کسی وقت پہنچ جاؤں گا۔ انتظار فرمائیے، ڈاکٹر صاحب رفیقِ سفر بنا کر مجھے ساتھ لے گئے۔

مَیں نے مولانا ظفر علی خاں کے اصرار پر الیکشن میں ان کی مدد کی تھی، اور واحد مقرر تھا جو ان کے ساتھ پھرتا رہا، یا پھر میرے ساتھ ابو سعید انور تھے، ڈاکٹر صاحب میری خطابت پہ ریجھ گئے۔ چھوڑتے ہی نہ تھے۔ ان کے بعض سخت سے سخت حلقے سر کیے، بالخصوص جہلم اور گجرات، گجرات میں جلسۂ عام کی صدارت مولانا عبدالقادر قصوری نے کی، میری تقریر سن کر فرمایا، مولانا آزاد آغاز میں اسی طرح تقریر کرتے تھے، کجا ذرّہ کجا آفتاب۔ بہرحال میرے لیے سرمایۂ فخر تھا! ڈاکٹر صاحب بھاگم بھاگ الہ آباد پہنچے، وہاں پہلی دفعہ آنند بھون دیکھا،

اور قریب سے پنڈت نہرو بھی ــــــ ڈاکٹر صاحب کو ماضی میں کانگرس سے فرار ہونے کا احساس تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ پنڈت جی ان سے خوش نہیں، کمال یہ کیا کہ لاہور سے روانہ ہوتے وقت کھدر پوش ہو گئے، سر پہ وہی گاندھی ٹوپی، سیٹھ سدرشن معلوم ہوتے تھے۔ پنڈت جی سے معانقہ کیا اور کہنے لگے:

"پنڈت موتی لال مجھے اپنا بیٹا سمجھتے تھے، میں آپ کا بھائی ہوں اور آپ مجھے اپنا بھائی سمجھیں، میں نے کبھی فرقہ واری قبول نہیں کی، میرا ذہن ہمیشہ نیشنلسٹ رہا ہے، میں نے کانگرس پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، پنجاب کی آب و ہوا تمام ملک سے مختلف ہے، اپنے معاشی حالات کی خرابی کے باعث کانگرس سے نکلا تھا لیکن ذہناً اور قلباً کانگرس ہی میں تھا۔"

ڈاکٹر صاحب نے پیچ در پیچ باتوں سے پنڈت جی کو رام کرنا چاہا، وہ کہنا چاہتے تھے کہ پنجاب میں پارلیمانی محاذ پر سکندر حیات کا مقابلہ صرف وہی کر سکتے ہیں، مسلمان صوبہ ہے، اپوزیشن لیڈر بھی مسلمان ہو تو فرقہ واریت کم ہو گی، پنجاب کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ بصورت دیگر سکندر حیات کو ہندو مسلم سوال پیدا کرنے میں آسانی ہو گی۔

پنڈت جی نے کہا:

"ڈاکٹر صاحب آپ جس ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں اس سے انحراف کیسے کر سکتے ہیں؟ یہ تو اصولاً غلط ہو گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"پنڈت جی! آپ نے تحریک کو غائر نظر سے نہیں دیکھا۔ میں نے پنجاب میں کانگرس کی اتنی بڑی خدمت کی ہے کہ پوری آرگنائزیشن انجام دینے سے قاصر تھی، آپ پنجاب کے مزاج کو سمجھتے ہیں، میں نے مسلمانوں کا ذہن

اور غصہ، مزاج و فساد سے ہٹا کہ قانون و امن کی طرف لگایا ہے، اگر
میں مسلمانوں کو مقدمہ کے چکر میں نہ ڈالتا تو پنجاب کے طول و عرض میں
اتنے زبردست فساد ہوتے کہ ہندوستان بھی اس وبا سے محفوظ نہ رہتا،
مسلمان مندروں اور گوردواروں کو ڈھانے کا تہیہ کیے ہوتے تھے، ظاہر
ہے کہ جواب الجواب آگ بھڑکتی، ملک برسوں پیچھے جا پڑتا، کانگرس کا مشن
غرق ہو جاتا، ملک کو شدید نقصان پہنچتا۔"

پنڈت جی ڈاکٹر صاحب کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئے، اکٹھے کھانا کھایا، پھر گھنٹہ
بھر تخلیہ میں باتیں کرتے رہے، ان سے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کے نام خط لیا اور ہنسی خوشی
لاہور روانہ ہو گئے ــــــ لاہور پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے کانگرس میں شامل ہونے
کا اعلان کر دیا، اور اپنے ڈرائنگ روم میں گاندھی ٹوپیاں لٹکا دیں۔

ڈاکٹر صاحب کو منتخب کرانے میں سکندر حیات کا ہاتھ تھا، گورنر کا بھی اشارہ
تھا، وہ ڈاکٹر صاحب سے خوش تھے کہ انہوں نے شہید گنج کا رُخ عدالت کی طرف موڑا
تھا، گورنر لاقانونی سے ہراساں تھا، ڈاکٹر عالم نے اس بنا پر گورنر کی خوشنودی حاصل کی کہ
تحریک کو مقدمہ میں منتقل کر کے معاملہ کو لمبا کر دیا، کسی معاملہ کو لمبا کرنا حکومت کے مفاد میں ہوتا
ہے، اس طرح عوام وہ چیز بھول جاتے ہیں جن سے حکومت کے لاء اینڈ آرڈر کو پریشانی ہوتی ہے

اب جو ڈاکٹر صاحب نے کانگرس میں شمول کا اعلان کیا تو شیخ دین محمد صاحب ان
کے ہاں تشریف لاتے اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے کیا غضب کیا، ابھی دو روز پہلے
سکندر حیات نے آپ کو وزیر تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا تھا ــــــ ڈاکٹر صاحب سخت
پریشان ہوتے، اب کیا ہو سکتا تھا، کہنے لگے:

"پنڈت نہرو نے دو روز پہلے مجھے بلوایا تھا، میں الہ آباد میں اُن سے
ملا، انہوں نے مجھے اپوزیشن لیڈر بنانے کی پیش کش کی اور یہ خط بھی دیا ہے"

سکندر حیات نے گوپی چند بھارگو کو بلوایا، ان سے پنڈت جی کے خط کا ذکر کیا کہ اس خط کی قیمت پر ڈاکٹر عالم مجھ سے وزارت مانگ رہے ہیں، بلیک میلنگ نہیں تو کیا ہے؟ ڈاکٹر بھارگو نے سردار صاحب کی کوٹھی سے پنڈت جی کو کلکتہ فون کیا، نتیجۃً ڈاکٹر صاحب اپوزیشن لیڈر بنتے بنتے رہ گئے، البتہ رکھ رکھاؤ کے لیے انہیں ڈپٹی لیڈر بنا دیا گیا۔

اِدھر سکندر وزارت بنی، اُدھر جنڈیالہ گورو کی ایک تقریر کے جرم میں مجھ پر ۱۲۴ الف کا مقدمہ بن گیا، مَیں امرتسر کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وشنو بھگوان کی عدالت میں پیش تھا کہ ڈاکٹر عالم آگئے وہ کسی اور مقدمہ میں پیش ہونے آئے تھے، مجھے دیکھا تو حیران رہ گئے۔

”تم کہاں ؟“

”۱۲۴ الف میں ؟“

ڈاکٹر صاحب نے وہیں ضمانت کی درخواست گزاری، میرے سن و سال کا لحاظ کرتے ہوئے دو ہزار کی حاضر ضمانت ہوگئی، ڈاکٹر صاحب ضمانت کرا کے چلے گئے، وہاں کوئی دوست عزیز اور ساتھی موجود نہیں تھا، مَیں جیل چلا گیا، اپنی بے بسی کا شدید احساس ہوا، تین دن جیل میں پڑا رہا، مقامی اتحادِ ملت کے وہ رہنما جو ہمیشہ منتیں کر کے مجھے لاہور سے امرتسر لاتے تھے مفقود الخبر تھے، لاہور کے مرکزی دفتر کو سانپ سونگھ گیا، آخر چوتھے روز شیخ غلام محی الدین امرتسری کی مہربانی سے ضمانت ہوگئی، مَیں سوچتا رہا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو میری تقریر پر بچھے جاتے تھے لیکن اب ایکا ایکی اتنے سرد مہر ہوگئے جیسے شناسا ہی نہ تھے ——— ان میں سے کسی کو احساس ہی نہ تھا کہ مجھ پر مقدمہ قائم ہوگیا ہے اور جن لوگوں کی خواہش کے مطابق تقریر کی تھی وہ طوطا چشم نکلے۔

پہلی تاریخ سے ایک دن پہلے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ اپنے بھائی نظام الدین کے ساتھ ٹہل رہے تھے، نظام الدین سب انسپکٹر بھرتی ہو کر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے، اس الیکشن میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہے

اُنہیں لیڈروں کی خطابت پر تبصرہ کرنے کا بیحد شوق تھا، کہنے لگے میں نے مولانا ابُوالکلام آزاد کو ان کی جوانی میں سُنا، اور رپورٹنگ کی ہے، وہ صبا رفتار تھے، شورش آبشار ہے۔
میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "کل میری پیشی ہے، آپ ہی پیروی کر سکتے ہیں۔"

تیوری چڑھا کر بولے "ناممکن، ناممکن، ناممکن۔"

مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی ہو، سکتے میں آ گیا، یہ وہی ڈاکٹر عالم ہیں جن کا الیکشن خطیبانہ حد تک میں نے تنہا لڑا اور جیتا تھا، احرار جیسے عدیم المثال خطیبوں کا مقابلہ کیا۔ جہلم و گجرات کے جلسے سر کیے۔ راولپنڈی کے محاذ کو فتح کیا، جلالپور جٹاں میں تلوار کا زخم سہا اور کبھی ان سے پھوٹی کوڑی تک نہ لی، حالانکہ میں ان دنوں نیم فاقہ کشی کی زندگی گزار رہا تھا، آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا باہر چلا آیا، لیکن میرے کان سُن رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کا بھائی نظام الدین کہہ رہا تھا:

"عالم! تمہیں ایسا کورا جواب نہیں دینا چاہیے تھا۔"

اور ڈاکٹر صاحب بول رہے تھے "بھائی جی! پانچ سال بعد پھر دیکھا جائے گا۔"

رات بھر نیند نہ آئی، سوچتا اور کروٹیں بدلتا رہا، ننگی چارپائی، جسم پر چٹاخ پڑ گئے۔ والد میری گرفتاری اور بیکاری دونوں سے نالاں تھے، دونوں بہنیں جوان ہو چکی تھیں، اور وہ بیاہنے کی فکر میں تھے، دو وقت کی روٹی ملنا مشکل ہو رہا تھا، صبح اٹھا، والد سے کہا امرتسر آج مقدمہ کی تاریخ ہے، کرایہ کے چند آنے دے دیں، انہوں نے جھٹک دیا، دفتر زمیندار گیا، مولانا اختر علی خاں سے کبھی سوال نہ کیا تھا، کرایہ مانگا، بھیجتا ہوں، کہہ کر اُوپر چلے گئے، غالباً چائے میں اتنے مشغول رہے کہ بھُول گئے، سوچا بغیر ٹکٹ کے سوار ہو جاؤں؟ حوصلہ نہ ہوا، اس پریشانی اور کشمکش میں سٹیشن کی طرف قدم اٹھاتے جا رہا تھا کہ ڈاکٹر کچلو کی کار نظر پڑی، وہ مجھے دیکھ کر رک گئے۔

"کہاں کھڑے ہو بدمعاش" بدمعاش عزیزوں کے لیے ان کا طرزِ مخاطبت تھا۔

"میرا مقدمہ ہے امرتسر میں"

"تو چلو بیٹھ جاؤ، میں بھی وہیں جا رہا ہوں"۔

اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں؟ —— میں فوراً بیٹھ گیا، مبادا کار آگے بڑھ جاتے۔

"وکیل کونسا ہے؟"

"کوئی نہیں"

"کیوں؟"

اس "کیوں" سے میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں، میرے کاندھے پر زور سے تھپکی دی، "ہش بدمعاش، گھبراؤ نہیں، تمہارا مقدمہ میں لڑوں گا"۔

چار ماہ مقدمہ چلتا رہا، ہر پیشی کے دن صبح سات سوا سات بجے ان کی کوٹھی پہنچ جاتا، وہ مجھے ساتھ لے کر امرتسر چلے جاتے، مقدمہ لڑتے، پھر ساتھ لے کر آتے، جو تھوڑے بہت اخراجات ہوتے خود کرتے، یہ میرے لیے ایک سبق تھا اور عبرت بھی، میں کبھی ان کے ساتھ نہیں رہا تھا، حتیٰ کہ ان کے انتخابی جلسوں میں بھی شریک نہیں ہوا تھا، اتحادِ ملت والے شیخ محمد صادق اور ان کی دولت کے ساتھ تھے۔ مقامی اتحادِ ملتی رہنماؤں کی یہ کوشش رہی کہ امرتسر میں ایک آدھ تقریر شیخ صاحب کے حق میں کروں لیکن میں نے بعض بزرگوں کی زبردست خواہش کے باوجود انکار کیا —— کیونکہ ڈاکٹر صاحب سے شناسائی نہ ہونے کے باوجود میرا ذہن انہی کی طرف تھا، میں ان سے غائبانہ اخلاص رکھتا تھا، اور اس کی وجہ ان کی بے نظیر قربانی تھی، وہ جلیانوالہ باغ کے ہیرو تھے، اور جلیانوالہ باغ برِ عظیم کی آزادی کا ایک ایسا موڑ تھا کہ اس نے ہندوستان میں برطانوی سامراج کی زندگی کو مختصر کر دیا تھا، گو امرتسر کے الیکشن میں اتحادِ ملت کے مرکزی رہنما احرار کی مخالفت کرتے

رہے لیکن ڈاکٹر کچلو کے وہ کسی طرح بھی خلاف نہ تھے ـــــــ میں سوچتا کہ یہ عظیم آدمی جس کے لیے میں نے ایک کلمہ تک نہیں کہا اس قدر شفیق ہے پھر اس کو مجھ سے کوئی غرض نہیں، اس کے برعکس ع

مر رہے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

ایک روز ڈاکٹر صاحب کسی کام کے لیے دہلی چلے گئے اور شیخ محمد صادق سے کہہ گئے کہ اس کے مقدمہ میں ایک سرکاری گواہ پر جرح کرنی ہے، پیش ہو جانا۔ شیخ صاحب عدالت میں آگئے، گواہ پر جرح کرنے لگے تو نفس مقدمہ کے ساتھ جرح کا تعلق ہی نہ رہا۔ اسے ڈی ایم نے ٹوکا، شیخ صاحب غالباً آپ نے مقدمہ کا فائل نہیں دیکھا۔ شیخ صاحب عجوبہ طبیعت کے انسان تھے، کہنے لگے:

"ڈاکٹر کچلو آج باہر گئے ہیں، ان کی خواہش پر آگیا ہوں، فائل تو دیکھا نہیں، یہی کافی تھا کہ آپ بھی کشمیری ہیں، ڈاکٹر صاحب بھی کشمیری ہیں، میں بھی کشمیری ہوں اور ملزم بھی کشمیری ہے، صرف آج کے لیے آگیا ہوں۔"

وشنو بھگوان ہنس پڑا، اس نے چودہ دن کی تاریخ ڈال دی، ڈاکٹر صاحب کا وشنو بھگوان پر بے حد اثر تھا وہ ان کی حد درجہ عزت کرتا، ایک دن ان سے کہنے لگا، سزا دینے کے لیے زور دیا جا رہا ہے، کوشش کیجیے کہ مقدمہ ہی واپس ہو جائے، ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا، مولانا ظفر علی خاں سے کہو وہ سکندر حیات سے ملیں، میں نے مولانا سے کہا، مولانا نے حامی بھر لی، اگلے روز فرمایا کہ سردار صاحب نے مقدمہ واپس لینے کے احکام جاری کر دیئے ہیں، لیکن احکام ندارد، مولانا صفائی کے گواہ تھے ـــ الزام یہ تھا کہ میں نے اپنی تقریر میں تشدد کی تلقین کی ہے، وشنو بھگوان چاہتے تھے اس الزام کی تردید ہو، انہی کے اشارہ پر مولانا کو اتحاد ملت کے صدر کی حیثیت سے

بلوایا کہ جماعت کے متعلق کہہ دیں کہ اس کی جد و جہد عدمِ تشدّد پر ہے، اور شورش جماعت عاملہ کا رکن ہے، وہ اس سے باہر نہیں اور نہ اس نے کبھی تشدّد کی تلقین کی ہے۔

مولانا تشریف لائے، ڈاکٹر صاحب نے ان سے سوالات کیے، سب کچھ کہا، لیکن ساتھ ہی فرما دیا کہ ہم تشدّد کو اپنا مذہب نہیں سمجھتے، ضرورت پڑے تو ہم تلوار بھی اٹھانے کو تیار ہیں، وشنو بھگوان مسکرا دیا، ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگا، اب ایک ہی چارہ کار ہے کہ صوبائی حکومت مقدمہ واپس لے لے، ڈاکٹر صاحب نے کہا مولانا کی روایت کے مطابق احکام جاری ہو چکے ہیں جانے آپ تک کیوں نہیں پہنچے؟ اس نے چودہ دن کی تاریخ ڈال دی۔ میں نے مولانا سے پھر کہا، فرمایا کہ میری آج بھی سکندر سے بات ہوئی ہے وہ احکام جاری کر چکے ہیں، جس روز حکم تھا، میں امرتسر پہنچا، تو معاملہ جوں کا توں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش پر مزید تین روز کی تاریخ ڈال دی گئی، لیکن احکام ہوتے تو پہنچتے، ڈاکٹر صاحب نے وشنو بھگوان سے بات کی، جس دن فیصلہ تھا ڈاکٹر صاحب مجھے گھر لے گئے۔ فرمانے لگے:

"میں نے اس سے کہہ دیا ہے، وہ تمہیں پانچ سو روپے جرمانہ کرے گا"

"پانچ سو روپے جرمانہ؟"

"ہاں"

لیکن ڈاکٹر صاحب میرے پاس تو پانچ آنے بھی نہیں، میں کہاں سے ادا کروں گا، میں نے تمہاری والدہ (اپنی اہلیہ) سے کہہ دیا ہے، اندر جاؤ اور اُن سے روپیہ لے لو، میں حیران تھا، الٰہ العالمین یہ کیا ہے؟ میں نے اندر جانے سے گریز کیا، کبھی اُن کے سامنے نہیں ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب خود ہی اندر گئے اور پانچ سو روپے لا کر میرے حوالہ کر دیا۔ "ناشتہ کر لو اور فوراً جاؤ، پھر وہاں سے سیدھے یہاں آنا"

عدالت میں پہنچا، وشنو بھگوان کورٹ انسپکٹر سے باتیں کر رہا تھا۔

"آ گئے آپ؟ تیار ہیں۔

میں یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بچہ ہی تھا، ان سے کہا

"مجھے ڈاکٹر صاحب نے جرمانہ کے پانچ سو روپے دیئے ہیں کہ ادا کر کے چلے آؤ"

وشنو بھگوان نے کورٹ انسپکٹر سے آنکھیں چار کیں، فرضی مسکرایا، اور کہا کہ شام چار بجے فیصلہ سنایا جائے گا۔

چار بج گئے، ڈاکٹر صاحب کے منشی مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے آنکلے کہ معلوم کریں کیا بیتی؟ وشنو بھگوان نے قریب پانچ بجے بلاکر فیصلہ سنا دیا،

"افسوس ہے، میں آپ کو ایک سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں"

ڈاکٹر صاحب نے پہلا فیصلہ خود لکھ کر دیا تھا لیکن میری ناسمجھی نے کیا دھرا بگاڑ دیا۔ دوسرا فیصلہ وشنو بھگوان نے لکھا اور میں ایک سال کے لیے قید ہو گیا، اگلے روز مجھے امرتسر سب جیل سے لاہور سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا، دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور پولیس کے سپاہی مجھے سب جیل سے ریلوے اسٹیشن تک پیدل لے جا رہے تھے۔ ع

نے کوئی پرسانِ غم اور نے کوئی پرسانِ حال

غازی عبدالرحمٰن اپنے تانگہ پر کچہری جا رہے تھے، مجھے اس حالت میں دیکھا تو اتر گئے، پولیس سے کہا تانگہ پر لے جاؤ، مجھے ان سے بھی نیاز حاصل نہ تھا، عذر کیا، نہ مانے، تانگہ پر سوار کرایا اور خود پیدل ہو گئے ——— تھرڈ کلاس میں سوار ہو کر لاہور پہنچا، راستہ میں دفتر زمیندار تھا، وہاں چلا گیا، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا اختر علی خاں بڑے تپاک سے ملے، مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا، سکندر حیات وعدہ کر چکے ہیں، دفتری کارروائی میں دیر ہو گئی ہے، چند دن تک باہر آ جاؤ گے، لیکن اتحادِ ملت نے احسان یہ کیا کہ اپیل تو کجا فیصلہ کی نقل تک نہ لی، وقت گزر رہا تھا، آخر ڈاکٹر صاحب نے ضلعی حکام سے فیصلہ کی نقل لی اور اپیل دائر کر دی، میری تقریر بلاشبہ تشدد سے پر تھی، ابتدائی دور کے لوازم کا ایک ناہموار نمونہ، سزا مجھے پہلے ہی کم ہوئی تھی، تقریر میں یہ تک کہہ دیا تھا کہ انگریزوں کو

ملک سے مار مار کے بھگا دو، بھگت سنگھ اور سکھدیو بن جاؤ ــــــ ڈاکٹر کچلو کیمبرج میں جسٹس سکیمپ کے ہم جماعت رہے تھے، میری کم عمری کی بنیاد پر ذاتی درخواست کی، سکیمپ راضی ہو گئے، مجھے بلوایا، کم عمری سے واقعی متاثر ہوئے، ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگے ملزم نے تو اپنی تقریر میں علانیہ انگریزوں کو قتل کر دینے کی ترغیب دی ہے، ڈاکٹر صاحب نے کہا ملزم نے یہ تقریر نہیں کی، رپورٹر سے نوٹس لیتے وقت غلطی ہو گئی ہے اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ملزم نے واقعی یہ الفاظ کہے ہوں گے تو وہ عدمِ تشدد پر یقین رکھتا ہے اپنے اِن پُر تشدد الفاظ پر جو اس سے منسوب ہیں افسوس کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مجھے کہہ چکے تھے کہ تشدد کے الفاظ پر میں افسوس کر دوں تو خواہ مخواہ بہادر بننے کی کوشش نہ کرنا، جسٹس سکیمپ سے بھی ذکر ہو چکا ہے اور اب میری عزت کا معاملہ ہے؟

۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی میں جن لوگوں نے تقریروں میں تشدد برتا تھا انہوں نے گاندھی جی کی ہدایت پر گاندھی اروِن میثاق کے بعد اظہارِ افسوس کر دیا تھا، تمہاری یہ قید "آبیل مجھے مار" کے مصداق ہے، کوئی جماعت نہیں، کوئی مقصد نہیں، کوئی تحریک نہیں، کس غرض سے قید کاٹ رہے ہو اور کن لوگوں کے لیے کاٹ رہے ہو۔

جسٹس سکیمپ نے مجھ سے دو چار سوال کئے اور اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل سے کہا ــــ صوبائی حکومت سے پوچھے کہ وہ کیا چاہتی ہے، لنچ کے بعد اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل نے کہا ــــ حکومت سزا کو چھ ماہ کر دینے کے حق میں ہے۔

جسٹس سکیمپ نے مجھ سے دریافت کیا؟

کتنی گزار چکے ہو؟

ایک ہفتہ کم چار ماہ، میں نے جواب دیا۔

اچھا تو چھ ماہ حکومت نے چھوڑ دیئے ہیں باقی ہم چھوڑ دیتے ہیں، جتنی کاٹ لی

کافی ہے، آپ کو رہا کیا جاتا ہے:

باہر نکلا تو ڈاکٹر عالم جسٹس ایڈیسن کے کمرہ سے نکل رہے تھے۔

"ارے تم؟"

"جی ہاں!"

"کیسے، کیونکر؟"

"جسٹس سکیمپ نے رہا کر دیا ہے"۔ یہ کہا اور غصہ سے آگے بڑھ گیا۔

رہا ہو کر گھر پہنچا تو ڈاکٹر صاحب کا ملازم آ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب یاد کرتے ہیں؟"

"خیریت ہے؟"

"مولانا محمد اسحاق مانسہروی آئے ہیں، آپ کو یاد فرمایا ہے"۔

"معاف کیجیے میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں نہیں جاؤں گا"۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب آ گئے، مجھے کھینچ کھانچ کے ساتھ لے گئے، وہاں اتحاد ملتی بزرجمہروں کا ایک مجمع تھا، ڈاکٹر صاحب نے ہر چند شیشہ میں اتارنا چاہا لیکن دل کے آبگینہ میں بال آ چکا تھا، اور اب اس کا محو ہونا ممکن نہ تھا، گئی رات تک وہ لوگ گپیں ہانکتے رہے، آخر وہیں سو گئے ہیں۔ علی الصبح اٹھا تو ڈاکٹر صاحب ایک عورت سے جھگڑ رہے تھے۔

"دو روپے ٹھیک ہیں بھاگ جاؤ"۔

"ڈاکٹر صاحب آپ نے پچاس روپے کا وعدہ کیا تھا" عورت کو اصرار تھا۔

ڈاکٹر صاحب عورت کے اصرار پر جھنجھلا گئے، انہیں ڈر تھا کسی نے دیکھ لیا تو رسوائی ہو گی، مولانا عبدالقادر قصوری برآمدے میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے، ڈاکٹر صاحب نے عورت سے کہا:

" ڈاکٹر صاحب تو وہ سامنے مصلّی پر نماز پڑھ رہے ہیں، میں ان کا منشی ہوں، بھاگ جاؤ، ورنہ ہم دونوں کی خیر نہیں، قید کرا دیں گے۔"

غرض وہ عورت شب کا معاوضہ دو روپے نقد لے کر چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور میں یہ لطیفہ سمیٹ کر گھر آ گیا۔

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

صوبائی خودمختاری کے انتخابی نتائج نے ہوا کا رُخ بدل دیا، بنگال، سندھ اور پنجاب کو چھوڑ کر تمام صوبوں پر کانگرس قابض ہوگئی، ابتدا میں کانگرس نے وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا لیکن پھر گورنروں کی اس یقین دہانی پر کہ وہ داخلی امُور میں مداخلت نہیں کریں گے وزارتیں قائم کیں، ملک کا پانسہ ہی پلٹ گیا، کانگرس کو خود اس کامیابی کی توقع نہ تھی اب جو بے نظیر اکثریت حاصل ہوئی تو قدرتاً اس کا سیاسی مزاج بالا ہو گیا، پنڈت جواہر لال نے چودھری خلیق الزمان اور نواب اسمٰعیل میرٹھی سے باہمی اشتراک کا وعدہ کیا تھا لیکن چودھری صاحب سے کہا گیا کہ کانگرس میں شامل ہو جائیں، انہیں مسلم لیگی ممبر کی حیثیت سے وزیر لینا مشکل ہے، اس واضح اکثریت کے بعد کانگرس کسی اشتراک کی خواہاں نہیں، چودھری صاحب برہم ہو گئے، ادھر پنڈت جواہر لال نہرو نے بیان داغ دیا کہ ملک میں دو ہی طاقتیں ہیں، برطانوی حکومت اور انڈین نیشنل کانگرس، مسٹر جناح نے فوراً ٹوکا اور کہا ——— ایک تیسری طاقت بھی ہے اور وہ ہیں مسلمان۔

پٹنہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہُوا تو مسلمان صُوبوں کے وزرائے اعظم اپنی کھیپ کے ہمراہ محمد علی جناح کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے، اِس اجلاس ہی میں میاں فیروزالدین احمد نے پہلی دفعہ محمد علی جناح کے ساتھ قائدِ اعظم کا لقب استعمال کیا، فیروزالدین زبردست نعرہ باز تھے، پاٹ دار آواز، نعرہ لگانے اور لگوانے میں اتارُو ——— سکندر جناح پیکٹ یہیں ہُوا۔

مولانا ظفر علی خاں نے اجلاس میں ایک فی البدیہہ نظم سنائی جس کا یہ شعر گویا حاصلِ ارتجال تھا ؎

سکندر اور جناح قوم کی آنکھوں کے تارے ہیں
کہ ان کے دیکھ لینے ہی سے ایمان تازہ ہوتا ہے

مولانا کی تحریک پر مسلم لیگ نے قرارداد منظور کی کہ شہید گنج پر مسلمانوں کا حق ہے اور وہ اس کی بازیابی کے مطالبہ میں حق بجانب ہیں، قرارداد میں مسجد کی واگزاری پر زور دیا گیا، اس وقت اجلاس میں سردار سکندر حیات اور دوسرے پنجابی زعماء موجود تھے ان سب نے قرارداد کو متفقہ طور پر منظور کیا تھا، گو پنجاب کی ذہنی فضا کو قابو میں رکھنے کے لیے یہ محض ایک قرارداد تھی لیکن اس کے تین پہلو تھے۔

اوّلاً: مولانا ظفر علی خاں شہید گنج کے قضیہ سے خود سبکدوش ہو گئے اور اس کی مسئولیت مسلم لیگ پر ڈال دی۔

ثانیاً: ملک برکت علی ایڈووکیٹ ہر لحاظ سے قائد اعظم کے سچے پیرو تھے انہیں یونی نسٹ پارٹی سے سخت عناد تھا، ان کے ہاتھ میں ہتھیار آ گیا کہ اسمبلی میں قرارداد پیش کر کے بازیابی کا مطالبہ کریں۔ سکندر نہ مانیں تو لیگ کی قرارداد بے معنی ہو جائے گی نتیجۃً مسلمان عوام ناراض ہوں گے، اور اگر مان جائیں تو یونی نسٹ پارٹی ٹوٹ جائے گی۔

ثالثاً: احرار کو موقع مل گیا کہ اپنا قرض چکائیں، مولانا مظہر علی اظہر نے دہلی دروازہ کے باہر جلسہ کر کے اعلان کر دیا کہ لیگ کے اجلاس پٹنہ میں پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات کی موجودگی میں شہید گنج کی بازیابی کا ریزولیشن ہوا ہے لہٰذا ان پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مسجد واپس دلائیں، اگر انہوں نے پس و پیش کیا تو وہ حصولِ مسجد کے لیے سول نافرمانی کریں گے۔

سر فضل حسین زندہ تھے تو سکندر حیات سے احرار کے خوشگوار مراسم تھے، ان مراسم کی

وجہ سے سکندر حیات نے مظہر علی اظہر کو چیف پارلیمنٹری شپ پیش کی، مولانا نے قبول نہ کی، ان کا بیان تھا کہ انہوں نے اصول پر وزارت کو ٹھکرایا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی راوی تھے کہ وزارت کے لیے چیف پارلیمنٹری شپ سے انکار کیا گیا۔ ان حالات میں سکندر حیات سہ طرفہ نرغے میں تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کو لیلا پوتی سے راضی کر لیا تھا کہ مرکزی اسمبلی میں بھجوا دیا اور وہ ہمیشہ کے لیے سیاسی ہنگاموں سے دستبردار ہو گئے، ملک برکت علی کو اپنے ایک بیٹے کی وجہ سے دستکش ہونا پڑا، اب سوال احرار سے نمٹنے کا تھا، مولانا مظہر علی اظہر اپنی بات کہہ کر روپوش ہو گئے، دنوں تک پتا ہی نہ چلا کہاں ہیں؟ میرزا معراج الدین کی شہ پر میاں فیروزالدین نے موچی دروازہ کے باغ میں جلسہ کیا جس میں احرار کو کھلے بندوں للکارا، فی الجملہ میاں صاحب نے ایک دنگل رچا دیا کہ احرار شہید گنج کو چلیں تو وہ بھی تیار ہیں، نقشہ یہ تھا:

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقابلہ میں مولانا ظفر علی خاں،
چودھری افضل حق کے مقابلہ میں مولانا اسحٰق مانسہروی،
مولانا مظہر علی اظہر کے مقابلہ میں میاں فیروزالدین احمد،
مولانا حبیب الرحمٰن کے مقابلہ میں ملک لال خاں،
شیخ حسام الدین کے مقابلہ میں ابوسعید انور۔

چونتیس سال پہلے کا ذکر ہے، ہو سکتا ہے کوئی نام اِدھر اُدھر ہو لیکن کئی روز تک زمیندار کے صفحۂ اوّل پر یہ چوکھٹا چھپتا رہا، عوام کالانعام اس مجوزہ دنگل پر خوش تھے۔

مولانا مظہر علی اظہر نے تنگ آ کر وزیر خان کی مسجد میں اعلان کر دیا کہ فلاں تاریخ کو جمعہ کی نماز پڑھ کر وہ شہید گنج کی طرف جا رہے ہیں، مولانا ظفر علی خاں کو چلنا ہو تو تشریف لے آئیں —— احرار زعما مولانا مظہر علی کے اس فیصلہ سے متفق نہ تھے، مولانا حبیب الرحمٰن نے اس کو عذرِ گناہ بدتر از گناہ کہا، سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرمایا اب تک ہم نے اس کو فرنگی فتنہ قرار دیا اب خود اس آگ میں کود رہے ہیں، چودھری صاحب نے گریز کیا، مظہر علی

کہاں مانتے، انہوں نے علاج بالمثل کا فیصلہ کر لیا اور ساتھیوں سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ احرار کو شہید گنج کی "گالی" سے نجات دلانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے، مولانا حبیب الرحمن اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اختلاف کر کے گھروں کو چلے گئے اور اس وقت تک نکلے ہی نہیں جب تک اونٹ نے آخری کروٹ نہ لی ——

چودھری صاحب نے مظہر علی سے کہا — فرض کرو پولیس روکتی نہیں، اس صورت میں کیا کرو گے؟ مسجد کے اندر جاؤ گے؟ بالفرض کسی اکالی کا نیزہ ترازو ہو گیا تب کیا ہوگا؟ کیا اس طرح فساد نہیں ہوگا؟ ایک ناچیز مقصد کے لیے جان کو ہلاکت میں ڈالنا دانش مندی ہے؟

مظہر علی اپنی روایتی خودسری اور خود پسندی کے باوجود احرار میں سب سے زیادہ بہادر تھے، فقیر منش، نیک سیرت، لیکن تقیہ کرنا ان کی عادت ہی نہیں فطرت ہو گیا تھا، چودھری صاحب سے کہا:

افضل حق! عمر بھر کی رفاقت کے باوجود تم نے مجھے ابھی تک نہیں پہچانا۔ اگر حکومت نے مجھے مسجد تک جانے دیا تو ضرور جاؤں گا، وہاں اذان دونگا، کسی اکالی نے میرے سینہ میں نیزہ مارنا چاہا تو بخدا بزدل نہ پاؤ گے، سینہ تان دونگا، مسلمان حقیقت حال سے واقف نہیں، جن لوگوں نے یہ ناٹک رچایا تھا وہ جانتے ہیں کہ شہید گنج کا حل خون خرابہ میں نہیں تھا، انہوں نے سب کچھ الیکشن جیتنے کے لیے کیا اب جہر طلب ہیں۔

چودھری صاحب نے کہا:

مظہر علی فیصلہ کر چکے ہو تو ٹھیک ہے، جماعت کے رضا کار تمہارے ساتھ ہیں۔

مظہر علی مقررہ تاریخ پر رضا کاروں کا ایک دستہ لے کر وزیر خان کی مسجد سے نکلے اور دہلی دروازہ کے باہر گرفتار ہو گئے اس کے بعد پانچ پانچ رضا کاروں کا دستہ ہر روز گرفتار ہوتا رہا، اتحادِ ملت کے رہنما جو موچی دروازہ کے باغ میں دنگل کرا رہے تھے اب غائب تھے

سب کے طوطے اُڑ گئے، جائیں کہاں ؟ کوئی خم ٹھونک کر سامنے نہیں آ رہا تھا، سب رستم، سب اسفندیار اور سب سہراب فقر و ہو گئے، تیسرے چوتھے روز ہائی کورٹ سے مسلمانوں کا مرافعہ بھی خارج ہو گیا، اتحادِ ملّت کے لیے کوئی جگہ نہ رہی، مولانا ظفر علی خاں نے مجلسِ مشاورت بلائی تو سب غائب، فون پر فون کر رہے ہیں، کوئی ساتھی نہیں آ رہا۔

مولانا نے رضاکاروں کی ایک مختصر سی مجلسِ مشاورت بلائی، اس میں اعلان کیا کہ سول نافرمانی کے سوا کوئی طریقِ کار نہیں رہا، لیکن جیل کون جائے ؟ سب کنی کترا رہے تھے ـــــ مولانا نے قرعۂ فال میرے نام ڈالا، مَیں نے عرض کیا مجھے رہا ہوتے ابھی دو ہفتے ہی ہوتے ہیں، کسی اور کو زحمت دیجیے، آخر زمیندار کے ایڈیٹر خدا بخش اظہر جو اتحادِ ملّت کے بھی جنرل سکرٹری تھے، ہتھے چڑھ گئے، انہیں مسجد وزیر خاں میں لے جایا گیا، وہاں احراریوں نے زندہ باد کے نرغہ میں لے کر قربانی کر دی۔

مقدمہ خارج ہُوا تو مسلمانوں نے وزیر خاں کی مسجد میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ چودھری افضل حق جلسہ کے صدر تھے، شہر بھر کا ہُوا تھا، مَیں بھی جلسہ میں چلا گیا، لوگوں نے مجھے دیکھا تو شورش شورش ہونے لگا، یہ پہلا موقع تھا کہ مَیں نے کسی احرار رہنما کی صدارت میں تقریر کی اور اعلان کیا کہ پنجاب کی وزارت نے کوئی مفاہمتی قدم نہ اٹھایا تو میں عید الاضحیٰ کو شہید گنج کے بجائے سکندر حیات کی کوٹھی پر جتھہ لے کر جاؤں گا۔ وہ مسلم لیگ کے اجلاسِ پٹنہ میں شہید گنج پر مسلمانوں کا حق تسلیم کر چکے اور اب بطور وزیرِ اعظم شہید گنج واپس دلانے کے ذمّہ دار ہیں، یُوں بھی بحیثیت مسلمان ان کا دینی فرض ہے کہ سامنے آئیں اور بتائیں کہ اِس قضیۂ نامرضیہ کا کوئی حل ہے ؟ کیا قید و بند غریبوں ہی کے لیے ہے، انہی کے بیٹے جیلوں کے لیے رہ گئے ہیں، جب سردار صاحب شہید گنج کی واگذاشت کا عہد کر چکے ہیں تو پھر ان کی حکومت ان نوجوانوں کو کس لیے قید کر رہی ہے، جو شہید گنج کی بازیابی کے لیے کوشاں ہیں"

میرے اس اعلان سے تہلکہ مچ گیا، ملک برکت علی بھی اسی مسجد میں اعلان کر چکے تھے کہ شہید گنج کا نتیجہ مسلمانوں کے خلاف نکلا تو وہ ۱۸۵۷ء کا غدر مچا دیں گے، یہ دو آتشہ تھا، مَیں تقریر کر کے گھر آگیا، ناگہاں چودھری برکت علی مالک و مدیر "ادب لطیف" آگئے۔

"شورش صاحب، آپ کو چودھری صاحب یاد کرتے ہیں"

"کون چودھری صاحب؟"

"چودھری افضل حق"

"کہاں ہیں؟"

"دفتر احرار میں"

مَیں قدرے جھجکا، کبھی دفتر احرار میں نہیں گیا تھا، ٹال مٹول کرنی چاہی، لیکن چودھری برکت علی بہ اصرار لے گئے، احرار کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا، ایک چھوٹے سے کمرے میں بان کی بدحال چارپائی پر چودھری صاحب آلتی پالتی مارے بیٹھے اور کچھ نوجوان ان کے گرد حلقہ باندھے کھڑے تھے، چودھری صاحب نے کہا:

"سبحان اللہ — بھئی مَیں نے تو پہلی دفعہ تقریر سُنی ہے، ہمارا خیال تھا خطابت احرار ہی کا ورثہ ہے اور ہم سے کوئی آگے نہیں لیکن تم نے حد کر دی ہم سے چار قدم اور آگے نکل گئے ہو، تمہارا ٹھکانا اتحاد ملت میں نہیں، سوشلسٹ پارٹی میں ہے۔ میں خود غرض ہوتا تو کہہ سکتا تھا تمہارا صحیح مقام احرار میں ہے لیکن تمہارے دل میں جو آگ سلگ رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہاری جدوجہد کا حقیقی محور کوئی انقلابی جماعت ہی ہو سکتی ہے۔"

ظاہر ہے کہ چوہدری صاحب میرا حوصلہ بڑھا رہے تھے، احرار نوجوان ان کا اشارہ پاتے ہی چلے گئے، میرا احرار کے بارے میں وہی تصوّر تھا جو اتحادِ ملّت کے اکابر نے بنا دیا تھا، چودھری صاحب کے متعلق بتایا گیا تھا کہ احرار کے شاطر ہیں، لیکن ان کی باتیں سُنیں اور سادگی دیکھی تو کیف سا پیدا ہو گیا۔

ان سے رخصت ہو کر گھر پہنچا تو ابّا جان نے بتایا کئی لوگ پھیرے ڈال چکے ہیں "زمیندار" سے دو دفعہ آدمی آ چکا ہے کہ مولانا یاد کر رہے ہیں، مَیں اُلٹے پاؤں دفتر زمیندار گیا، تو مولانا ظفر علی خاں اپنے صاحبزادے اختر علی خاں کے ساتھ موٹر پر کہیں جا رہے تھے، معلوم ہُوا سکندر حیات نے یاد کیا اور تشریف لے گئے ہیں، کوئی گھنٹہ بھر میں مولانا لوٹے، اچانک چودھری افضل حق بھی چند رضا کاروں کی معیّت میں آ گئے" مولانا کا ڈرائنگ روم کچھ زیادہ وسیع نہ تھا، چودھری صاحب فرش پر بیٹھ گئے، اور مولانا سے کہا،

"مولانا، خیریت ہے؟ آپ نے یاد فرمایا تھا"

"جی ہاں کچھ باتیں کرنی ہیں"

"فرمائیے"

"بھئی یہ کیا، آپنے بے وقت راگنی چھیڑ دی ہے؟

چودھری صاحب مسکرائے، بے وقت کی راگنی؛ مولانا آپ نے تو ہماری لاش پر ڈھول پیٹے ہیں۔

کوئی ڈھائی گھنٹے ان کے مابین گفتگو ہوتی رہی، چودھری صاحب کا استدلال اور گرفت دونوں مضبوط تھے، مولانا نے ان کی ہر بات تسلیم کی، چودھری صاحب نے مولانا سے کہا اور وہ مان گئے کہ

(۱) شہید گنج کے انہدام میں سرکاری ہاتھ تھا۔

(۲) اس کے حصول کا طریقہ کبھی سول نافرمانی نہیں تھا، اور نہ ہو سکتا ہے۔

(۳) حصول کا صحیح طریقہ آئینی اور صرف آئینی ہے، یا سکھوں کے ساتھ مصالحت، جسے پہلے ہی دن طیش میں آکر ختم کر دیا گیا۔

(۴) اتحادِ ملت میں جو لوگ اکٹھے ہوئے تھے وہ مخلص نہیں تھے، اکثر خود غرض، مطلب پرست، جاہ طلب، کاسہ لیس اور منتقم تھے۔

مولانا نے چودھری صاحب سے کہا "میں تسلیم کرتا ہوں کہ صورتِ حال یہی تھی لیکن اب اس سے کیونکر چھٹکارا ہو سکتا ہے؟"

چودھری صاحب نے کہا "مولانا، میں آپ کے تدبر کی داد دیتا ہوں، آپ نے کانٹوں کا ہار اپنے گلے سے اتار کر مسلم لیگ کے گلے میں ڈال دیا، یہ تنہا آپ کے بس کا روگ نہیں تھا۔ آپ اطمینان سے بیٹھیے، اب مسلم لیگ قوم کے سامنے جوابدہ ہے۔"

مولانا چودھری صاحب کی اس بات پر بہت خوش ہوتے، حسبِ معمول انگلی پہ دائرہ بناتے ہوئے فرمایا:

"جی ہاں، میرے پیشِ نظر یہی تھا، اس قضیہ کے حل کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی —— اور ہاں میں ابھی سکندر حیات سے مل کے آیا ہوں، وہ چاہتے ہیں کہ آپ سول نافرمانی بند کر دیں، اس دردسری سے فائدہ؟

چودھری صاحب چونک گئے، ان کا لہجہ پہلے کی بہ نسبت ذرا تلخ ہو گیا۔

"مولانا معاف کیجیے آپ لوگوں نے سارے پنجاب میں ہمیں تماشا بنایا، جس تیر سے چاہا ہمیں گھائل کیا،

چودھری صاحب اچانک رک گئے، پھر فرمایا:

"آپ کا ارشاد تھا کہ مسجد سول نافرمانی سے مل سکتی ہے، ہم نے اختلاف کیا، اس پر آپ کا اخبار، آپ کے ساتھی، آپ کی جماعت ہم پر سب و شتم کرتے رہے،

ہمارے لیے جینا مشکل ہو گیا، گو ہماری رائے یہی ہے کہ سول نافرمانی سے شہید گنج نہیں مل سکتی لیکن اب ہم نے آپ کی رائے قبول کرلی ہے، اور آپ ہیں کہ اپنی ہی رائے سے منحرف ہو رہے ہیں، آپ چاہتے ہیں کہ سول نافرمانی بند کر دی جائے، تو لاہور کے جلسۂ عام میں اعلان فرمایئے کہ شہید گنج کا حل یہ نہیں، مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم سول نافرمانی بند کر دیں گے، اور اگر آپ عوام میں جانے کو تیار نہیں تو ہمارے لیے اٹھایا ہوا قدم واپس لینا مشکل ہے، دعا کیجیے اللہ تعالیٰ آپ کی رائے اور ہماری قربانی قبول فرمائیں۔

بات ختم ہو گئی، مَیں بھی چودھری صاحب کے ساتھ اُٹھ کر آ گیا، میرا تاثر ان کے متعلق اُجلا ہوتا گیا، مَیں مولانا ہی کا عقیدت مند تھا، لیکن مَیں نے محسوس کیا کہ مولانا انشا پرداز ہیں، سیاستدان نہیں، چودھری صاحب کی باتیں گویا فہم و فراست کا آمیختہ تھیں۔

مَیں ہر روز جلسۂ عام میں اپنا یہ مطالبہ دہراتا کہ سکندر حیات کے نزدیک اس قضیے کا حل کیا ہے؟ اگر وہ مسلمانوں کو مسجد نہیں دلا سکتے تو مستعفی ہو کر وزارتی تعطّل پیدا کر دیں؛ اتحاد ملّت اور وزارت دونوں میرے اس مطالبہ سے پریشان تھے، اور مَیں کسی طرح ان کے ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا، مولانا کا خیال تھا کہ ان کا گرویدہ ہوں مجھے منانا مشکل نہیں ہوگا، لیکن وہ اس سے بے خبر تھے کہ تیر ان کے ترکش سے نکل چکا ہے۔ میری جھنجلاہٹ میں ایک اور واقعے نے سختی بلکہ نفرت پیدا کی، مولانا ظفر علی خاں کے پوتے مسٹر منصور علی خاں دوسرے تیسرے روز چودھری صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے:

"آپ کو دفتر میں چھوٹے اباجی (مولانا اختر علی خاں) اور مولانا غلام رسول مہر یاد کرتے ہیں"

چودھری صاحب نے کہا:

"بھئی میں بیمار ہوں، انہیں کہیے یہیں آ جائیں"

تھوڑی دیر میں اختر علی خاں اور مولانا مہر آ گئے، چودھری صاحب نے مجھے عقب

کی ایک کوٹھری میں چھپا دیا۔

مہر صاحب نے کہا:

"افضل حق، یہ قضیہ کیا شروع کر دیا ہے؟ سکندر تم سے ملنا چاہتا ہے"؟

چودھری صاحب نے کہا:" وہ شوق سے تشریف لا سکتے ہیں"۔

چودھری صاحب یہ بھی کوئی ملاقات کی جگہ ہے"؟ مہر صاحب بولے

"تو پھر کہاں مل سکتے ہیں"؟

"سردار صاحب کی کوٹھی پر چلتے ہیں"

"جی نہیں، میں وہاں نہیں جاؤں گا، اوّل تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، دوم وہاں جانا میرے لیے مصیبت بن جائے گا" چودھری صاحب نے کہا۔

"کیا مفروضے قائم کر رکھے ہیں آپ نے"؟ مہر صاحب بولے۔

"مہر صاحب کل کلاں کوئی اخبار نویس بزرگ یہ لکھ دے کہ افضل حق سکندر حیات کی کوٹھی پر سول نافرمانی کی قیمت لینے گیا تھا، چونکہ معاملہ طے نہیں ہو سکا لہٰذا احرار وزارت کو بلیک میل کر رہے ہیں تو اس صورت میں میرے پاس کونسی طاقت ہے کہ اسے روک سکوں، عوام میرے ساتھ نہیں کہ انہیں یقین دلا سکوں۔ اخبار شروع دن سے جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ آپ جانتے ہیں ـــ" چودھری صاحب کہا۔

مولانا اختر علی خاں نے چودھری صاحب کی بات سن کر لاحول پڑھا اور کہا:

"آپ کیا کہہ رہے ہیں چودھری صاحب"؟

چودھری صاحب کا رنگ سرخ ہو گیا" میں وہی کہہ رہا ہوں جو آپ کر چکے اور کر رہے ہیں، معاف کرنا مجھے سب سے زیادہ آپ سے خطرہ ہے، کیونکہ زمیندار خرید و فروخت کے فرضی وثیقے شائع کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ احرار پر جو اُفتاد آئی ہے اس کا سرچشمہ زمیندار اور صرف زمیندار ہے،

اختر علی خاں اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے ——— چودھری صاحب نے میرا ذکر چھیڑنا چاہا تو اختر علی خاں نے ایک اور لاحول پڑھی:

"کیا کروں ابّا نے اِن لڑکوں کو مُنہ زور کر دیا ہے، کہاں شورش کہاں سکندر حیات! چودھری صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں، چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک، اِن لونڈوں کو دو سیکنڈ میں ٹھیک کیا جا سکتا ہے ———"

مولانا مہر کے زور دینے پر چودھری صاحب راضی ہو گئے کہ وہ سکندر حیات سے ملنے کو تیار ہیں لیکن علّامہ اقبالؒ کے مکان پر اور یہی طے پایا وہ اٹھ کر چلے گئے، مَیں باہر نکلا، تو چودھری صاحب میری طرف استفہامیہ انداز میں دیکھ رہے تھے ——— "سُن لیا میرے عزیز یہ ہیں بزرگانِ سیاست اور رہنمایانِ صحافت! چودھری صاحب نے شہید گنج کا سارا قضیہ، پس منظر، پیش منظر اور تہہ منظر سنایا، مَیں سُن کر کانپنے لگا۔ ہر گوشہ مجھ پر صاف ہو گیا۔ اگلے دن چھ بجے شام "سکندر افضل" ملاقات کا وقت تھا، مَیں نے اُس روز بھی نماز ظہر کے بعد وزیر خاں کی مسجد میں اپنے عزم کا اعادہ کیا اور کہا کہ عید اضحیٰ میں چند دن باقی ہیں، ایک سو رضا کاروں کا جتھہ لے کر سکندر حیات کی کوٹھی پر جاؤں گا" اخباروں میں اِس اعلان سے ہنگامہ برپا تھا۔

چودھری صاحب نے مجھے ساتھ لیا اور علّامہ اقبال کے ہاں گھنٹہ پہلے چلے گئے فرمایا، دس منٹ پہلے لوٹ آنا، علّامہ گاؤ تکیہ کی ٹیک لیے بیٹھے تھے، حقہ کی نَے مُنہ میں تھی، علّامہ نے کہا:

"اوتے افضل حق ایہناں خنزیراں نوں ایتھے کیوں بلایا ای،

(افضل حق! اِن خنزیروں کو یہاں کیوں بلایا ہے؟)

چودھری صاحب بولے:

"ڈاکٹر صاحب، اونہاں خنزیراں نے مینوں ایتھے بلایا اے۔"

(ڈاکٹر صاحب اِن خنزیروں نے مجھے یہاں بلایا ہے)

"تے ایہہ کوئی سُوراں دا باڑا اے" ڈاکٹر صاحب نے کہا

(یہ کوئی سوروں کا بھٹ ہے)

چودھری صاحب مُسکرا دیئے، قدرے توقف کیا، پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"ڈاکٹر صاحب یہ شورش کاشمیری ہے"

ڈاکٹر صاحب نے نگاہ اٹھائی، ہُونہہ! سکندر کی کوٹھی پر یہی جا رہا ہے۔

"جی ہاں"

ڈاکٹر صاحب، پھر وہی اُونہہ ——— ٹھیک ہے بھئی،

مَیں ڈاکٹر کے ہاں یہ کوئی دوسری یا تیسری دفعہ آیا تھا لیکن ان کی ہیبت نے اتنا مبہوت کر دیا کہ مجھ پر ان کا دبدبہ طاری ہو گیا، اور مَیں مورتی کی طرح منجمد ہو گیا، اتنے میں نواب شاہنواز ممدوٹ کی کار آ گئی، علی بخش کرسی لے آیا، ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا:

"تشریف رکھیے، کیوں بھئی میرا مکان اِن بلاؤں کے لیے رہ گیا ہے؟ آپ کی اپنی کوٹھی بھی تو ہے؟

"ڈاکٹر صاحب! چودھری صاحب کو آپ ہی کے ہاں اکٹھا ہونے پر اصرار تھا" نواب صاحب نے کہا۔

چھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ مَیں اُٹھ کے آ گیا۔

چودھری صاحب بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں واپس آ گئے، گفتگو کا ملخص بیان کیا، فرمانے لگے، سکندر عوام میں جا کر یہ کہنے کو تیار نہیں کہ شہید گنج کا حصول اس طرح ناممکن ہے، آئینی ذرائع ختم ہو چکے ہیں، سول نافرمانی اس کا حل نہیں، وہ ہمارے

کندھوں پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتا ہے، ہم کیسے تیار ہو سکتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے بھی سکندر کو ڈانٹا اس سے کہنے لگے "بھئی اِس فقیر کے مکان کو اپنی اسلام دشمنیوں کا مرکز کیوں بناتے ہو؟ کوئی اور راستہ لو" چودھری صاحب نے بتایا کہ میری سکندر حیات سے تو تکار ہو گئی، وہ مجھے بالواسطہ دھمکانا چاہتا تھا مَیں نے ٹکا سا جواب دیا کہ ع

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

گھر پہنچا تو میاں فیروز الدین احمد انتظار میں بیٹھے تھے، مولانا ظفر علی خاں کے ہاں ساتھ لے گئے۔ مولانا نے فرمایا:

"شورش یہ کیا کر رہے ہو؟ احرار بے ایمان ہیں، انہوں نے تمہیں ورغلایا ہے، آخر سکندر کے دل میں بھی اسلام کا درد ہے، کیوں اس کی خفگی مول لیتے ہو، تمہاری تقریروں سے وہ بہت خفا ہے۔"

مَیں نے عرض کیا:

"مولانا مجھے کسی خفگی کی پروا نہیں اور نہ اس سے بحث ہے کہ احرار بے ایمان ہیں۔ سوال ہمارے امتحان کا ہے، کیا شہید گنج کی مسجد اب کعبہ کی بیٹی نہیں رہی؟ اس کی بازیابی ساقط ہو گئی ہے؟ آخر ہمیں کس لیے قید کرایا گیا؟ بیسیوں بے گناہ نوجوان کس خوشی میں شہید کرائے گئے؟ ان کا لہو کس کی گردن پر ہے؟ کیا وہ اپنے والدین کی اولاد نہیں تھے؟......"

دل اس وقت درد سے لبریز تھا، آنکھیں غصّہ کی حدت سے شعلہ بنی ہوئی تھیں اور دماغ کھول رہا تھا۔

مولانا! میرے جذبات کی شدت کو پا گئے، پینترا بدلا، فرمایا:

"دیکھو، شاگرد اور بیٹے ہو، ضد چھوڑ دو، اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔"

میاں فیروزالدین نے بھی مولانا کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کی۔ میں دونوں کے "اصرار و التماس" سے چکرا گیا۔ آخر یہ عرض کرکے اُٹھ آیا: "بہت اچھا صبح عرض کروں گا"۔ رات بھر سو نہ سکا، مَیں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے بت توڑ دیئے تھے، الٰہ العالمین، ہم کن لوگوں میں گھرے ہوتے ہیں، انہی لوگوں سے قومیں بنتی ہیں؟

اپنی خانہ ویرانی پر غور کیا، عجب دن تھے جن پر ہم گزر رہے تھے، ایک ویران احاطہ، اس میں سات کوٹھریاں، ان میں سے ایک کوٹھری چار روپے ماہانہ کرایہ پر لے رکھی تھی جس میں سات افراد کا کنبہ رہ رہا تھا، کس شاخ سے ٹوٹے اور کس ٹہنی پہ آ رہے تھے؟ احاطے بھر میں ایک ہی بیت الخلا تھا، مجھے قبض رہنے لگا اور بواسیر ہو گئی، ایک ہی نل تھا، ہینڈ پمپ، کوٹھری میں روشندان تک نہ تھا، بسا اوقات دن کو بھی لیمپ جلانا پڑتا، اچھے دن جلد ہوا ہو جاتے ہیں، مصیبت کا پانچواں برس تھا، بہنوں کو نہانا ہوتا تو چارپائیوں پر چادریں ڈال کر غسل خانہ بناتیں، ہم لوگ ہر روز مسجد کے غسل خانوں میں نہاتے، اسی کوٹھری میں دادی اماں نے دم توڑا تھا غرض ؏

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی،

دادا جان بیمار پڑ گئے، جیب میں چار پیسے نہیں تھے کہ علاج کرتے، تقدیر نے تماشا بنا رکھا تھا، صحن کوئی تھا نہیں، گرمیوں میں اندر ہی سوتے، آدھی رات آنکھوں میں کٹ جاتی، گتّے کا پنکھا جھلاتے؟ گھڑے سے پانی ختم ہو جاتا تو گلی سے باہر مسجد میں جاتے، ایک دفعہ ہیڈ کانسٹیبل نے پکڑ لیا، آدھی رات میں کہاں سے آ رہے ہو؟ خیریت ہوئی کہ پہچان لیا ورنہ آدھی رات حوالات میں کٹتی ———

قدرت نے مجھے ایک عجیب سانچے میں ڈھالا تھا، میں جانتا ہی نہیں تھا کہ دستِ سوال بھی پھیلایا جا سکتا ہے یا لوگ روپیہ دیں تو قبول کیا جا سکتا ہے، یا پھر چندے کے نام پر جو رقم جمع ہوتی وہ کھانے پینے یا بندر بانٹ کے لیے ہوتی ہے، میں اس سے عمری

تھا، پہلے عادتاً پھر فطرتاً اب عقیدتاً بحمداللہ میرے دامن پر ایسا کوئی داغ نہیں ہے۔
سوچتا رہا اور سو گیا، صبح خلافِ معمول بہت دیر سے اٹھا، گیارہ بجے دن، کوئی پونے بارہ بجے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا، تو گلی کے نکڑ پر ایک چنی فروش تھا، اس نے چھٹتے ہی طعن دیا:

"واہ جی بھاگ گئے نا؟"

کچھ نہ سمجھا، آگے بڑھا تو ایک پانفروش کی آواز آئی:

"بیٹھ گئے نا؟"

ذرا ایک پھل فروش نے آوازہ کسا:

"اجی کنگلا تھا، بچھڑ پہ کچھ مل گیا ہوگا"

غرض موری دروازہ سے لوہاری دروازہ تک پہنچتے پہنچتے مغلظات کا ایک ڈھیر ہو گیا، ابین الدین صحرائی نے بغل سے گالی لڑھکاتے ہوئے کہا:

"آخر پیسے لے لیے نا؟"

میں بھونچکا رہ گیا، یا اللہ کیا معاملہ ہے؟ صحرائی نے زمیندار دکھایا۔ پہلے صفحہ میں چوکھٹا لگا ہوا تھا:

"سردار سکندر حیات کی کوٹھی پر جتھا لے کر جانے کی جو خبریں بعض اخباروں نے مجھ سے منسوب کی ہیں وہ غلط ہیں، میں نے کسی تقریر میں کبھی اعلان نہیں کیا ہے"

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ——— اتنی بھونڈی تردید اور اتنا سفید جھوٹ، میری آنکھوں میں خون اتر آیا، لوگ گالیاں دینے میں حق بجانب تھے، میں اتنے دنوں اعلان کرتا رہا اور اب یہ قطعی جھوٹ چھپا ہوا تھا لوگوں کا برہم ہونا قدرتی امر تھا۔

مَیں سیدھا دفتر احرار پہنچا، چودھری صاحب نے مصافحہ تو کیا لیکن محسوس ہوا کہ سردمہری سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔

"چودھری صاحب! مَیں نے ابھی آدھ گھنٹہ پہلے زمیندار پڑھا ہے — خدا گواہ مجھے اس کا علم ہی نہیں، سب جھوٹ ہے، مَیں تردید لکھتا ہوں۔ اخبار دن میں بھجوا دیجیے، جلسۂ عام میں خود تردید کر دوں گا،

چودھری صاحب بھی ششدر رہ گئے، فرمایا:

"تمہاری عزت کو نقصان پہنچانے کی شرمناک حرکت کی گئی ہے اس سے بچ نکلنا اور اس کی تلافی کرنا اب تمہاری اپنی ہمت پر موقوف ہے۔"

مَیں نے کہا، چودھری صاحب مَیں ضرور جھگڑے کر جاؤں گا، خواہ قیامت ٹوٹ پڑے مجھے کوئی روک نہیں سکتا، آپ براہِ کرم تردید بھجوا دیجیے، میں ذرا دفتر زمیندار سے ہو آؤں، کہ انہیں یہ جسارت کیسے ہوئی؟ دفتر "زمیندار" میں پہنچا تو وہاں مولانا اختر علی خاں غائب تھے، مولانا ظفر علی خاں اوپر تھے، دفتر میں علّامہ حسین میر کاپی جوڑ رہے تھے، مَیں نے واہی تباہی بکنا شروع کیا کہ میرے نام سے ایک غلط بات کس طرح چھپ گئی، علّامہ صاحب نے کہا:

"گرم کیوں ہوتے ہو؟ مولانا ظفر علی خاں نے لکھا اور میں نے چھاپا ہے"،

مَیں نے مولانا سے ملنا چاہا، جواب آیا دو گھنٹے تک نیچے آئیں گے، قیلولہ فرما رہے ہیں۔ مَیں غصہ میں تن کے بیٹھا رہا، مولانا آئے،

"مولانا یہ خبر کس نے دی ہے؟"

"میں نے!"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ مَیں نے تمہیں منع کر دیا تھا۔"

"لیکن اس خبر سے تو آپ نے مجھے اُن ہزاروں مسلمانوں کی نگاہ میں گرا دیا ہے جن کے سامنے مَیں ہر روز اعلان کرتا رہا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، لوگوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ آؤ سکندر حیات کے ہاں چلتے ہیں وہ تمہیں ملنا بھی چاہتا ہے۔"

—— "جی ہاں! مَیں عید کے دن ملنے جاؤں گا۔"

"پھر وہی بچوں کی سی بات!"

مولانا نے ڈرائیور کو بلوایا، کار آگئی، بازو سے پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ بٹھایا اور سکندر حیات کی کوٹھی پر لے گئے۔

سردار صاحب نہایت تپاک سے ملے، مَیں تلخ ہوا تو وہ مکدر ہو گئے۔ نتیجۃً مَیں تھوڑی دیر میں اُٹھ کر باہر آگیا، پیدل گھر پہنچا، وہاں سے چودھری افضل حق کے ہاں گیا اور انہیں سارا قصہ سنایا۔

اگلے ہی دن شاہی مسجد میں جلسۂ عام تھا، ہزارہا لوگ جمع تھے۔ مَیں نے ایک زبردست تقریر میں "زمیندار" کے اعلان کی مذمت کی، جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا:

(۱) ہندوؤں کے سرکاری اور غیر سرکاری افراد قومی تحریکوں میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق حصہ لیتے اور باہمی اشتراک کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں کا معاملہ اس کے اُلٹ ہے جو لوگ قومی جدوجہد میں حصہ لیتے یا کسی اسلامی مسئلہ پر قربانی کرتے ہیں ان کے خلاف مسلمانوں کے سرکاری خاندان میں میخ نکالتے، انہیں رسوا کرتے اور روڑے اٹکاتے ہیں۔ نتیجۃً عوام اِن اُمراء کے فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

(۲) مسلمانوں کے خواص کا گروہ کبھی قومی کارکنوں کی اعانت نہیں کرتا، نہ انہیں قریب قریب پھٹکنے دیتا ہے اور نہ ان کا احترام کرتا ہے، رہ گئے سرکاری ملازم تو وہ انگریزوں کی منشا کے خلاف کوئی کام کرنا جُرم سمجھتے ہیں۔

(۳) انڈین نیشنل کانگرس کی پشت پناہی ہندو عوام و خواص ہی نہیں، ہندو افسر و اہلکار تک کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے سرکاری افسر مسلمانوں کی تحریکوں اور کارکنوں کی تباہی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

(۴) حکومت نے کرپان رکھنے پر پابندی لگا دی تو سکھوں نے مورچہ لگا دیا، پنجاب کونسل کے ڈپٹی پریذیڈنٹ نے بھی اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ نتیجۃً سکھ جیت گئے لیکن وزارتی اور سرکاری مسلمان شہید گنج کے مسئلہ پر منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔

(۵) آپ نے سنا ہوگا کہ جب کسی زمین پر ایک دفعہ مسجد بن جاتی ہے تو وہ فرش سے عرش تک مسجد ہو جاتی ہے، اور یہ شرعی مسئلہ ہے۔ شہید گنج مسجد ہے۔ اس کے منہدم کرنے والے اللہ کے نزدیک ظالم ہیں اور ظالموں کی اعانت کرنے والا خود ظالم ہوتا ہے۔ ظلم کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا دینی فرض ہے۔

(۶) شہید گنج کا حصول ہر مسلمان پر واجب ہے۔

(۷) تمام مسجدیں خانہ کعبہ کی بیٹیاں ہیں، وہ مسلمان جو ان کی بے حرمتی کے بعد خاموش بیٹھتا ہے، ضعفِ ایمان کا مریض ہے۔

(۸) مداخلت فی الدین ہو تو مسلمانوں پر جہاد فرض اور آرام حرام ہو جاتا ہے۔

(۹) کیا اسلام کے لیے قربانی و ایثار اور جہاد و جنگ مجھ جیسے عاجز مسلمانوں کے لیے رہ گئے ہیں، ان مسلمانوں کا کوئی فرض نہیں جو اسلام کے نام پر فوائد حاصل کرتے اور قال اللہ و قال الرسول کی روٹیاں توڑتے ہیں۔

(۱۰) کیا علماء کا فرض مسجد کی حرمت پر وعظ کرنا رہ گیا ہے، امراء کا مقصد اس کے نام پر وزارت بنانا تھا اور اخبار نویس گلگونہ سرخیاں بیچ کر ٹکے کھرے کرنے کے لیے ہیں؟ ان کے لیے احتجاج فرض نہیں؟

میں تقریر کر چکا تو سندھ کے ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس خان بہادر ضیاءالدین اسٹیج پر آگئے، میرا منہ چوم لیا، مجھ سے معانقہ کیا اور اعلان کیا کہ :

"اس نوجوان کی تقریر نے اتنا متاثر کیا ہے کہ میں خان بہادری کا خطاب ترک کرتا ہوں۔"

نعرہ ہائے تکبیر سے مسجد کا صحن گونج اٹھا، خان بہادر ضیاءالدین، مولوی صلاح الدین احمد ایڈیٹر "ادبی دنیا" کے بڑے بھائی اور مسٹر ریاض احمد سی ایس پی کے والد تھے، پروفیسر ملک عنایت اللہ جلسہ کی صدارت کر رہے تھے، نواب سر شاہنواز ممدوٹ کے منشی نے ان کے کان میں کھسر پھسر کی، ملک صاحب نے کہا "نواب صاحب ممدوٹ ہم دونوں کو بلا رہے ہیں۔"

"کب اور کہاں ؟"

"رات کھانے پر بلایا ہے۔"

میں رضامند ہو گیا، چنانچہ وقت پر موٹر آگئی، ملک عنایت اللہ اور حاجی امین الدین صحرائی بھی موٹر ہی میں تھے، اُن کے ساتھ نواب صاحب کے ہاں پہنچا تو انہیں منتظر پایا۔ نواب صاحب نے مجھے کان میں کہا کہ میں نے صرف تمہیں یاد کیا تھا، یہ لوگ خواہ مخواہ آگئے ہیں۔ سکندر حیات آنا چاہتے تھے، اب نہیں آرہے وہ تمہیں علیحدگی میں ملنا چاہتے ہیں، کل صبح آئیں گے۔ آٹھ بجے صبح چلے آنا۔

کھانا کھایا، باتیں کیں، نواب صاحب یہی زور دیتے رہے کہ سردار صاحب سے اُلجھنا بیکار ہے، زورِ خطابت مقصود ہو تو کئی نشانے ہیں، مثلاً پنجاب کے اضلاع کا دورہ کیجیے، مسلمانوں کو تیار کیجیے اور کہیے کہ اب کے گائے کی قربانی کریں تاکہ ہندوؤں اور سکھوں کو احساس ہو کہ ایک قوم کے جذبات کو ٹھیس پہنچا کر کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟ ان کے خیال میں مسجد کے انہدام پر سکھوں کے خلاف احتجاج کا یہ بھی ایک طریق تھا، میں نے انکار

کیا، نواب صاحب چپ ہوگئے، جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالا، میرے ہاتھ میں تھمانا چاہا۔ فرمایا "تانگہ کا خرچ ہے!"

میں نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا، "قبلہ ہم آپ کی کار میں آتے ہیں، تانگہ کا خرچ نوٹوں کی تھئی نہیں ہوتی، یہاں سے کل آٹھ آنے لگتے ہیں، میں اپنے دونوں ساتھیوں کو چھوڑ کر باہر نکل آیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر آگیا۔

اگلی صبح حسبِ وعدہ نواب صاحب کے ہاں پہنچا، سردار صاحب کا چہرہ اُن کے طُرّے کی طرح مسکرا رہا تھا، لب و لہجہ میں مٹھاس اور کہنے سننے میں شرافت، فرمایا:

"کس اُلجھن میں پھنس گئے ہو؟ شہید گنج کے لیے سکھوں کو ہراساں کرنا ہے تو گائے کی قربانی بہترین نسخہ ہے۔"

"آپ ملک میں فساد کرانا چاہتے ہیں؟"

"بالکل نہیں، یہ حربہ شہید گنج کے واپس دلانے میں ممد ہو سکتا ہے؟"

"اس کا لازمی نتیجہ فرقہ وار فسادات ہیں اور آپ مجھے ایک فسادی مقرر کے طور پر جیل میں ڈالنا چاہتے ہیں۔"

سردار صاحب مسکرائے، "یہ نہیں ہوگا" میں ذمہ داری لیتا ہوں، تمہارے خلاف کچھ نہیں ہوگا اور اگر قید ہوئی تو بی کلاس میں یہی دو چار مہینے۔"

میرے منہ سے نکل گیا۔ "میرے گھر والے کہاں جائیں گے؟"

نواب ممدوٹ نے بات اُٹھا کر فرمایا:

"آپ کے ہاں ہر ماہ سو روپیہ پہنچتا رہے گا۔"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا، شاید ان کا خیال ہو کہ میں رام ہو گیا ہوں، فوراً ماتھے پہ ہلکی سی شکن ڈال کر عرض کیا:

"جناب جذبے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور عشق روپے کی چیز نہیں

سردار صاحب عوام سے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ شہید گنج کا صحیح حل کیا ہے ؟"
سردار صاحب نے مجھے کئی طرح رام کرنا چاہا، لازماً میرا معاشی مستقبل چمک سکتا اور ہم اُس خانہ ویرانی سے نکل سکتے تھے جس نے ہمیں گھیر رکھا تھا لیکن مَیں انہیں دو ٹوک جواب دے کر آ گیا۔ گھر پہنچا تو میاں فیروز الدین احمد راہ دیکھ رہے تھے، کہنے لگے:

"میرے ساتھ چلو"

"کہاں ؟"

"بس چلو ؟"

کھینچ کھانچ کے میرزا معراج الدین کے ہاں لے گئے، میرزا صاحب نے مسٹر ہنیبٹ یا ویس (غالباً یہی نام تھا) ڈپٹی انسپکٹر جنرل (سی آئی ڈی) سے ملایا۔ پہلے تو سر سے پاؤں تک گھورتا رہا۔ لہجہ حاکمانہ تھا، کہنے لگا:

"اوہ، بالکل نوجوان، دیکھو میں تمہیں اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی کر لیتا ہوں، سال بعد سب انسپکٹر ہو جاؤ گے، ہمارے ساتھ کام کرو، اس محکمہ میں ترقی کے بہت سے مواقع ہیں۔"

مَیں نے جواب دیا:

"آپ سے میرا کوئی جھگڑا نہیں، مَیں تو اپنی قوم کے نمائندوں سے ایک ایسے جھگڑے کا حل پوچھنا چاہتا ہوں جس جھگڑے کی وجہ سے بیسیوں نوجوانوں کا خون بہا ہے۔"

قصہ کوتاہ ان کا جادو بھی نہ چل سکا اور ہم جلد ہی باہر آ گئے۔ میاں صاحب وہاں مجھے کیوں لے گئے ؟ اندازہ نہ کر سکا لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ وہ کیا ہیں۔ باہر آ کر مجھے شاباش دیتے رہے کہ تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔

چودھری صاحب کو یہ سب کچھ سنا کر نکلا تو ایک اجنبی مل گیا، کہنے لگا آپ مجھے

نہیں جانتے لیکن میں آپ کو جانتا ہوں، آج فلاں شخص تمہیں سنیما چلنے پر زور دیگا، وہ بظاہر تمہارا دوست ہے لیکن اس کے ساتھ جانا نہیں، تمہیں پھانسنے کے لیے سازش کی گئی ہے۔

سازش یہ تھی کہ سنیما میں ایک پردہ دار خاتون ساتھ کی نشست پر بیٹھی ہوگی
اس کے اردگرد کچھ مقررہ لوگ ہوں گے، اچانک وہ خاتون شور مچا دے گی
کہ تم نے اس پر ہاتھ ڈالا ہے، اس پر وہ لوگ تمہیں پیٹیں گے۔ معاً پولیس
آجائے گی اور تم پکڑے جاؤ گے۔ نتیجۃً صبح عید کا پروگرام رہ جائے گا۔"

میں یہ سن کر کانپ اٹھا، دوسرے شو سے ذرا پہلے وہی دوست آگیا، اور سنیما چلنے کے لیے اصرار کیا، میں نے انکار کر دیا، اس نے بہتیری منتیں کیں لیکن میں کسی طرح بھی راضی نہ ہوا حتیٰ کہ تلخی ہوگئی۔ اور وہ دوست ایک ایسا شخص تھا ، جس نے احرار کے فرضی خطوط بنائے، میرزا بشیر الدین محمود کے پاس بیچے اور ہمیشہ چودھری ظفر اللہ خاں کے حاشیہ میں رہا تھا۔

عید اضحیٰ آگئی ـــــ میں حسبِ اعلان سو رضا کاروں کا جتھہ لے کر روانہ ہو گیا۔ ابوسعید انور ـــــ مولانا ظفر علی خاں کی طرف سے پہلی دفعہ عیدی کا چیک لائے، میں نے فخر و ناز کی پونجی سمجھ کر جیب میں رکھ لیا، اُن دنوں نیلا گنبد سے آگے جہاں آج کل بینک اسکوائر ہے ایف سی کالج تھا، وائی ایم سی اے اور ایف سی کالج کے تراہے پر پولیس کی بھاری جمعیت نے روک لیا، گاردیں زنجیر بن کر کھڑی ہوگئیں، مسلح پولیس کے دستوں نے گردو پیش کا احاطہ کیا، مسلح لاریاں جنرل پوسٹ آفس کے آس پاس کھڑی تھیں، آناً فاناً پولیس آفیسر بھی پہنچ گئے، ڈپٹی انسپکٹر جنرل سے لے کر سٹی انسپکٹر تک۔

اس زمانے میں ایک صاحب میرزا محمد باقر سٹی کوتوال تھے، ہر لحاظ سے شریف انسان، پوچھا:

"آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"سردار سکندر حیات کی کوٹھی پر"

"کیوں؟"

"عید کی مبارک باد دینے"

"آپ منتشر ہو جائیں"

"ہم منتشر ہونے سے انکار کرتے ہیں"

"مجمع خلافِ قانون ہے"

"کس نے خلافِ قانون قرار دیا ہے"

ایک مجسٹریٹ نے آگے بڑھ کر کہا" دفعہ ۱۴۴ کے تحت آپ کو منتشر ہو جانے کے لیے کہا جاتا ہے، چلے جایئے، ورنہ پانچ منٹ بعد آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا"

تمام رضاکار پنجابی اور پٹھان تھے، بہادر، دلیر، اشجع۔ سب نے ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈال کر حلقہ بنا لیا، پولیس نے قدم بڑھائے تو سب جلیبی کی طرح پیوست ہو کر لیٹ گئے۔ اِدھر اُدھر ہزار ہا لوگوں کا ہجوم نعرے لگا رہا تھا، پولیس کے لیے رضاکاروں کو الگ کرنا مشکل ہو گیا، پولیس کے بعض دستوں نے لوگوں پر ہلکا سا لاٹھی چارج کیا، لوگوں میں سے بعض نے پتھراؤ کرنا چاہا، دو ایک نے تلواریں سونت لیں، مَیں نے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"پولیس پر سنگباری کرنا، تلواریں نکالنا، مقابلہ کرنا ہمارے مقصد کے خلاف ہے، آپ لوگ دس دس گز پیچھے ہٹ جائیں، ہم نے گرفتاری کے لیے اپنے آپ کو خود پیش کیا ہے، آپ امن کے ساتھ گھروں کو جایئے اور بچوں کے ساتھ عید منایئے"

پولیس نے بہت جتن کیے۔ ایک ایک رضاکار کو پانچ پانچ سپاہی اُٹھانے لگے لیکن حلقہ توڑنا مشکل ہو گیا، مَیں ان سب کے وسط میں تھا، آخر ڈیڑھ گھنٹے کی تگ و دو

کے بعد لاریوں میں لاد کر چیئرنگ کراس کے تھانے میں لے گئے۔

پولیس آفیسر مجھے ساتھیوں سے الگ کر کے کہیں اور لے جانا چاہتے تھے لیکن رضاکاروں کی مدافعت کارگر ہو گئی اور میں محفوظ ہو گیا، دن بھر بھوکا رہنا پڑا، شام کو لاہور سنٹرل جیل بھجوا دیا گیا، جہاں ہمیں سیاست خانہ کی چکیوں میں رکھا گیا، عید فاقہ ہی میں گزر گئی، ایک بجے شب سالن بغیر فی نفر دو روٹیاں دی گئیں، سبھی بھوکے تھے، پانی کے ساتھ کھا گئے۔

صبح اُٹھ کر ہم نے شور مچایا کہ ساتھیوں میں رکھو، افیسر پہلے تو ٹال مٹول کرتے رہے، بالآخر سپر انداز ہو گئے۔ مولانا مظہر علی اظہر، قاضی احسان احمد اور سینکڑوں احرار رضاکار حوالات کے احاطہ میں رہ رہے تھے، انہوں نے نعروں سے جیل گونجا دیا، ہم نے آسمان سر پر اٹھا لیا، پٹھان رضاکاروں نے ہوا میں لوہے کی تھالیاں اُڑانا شروع کیں، ایک شور مچ گیا، اکٹھے ہوئے تو احاطہ میں میلہ لگا ہوا تھا، مولانا مظہر علی اظہر کو اے کلاس دی گئی تھی، انہوں نے رضاکاروں کے ساتھ سی کلاس میں رہنا پسند کیا، منحنی جُثّہ، سیدھا سادا لباس، واجبی خدوخال لیکن ان کے وجود میں ایک ایسا ولولہ پوشیدہ تھا جس کا تذکرہ تو بہت پڑھا ہے لیکن اس کی انسانوں میں نظیر شاذ ہی دیکھی ہے۔

اظہر امرتسری بی کلاس میں ٹکے ہوئے تھے، میں ان کے پاس جا کر انہیں بھی اٹھا لایا، لیکن وہ چند دن ساتھ رہ کر بی کلاس میں واپس چلے گئے۔

صوفی عنایت محمد پسروری، راولپنڈی میں جوہر وسمہ مہندی کے "موجد" تھے، وہ کانگرس، خلافت، احرار، اتحاد ملت، سب جماعتوں میں رہ چکے تھے، کوئی تحریک چلتی قید ہو جاتے، برطانوی حکومت سے انہیں سخت نفرت تھی، میں جتھا لے کر انارکلی سے آ رہا تھا، راستہ میں مل گئے، میں نے مصافحہ کیا اور انہیں بھی ساتھ کھینچ لایا، اب یہاں ہمارے ساتھ ہی پڑے تھے، وہ ان لوگوں میں سے تھے جن سے غیرت کو حیا، ہمت کو اعتماد

اور تحریک کو تقا ملتی ہے، ہمارے خلاف دفعہ ۴۴۱ توڑنے کا مقدمہ چلا، تو مجسٹریٹ نے رضا کاروں کو دو دو ماہ قید سخت اور مجھے چار ماہ قید سخت کا حکم سنایا، سزا سنتے ہی ہم نے برٹش راج مُردہ باد اور انقلاب زندہ باد کے نعروں سے فضا کو ہلا دیا، ایف سی بورن ڈپٹی کمشنر دفتر سے نکل آیا، بھاگ سنگھ کورٹ پی ڈی ایس پی لال پیلا ہونے لگا:

بورن نے کہا ——— "تُم کیا کرتا ہے؟"

مَیں نے جواب دیا: "ہم نعرے مارتا ہے"

"او یُو" بورن نے غصّہ میں کہا۔

"او ہم" اور مَیں مسکرا دیا۔

بورن نے نتھنے پھلا دیئے، کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اتنے میں ایک اور رضا کار نے چٹکی لی، اُس نے کچھ ایسی آوازیں نکالیں کہ بورن چڑکر دفتر چلا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کو شکایت لکھی، اُن دنوں سپرنٹنڈنٹ جیل پنجاب کے مشہور کانگرسی لیڈر رائے زادہ ہنسراج کے بیٹے کرنل ایس ڈی سوندھی تھے۔ سوندھی نے مجھے طلب کیا:

"تمہاری شکایت آئی ہے!"

"جی ہاں! مَیں نے نعرے لگوائے ہیں، لیکن جیل میں نہیں، کچہری میں، مسٹر بورن مجھے خود سزا دیں، ایک ہندوستانی کا سہارا کیوں لے رہے ہیں؟ آپ کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتے ہیں۔

سوندھی ہنس پڑا اور ٹکٹ پر وارننگ لکھ دی۔

دوسرے تیسرے روز گجرات سے میرے خلاف ۱۲۴ الف کے وارنٹ آ گئے، لاہور سے اٹھا کر مجھے گجرات چالان کر دیا گیا۔ وہاں لالہ لکھمی چند ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ چلتا رہا اور ایک سال قید سخت کی سزا ہو گئی۔ مَیں سزا پا کر لاہور سنٹرل جیل واپس آ گیا۔

قید کی پوری کہانی "پسِ دیوارِ زنداں" میں آچکی ہے، ایک سال اور چار ماہ کے ان قیدی دنوں میں سبقاً سبقاً بہت کچھ پڑھا، میرے خیالات نسبتاً واضح ہو گئے، بعض افکار میں پختگی آگئی۔ میں یہ تہیہ کر کے نکلا تھا کہ اب ان عناصر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ہوگا جن کے چہروں سے نقابیں اتر چکی ہیں اور جن کی سیرتیں میرے سامنے کما حقہٗ آشکار ہو گئی ہیں، میں نے اپنے سیاسی سفر کے لیے احرار کو منتخب کیا، جو شہید گنج کے ہاتھوں پٹ چکے تھے، لیکن میرے نہاں خانۂ خیال میں ان کے اعمال و افکار کی سچائیوں کے بہت سے نقش مرتسم ہو رہے تھے، میں نے احرار میں شمول کا قطعی فیصلہ کر لیا، چنانچہ رہا ہوتے ہی میں نے اعلان کر دیا کہ احرار کے ساتھ ہوں، اور احرار ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کا سیاسی فکر اور سیاسی سفر میرے مذاق سے ہم آہنگ ہے۔

۲۷ رفروری ۱۹۴۹ء پہلا دن تھا کہ میں نے احرار میں شمول کا اعلان کیا۔ احرار رضا کاروں نے سنٹرل جیل سے رہائی پر جلوس نکالا، اگلے روز جلسہ کیا، مجھے سپاسنامہ پیش کیا، میں نے اپنے خیالات کے تغیرّ اور دَورِ ماضی کے تجربات پر ایک نپی تُلی تقریر کی۔

اتحادِ ملت تقریباً مر چکی تھی، مسلم لیگ نے آنکھیں کھولیں اور اس پر ابھی جوبن نہیں آیا تھا۔ نواب شاہ نواز ممدوٹ نے امرتسر کے میر عبداللہ کو میرے پاس بھیجا۔ میر صاحب امرتسر میں سونا بیچتے تھے، ہم لوگ مولانا ظفر علی خاں کے ہمراہ اکثر انہی کے ہاں ٹھہرا کرتے، آجکل میر صاحب لاہور میں بیڈن روڈ پر مقیم ہیں، وہ میرے پاس آئے اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنا مدعا بیان کیا:

"مجھے نواب ممدوٹ نے بھیجا ہے وہ چاہتے ہیں کہ تم لیگ میں آجاؤ۔ تمہاری مالی امداد بھی کرنے کو تیار ہیں، انہیں تمہاری حالت کا احساس ہے اور چاہتے ہیں تمہیں رہنے سہنے کے لیے ایک چھوٹا سا مکان لے دیں، پہلے مالی حالت سدھارو، پھر سیاسی بکھیڑوں میں پڑنا، لیگ کو نوجوان مقررون

کی ضرورت ہے، نواب صاحب نے مجھ سے پکا وعدہ لیا اور تمہارے پاس بھیجا ہے ــــ"

میر صاحب ایک سچے دوست ہی نہیں بلکہ بالطبع ایک مخلص، ایماندار، صاحب دل اور مخیّر انسان تھے، مَیں نے انہیں دو ٹوک جواب دینا مناسب نہ سمجھا، اُن سے کہا شورش کی آنکھوں پر، نواب صاحب کے سوال کا جواب سیّد عنایت شاہ ہی دے سکتے ہیں، مَیں انہی کے مشورہ سے کوئی قدم اٹھاتا ہوں، آیئے ان کے پاس چلتے ہیں۔

ہم دونوں شاہ صاحب کے پاس گئے، میر صاحب نے اُن سے علیحدہ گفتگو کی، شاہ صاحب نے نواب صاحب کی ہر پیش کش مسترد کر دی، کہنے لگے نواب صاحب میرے بیٹوں کے متعلق اس قسم کا سودا کریں تو شاید مجھے انکار نہ ہو لیکن میں شورش کے متعلق اس قسم کا خیال بھی اپنے دماغ میں نہیں لا سکتا، میں اس خیال کو باطل کرنا چاہتا ہوں کہ ہر غریب خریدا جا سکتا اور ہر کارکن کی قیمت ہوتی ہے۔

میر صاحب نے شاہ صاحب کو ہر چند راضی کرنا چاہا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ شورش نے آپ کے احترام کو ملحوظ رکھا اور صرف جواب دلوانے کے لیے میرے پاس لایا ہے۔

مولانا ظفر علی خان سے عقیدت کے باوجود میں نے اتحادِ ملت کو انتہائی نفرت سے چھوڑا، یہ کوئی جماعت ہی نہ تھی، نوجوان مخلص تھے، بڈھے نٹ کھٹ، ان شغالوں نے شیروں کا لہو بیچ دیا تھا، اپنی ذہنی کشمکش اور واقعاتی صورتِ حال کا ذکر تو آئندہ صفحوں میں ہوتا ہی رہے گا لیکن ذاتی نوعیت کے بعض واقعات اسی موڑ پر آجائیں تو بہتر ہے، ان کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ نوجوانوں کو اندازہ ہو کہ سیاسی سفر میں کن کن مرحلوں، کن کن منزلوں، کن کن رہنماؤں اور کن کن سانحوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

میر مقبول دسردار شوکت حیات کے خسر) سے عندالملاقات پتا چلا، کہ ایک

بزرگ سردار سکندر حیات سے دو سو روپے لے آئے تھے کہ شورش سے اتنی رقم پر معاملہ ہو گیا ہے، اب وہ عید کے دن جھک مارنے کہیں نہیں جائے گا، اس رقم ہی کا کرشمہ تھا کہ میرے نام سے زمیندار میں فرضی اعلان چھپا تھا، اور مجھے عیدی کے صرف پانچ روپے ملے تھے۔

ایک اور بزرگ ڈاکٹر ستیہ پال سے میری اعانت کے نام پر دو سو روپے ہتھیا لائے اور کھا گئے، یہ صاحب احرار میں تھے نہ اتحاد ملت میں، چودھری افضل حق نے میرے گھر کی حالت کا احساس کرتے ہوئے کچھ روپے بھجوائے، اباجان نے انکار کر دیا، فرمایا، میں نے اپنے بیٹے کو یومیہ مزدوری پر نہیں بھیجا ہے۔

ہم لوگ عسرت کے نرغے میں ضرور تھے، لیکن بفضلہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہ تھے، اس سارے عرصہ میں جو کچھ ملا یہ تھا کہ مولانا ظفر علی خان نے پانچ روپے عیدی بھیجی، مولانا اسحاق مانسہروی نے زری کی جُوتی عنایت کی، بیرونِ لاہور مجالس اتحاد ملت کے جو لوگ تقریر پر بُلاتے وہ آمد و رفت کا کرایہ عنایت فرماتے، ایک دفعہ اپنی عادت اور فطرت کے خلاف میاں فیروز الدین سے بیس روپے قرض مانگے وہ کئی روز ٹالتے رہے، تیسرے چوتھے روز سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے پندرہ روپے عنایت کیے اور ایک کاغذ پر دستخط لے لیے۔ احساس پر چوٹ تو شدید لگی لیکن زہر کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہا۔ میں نے اچھے دنوں میں میاں صاحب سے ان دستخطوں کا ذکر کیا تو کہنے لگے ملک لال دین قیصر نے کچھ روپے مستحق دوستوں کو بانٹنے کے لیے دیئے تھے وہ دستخط ان کی خاطر لیے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے پانچ سال کاٹ کے رہا ہوا تو حکومت نے پیسہ اخبار میں نظر بند کر دیا، ایک دن میاں صاحب تشریف لائے، اور سو روپے کا نوٹ پھینک کر چلے گئے۔

اتحاد ملت کی جماعت عاملہ نے سب کا ماہانہ الاؤنس مقرر کیا، خود مجھے ایک بار تیس روپے ملے تھے، میں قید ہو گیا تو ملک لال خاں صاحب (جنرل سیکرٹری) نے ایک دفعہ ہمارے گھر میں وہ تیس روپے بھجوا دیئے، الحاج امین الدین صحرائی لاہور کی ایک

عجیب وغریب شخصیّت تھے، پہلے سیّد حبیب کے حاشیے میں رہے پھر مولانا اختر علی خاں کے سائے میں چلے گئے —— حجاز سے ایک انگوٹھا چپل لاتے تھے مجھے تحفۃً عنایت کی، کچھ دنوں بعد بگڑ گئے، گریبان پکڑ لیا —— "لاؤ میری چپل"؟ اُس وقت میرے پاؤں میں وہی چپل تھی، مَیں نے فوراً اُتار دی، صحرائی نے مجھے زور سے تھپڑ مارا، پُرانی ہو چکی ہے، قیمت ادا کر دو، چپل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟ بہر حال اُن کا غصّہ ٹھنڈا ہو گیا وہ چپل لے کر چلے گئے اور میں ننگے پاؤں گھر آ گیا۔
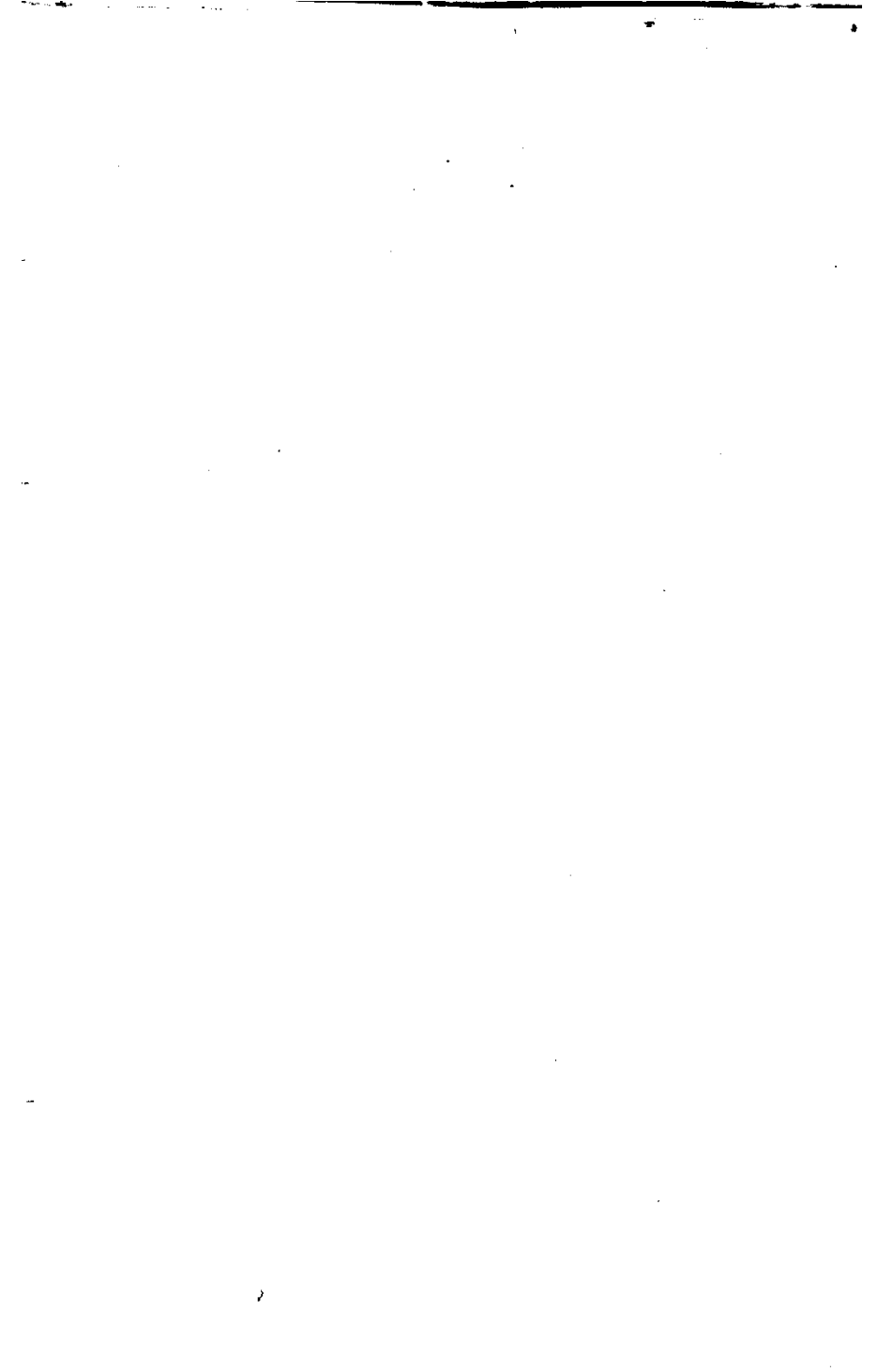
ایک تجربہ — ایک مُطالعہ

۱۶ رجولائی ۱۹۳۵ء سے ۲۶ رفروری ۱۹۳۹ء تک تقریباً چار سال مجھے ایک عمیق مطالعے اور ایک تلخ تجربے سے گزرنا پڑا۔ میں جو کچھ بن رہا اس سانچے ہی سے نکل رہا تھا لیکن جو کچھ دیکھا اور جو کچھ پرکھا اُس نے مجھے دماغی طور پر ہلا دیا تھا۔

شہید گنج اب ایک فراموش شدہ افسانہ ہے۔ اس کے بہت سے کردار رفتہ رفتہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، مرحومین کے کفن پھاڑنا اور قومی رُسوائیوں کو اُچھالنا میرے نزدیک مُستحسن نہیں، لیکن تاریخ نام ہے قوم کے حافظے کا، انسانوں کے تجربے بڑی چیز ہوتے ہیں، لوگ دوسروں کے تجربے سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور نہ اُن سے سبق لیتے ہیں بلکہ خود تجربہ کرتے ہیں، لیکن اس قسم کے تجربے ضرور محفوظ رہنے چاہییں۔ ہمارے ملک میں ان تجربوں کو محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہی تجربے ممکن ہے کبھی نئی پود کے لیے غلطیوں سے اجتناب کا ذریعہ بن جائیں، اور لوگ اُن رہبروں سے بچیں جن کی رہزنی ڈھکی چھپی ہوتی ہے، لیکن جن کے خط و خال برہنہ ہوتے ہیں تو ان کے دشنہ و خنجر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، میں نے شہید گنج کی تحریک سے جو کچھ حاصل کیا وہ یہ تھا کہ

۱۔ میری زندگی کا ایک راستہ متعین ہو گیا اور میں نے ذہنی طور پر فیصلہ کر لیا کہ مجھے سیاسیات ہی میں حصہ لینا ہے۔

۲۔ میں نے اپنے اندر ایک ولولہ، ایک جذبہ اور ایک استقامت پیدا کر لی، جس نے

مجھے قربانی کا حوصلہ بخشا۔

۳۔میرے مطالعے، مشاہدے اور تجربے میں وسعت اور تنوع پیدا ہوگئے، میرے افکار پختہ ہونے لگے۔

۴۔خیالات کا پرانا سانچا ٹوٹنے لگا اور نیا سانچا استوار ہوگیا۔

۵۔میں نے اپنے افکار و اعمال کے محور و مرکز تبدیل کر لیے۔

۶۔برطانوی سامراج کے خلاف جو لہریں ابتدا ہی سے میرے دماغ میں کروٹیں لے رہی تھیں اور جن کو میں منضبط، مرتب اور متشخص نہیں کر سکا تھا ان کا خاکہ اُبھرنے لگا۔

۷۔سیاسی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں کے متعلق میرا تصور یکسر بدل گیا۔

۸۔جن لوگوں کو جذبات کے آئینہ خانہ میں اپنا محبوب تصور کرتا تھا، ان کی تصویریں مجھے عام انسانوں کی تصویریں معلوم ہونے لگیں۔

۹۔مجھے یقین ہوگیا کہ شہید گنج کا سانحہ محض سیاسی شاطروں کی مہرہ بازی کا کرشمہ تھا، اور اس میں پرایوں کے علاوہ خود اپنے بھی جُوا کھیلتے رہے ہیں۔

۱۰۔اپنے صوبہ کی مسلمان اکثریت کے متعلق میری تمام امیدیں ڈھے گئیں، مسلمان عوام کے متعلق میرا حُسنِ ظن کبھی نہیں ہلا اور نہ ان کے اندرونی ولولوں سے مجھے کبھی بدظنی ہوئی، لیکن ان کی ذہنی تربیت پر مجھے کبھی اعتماد نہیں رہا، مجھے یقین ہوگیا کہ مسلمان انفرادی طور پر بہادر اور کوتاہ اندیش ہے لیکن اجتماعی طور پر بزدل اور مصلحت کوش ہے۔

۱۱۔مسلمانوں کے مختلف طبقے مختلف الاصل مزاج رکھتے ہیں، عوام جذباتی ہیں لیکن مثبت اقدار پر کم اکٹھے ہوتے اور ان کا اعتماد و ارادت دیرپا نہیں ہوتے، خواص بالفطرت عوام سے ایک مختلف گروہ ہیں، مذہبی طبقہ (چند روشن چہروں کے سوا) منبر و محراب کا سوداگر، اوامر کا حریف اور نواہی کا حلیف ہے، ان کی معرفت جو مذہب مسلمانوں تک پہنچتا ہے وہ مذہب نہیں کچھ اور ہے، انگریزی پڑھے لکھوں میں اسلامی حمیت اور قومی

شجاعت کی کمی ہے، اُمراء ملّت کا سب سے ناکارہ عنصر ہیں، ان سے خوشامد کے سوا کسی جوہر کی توقع ہی عبث ہے، ان کا وجود سرطان کا پھوڑا ہے ـــــــ حکّام جنہیں انگریزوں نے پروان چڑھایا، ان کی وفاداری کا مکمل نمونہ ہیں، ان سے اسلام کے خلاف ہر غدّاری کی توقع کی جاسکتی ہے۔

۱۲۔ پنجاب ایک ایسا خطّہ ہے جہاں حق، حُرّیت، دین اور سچّائی کے خلاف ہر طوفان اٹھایا جاسکتا ہے۔

۱۳۔ مسلمانوں میں من حیث المجموع ایثار کے لیے قدر ہی نہیں۔

۱۴۔ یہاں قومی عزت، سیاسی آبرو، ملکی ناموس اور دینی شرف کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور بڑے بڑے سربستہ راز افسروں کے خندہ ہائے نیم شبی میں گم ہوجاتے ہیں۔

۱۵۔ غریبوں کی جرأت، جسارت، قربانی، استقامت اور صداقت کا شاذ ہی اعتراف و احترام کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ انگریزوں نے پنجاب پولیس کو مسلمانوں کے جن افراد سے مرتب کیا ان کی اکثریت ایسی ہے کہ پناہ بخدا۔

۱۷۔ مسلمانوں کی خانہ ویرانی کے ذمّہ دار ہندو یا سکھ ہی نہیں بلکہ مُسلمان جاگیردار اور حکومت کے اہلکار بھی ہیں۔

۱۸۔ پنجاب کی خاک بڑے انسانوں کے شرف سے محروم ہوچکی ہے۔

۱۹۔ انتخابات نہ ہوتے تو شہید گنج نہ گرتی، سکھوں نے گرائی، حکومت نے گروائی۔ اتحادِ ملّت نے عوام کو جُوا پر لگا دیا، خواص نے مسجد کی زمین اور شہیدوں کا خون بیچا، احرار نے مسلمانوں کے اشتعال کا خمیازہ بھگتا، اخباروں نے ٹکے کھرے کیے، ہم نے قیدیں کاٹیں؛ آخر شہید گنج کا سانحہ تماشا ہوکر ختم ہوگیا۔

۲۰۔ شہید گنج اساسًا ایک مسجد تھی، ممکن ہے مغلیہ عہد میں کسی مسلمان گورنر نے

کبھی یہاں سکھوں کے سر قلم کیے ہوں اُس کی "پاداش" ہی میں شہید گنج سکھوں کی تحویل میں چلی گئی۔ نواب مظفر خاں نے اس پر صاد کیا، پھر اس کی ایک دستاویز تھی جو ملک لال خاں کے ہاتھوں سے نکلی اور اختر علی خاں کے ہاتھوں کھو گئی، مسلمان افسروں نے ہم ایسے نوجوانوں کو انگریزوں کی خوشنودی کے لیے پیٹا، آخر مسلمان وزارت نے معاملہ ختم کر ڈالا۔ ایک اہم قرارداد ایک یورپین پادری کی بیٹی سے اختلاط کے جرم میں ختم ہو گئی۔ سکندر حیات نے اعلان کیا کہ شہید گنج کی مسجد مسلمانوں کو واپس کی جائے تو سارے ہندوستان میں ایسی بہت سی مسجدیں مسلمانوں کو ہندوؤں کے حوالے کرنا ہوں گی جن کی بنیادیں مندروں پر استوار ہوئی ہیں۔ آغاز میں احرار بھی یہی کہتے تھے، کسی نے سُنا تک نہیں، یہی الفاظ سکندر نے کہے تو کانگرس ہائی کمانڈ نے مبارک باد کا تار بھیجا، لطف یہ کہ شہید گنج اب بھی اُسی طرح پڑی ہے، اور اس سب سے بڑی اسلامی سلطنت میں سکھوں کی ملکیت تسلیم کی جاتی ہے۔

بہر حال شہید گنج کی بدُعا آخر کار اُن تمام عناصر کو کھا گئی جن کی شخصیتوں کے افراسیابی گنبد اُس کی اینٹوں سے کھڑے ہوئے تھے۔

شہید گنج کے سانحہ کو آج ۴۴ سال ہو چکے ہیں، حافظے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، اور میں صرف حافظے پر انحصار کر رہا ہوں، اُنہی واقعات کو چھیڑا ہے جو میرے حافظہ میں رہ گئے یا میری ذات سے متعلق ہیں، یا جن کے سیل میں سے گزر چکا ہوں، بعض چیزوں کی تفصیل عمداً ترک کر دی ہے۔ ایک تو ان کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں، دوسرے اُن کا خاکِ نسیاں میں دفن ہو جانا ہی بہتر ہے، بعض سنگین پہلو سیاسی بدمزگی کے باعث ترک کر دیئے ہیں، بعض عقیدتوں کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچانے سے عمداً احتراز کیا ہے۔ کئی چیزیں ایسی ہیں جنہیں بالارادہ چھوڑ دیا ہے، مٹی اڑانے سے فائدہ؟ عموماً اجتماعی حالات اور اجتماعی نتائج کو ملحوظ رکھا ہے، اس کہانی میں تاریخ و تبصرہ دونوں کی آمیزش ہے، سچ بولنا بڑا خطرناک ہے، سچ سے زیادہ کوئی شے کڑوی نہیں، سچ بہر حال سچ ہے لیکن ہر وقت اور ہر مقام پر سچ بولنا بالخصوص سیاسیات میں مہلک بھی ہے اور مُضر بھی! سچ کے لیے ہمیشہ دو کی ضرورت ہے، ایک وہ جو سچ بولے، دوسرا وہ جو سچ سُنے، سچ تب ہی مکمل ہوتا ہے! یہاں سچ بولنے والے کم ہیں لیکن سچ سُننے والے کمیاب ہیں بلکہ نایاب، اکثر سچائیاں صرف اس لیے ناکام ہو گئیں کہ ان کے پاس طاقت نہ تھی، بیشتر جھوٹ اس لیے سچ ہو گئے کہ انہیں طاقت نے پروان چڑھایا۔ "آخری فتح سچ کی ہوتی ہے"، ہمارے دور میں یہ مقولہ کبھی بارآور نہیں ہوا۔ "سانچ کو آنچ نہیں" تو نئی زمانا اس قسم

کے خوبصورت فقرے کتابوں کے صفحات پر ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں، حقائق سے ان کا برائے نام تعلق ہے۔ تاریخ بجائے خود کوئی شے نہیں، وہ ان حالات و واقعات اور حادثات و سانحات کے مجموعہ پھر تجزیے کا نام ہے، جو ایک خاص عہد میں ایک خاص معاشرہ کو پیش آتے ہیں۔

آج کل سچائی قوت کی مرضی اور حق طاقت کی خواہش کا نام ہو گیا ہے ——

مولانا ظفر علی خاں اور "زمیندار" نے ابتدائی طور پر سیاسی مذاق کا چسکا ڈالا اور ذہن اسی آب و گل سے تیار ہوتا رہا، شہید گنج تک میرے تاثر کا بڑا حصہ انہی کا مرہون تھا۔ یوں بھی زمیندار کا دامن میرے لیے وسیع رہا۔ مولانا نے اپنے قلم کی فیاضیوں سے مجھے نوازا لیکن ایک طلسم جو ان کے متعلق میرے ذہن میں تھا وہ قریب آ کر ٹوٹ گیا، مولانا کی طبیعت میں تلوّن تھا، تلوّن نہ ہوتا تو جس پایہ کے وہ انسان تھے اُسی پائے کی شخصیت ہوتے۔ وہ انشا پرداز اور ہنگامہ ساز تھے، ان کا دماغ ایک سیاستدان کی بہ نسبت ایک شاعر کا تھا۔ پنجاب ان کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اگر تذکروں کو ان کے نام سے محروم رکھا جا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کی اپنی زندگی سازشوں کا نتیجہ ہے اور جو بجائے خود کوئی مابہ امتیاز خصوصیت نہیں رکھتے۔ مولانا سے ہر اس شخص نے اپنا قرض چکایا جو ان کی ناوک افگنی کا شکار رہا۔ مثلاً میرزائی جنہیں پاکستان میں اقتدار یا رسُوخ حاصل ہے اور جو ہمیشہ سے سیاسی کاسہ لیس، علم کے بہروپیے اور عمل کے اپاہج رہے ہیں، بلاشبہ ہم آزاد ہیں۔ لیکن ہماری آزادی ناقۂ انقلاب کے محمل سے اغوا کی گئی ہے اور اغوا ان لوگوں نے کی ہے جن کا ضمیر و خمیر برطانوی استعمار کے ہاتھوں رہن رہا ہے۔

مولانا بھی انسان تھے، عقیدت آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔ اگر انہیں انسان سمجھ کر رابطہ پیدا کیا جاتا تو شاید مایوسی سرعت سے نہ آتی اور بددلی بھی شدید نہ ہوتی،

ان کی کمزوریاں ایک انسان کی کمزوریاں تھیں، لیکن ان کی خوبیاں غیر معمولی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے پنجاب کے مزرعۂ ویران کو سرسبز کیا، مگر پنجاب نے اعتراف سے روگردانی کی، جہاں تک سیاسی لہروں کے اُچھلنے، قومی بیداری کے اُبھرنے اور اسلامی عشق کے مچلنے کا تعلق ہے ظفر علی خاں سے زیادہ کوئی شخص پنجاب میں سرفہرست نہیں رہا، اور جس حد تک گمنامی کا تعلق ہے ان سے زیادہ کسی شخص کے خلاف سازش نہیں کی گئی، اپنے ماضی کی شرمندگی کے باعث یگانوں اور بیگانوں نے ان کے مقام کو ابھی تک متعین نہیں ہونے دیا، ان کی جفائیں تو زبانوں پر آجاتی ہیں لیکن وفائیں "حسابِ دوستاں" ہو چکی ہیں۔

ان کے علاوہ شہید گنج میں جن بزرگوں اور عزیزوں کو دیکھا اُن سے کئی ایک تجربے حاصل کیے۔ سب سے بڑھ کر انسانی فطرت سے شناسائی کا ملکہ پیدا ہُوا، جو چیزیں کتابوں سے حاصل نہیں ہوتیں یا مطالعہ کی وسعتیں بھی جنہیں پیدا نہیں کرتیں وہ انسانوں کی اس جمعیت سے حاصل ہو گئیں، ان سے گمشدہ تذکروں کا پتہ چلا، ماضی کی سیاسی تحریکیں سامنے آگئیں۔ افراد کے خاکے معلوم ہوئے، شخصیتوں کی سیرتیں کھل گئیں "حکومت کیا ہوتی ہے؟" کا تجربہ ہوا، عوام و خواص کے فاصلے ظاہر ہو گئے، اکثر سیاسی راز بکھرتے گئے اور میں سمیٹتا رہا، بادۂ دوشینہ کی سرمستیاں اور نشاطِ صبح کی دلفریبیاں بے نقاب ہوتی گئیں، دل آئینہ تھا، ان چیزوں کا عکس پڑتا رہا، لیکن کسی عکس نے رونق پیدا نہ کی، البتہ میرے ذہن کی سیاسی بصیرت اور میرے فکر کی ادبی فراست کو نشوونما و بلوغ حاصل ہوتا رہا۔ نتیجۃً میرے دل میں رہنماؤں کے ذوقِ بادیہ پیمائی کی بہ نسبت رندانِ لاابالی کی لغزیدہ پائی کا احترام بڑھ گیا۔

ڈاکٹر شیخ محمد عالم (اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں معاف کرے) ایک عجیب و غریب انسان تھے، دماغ کے غنی اور دل کے غبی، اپنے سوا کسی کے وفادار نہ تھے، حلق سے اوپر بات کرتے، سیدھی بات جانتے ہی نہیں تھے، اپنی ذات میں اتنے محصور تھے کہ

اُس کے سوا کسی عقیدے، کسی خیال، کسی تحریک، کسی جماعت، کسی رہنما اور کسی مسلک کے وفادار نہ تھے۔ ان کا سیاسی فہم جتنا بلند تھا ان کا اخلاص اتنا ہی پست تھا، طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے، کام نکالا اور رفو چکر ہو گئے۔ سیاسی سفر میں سواریاں بدلتے رہے، کسی ایک جماعت کے وفادار ہوتے تو وہ ان کے لیے مایۂ فخر اور یہ اس کے لیے وجہ مباہات ہوتے، کانگرس نے اپنی ورکنگ کمیٹی میں لے کر احرار کو بدظن کیا لیکن ڈاکٹر صاحب اس کے بھی نہ ہوئے، حالانکہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کی رکنیت ملکی سیاسیات میں بہت بڑا اعزاز تھی ــــ کانگرس میں رہتے تو لازماً ایک روز جواہر لال یا سبھاش چندر بوس کی طرح "راشٹرپتی" بن جاتے لیکن دغا دے گئے، ان کا سیاسی شعور آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود سے کہیں بلند تھا لیکن قانع اور صابر نہ تھے، ان کو حرص نے کٹا ہوا پتنگ بنا دیا، طمع نے ان کی سیاسی زندگی کو اتنا کھوٹا کیا کہ آخر کچوکوں کی تاب نہ لا کر قبل از وقت رحلت کر گئے ــــــ خلافت کی تحریک سے زندگی کا آغاز کیا، اعلیٰ پایہ کے مقرر اور دانشور سیاست دان تھے، لیکن طبیعت میں ٹھکاؤ نہ تھا۔ مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی تو اس کا پہلا شیخ الجامعہ بنایا، لیکن وہاں سے چلے آئے، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا دامن پکڑا، وہ بھی چھوڑ دیا۔ حکیم اجمل خاں کے زمانہ میں لیگ کے ہو گئے، نیگال یوتھ کانگرس کی صدارت کی، گاندھی بھگت ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں ستیہ گرہ کیا، پکڑے گئے، رہا ہوتے تو نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی بنیاد رکھی۔ ملک برکت علی کو صدر استقبالیہ بنا کر صوبائی کانفرنس رچائی۔ "مساوات" اور "تریاق" کے نام سے دو روزنامے نکالے جو کچھ دنوں چلے پھر مرجھا گئے، مولانا عبدالقادر قصوری تمام عمر ان کے سرپرست رہے۔ انہی کی سفارش پر کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہوئے، لیکن ان سے مشورہ کیے بغیر استعفا داغ دیا، سال ڈیڑھ سال چپ رہے۔ شہید گنج کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے صلاح کاروں بلکہ ہدایت کاروں میں ہو گئے۔ قائداعظم نے یونینسٹ پارٹی کے جن ارکان کو بلوا کر لیگ میں شامل کرنا چاہا ان

ہیں ڈاکٹر صاحب بھی تھے، ــــــ قائداعظم نے ان سے کہا

"عالم! اسمبلی میں لیگ پارلیمانی پارٹی باقاعدہ بن گئی ہے، اس میں شامل ہو جاؤ، یاد ہو گا کہ تم نے قرار دادِ پاکستان کی تائید کی تھی"!

ڈاکٹر صاحب نے جواباً کہا: "سوچ کر جواب دیا جا سکتا ہے۔

قائداعظم نے چمک کر فرمایا:

"عالم! کسی پارٹی میں آنے جانے کے لیے کیا تمہیں بھی سوچنے کی ضرورت ہے"؟

ڈاکٹر صاحب اس شدید طنز سے گھبرا گئے اور اپنا سا منہ لے کر لوٹ آئے۔ ڈاکٹر صاحب اصلاً سوانگ رچانے کے بادشاہ تھے، مثلاً پیر جماعت علی شاہ کا ان کے دل میں رتی بھر احترام نہ تھا، لیکن شہید گنج کی تحریک میں ان کے ہاں اس طرح ہوتے جس طرح برہمن اپنے بُت کے سامنے بیٹھا یا کھڑا ہو، مولانا عبدالقادر قصوری کو ہمیشہ اپنا گورو کہتے، لیکن مولانا ظفر علی خاں سامنے ہوتے تو انہیں گورو بنا لیتے۔ ان میں دو خوبیاں کمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔ ایک تو وہ اعلیٰ پائے کے مقرر تھے، دوسرے قانونی بصیرت کے دھنی تھے۔ عموماً قتل کے مقدمات لیتے اور نوے فیصد میں کامیاب ہوتے۔

شہید گنج کا مرافعہ خارج ہوا تو شاہی مسجد میں نمازِ عشاء کے بعد ایک بہت بڑا جلسہ کیا گیا، ڈاکٹر صاحب کانگرس میں شامل ہو چکے تھے، لوگوں نے اعتراض کیا ــــــ الفاظ کی موجوں کو اُچھالتے ہوئے بولے کانگرس میں ضرور شامل ہوا ہوں، لیکن میرا انتخاب شہید گنج کے ٹکٹ پر ہوا ہے اب کانگرس مجھے اپنا ممبر بناتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کانگرس اُس ٹکٹ کو تسلیم کرتی ہے جس ٹکٹ پر میں نے نشست حاصل کی ہے گویا کانگرس نے اصولاً شہید گنج کی بازیابی کا اصول مان لیا ــــــ جہاں تک کانگرس کا تعلق ہے وہ انشاء اللہ مسلمانوں کے موقف کی حمایت کرے گی۔ مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں سردار سکندر حیات شہید گنج پر مسلمانوں کا حق تسلیم کر چکے ہیں، اب اسمبلی میں قرار داد پیش کرنا

ان کی پارٹی کا فرض ہے، اکثریت اُن کی، وزارت اُن کی، مَیں اعلان کرتا ہوں کہ جونہی انہوں نے اس مطلب کی قرارداد پیش کی، کانگرس مخالفت نہیں کرے گی بلکہ ہمنوا ہوگی۔"

نعرہ ہائے تکبیر سے مسجد کا صحن گونجنے لگا۔

مولانا ظفر علی خاں جلسہ کے صدر تھے، ڈاکٹر صاحب نے کہا:

"ہندوستان کو وہی فرقہ وار سمجھوتا قبول ہوگا جس پر جواہر لال نہرو اور مولانا ظفر علی خاں دستخط کریں گے۔"

اگلے روز ٹریبیون نے یہی الفاظ چھاپ دیئے تو اناباش چندر بالی (ٹریبیون کے سٹاف رپورٹر) کو فون کیا۔

"بالی صاحب! بعض باتیں کہنے کی ہوتی ہیں، چھاپنے کی نہیں۔ وہ تو ظفر علی خاں کو خوش کرنے کے لیے کہا تھا ورنہ کجا پنڈت کجا مولانا؟ کوئی نسبت ہے؟"

بالی نے کہا: "ڈاکٹر صاحب آپ نے کہا تھا مَیں نے چھاپ دیا۔"

"نہیں بابا، اس کی تردید کر دو۔" اگلے روز اس کی تردید ہو گئی۔

مَیں نے مولانا سے کہا، سُنا اور خاموش ہو گئے، دوسرے تیسرے روز ڈاکٹر صاحب مولانا سے ملنے آئے تو مولانا نے گِلا کیا۔

"نہیں! مولانا ایسی بات نہیں، جو بات بیس ہزار کے مجمع میں کہی ہے اُس کی تردید یا تائید کی ضرورت ٹریبیون کو ہوگی ہمیں کیا؟ وہ ایک چیز خود چھاپتا خود ہی تردید کرتا ہے، ان چھوٹی باتوں سے آپ کی بڑائی میں کوئی کمی نہ آئے گی، آپ کسی شخص یا اخبار کے قلم یا زبان کے محتاج نہیں۔"

یہی ذہنی عیاریاں تھیں جن کی بدولت ڈاکٹر عالم عبرت کا ورق ہو کر غفرلہٗ ہو گئے۔

مولانا عبدالقادر قصوری پنجاب کے مسلمان رہنماؤں میں بڑے پائے کے بزرگ تھے، مسلک اہلِ حدیث تھا لیکن سیاسی ذہن عمر بھر کانگرسی رہا۔ صوبہ کانگرس کے صدر بھی رہے، مخیّر، نابغہ اور ایثار پیشہ، ہاتھ اتنا سخی کہ صوبہ بھر کے بیشتر سیاسی کارکن اُن سے مستفید ہوتے، مولانا ابوالکلام آزاد اور مہاتما گاندھی دونوں ان کی عزت کرتے، پُرانے وکلاء میں سے تھے، قانونی سُوجھ بوجھ کی بڑے بڑے جج تعریف کرتے، لاہور چیف کورٹ کے چیف جج نے ایک تقریب میں ان کے متعلق کہا تھا کہ قانون میں ان کی نظر اتنی وسیع ہے کہ ان کی فاضلانہ بحث پریوی کونسل میں بھی غایت درجہ دلچسپی اور تحمّل سے سنی جا سکتی ہے، احرار ان سے اور وہ احرار سے برگشتہ رہے، پنجاب کے مسلمان زعماء میں کچلو اور قصوری دو شخصیتیں ایسی تھیں کہ اپنی جائداد بھی سیاسی سفر میں لٹاتے رہے، اور بہت کچھ لٹایا۔

آخری دَور میں کہن سالی کے باعث سیاسیات سے ریٹائر ہو گئے۔ مجلس اتحادِ ملّت کے عام رہنماؤں نے احرار پر تبرّیٰ کرنا اپنا شیوہ بنا رکھا تھا، مولانا عبدالقادر بھی احرار سے خوش نہ تھے لیکن کبھی خلوت و جلوت میں بھی احرار پر سبّ و شتم نہ کیا، نہ ان کی زبان پر کبھی غیبت کے الفاظ آتے، شہید گنج کے مقدمہ میں اکثر قانونی نکات اور ضروری مباحث بھی انہی کے تیار کیے ہوئے تھے۔

پنجاب کے مسلمان رہنماؤں میں مولانا عبدالقادر قصوری، چودھری افضل حق اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی اس قابلیّت کے لوگ تھے کہ پنجاب سے باہر کسی دوسرے صوبے میں ہوتے اور حالات موافق ہوتے تو ان کے فکر و نظر کی رسائی بہت دُور تک ہوتی۔ یہ تینوں بزرگ دماغی اعتبار سے کانگرس ہائی کمانڈ کی سی قابلیت کے لوگ تھے۔

مولانا عبدالقادر ذہناً پنڈت موتی لال نہرو کے ہم پایہ تھے، چودھری افضل حق، سردار پٹیل سے کمتر نہ تھے بلکہ سُوجھ بُوجھ میں اُن سے آگے تھے۔ خواجہ عبدالرحمٰن غازی

نرم خُو ہوتے تو پنجاب میں لاجپت رائے سے شانہ ملا کر چلتے، ان کا وہی مقام ہوتا جو ہندوؤں میں لاجپت رائے کا تھا۔ نہ زمانہ اُن سے موافق رہا، نہ یہ زمانہ سے موافق ہو سکے، افسوس کہ استعمار دشمن مسلمانوں کا وجود بسالت کے نقش جمانے کی بجائے عبرت کی کہانیاں ہو کر رہ گیا، اور یہ غالباً پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی بہت بڑی بدنصیبی ہے۔

ملک لال خاں تحریکِ خلافت کی باقیات میں سے ہیں۔ حافظہ بڑا تیز ہے، ہر دَور کی سیاست میں قدم رکھا، اور اپنا روزنامچہ مرتب کرتے رہے۔ خلافت کی تحریک سے مسلم لیگ کی تحریک تک تقریباً سبھی رہنماؤں کا شجرۂ نسب ان کے پاس محفوظ ہے، ایک زمانہ میں انہیں خلافت کی اماں کہا جاتا تھا، سیاسی تنظیموں میں سکرٹری شپ کے دفتری فرائض خوب ادا کیے، جب تنظیمیں ٹوٹ گئیں یا گورکنارے پہنچیں تو ان کا سارا ریکارڈ اپنی لائبریری میں منتقل کر لیا، یہی اُن کا شعار رہا۔

ملک صاحب ہی نے سب سے پہلے اس امر کا انکشاف کیا تھا کہ ان کے پاس شہید گنج کے متعلق ایک دستاویز تھی جس پر مقدمہ کی کامیابی کا انحصار تھا وہ دستاویز ان سے مولانا اختر علی خاں نے لی، پھر پتا نہ چلا کہاں چلی گئی۔

مجلس اتحادِ ملّت میں جنرل سکرٹری رہے۔ اتحادِ ملّت کا انتقال ہو گیا تو ملک صاحب نے مولانا ظفر علی خاں پر روپے کی وصولی کا دعویٰ کر دیا۔ آخر فریقین کی رضامندی سے مقدمہ ختم ہو گیا۔

ملک صاحب سیاست و خطابت دونوں سے کورے تھے لیکن ہر جماعت میں ایک دفعہ نظامت تک ضرور پہنچ جاتے۔ ان کے دل میں شاذ ہی کسی لیڈر کے لیے (الّا ماشاء اللہ) احترام تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ایک قابلِ قدر بزرگ تھے۔ اپنے سوانح لکھتے تو ان سے قومی تاریخ بہت کچھ حاصل کرتی۔

مولانا محمد اسحاق مانسہروی ——— تحریکِ خلافت میں نکلے، حکومت نے

انہیں گرفتار کیا۔ تو مانسہرہ کا سارا علاقہ گورہ فوج نے گھیر لیا۔ جیل خانہ میں ایسی اذیتیں دی گئیں کہ اُن کی ہڈیاں توڑ دی گئیں ——— امیر المجاہدین کے لقب سے معروف ہو گئے۔

غالباً ۱۹۲۲ء کے بعد سیاسیات سے سبکدوش ہو گئے، ان کے معتقدوں نے راولپنڈی میں مسجد انگوا دی، اسی میں رہتے اور امامت کرتے۔ عمر بھر شادی نہیں کی، بڑی عمر میں وفات پائی، غالباً نوے سال کے لگ بھگ۔ گھوڑیاں پالنے اور پھل والے پودے لگانے کا بہت شوق تھا، اولاد کی طرح اُن کی پرورش کرتے، انتہائی سادہ، غصیل اور غیرت مند سیاسی سوجھ بوجھ کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن جذبہ اور جرأت کے دھنی تھے، ان کا ایک لطیفہ مشہور ہے۔

"فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، پہلے رکوع میں سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سُورۃ بھُول گئے، ڈیڑھ دو منٹ کھڑے رہے، خدا جانے کیا تعطل پیدا ہو گیا کوئی سورت ذہن میں نہ آ رہی تھی ——— معاً ایک دوہا ذہن میں آ گیا ——— قرأت کی اور پڑھ دیا:

——— دیوے وچ تیل نہیں اوں

وسناں ایں کتھے ماہیا

ملنے دی وہل نہیں اوں

اللہ اکبر

(ترجمہ: چراغ میں تیل نہیں، میرے محبوب تو کہاں ہے؟ کیا ملنے کی فرصت نہیں ——— اللہ اکبر

خود فرمایا کہ مقتدیوں میں دن بھر یہی چرچا رہا کہ حضرت نے آج اللہ تعالیٰ سے براہِ راست گفتگو کی ہے۔

سید حبیب کا تفصیلی ذکر میری کتاب "نورتن" میں آ گیا ہے، سید صاحب کی

زندگی حیرت انگیز تضادات کا مرقع تھی، شہید گنج کی تحریک میں بڑے اخلاص سے آئے اور اُس کی بازیابی کے پیسے کو شاں بھی رہے، لیکن ہمراہیوں سے ان کا نباہ نہ ہوسکا، ان کے قلم میں دو ہی چیزیں تھیں، مہربان ہوئے تو محمد شاہ رنگیلا (سیالکوٹ کے ایک عجمی طبیعت مولوی) کو امام العصر بنا دیا، ناراض ہوئے تو مولانا ظفر علی خاں کو عمر بھر گدائے لم یزل لکھتے رہے، سکندر حیات سے اُلجھے تو ان کے خلاف گفتنی و ناگفتنی سبھی کچھ کہہ ڈالا حتیٰ کہ اس لڑائی کے ہاتھوں تباہ ہو گئے ـــ گورنر ایمرسن کے خلاف اس سختی سے لکھا کہ ان کی بے مثال جرأت کا مدتوں چرچا رہا، ہوا یہ کہ مسلمانوں کا ایک وفد گورنر سے ملا۔ روزوں کے دن تھے۔ افطاری کا وقت ہو گیا۔ شاہ صاحب نے پانی مانگا۔ گورنر نے کہا۔

"باہر نل ہے، افطار کر لو۔"

شاہ صاحب نے اگلے روز افتتاحیہ لکھا:

"بدتمیز گورنر" ـــ گورنر کی طرف سے نفسِ واقعہ کی تردید کی گئی۔ شاہ صاحب نے دوسرا اداریہ لکھا "گورنر کا جھوٹ"۔ محکمہ اطلاعات نے ایک اور تردید کی ـــ شاہ صاحب نے تیسرا مقالہ لکھا: "گورنر نے پھر جھوٹ بولا"۔ اب جو ٹھن گئی تو شاہ صاحب آتش کا پرکالہ نکلے، سکندر حیات کو کاٹھ کا اُلو لکھا۔ جسٹس ڈگلس ینگ چیف جسٹس کو آڑے ہاتھوں لیا۔ پیر جماعت علی شاہ کو عمر بھر قبلۂ عالم و عالمیاں لکھتے رہے ان سے شہید گنج کے مسئلہ میں اُلجھ گئے تو رسید تک نہ دی۔ میرزا معراج الدین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی سے ان کے دوستانہ مراسم تھے، ایک دفعہ بگڑی تو آخر وقت تک اُس کے مخالف رہے، پاکستان بن جانے کے بعد خان قربان علی خاں انسپکٹر جنرل پولیس کے خلاف بڑے معرکہ کا افتتاحیہ لکھا اور مطالبہ کیا کہ میڈیکل بورڈ بٹھا کر ان کے دماغ کا معاینہ کرایا جائے، آیا صحیح کام کر رہا ہے یا نہیں؟ مولانا ظفر علی خاں سے اِن کے تعلقات کبھی استوار نہ ہوئے، شہید گنج میں عارضی صلح ہوئی لیکن نقش بر آب۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ چند دن صلح کیسے رہی؟

دونوں میں بُعد المشرقین تھا ــــ شاہ صاحب معاف کرنا جانتے ہی نہیں تھے، لیکن تمام انسانی کمزوریوں کے باوجود وہ ایک بہادر انسان تھے ــــ اس زمانے میں مسلمانوں کے تین پرچے تھے، زمیندار، انقلاب اور سیاست۔ شاہ صاحب سیاست کے مالک تھے، ان میں تحمّل ہوتا تو پنجاب کے بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے، لیکن تحمّل کے فقدان نے انہیں پنپنے ہی نہ دیا، لاہور میں تیس برس تک اخبار نویسی کرتے رہے، مقرر بھی بہت اچھے تھے، لیکن ان کی رحلت اس طرح ہوئی کہ رات سوئے تو صبح اُٹھے ہی نہیں۔ کسی روزنامے کو خبرِ وفات دینے کی توفیق نہ ہوئی، اور جنازے میں بھی گنے چُنے لوگ ہی تھے۔

میاں فیروز الدین کا ذکر بہت جگہ آچکا ہے، بڑے دبنگ انسان تھے، آواز پاٹ دار تھی، خوب تقریر کرتے، نعرے لگانے اور لگوانے میں بے نظیر تھے، باتیں بھی خوب کرتے لیکن ان کی تھاہ پانا مشکل تھا، صیّاد اور صید دونوں کے دوست ہو کر وقت گزارتے، ان کے متعلق شبہات کی فضا ہمیشہ قائم رہی ــــ کئی ریاستوں کے وظیفہ خوار رہے، ایک مرحلہ میں مولانا ظفر علی خاں کو نقصان پہنچا چکے تھے۔ شہید گنج میں اکٹھے ہوتے تو مرتے دم تک ان کا دم بھرتے رہے، مولانا شوکت علی کے مریدِ خاص تھے، کئی لیڈروں کے راز انہی کے ساتھ دفن ہو گئے، انہیں لیڈروں کو راز بنانے اور اُن کے راز چُرانے میں مزہ آتا تھا۔ عوام رس بھی تھے اور حکام رس بھی۔

ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے، جنہوں نے شہید گنج کے معرکہ میں حصہ لیا مثلاً ملتان کے سیّد زین العابدین گیلانی خانقاہ سے نکلے تھے، خانقاہ ہی کو لوٹ گئے، مجاہدانہ طبیعت کے انسان تھے۔ شہید گنج کے بعد ان کی گونج اور گرج دونوں مدھم پڑ گئیں، سیّد غلام مصطفیٰ شاہ گیلانی شہید گنج کی صفوں سے اُٹھے اور مسلم لیگ کی صفوں میں چلے گئے، ایم ایل اے بھی ہوتے، لیکن امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں گوشہ نشین ہو گئے ــــ

اظہر امرتسری، زمیندار کے ایڈیٹر ہو گئے، نغز گو شاعر تھے، شاعری کو صحافت سے ڈوبی اور صحافت کو شراب۔ ٹھرا پی کر الفاظ کے پیوند لگاتے، اس زمانے کے صحافی تھے جس زمانہ میں الفاظ کی مینا کاری فہم و تدبر کا شاہکار سمجھی جاتی، زمیندار اُن کا حرفِ آخر تھا اور وہ زمیندار کا حرفِ آخر۔ ع

پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

نوجوانوں میں یعسوب الحسن انقلابی تھا لیکن شرابی ہو کر فنا ہو گیا، مولا بخش کو پولیس لے ڈوبی، تھانیداروں نے اس کو علاقہ کا معزز بنا لیا، اس اعزاز نے اس کی عزت پر پھول ڈالی اور وہ رُسوائی کے زخم اُٹھا کر قتل ہو گیا۔

امین الدین صحرائی بھی شہید گنج کی یادگاروں میں سے ایک یادگار تھا۔ اِدھر منہ کھُلا اُدھر بھرم کھُل گیا۔ پاکستان بنا تو روزنامہ جدید نظام نکالا جو محض ایک ضمیمہ تھا، فی نفسہٖ خاص عادتوں کا شہ پارہ تھا، جھوٹ بولنے، جھوٹ لکھنے اور جھوٹ اُچھالنے میں کبھی خدا کا خوف محسوس نہ کیا۔

صاحبزادہ غلام ربانی بھی مولانا ظفر علی خاں کے شاگرد تھے، شہید گنج کی تحریک ٹھنڈی پڑ گئی تو وہ بھی ٹھنڈے پڑ گئے، ان میں ایک اچھے مقرر کی صلاحیتیں اور ایک اچھے صحافی کی خصوصیتیں اُبھر رہی تھیں، لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ بھاری پتھر ہے چوما اور چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ ڈپٹی کمشنر گجرات کے دفتر میں کلرک رہے، پھر مسلم لیگ کی تحریک میں آ گئے، اب ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔

ابوسعید انور بھی مولانا ہی کے مدرسۂ فکر سے نکلے، ان کے سیاسی سفر کا آغاز احرار سے ہوا، طبیعت میں انفرادیت تھی، شہید گنج میں مولانا ظفر علی خاں کے ہو گئے، مولانا نے بالا کیا ——— اُن میں ایک اچھے مقرر اور ایک اچھے صحافی کا رنگ و روغن شروع سے تھا، خطیب تو اُبھر کر نمایاں ہو گئے، لیکن صحافی ہوتے ہوتے رہ گئے، صوبہ مسلم لیگ کے

دو چار مقرروں میں ان کا نام بھی لیا جا سکتا ہے لیکن لیگ کے لیے جتنا کام انہوں نے کیا، اتنا مقام نہیں پایا، دولتمند ہوتے تو پنجاب کے حکمرانوں میں ہوتے، خود ساز تھے، لہٰذا پنجاب کے ریگستانوں میں اُن کی آواز صدا بصحرا اور ان کی پرواز کوتاہ ہو کے رہ گئی۔

قید سے اُن کی طبیعت اکتاتی رہی، ایک دفعہ شہید گنج کی تحریک میں کھلے نظر بند رہے، دوسری دفعہ معاہدۂ تاشقند کے خلاف احتجاج کی پاداش میں نظر بند کیے گئے جیل سے بیمار ہو کر ہسپتال آ گئے اور وہاں سے رہا ہو گئے، اب سیاسیات سے دل برداشتہ ہو کر کاروبار کی راہ پر ہیں، لیکن ان کی طبیعت سیلانی اور مزاج رومانی ہے، ملک سے باہر کئی بین الاقوامی مزدور تنظیموں میں پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ مغربی پاکستان لیبر کورٹ کے ممبر بھی رہے ہیں۔ سردار عبدالرب نشتر کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے، آجکل تحریکِ استقلال میں ایئر مارشل اصغر خاں کے شانہ بشانہ کام کر رہے ہیں —— ان کے سیاسیات میں پیچھے رہ جانے کا باعث یہی ہے کہ سرمایہ کی نقرئی آغوش میں پلے نہیں یا پھر ان کا خاندان پنجاب کے روایتی خاندانوں میں سے نہیں تھا۔ وہ ایک عام گھرانے کے فرد تھے، اور یہی وہ ابتلا ہے جس نے پنجاب کے اُن نوجوانوں کو اُبھرنے نہیں دیا، بلکہ مار ڈالا، جن کے حسب و نسب میں سرمایہ و عزت کا پشتینی غرور نہیں تھا۔

یہ سوال میرے ذہن میں ایک المیہ سے کم نہیں کہ پنجاب کے مُسلمان اُمراء نے شاذ ہی کوئی ہونہار فرزند جنا ہے، اگر چند ایک جاگیرداروں نے حکومت کے ایوانوں میں نام پیدا کیا تو کسی تخلیقی کارنامہ پر نہیں، بلکہ اور راک فرد شی کے فن میں کہ اُمراء کے بچے عموماً اس فن میں چابکدست ہوتے ہیں، علم کا ہر گوشہ غرباء سے معمور رہا۔ سیاسیات میں جو لوگ اُبھارے گئے ان میں غرباء نہیں تھے اور جو اپنے طور پر اُٹھے وہ مڈل کلاس میں سے تھے —— لیکن انہیں وہ مقام و امتیاز حاصل نہ ہو سکا جو دوسرے صوبوں کے مسلمان

رہنماؤں کو حاصل ہوا، تحریکِ خلافت کے تقریباً سبھی رہنما درمیانہ درجہ کے لوگ تھے، بلکہ بعض نے انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں پرورش پائی، مثلاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابُوالکلام آزاد وغیرہ اُن خاندانی وجاہتوں سے بہرہ مند نہ تھے جو دولتمندوں کی تجوریوں سے تیار ہوتی ہیں۔ اسی طرح احرار رہنماؤں کو ادنیٰ متوسط درجے کے شہریوں میں شمار کیا جاسکتا ہے لیکن پنجاب کی خاص ذہنیت نے انہیں اُٹھا کر گرا دیا۔

شہید گنج کی تحریک میں جن نوجوانوں کا ذکر آیا ہے وہ اپنی نوعمری میں استعمار کے ستم و کرم کا شکار ہوتے رہے (الا ماشاء اللہ) یعسوب الحسن، ابوسعید انور، غلام ربّانی، سازگار فضا میں اپنے ذہنوں کو بالا کر سکتے اور اپنی زمینوں کو سرسبز بنا سکتے تھے، لیکن دولت کے بغیر مسلمانوں کے زمرہ میں پنپنا محال تھا۔ پنجاب میں جتنا اوچھا مذاق غرباء کے بیٹوں کی سیاسی نشوونما سے ہوا ہے اس سے زیادہ خطرناک مذاق شاید ہی کسی اور سے کیا گیا ہو۔

مسلمان نوجوانوں میں جوش، جذبے، علم اور عمل کا فقدان نہیں رہا، لیکن مسلمان عوام میں ان کی پذیرائی، تحسین، ستائش اور اعتراف کا فقدان ضرور رہا، یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ محرومیوں کا ایک مرقع ہو کر رہ گئی ہے، پنجاب نے حالی پیدا کیا، اقبال کو جنم دیا، ظفر علی خاں کو جنا، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اُٹھے لیکن اس کا تاج دوسروں کے سر پر چمکتا رہا، پانی اس کا تھا، کھیت باہر کے سیراب ہوتے گئے، ہر تحریک یہاں سے اُٹھی، ملک کی سیاسی تبدیلیوں کا ہر انقلابی عہد یہیں سے شروع ہوا لیکن منزل دوسروں کے ہاتھ چلی گئی —— سیاسیات کی طرح ادبیات میں بھی جتنے موڑ آئے پنجاب ہی محرک و مؤیّد رہا، لیکن سیادت کے اعتبار سے پنجاب بانجھ ہو گیا ——
پنجاب نے جگرداز انقلابی پیدا کیے، بہترین مقرر نکالے، شاعری کے نئے مہرسن

کی جنم بھومی بنا، مثلاً حالی، اقبال، فیض، میراجی۔ پھر وہ تمام انشا پرداز، مکالمہ نویس اور افسانہ نگار اس خاک سے اُٹھے کہ ان سے ادب و انشا کی نئی نئی راہیں کھلیں لیکن پنجاب کی محرومیاں جُوں کی تُوں رہیں، تاریخ نے کبھی آغوشِ اعتراف وا نہ کیا، اس کی وجہ کوئی بیرونی اُفتاد یا خارجی سازش نہ تھی بلکہ پنجاب کے وفادار خاندان ہی تھے جن کے "خنجر بکف" ہاتھ عوام کی شہ رگ پر رہے تھے۔

منشی احمد دین پنجاب میں سوشلسٹوں کے جنرل سکرٹری تھے، غریب خاندان تھا، چوتھی جماعت سے زیادہ نہ پڑھ سکے، لیکن جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی ہیں اور ان سے سیاسیات پر گفتگو کی ہے انہیں معلوم ہوگا کہ وہ کس پائے کے مقرر اور مدبّر تھے، کوئی شخص یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ اس شخص کی تعلیم ادھوری ہے، الفاظ کا چناؤ، مطالب کا تسلسل، منطق کی گیرائی، استدلال کا خلوص، زبان کی روانی، بیان کا سحر، غرض ایک بڑے مقرر میں جو کمال ہونا چاہیے ان میں کمال و تمام موجود تھا، لیکن مسلمان انہیں اجیر سمجھتے رہے۔ ہندو فقیر استخلاصِ وطن کی تحریک میں برسوں اسیر رہے، آخر قعرِ گمنامی میں وفات پا گئے اور اب کسی تاریخ یا تذکرے میں ان کا نام نہیں۔

لاہور میں ایک اور نوجوان کامریڈ احسان الٰہی تھے، مدتوں شاہی قیدی رہے، بڑے بڑے انقلابی ان کے شاگرد تھے، اکثر نوجوان انہیں اپنا گورو کہتے، پاکستان بنا تو زندگی بڑھاپے سے پہلے گور کنارے پہنچ گئی، آخر ان کا چراغِ حیات بھی گُل ہو گیا اور وہ منزل اُنہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے۔

جذباتی کہہ لیجیے لیکن تاریخ اُس دن کے انتظار میں ہے جب اِن لوگوں کے زخموں کا حساب اُن لوگوں کو چکانا ہوگا جو نسلاً بعد نسلٍ کاسہ لیسی کے دروازے پر کشکول لے کر کھڑے رہے لیکن آزادی کے بعد ناقۂ لیلیٰ کے حدی خوان ہو گئے اور اب انہیں اپنے قیس ہونے پر اصرار ہے۔
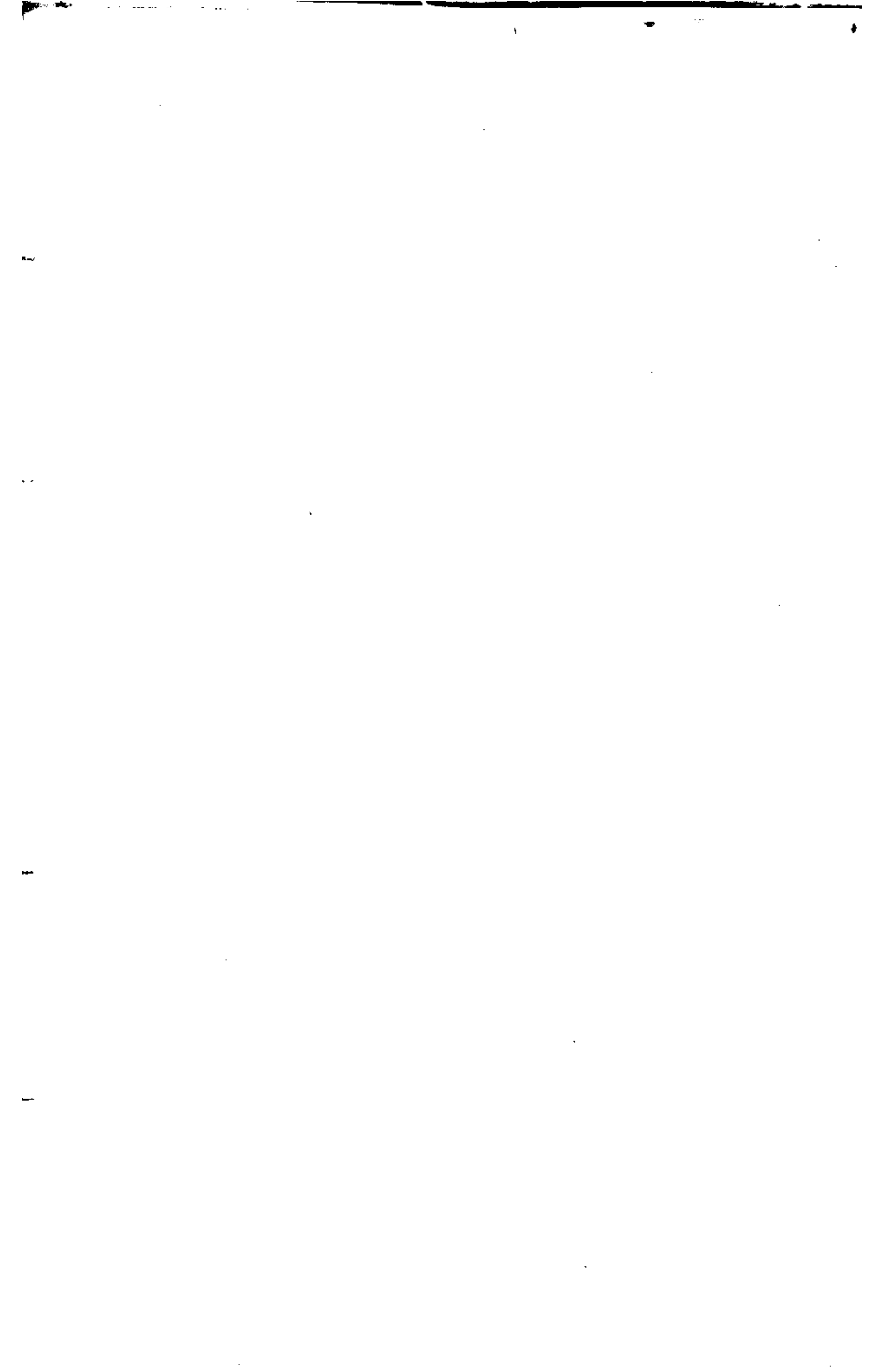
احرار میں

احرار میں شمول کے بعد عرصہ تک میں نے اوپرا پن محسوس کیا، دو وجہیں تھیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ ہر نئی فضا میں انسان کچھ دنوں اجنبی رہتا ہے، دوسری وجہ بعض احرار رہنماؤں کا روکھا پن تھا۔ میں احرار میں اس لیے شامل ہُوا تھا کہ میرا ذہن غیر ملکی استبداد کے سخت خلاف تھا، لیکن طبیعت میں اسلام بھی تھا، ان دونوں کا آمیختہ احرار تھے۔ اور اس وقت پاکستان کے موجودہ علاقوں میں اس خوبُو کی اور کوئی جماعت نہ تھی۔ ناممکن تھا کہ میں اتحادِ ملت میں پلٹ کر جاتا، مسلم لیگ اُمراء کا تکیہ تھا —— ہفتوں سوچتا رہا۔ طبیعت میں شعر و انشا کا ذوق تھا، چاہا قرطاس و قلم کی طرف لوٹ جاؤں، نومشق تھا تاہم یقین تھا کہ محنت ضرور پھل لاتی ہے۔ تاجور، احسان، اختر شیرانی میری طبیعت کے میلان سے بہت خوش تھے، ان کا خیال تھا کہ میرے اندر ایک بڑا شاعر اور ایک بڑا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں، اللہ نے مجھے یہ جوہر عطا کیا ہے، اُس کا ہو جاؤں تو قدرت میرے لیے سروسامان پیدا کر دے گی، لیکن زبان کو سیاسی چسکا پڑ چکا اور منہ کو اس کا خون لگ چکا تھا۔ دو تین ہفتہ ذہنی بحران میں رہا، چودھری افضل حق واحد شخص تھے جن کا دل میرے معاملہ میں آئینہ تھا، وہ بہرحال چاہتے تھے کہ اُبھروں، انہیں مسلمانوں میں سیاسی نوجوانوں کے خلاء کا شدید احساس تھا، وہ میری سیاسی نشوونما چاہتے تھے، انہیں اپنے رفیقوں کے محسوسات کا

بھی اندازہ تھا لیکن اس کے باوجود میری دلجوئی کر رہے اور میرے اس احساس کو دُور کرنے کی فکر میں تھے کہ میں کسی شاخ سے ٹوٹ کر ایک ایسی روش پر آگیا ہوں جہاں مُرجھانے کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔

غالباً تیسرے ہفتے لاہور میں ضلعی احرار کانفرنس ہوئی، تقریباً تمام احرار رہنماؤں سے تعارف ہُوا، لیکن میں اپنے اس احساس پر قابو نہ پا سکا کہ بعض رہنماؤں کے چہرے ناخوش تھے۔

چودھری افضل حق کانفرنس کے صدر تھے، مَیں نے اپنی تقریر میں شہید گنج کے مختلف المعنیٰ اوراق پر تبصرہ کیا۔ سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری بھی اِس اجلاس میں موجود تھے، مَیں نے اِن سے مصافحہ کرنا چاہا، ہاتھ بڑھایا تو سرد مہر پایا۔

شب کے اجلاس میں شاہ جی کی تقریر ہوئی، میرا نام تو نہیں تھا لیکن میں ہی موردِ تنقید رہا۔ شکوہ انہیں یہ تھا کہ احرار پر عوام نے جو قہر و غضب توڑا ہے اس کا مسئول مَیں بھی ہوں۔ یہ شکوہ کسی حد تک بجا تھا اور غالباً ان کی برہمی کا باعث دو چیزیں تھیں، پہلی چیز تو احرار کا وہ عنصر تھا جو میرے شمول سے ناخوش تھا، دوسری چیز میری تقریر کا ایک فقرہ کہ حالات کی بوقلمونی کے باوجود میری پختہ رائے یہی ہے کہ احرار نے شہید گنج کی تحریک میں حصّہ نہ لے کر غلطی کی ہے۔ چودھری افضل حق شاہ جی کی تقریر شروع ہونے سے پہلے اٹھ کر چلے گئے۔ ایک وہی تھے جو انہیں ٹوک سکتے تھے۔ باقی لوگ سبحان اللہ یا جزاک اللہ تھے۔ میرے دو جگری دوست مسعود اختر اور چونی لال کاوش بھی جلسہ میں موجود تھے۔ انہیں شاہ جی کے الفاظ سے رنج پہنچا، مجھے اشارہ کیا اور ہم تینوں کانفرنس سے اُٹھ کر گھر چلے گئے، مولانا مظہر علی اظہر کو بھی گھر جانا تھا۔ ہمارے ساتھ ہی پنڈال سے نکلے تو کاوش نے ان سے گلا کیا۔

"خوب ہے مولانا! اچھی درگت بنائی ہے!"

تیر اپنے ترکش سے نکل چکا تھا اور وہ الفاظ واپس نہیں آسکتے تھے، خود میرے اباجی کو اس کا قلق تھا۔ صبح کوئی دس بجے مظہر علی اظہر آگئے، فرمایا: چودھری صاحب یاد کرتے ہیں، میں نے عذر کیا کہ جو ہونا تھا ہو چکا، اب کیا رہ گیا ہے؟ واپس چلے گئے، تھوڑی دیر بعد چودھری برکت علی آگئے:

"چودھری صاحب یاد کرتے ہیں"؟

"کوئی کسر باقی رہ گئی ہے"؟

"چودھری صاحب کو ملال ہے اور وہ خود پریشان ہیں، شاہ جی کو سخت ڈانٹا ہے۔ چودھری صاحب کو ان کی اہلیہ محترمہ نے رات دو بجے جگا کر سارا قصہ سنایا، تو وہ پریشان ہو گئے۔ شاہ جی ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ چودھری صاحب صبح کی نماز پڑھ کر سیدھے ڈاکٹر عبدالقوی کے ہاں گئے، معلوم ہوا کہ شاہ جی نماز فجر کے فوراً بعد ریلوے اسٹیشن چلے گئے ہیں اور انہیں ابھی صبح کی گاڑی سے جہلم جانا ہے، چودھری صاحب بھاگم بھاگ ریلوے اسٹیشن پہنچے، شاہ جی کی اپنی روایت تھی کہ اُس وقت چودھری صاحب کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔ میں تاڑ گیا کہ رات کی بات سے انہیں دُکھ ہوا ہے۔ میں نے ہاتھ باندھ دیئے:

"ماماجی (وہ پیار سے چودھری صاحب کو یہی کہا کرتے تھے) میں نے خود محسوس کیا ہے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ میری طرف سے ابھی جا کر شورش سے معافی مانگ لو۔ کل سہ پہر واپس آکر میں خود اس سے خود معافی مانگ لُونگا۔ چودھری صاحب غصہ میں پیٹے ہوئے جو کہہ سکتے تھے کہہ گئے۔ شاہ جی نے کہا:

"افسوس ہے ـــــ میں جذبات پر قابو نہ پا سکا۔ حضرت امیر حمزہؓ کے قاتل وحشی کا ذکر کرتے ہوئے وہی نقشہ ذہن میں تازہ ہو گیا، حضورؐ نے فرمایا تھا "وحشی تم آتے ہو تو چچا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے" مجھے مجلس احرار

کی بربادی یاد آگئی۔"

چودھری صاحب نے غصہ میں کہا، اُس نے تمہارا کونسا چچا مارا ہے ؟

شاہ جی کے لیے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا، چودھری صاحب ریلوے اسٹیشن سے سیدھے میرے مکان پر آئے۔ میں گھر میں نہیں تھا، لوٹ گئے احباب کو بھیجا میں نے ٹال دیا۔ مولانا مظہر علی اور چودھری برکت علی پہلے ہی ٹکا سا جواب پاکر چلے گئے تھے۔ اگلے دن چودھری صاحب علی الصبح تشریف لائے تو ان سے معذرت کرنا میرے لیے مشکل ہوگیا، اپنے ساتھ دفتر احرار میں لے گئے، شاہ جی کی معذرت کا ذکر کیا، خود معذرت کرتے رہے لیکن میرا دل اندر سے ہل گیا تھا، اپنی بے عزتی کا مجھے شدید احساس تھا، میں ٹال مٹول کرتا رہا اتنے میں شپ سے شاہ جی آگئے، میں چائے پی رہا تھا، پیالی ہاتھ سے چھین لی۔

"لو بھائی تمہاری جھوٹی چائے پی کر معافی مانگتا ہوں۔ یہ ہیں میری داڑھی کے سفید بال، اِن کا واسطہ ہے، معاف کر دو۔"

——— اب میرا یہ حال تھا کہ ع

مجھے جینے نہیں دیتی نگاہِ شرمسار اس کی

اتنا بڑا انسان، ملک کا سب سے بڑا خطیب، خسروانہ انداز رکھنے والا درویش شہنشاہوں سے بے نیاز، قرنِ اوّل کے مجاہدوں کی ہُو بہُو تصویر، فقر و استغناء کا مجسّمہ ایک ذرّۂ ناچیز سے معذرت کر رہا تھا۔ ع

اس پشیمانی کے صدقے میں پشیماں ہوگیا

شاہ جی فوراً ہی بے تکلف ہوگئے۔

"کیوں میاں! اب تو دل میں کوئی کدورت نہیں؟"

"جی نہیں! آپ ایک ذرّہ کو آفتاب بنا رہے ہیں۔"

میرا دل واقعی صاف ہوگیا، اس میں بال برابر غبار نہ رہا۔ میں نے شاہ جی سے

ایک بات کہی اور وہ سرد آہ بھر کر گہری سوچ میں ڈوب گئے :

"میں آپ کے اس قافلے میں نو وارد ہوں، میں نے اس سے پہلے جو
کچھ دیکھا ہے اُس نے میری عقیدتوں کے تاج محل گرا دیتے ہیں، یہی فضا
یہاں ملی تو میری برگشتگی قدرتی ہوگی۔ میں کسی حال میں بھی بدقماش قیادت
اور بد شعار سیادت کی ہمنوائی نہیں کر سکتا، یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔"

یعسُوب نے بات پلٹتے ہوئے شاہ جی سے کہا :

"قبلہ، پان پت تو اس کی عام جلسہ میں اُتاری گئی ہے لیکن معذرت
تخلیہ میں فرما رہے ہیں، اس سے کوئی فائدہ نہیں ؛ اور نہ یہ بات جچتی ہے۔"

شاہ جی نے کہا "بہت اچھا، کل کے لیے جلسۂ عام کا اعلان کر دو، لاہور ہمیشہ اُن کی سحر بیانی کا منتظر رہتا، رضا کاروں نے ڈونڈی پیٹی، ہزارہا لوگوں کا مجمع ہو گیا — شاہ جی نے خطبۂ مسنونہ پڑھا، میں پاس ہی بیٹھا تھا، میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور فرمایا :

"اُس روز میرے مُنہ سے غصّہ میں برہمی کے کلمات نکل گئے تھے میں
اس بھرے مجمع میں آپ سب کے سامنے آغا جی سے معافی مانگتا ہوں"

تمام مجمع حیران رہ گیا، کہاں شاہ جی، کہاں شورش کاشمیری ! لیکن چودھری افضل حق نے انہیں سحر کیا اور وہ رام ہو گئے، حقیقتہً احرار ان دو شخصیتوں ہی کے سحر و تاثر کا نام تھا، چودھری افضل حق نے یہ قافلہ مرتب کیا، شاہ جی اس قافلے کے حدی خوان تھے، ان دونوں کی سیرت نے مجھے احرار میں سمو لیا اور میں اس لڑی میں پرو دیا گیا۔

اس سے پہلے جن تصویروں سے میرے تصوّر کو ٹھوکریں لگی تھیں ان کی شخصیتوں سے وہ زخم مندمل ہو گئے، چودھری افضل حق قرنِ اوّل کے اُن صحابہ کی یادگار تھے جن سے فہم و فکر اور فقر و استغنا کی راہیں روشن ہوئیں، اور جو اسلام کے تاریخی تذکروں میں فخر و مباہات کی مسندوں پر فائز ہیں۔

اور شاہ جی ان صحابہ کا پرتو تھے جن کی تربیت کعبہ کی چھت پر ہوئی تھی، صدیاں بھی ان سے بڑا خطیب پیدا نہیں کر سکتیں۔ ان کے گرد و پیش رہ کر میرا یہ کانٹا نکل گیا کہ رہنما شخصیتیں سراب ہوتی ہیں۔ افضل حق اور عطاء اللہ شاہ دونوں قدرت کا عطیہ تھے، پنجابی مسلمانوں نے ان سے کیا فائدہ اٹھایا یہی کہ سومنات ان کی اذانوں سے محروم رہا۔ پتھروں میں بیج بویا، پانی دیا، لیکن بیج رہ گیا، پانی بہ گیا، آبلہ پا کانٹوں کی سیرابی کا تماشہ دیکھ کر رخصت ہو گئے ـــــــ

۱۹۳۹ء کی پہلی سہ ماہی گزر چکی، دوسری سہ ماہی کا آغاز تھا۔ یورپ کے حالات روز بروز دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز کی نیو اٹھا رہے تھے، چیمبرلین برطانیہ کے وزیر اعظم تھے، انہیں ہٹلر کو رام کرنا مشکل ہو گیا تھا، ہٹلر معاہدہ کرتا، توڑ دیتا، وعدے کرتا مکر جاتا۔ اُس کا قول تھا کہ وعدے پورے نہیں کیے جاتے فتح کیے جاتے ہیں، چودھری افضل حق کا خیال تھا دوسری عالمگیر جنگ آئندہ پانچ چھ ماہ میں ضرور چھڑے گی، ان کے نزدیک یہی موقع تھا کہ برطانیہ پر ضرب لگائی جاتے اور اس سے کھلم کھلا ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا جاتے۔ انہیں افسوس تھا کہ احرار کی آواز میں وہ طاقت نہیں جو برطانوی حکومت کو جھنجھوڑ سکے اور جھکا دے، لیکن انہیں قوی یقین تھا کہ احرار برطانوی حکومت کو پریشان کر سکتے ہیں۔ وہ آئندہ جنگ میں برطانیہ کے خلاف نعرۂ رستاخیز بلند کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ دوسری عالمگیر جنگ نہ صرف ہندوستان کی آزادی کا مقدمہ ثابت ہو گی بلکہ اس سے ایشیا و افریقہ کے ملکوں کی آزادی کے دن بھی قریب آ جائیں گے، برطانیہ کے لیے استعماری طاقت کے طور پر زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔

برطانوی حکومت کے فرزندِ رشید چودھری ظفر اللہ خاں ان دنوں مرکزی حکومت میں لاء ممبر تھے، انہوں نے آرمی بل پیش کیا جس کی رو سے فوج میں بھرتی کے خلاف کہنا سننا جرم قرار دیا گیا۔ سزا ایک سال رکھی گئی، احرار نے آرمی بل کے پرخچے اڑانے

کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ دہلی سے لے کر پشاور تک ہنگامہ برپا کر دیا، جگہ جگہ احرار کے جلسے شروع ہو گئے، مجھے بھی بلایا جا رہا تھا، میں کبھی ہنسی خوشی اور کبھی طوعاً و کرہاً اِن جلسوں میں شریک ہوتا۔ اس طرح پنجاب کے ہر شہر اور قصبے سے پھر آیا، اپریل کے آخر میں آل انڈیا مجلسِ احرار کا سالانہ اجلاس پشاور میں ہوا، چودھری افضل حق اجلاس کے صدر تھے، ان کا صدارتی خطبہ سیاست کے تاریخی شہ پاروں میں سے تھا۔ تیس سال ہو گئے ہیں! ور آج بھی اس خطبہ کے مندرجات کھرا سونا ہیں، ——— بعض پیشگوئیاں حرف بحرف پوری ہو گئی ہیں، بعض کی تعبیر میں ایک آدھ کروٹ باقی ہے اور بعض مباحث اِن حالات میں بھی تر و تازہ ہیں۔

کانفرنس کو مَیں نے بھی خطاب کیا، عوام عش عش کر اُٹھے، لیکن حکام چیں بہ جبیں ہو گئے، خاں صاحب کی وزارت کا دَور تھا اُنہیں گورنر نے بلا کر بڑے طیش کا اظہار کیا، ڈاکٹر صاحب نے احرار رہنماؤں کو چائے پر بلا کر سارا قصّہ بتایا، اس کی "رُوداد" "پسِ دیوارِ زنداں" میں آ گئی ہے مختصراً میں پشاور سے رخصت ہو کر لاہور آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے گورنر سے کہا مقرّر کو صوبہ سے نکال دیا گیا ہے، لیکن گورنر غصّہ سے لال پیلا ہوتا رہا، ڈاکٹر صاحب طرح دے گئے، گورنر کی ناراضی کا سبب میری تقریر میں وزیرستان کا مسئلہ تھا یا پھر پٹھانوں سے کہا گیا کہ وہ آئندہ جنگ میں اپنا ملی قرض ادا کریں کیونکہ انگریزی حکومت کو ہندوستان سے رخصت کرنے کا یہ آخری موقع ہے، اب کے اس کے قدم جمے رہے تو اُسے اُکھاڑنا بہت مُشکل ہو گا۔

حافظ علی بہادر خاں بمبئی میں احرار کی روحِ رواں تھے، انہوں نے بمبئی احرار کانفرنس کا اعلان کیا اس غرض سے تمام احرار رہنما بعض ممتاز کارکن اور رضاکاروں کا ایک دستہ مدعو کیے گئے، لیڈروں کا کرایہ حافظ جی نے بھجوایا، کارکنوں اور رضاکاروں نے روایت کے مطابق اپنا انتظام خود کیا، میرے معاملہ میں کھسر پھسر شروع ہو گئی،

ایک آدھ رہنما اور بعض کارکن چودھری صاحب پر ذہنًا ناراض تھے کہ وہ خواہ مخواہ مجھے آگے بڑھا رہے ہیں، چودھری صاحب کو پتا چلا تو انہیں سرزنش کی، انہیں معلوم تھا کہ بعض لوگ اپنی طاقت سے زیادہ اُڑے پھرتے ہیں، بہرحال ہم لوگ تھرڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہوکر بمبئی روانہ ہوگئے، مولانا مظہر علی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ تین دن کا سفر ہر اسٹیشن پر ہندو روٹی، مسلمان روٹی کی صدائیں گونجتیں ہم لوگ ان خوانچہ فروشوں سے روٹی خریدتے اور کھاتے پیتے بمبئی پہنچ گئے ـــــ بمبئی واقعی عروس البلاد تھا، پنڈال بھی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا، اخباروں نے سر پہ اٹھالیا میں خطیب و ادیب سے پہلے شاعر تھا لیکن نہ کبھی مشاعروں میں شریک ہوا اور نہ کبھی اسٹیج پہ کوئی نظم سنائی تھی، یہاں اجلاس کے شروع میں اپنی معرکہ آرا نظم جنگِ یورپ پڑھی تو داد وتحسین کا ہنگامہ برپا ہوگیا، تقریر کی تو وہ سونے پہ سہاگہ ہوگئی۔ چاروں طرف شورش کاشمیری ہونے لگا۔

شاہ جی نے رات ساڑھے گیارہ بجے بولنا شروع کیا تو چار گھنٹے تک بے تکان بولتے رہے، سوا دو گھنٹہ صرف میرا تذکرہ کیا، دل ان کا دریا تھا چھوٹوں کو اُٹھا کر آسمان پر لے جاتے، ساڑھے تین بجے ان کی تقریر ختم ہوئی تو لوگوں نے پھر میرے نام کا شور مچا دیا، مولانا حبیب الرحمٰن اس وقت اجلاس کے صدر تھے انہوں نے رات گزر جانے کا عذر کیا، فجر کی نماز کا ذکر چھیڑا، مجمع وحدت بن کر بیٹھا ہوا اور مصر تھا کہ ہم دوبارہ شورش کاشمیری کی تقریر سنیں گے، میں نے فجر کی نماز تک بڑے ٹھاٹھ سے تقریر کی، خواتین رات بھر جاگتی رہیں، تقریر ختم ہوئی تو مجھے رنگا رنگ دھاگوں کی مالائیں پیش کی گئیں۔

اگلے روز رات کے اجلاس میں سب سے پہلی تقریر میری ہوئی، بمبئی کی جماعت اہلحدیث کے امیر بھی اجلاس میں شریک تھے، شاہ جی کو ان کے علم کا اتنا احترام تھا

کہ انہیں آنکھوں پر بٹھاتے —— وہ میری تقریر کے کسی فقرے پر وجد میں آگئے، اللہ اکبر کا نعرہ لگایا، فرمایا "ہاں میاں! ایک دفعہ پھر، گو میرے لیے یہ بڑا اعزاز تھا لیکن انہیں ستائش میں ڈوبا ہوا پایا تو عجیب و غریب فخریہ احساس پیدا ہو گیا — لوگوں نے مجھ پر پھولوں کی بارش کی، اگلے روز اردو اور انگریزی کے روزناموں میں اسی تقریر کا شہرہ رہا، روزناموں نے میری تصویر اور انٹرویو شائع کیے۔ پارسی نوجوانوں کی ایک جماعت نے یوم زردشت منایا، البانیا کے سفیر صدر تھے، مجھے بھی مدعو کیا، وہاں ایک مختصر سی تقریر کی۔ کانگرس کا جلسہ عام مسٹر کے ایف نریمان کی صدارت میں چوپاٹی کے کنارے ہو رہا تھا وہاں بھی صوبائی کانگرس کی درخواست پر تقریر کی؛ میں ہی اردو کا واحد مقرر تھا باقی سب گجراتی میں بول رہے تھے، زبردست خیر مقدم کیا گیا۔

غرض ہفتہ بھر بمبئی کی سیاحت و سیاست میں گزار کر ہم لوگ پلٹے، اس دوران میں انسانی کمزوریوں کا اندازہ کیا، اپنے احوال پر نظر ڈالی، ایک چیز جس نے میرے دماغ پر عجیب اثر ڈالا انسانی فطرت کا ایک خاص رویہ تھا کہ اپنے کسی ہم سفر کی پذیرائی پر حاسدوں سے زیادہ دوستوں کو رنج پہنچتا ہے۔

آگرہ میں رکے، رات جلسہ تھا، قلعہ کے میدان میں ہزارہا لوگ جمع تھے میں نے ساڑھے نو سے ڈیڑھ بجے تک تقریر کی، کبھی میر و غالب کا شہر، اب سیماب کا نگر، زبان و بیان دونوں کی شہرت ہو گئی، سیماب کے ہاں گیا، بڑے تپاک سے ملے، دیر تک تعریف کرتے رہے، فرمایا

"جلسوں میں نہیں جاتا، تاج محل سے لوٹ رہا تھا۔ چند شاگردوں نے روک لیا، ایک کونے میں کھڑا رہا، دو گھنٹہ تقریر سنی، پنجابی ہو کر اتنی صاف اردو بولتے ہو، قاف شین تک درست ہے۔"

سیماب کی تحسین گویا کلاہِ افتخار میں طرۂ امتیاز تھا، آداب بجالایا، بمبئی نے دامن خیال کو بہت کچھ دیا، لیکن آگرہ ویرانی کے باوجود تاریخ کا ایک شہ پارہ نظر آرہا تھا۔ فتح پور سیکری سنگ و خشت کے اوراق میں مغلئی عہد کا تذکرہ تھا لیکن آگرہ میں نقش پا کی شوخیاں گمشدہ کارروانوں کا پتا دے رہی تھیں، جامع مسجد دیکھی، قلعہ دیکھا، تاج محل دیکھا، معتمد الدولہ کا مقبرہ دیکھا، غرض ایک پورا عہد عمارتوں میں ملفوف تھا، اب ان پر کیا بیت رہی ہے، واللہ اعلم! لیکن تاج محل نے موت کو بھی حسین کر دیا تھا، قلعے سے مغلوں کی جوانمردی کا بانکپن ٹپک رہا تھا، جامع مسجد میں اذان سنی جیسے قرنِ اوّل کی کوئی صبح گہری نیند سے جاگ اٹھی ہو ـــــــ ان عمارتوں کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا، کیا زمانے تھے جو ختم ہو گئے، کیا لوگ تھے، جنہیں موت چاٹ گئی۔ اور کیا رنگ تھا کہ پھیکا پڑ گیا۔ فی الجملہ صبحِ تمنا کے ماتھے پر شامِ تمنا کا جھومر لٹک رہا تھا ـــــــ قلعہ کے دیوانِ عام سے دائیں رُخ پر ایک ویران باغیچہ میں اُس کمانڈر کی قبر ہے جس نے اسے فتح کیا تھا۔ ـــــــ سالار سراج دین نے الف ننگا ہو کر پیشاب کیا تو چوبدار آگیا لیکن معاملہ قہقہوں میں رفع دفع ہو گیا۔

انبالہ میں دو چار روز ٹھہر کر میں لاہور آگیا، معلوم ہوا کہ یونی نسٹ وزارت نے احرار پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن پہلے ہی لدھیانہ میں زیرِ دفعہ ۱۲۴ الف ماخوذ تھے اور ان دنوں ضمانت پر تھے، شاہ جی پر ۱۲۴ الف، ۱۲۱ الف اور $\frac{302}{112}$ کے مقدمات قائم کیے گئے، مولانا مظہر علی اظہر بھی بغاوت کے جرم میں پکڑے گئے، میرے خلاف اوکاڑہ کی ایک تقریر نکالی گئی، ۱۲۴ الف کے وارنٹ ابھی سفر میں تھے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں جنگِ عظیم چھڑ گئی، ہٹلر نے ڈنزگ پر حملہ کیا، برطانیہ نے جنگ قبول کر لی، فرانس بھی شریک ہو گیا۔

چودھری افضل حق نے سول میں خبر پڑھی تو ناچنے لگے وہ ان دنوں امرتسر میں

ضمنی انتخاب لڑ رہے تھے، ان کے جیتنے کا سوال خارج از بحث تھا، خود سکندر حیات شیخ صادق حسن کے لیے امرتسر گئے، مقابلہ تین آدمیوں میں تھا، ڈاکٹر کچلو، شیخ صادق حسن اور چودھری افضل حق ــــــ امرتسر ہمیشہ بہادروں کا شہر رہا، سکھوں کا مقدس شہر، باہر کشمیری مسلمانوں سے اس کی رونق تھی۔ جلیانوالہ باغ کا حادثۂ فاجعہ اسی شہر میں ہوا، اسی شہر نے ملک کو جد و جہد کا ایک موڑ دیا۔ ایک ہی وقت میں یہاں آل انڈیا کانگرس کل ہند خلافت کمیٹی، جمعیتہ العلماءِ ہند اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس ہو چکے تھے، لیکن یہاں کی مسلمان نشست ہمیشہ شیخ صادق حسن یا ان کے بھائی شیخ محمد صادق کے ہاتھ رہی، دونوں بھائی رؤسائے شہر کے سرخیل تھے، فہم و فراست اور فکر و سیاست میں کورے، ان کا انتخاب ہمیشہ ایک سیاسی المیہ رہا۔

یں نے چودھری صاحب سے عرض کیا، جب انہیں یقین ہے کہ نشست ان کے ہاتھ نہیں آئے گی اور پہلے بھی ہر چکے ہیں تو خواہ مخواہ زور آزمائی سے کیا فائدہ ہے؟
چودھری صاحب کا جواب آج تک یاد ہے، فرمایا:

"میں نشست کے لیے نہیں لڑ رہا، میں جانتا ہوں کہ ہار یقینی ہے یونی نسٹ وزارت ہمیں کبھی منتخب نہ ہونے دیگی لیکن اصل مقابلہ امیری اور غریبی میں ہے، میرے سامنے دو چیزیں ہیں۔
(۱) دولتمندوں کو احساس رہے کہ ان کے مقابلے میں غریبوں میں کھڑا ہونے اور آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ ہے اور ہر غریب خریدا نہیں جا سکتا۔

(۲) اس طرح غریبوں میں عزتِ نفس کا احساس پیدا ہوتا اور جرأت کی راہ کھلتی ہے جس کی فی زمانہ مسلمانوں کو اشد ضرورت ہے۔"
چودھری صاحب نے جنگ چھڑتے ہی امرتسر میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلا لیا،

مولانا حبیب الرحمٰن صدارت سے مستعفی ہو گئے، شیخ حسام الدین کو صدر چنا گیا، چودھری صاحب کی تحریک پر مجھے جنرل سکرٹری بنایا گیا۔ ایک طویل قرارداد میں برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان چھوڑ دے، اور اُن تمام مشرقی مقبوضات سے ہاتھ اٹھا لے جو اُس کے تصرف میں ہیں، اِن حالات میں مجلسِ احرار اسلام جنگ میں بھرتی دینے اور برطانیہ کی ہمنوائی کرنے سے انکار کرتی ہے۔

فوراً ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ ہو گیا، چودھری ظفر اللہ خاں نے آقایانِ ولی نعمت کی تعریف و ثنا میں قصیدہ پڑھا اور اس طرح ہندوستان برطانوی عملداری کے باعث خود بخود جنگ میں شریک ہو گیا۔

احرار کے فیصلہ سے شہر میں ایک لہر سی دوڑ گئی، گلوالی دروازہ کے میدان میں جلسۂ عام منعقد کیا گیا، انسانوں کا ازدحام تھا، جہاں تک نگاہ جاتی انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے، شیخ حسام الدین نے مجھے، عبداللہ ملک اور عبداللہ بٹ کو سینما بھجوا دیا تھا، پکچر بدمزہ نکلی، ہم اُٹھ کر جلسہ گاہ میں آ گئے، شیخ صاحب پورے شباب میں تقریر کر رہے تھے، لوگوں نے مجھے دیکھا تو زندہ باد کے غل سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ شیخ صاحب خطابت کے دھنی تھے لیکن عوام کی اُکساہٹ کے باوجود تقریر کو طول دینے کے عادی اور بعد والوں کے لیے ہر موضوع صاف کر جاتے تھے۔ شاہ جی اور مظہر علی کے سوا ورکنگ کمیٹی کا ہر رکن جلسہ گاہ میں موجود تھا، چودھری افضل حق صدارت کر رہے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن ان کے ساتھ فروکش تھے، غرض مجلس عاملہ کا ہر رکن پہلو بہ پہلو موجود تھا، شیخ صاحب نے طول کھینچا، لوگوں نے کھانسنا شروع کیا، گیارہ بج گئے۔ چودھری صاحب نے دامن کھینچا ——— میں کھڑا ہوا تو رنگ ہی دوسرا تھا، مجھے اس تقریر پر ہمیشہ فخر رہے گا، مجمع میری مٹھی میں تھا۔ میں الفاظ سے گویا انسانی عقلوں کو شکار کر رہا تھا، جانے کیا جذبہ تھا جس نے انسانوں کو مسحور کر لیا تھا، میں عوام کو بہا کے

لیے جارہا تھا اور لوگ بہتے چلے جارہے تھے، لوگ اتنے غضب آلود ہو گئے کہ پورا امرتسر ہل سکتا تھا۔ میں خود خطابت کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن فوراً اپنی کرسی سے اُٹھے، شانہ پر ہاتھ رکھ دیا، فرمایا: رُک جاؤ، یہی وہ جادو ہے جس سے عقلیں شکار ہو جاتی ہیں، قرآن نے اس کو سحر کہا ہے، لوگوں سے کہا: بس گھروں کو چلے جاؤ، جلسہ برخاست کیا جاتا ہے۔

اِدھر اُدھر ہوتا ہوا تا دفتر احرار پہنچا، چودھری صاحب کوٹھے پر آرام کر رہے تھے، کہنے لگے "کہاں آگئے ہو، فوراً چلے جاؤ، پولیس ڈھونڈ رہی ہے"۔ چنانچہ کچھ دوستوں کے ہمراہ ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ صبح اُٹھا تو اسمٰعیل ذبیح فجر کی نماز پڑھ کر آگئے، ان سے مشورہ کیا اور لاہور روانہ ہو گئے۔

لاہور میں جلسۂ عام کا اعلان ہو چکا تھا، دہلی دروازہ کے باغ میں ایک لاکھ کے لگ بھگ آدمی جمع ہو گئے، میں صدر تھا۔ شیخ صاحب نے تقریر کی، میں بھی چاہتا تھا تقریر کروں لیکن شیخ صاحب نے روک دیا کہ چودھری صاحب نے منع کر دیا ہے، شیخ صاحب بادلوں کی طرح گونجتے گرجتے رہے، اُن کی یہ تقریر واقعی شاہکار تھی۔

اگلی صبح چودھری صاحب نے پوچھا کہ میں نے تقریر کیوں نہیں کی؟ عرض کیا کہ شیخ صاحب نے آپ کا نام لے کر منع کیا تھا وہ ششدر رہ گئے، ماتھے پہ ایک شکن ڈالی، سوچ کے دائرے بنائے، کچھ نہ کہا اور سب کچھ کہہ گئے، تاندلیانوالہ (لائل پور) میں ضلع احرار کانفرنس تھی ——— تمام احرار رہنما گرفتار ہو چکے تھے صرف میں اور شیخ صاحب تھے کہ پولیس سے بچ کر ادھر ادھر اُڑتے پھر رہے تھے۔ میرا ارادہ تھا یو پی کی طرف نکل جاؤں، ذبیح کو تیار بھی کیا لیکن غازی محمد حسین کے اصرار پر تاندلیانوالہ جانا پڑا، وہاں تقریر کی ——— مجھے معلوم تھا کہ وارنٹ متعاقب ہیں، پچھلی رات لائل پور میں تقریر کی اور پولیس کو جھانسہ دے کر نکل آیا تھا، اب

نا ندلیانوالہ، میں بھی جُل دے کر نکل آیا۔ پولیس نے بہت دوڑ دھوپ کی، لیکن میں اور فرید بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ نا ندلیا نوالہ سے ہم ملتان چلے گئے، وہاں حافظ یار محمد کے مکان میں ٹھہرے، وہیں جلسۂ عام کے انعقاد کا فیصلہ کیا، پولیس دن بھر پریشان رہی، لیکن ہمارا ڈھونڈھنا مشکل ہوگیا، تمام معاملہ رازداری میں تھا ضلع کے سالار، لال دین عاصی کو جلسہ سے گھنٹہ پہلے راز میں لیا کہ یہاں سے بھاگنے کی تجویز اس طرح ہوگی ——— عاصی پولیس کا مخبر نکلا اس نے لیکھراج سب انسپکٹر کو بتا دیا، بات افسروں تک پہنچ گئی اور ہم نرغہ میں آگئے، چنانچہ جلسہ شروع ہونے کے پندرہ بیس منٹ بعد میری تقریر نقطۂ عروج پر تھی کہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے نوٹس دیئے بغیر جلسہ پر لاٹھی چارج کر دیا ——— ایوان سٹی انسپکٹر اراٹون ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور کئی سب انسپکٹروں نے لوگوں کو مار مار کر اَدھ مُوا کر دیا، اور جو سلوک میرے ساتھ ہُوا اس کی تفصیلات "پسِ دیوارِ زنداں" میں آگئی ہیں۔ مختصر یہ کہ مجھے گھیرے میں لے کر گرفتار کر لیا۔ پولیس نے جلسہ گاہ سے لے کر حرم دروازہ کے تھانے تک پیروں کے اس شہر میں جہاں ہر کوئی ولی اللہ ہے مجھے اِس بُری طرح پیٹا کہ در و دیوار پناہ مانگ اُٹھے[1]

تین مقدمات چلائے گئے، دو ڈیفنس آف انڈیا کے تحت ملتان اور لائل پور میں، تیسرا زیر دفعہ ۱۲۴ الف' اوکاڑہ کی ایک تقریر پر۔ ان مقدمات میں سات برس قید ہوئی، اوکاڑہ کا مقدمہ منٹگمری میں چلتا رہا لیکن مسٹر این ایم بج (ایک ہندو مرہٹہ) ڈپٹی کمشنر کی تحریک پر واپس ہوگیا، لاہور میں ایک چوتھا مقدمہ سردار عبدالصمد سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں تھا، جُرم یہ تھا کہ مَیں نے جلسۂ عام میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو

---

[1] پسِ دیوارِ زنداں دیکھیں

پٹوایا ہے، حقیقت یہ ہے کہ میں نے رضاکاروں کی برہمی سے انہیں بچایا تھا، ڈاکٹر صاحب نے عدالت میں حاضر ہونے سے تو معذرت کی لیکن تحریرًا اس کا اعتراف کیا، میرے ساتھ ایک دوسرا ملزم حسین بخش تھا اس نے ڈاکٹر صاحب کو واقعی پیٹا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کے متعلق لکھا کہ اس کے خلاف بھی مجھے کوئی شکایت نہیں، اس نے مجھے پیٹا ضرور تھا لیکن میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔

مقدمہ کے دوران ڈسٹرکٹ جیل ملتان ہی میں رہا، دوسرا مقدمہ لائل پور میں ہوا، وہاں دو چار دن ٹھہرا، لاہور میں چند دن رکا پھر ملتان آگیا، وہاں سزا ہوگئی تو سنٹرل جیل منٹگمری بھیجا گیا اور اپنی سزا کا تقریبًا دو تہائی حصہ منٹگمری کی اذیت ناک تنہائی میں کاٹا، قیامت کا سامنا رہا۔ لاہور کا شاہی قلعہ ماند پڑ گیا، منٹگمری سے لاہور آگیا اور قید کے باقی دن یہیں گزارے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء کے اواخر تک قید میں رہا، اس عرصہ میں بڑے بڑے سفینے ڈوب گئے، ہٹلر طوفان کی طرح اٹھا، اور اب غبار کی طرح بیٹھ رہا تھا، محوری ہار رہے اور اتحادی جیت رہے تھے، یہ سب نقشے اس تیزی سے بن اور بگڑ رہے تھے کہ عقلِ انسانی عاجز آگئی۔ جواہر لال نہرو دہریہ تھے لیکن وہ بھی بے قابو حالات پر چلا اٹھے تھے کہ:

> "جو کچھ قدرت کے ہاتھوں ہو رہا ہے عقلِ انسانی اس پر حکم نہیں لگا سکتی، معلوم ہوتا ہے انسانی طاقت سے ماوراء کوئی طاقت ضرور ہے جو اس سارے ڈرامے کی ہدایت کار ہے[1]"

---

[1] پسِ دیوارِ زنداں دیکھیں۔
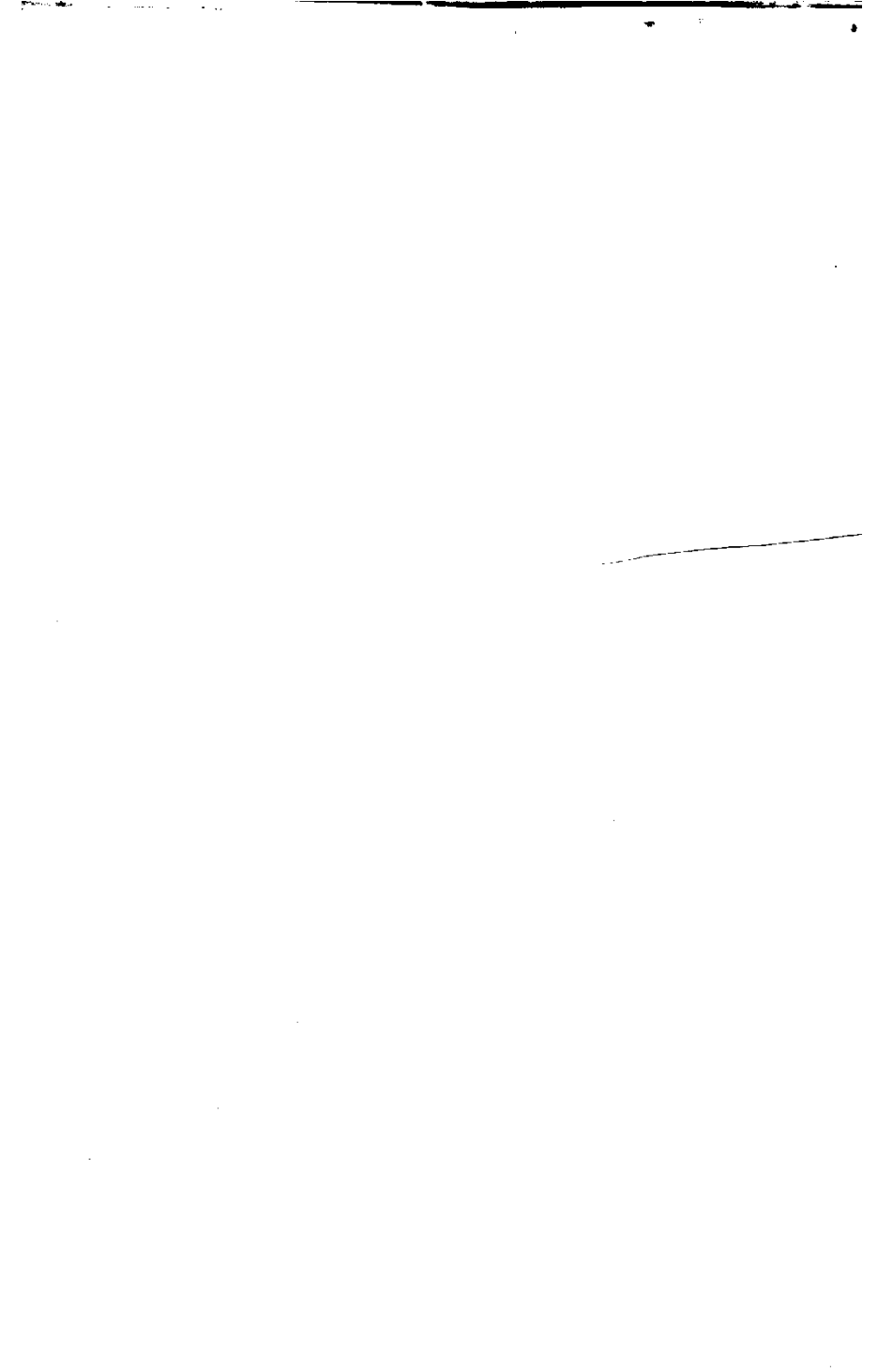
رہائی کے بعد

رہائی سے کئی ہفتے پہلے قیدی دوستوں نے دعوتیں شروع کیں جو پورا مہینہ جاری رہیں۔ رگھو نندن سرن ہمارے ساتھ ہی قید میں تھے، وہ دہلی کے رؤسا میں سے تھے اور کئی سال چیمبر آف کامرس کے صدر رہ چکے تھے، ان کی تجویز اور تحریک پر دوستوں نے میری رہائی پر مجھے پانچ یا دس ہزار روپے کی تھیلی نذر کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ان کے اخلاص کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مُصر ہوتے ہیں نے عرض کیا کہ وہ یہ رقم بنگال فنڈ میں دے دیں۔ بنگال میں اُن دنوں سخت قحط پڑا ہُوا تھا اور ہم جیل سے بھی آپس میں کچھ رقم جمع کر کے بھجوا چکے تھے، ہر چند دوستوں نے بہت اصرار کیا کہ ان کا ہدیہ قبول کر لوں لیکن اپنے بیرونی حالات کی ویرانی کے باوجود میرے لیے رقم قبول کر لینا مشکل تھا۔

رہائی کا دن آگیا تو سب دوستوں نے اخلاص و ارادت سے رخصت کیا، اکثر دوستوں کے چہرے اشکبار ہو گئے، وہ خوش تھے کہ ایک ساتھی رہا ہو رہا ہے لیکن وہ مغموم تھے کہ ان کی محفل سُونی ہو رہی ہے، رہائی کے کاغذات مکمل ہو گئے تو جیل کے دفتر میں سی آئی ڈی کا ایک سب انسپکٹر مع ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے داخل ہُوا۔ ہوم سیکریٹری کی طرف سے حکمنامہ تھا کہ :

"شورش کاشمیری کو انارکلی تھانے کے حدود میں نظر بند کیا جاتا، اور پانچ یا پانچ سے زیادہ لوگوں میں بیٹھنے، تقریر کرنے، تحریر لکھنے اور

سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ممانعت کی جاتی ہے، ہر اتوار کو
صبح دس بجے پرانی انارکلی کے تھانے میں حاضر ہو کر حاضری کی رپٹ
لکھوانی ہو گی ــــــــ"

ظاہر ہے کہ یہ پابندیاں فی الجملہ قید و بند سے کمتر نہ تھیں، نوٹس لے کر باہر نکلا تو
سینکڑوں دوستوں نے پُرجوش استقبال کیا، لاہور سنٹرل جیل کے سیاہ پھاٹکوں پر رخصتی
نگاہ ڈالی، مَیں نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں مجھے جوُں کی توُں گھور رہی ہیں ــــــ
انہیں غالباً اپنے ایک پنچھی کے اُڑ جانے کا افسوس تھا، پچھلے دس برس میں کئی دفعہ میں انہی
دیواروں کے پیچھے ہاتھا۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں قید ہو کر آخر میں رہا ہُوا، ۱۹۳۶ء میں دوبارہ پکڑا گیا،
مہینوں اندر رہا، ۱۹۳۷ء کے شروع میں یہی معاملہ پیش آیا۔ بقر عید کے دن پکڑا گیا، اور ۱۹۳۸ء
کا پُورا سال اندر گزارا، فروری ۱۹۳۹ء میں رہا ہوُا، ستمبر ۱۹۳۹ء میں سات برس کے
لیے قید ہو گیا۔ اواخر ۱۹۴۴ء میں رہا ہوُا۔ ۴۵ء سے ۴۶ء تک چھ سات ماہ ہونگے جو جیل سے
باہر گزارے۔ ہوتا یہ رہا کہ اِدھر رہا ہوُا اُدھر قید ہو گیا۔ ایک آدھ عید کے سوا دس سال
کی پُوری عیدیں اندر ہی گزاریں، اُس دن آدھی رات تک میں دوستوں سے ملتا ملاتا رہا،
سب سے پہلے چودھری افضل حق کے مزار پر گیا، آنسو آگئے، پھر مولانا ظفر علی خاں سے
ملا، دفتر احرار میں گیا، بعض بے تکلف دوستوں سے ملا، حادثوں اور سانحوں کی رُودادیں
سُنیں، کتنے ہی عزیز اور بزرگ تھے جو اس عرصہ میں قید حیات سے رہائی پا گئے اور کتنے
ہی طوفان تھے جو لیل و نہار کی ان گردشوں میں نکل چکے تھے۔ رات بھر واقعات کی
رَو میں سوچتا رہا۔

۱۔ کیا مَیں اس لیے پیدا ہوُا تھا؟

۲۔ مَیں نے لڑکپن دیکھا ہی نہیں، عمر کا یہ حصہ جیل کی نذر ہو گیا۔

۳۔ نوجوانی کے زینے پر قدم رکھا تو غموں نے تانا بانا بُن رکھا تھا، چھاپے اور

کانٹے یکجا ہو گئے تھے۔

۴- جن بہنوں کو بچہ چھوڑ گیا تھا اب صاحبِ اولاد ہو چکی تھیں۔

۵- گھر میں وہی بجھا ہوا چولہا تھا، پندرہ برس ہو گئے تھے لیکن سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہ تھی۔

۶- میرا چھوٹا بھائی اقبال جس نے یورش تخلص کر لیا تھا۔ دق کے مرض میں محصور موت کی شاہراہ پر تھا۔

۷- معاً یادوں کی ناؤ میں سوار ہو کر سوچنے لگا۔ دادا مرحوم کا نورانی چہرہ آنکھوں میں متشکل ہو گیا۔ پہلی قید سے رہائی کے بعد ان کے چہرے پر آنسوؤں کی جھالر اور زبان پر ٹوٹے ہوئے الفاظ تھے کہ تم نے ہتھکڑی لگوالی ہے؟ ان کا لُٹا ہوا عیش، اس عیش کی ویرانی، آخری دنوں میں کس مپرسی کی تلخیاں، بیماری کا زور، دوائی سے محرومی، ایک رات سوئے تو صبح اُٹھے ہی نہیں، بہتیرا جگایا لیکن ہمیشہ کی نیند سو چکے تھے ــــ نزع میں بھی تکلیف نہ دی، ہم ہکا بکا تھے کہ دادا جان اللہ کو پیارے ہو گئے اور ہم سے پوچھا تک نہیں؟ کچھ کہہ سن ہی لیتے۔

۸- گھر وہی گورِ غریباں تھا، نئے چراغ نئے گُلّے۔

پنجاب سی آئی ڈی کے بزرجمہروں کو سیاسی اُمراء اور سیاسی غرباء کے بارے میں دو چیزوں کی تلاش ضرور رہی ہے۔

۱- اُمراء کے بارے میں یہ کہ ان کی راتوں میں کون کون شریک ہوتا ہے؟

۲- غُرباء کے بارے میں یہ کہ ان کی گذر بسر کیسے ہوتی ہے؟

ایک روز سیّد اعجاز حسین سب انسپکٹر (سی آئی ڈی) آنکلے، مَیں ان سے اتنا ہی واقف تھا کہ جیل کے دروازہ پر نظر بندی کا نوٹس لے کر آئے تھے، مولانا مظہر علی سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، تمام عمر سی آئی ڈی میں رہے ــــ پاکستان میں

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچے لیکن صوبے کے سیاسی رہنماؤں اور جماعتی کارکنوں کا ان سے متعلق تجربہ یہ تھا کہ ایک شریف انسان ہیں، ان سے کسی کو شخصی آزار نہیں پہنچا، وہ افسر تو سی آئی ڈی ہی کے تھے لیکن ان کے خلاف کسی سیاسی آدمی کو کبھی شکایت نہ ہوتی، یہی وجہ ہے کہ ان کی موت پر جہاں پولیس افسروں نے ان کی مفارقت محسوس کی وہاں سیاسی کارکنوں نے بھی محسوس کیا کہ سی آئی ڈی کے قصاب خانے سے ایک صاحبِ دل اُٹھ گیا ہے۔

شاہ صاحب نے کہا:

"ہمارا سپرنٹنڈنٹ پوچھتا ہے شورش کا گذارہ کیسے ہوتا ہے؟"

"آپ نے کیا جواب دیا؟"

"بہت ٹالا ہے لیکن مانتا ہی نہیں"

"تو پھر ـــــ"

"لکھا ہے کہ تھوڑے بہت اخراجات ہیں جو مخلص دوستوں کی اعانت سے پورے ہو رہے ہیں لیکن وہ ان دوستوں کے نام جاننے پر مُصر ہے۔"

"شاہ صاحب آپ نے غلط لکھا، میں سیاسی کاموں میں مدد لینا گناہ سمجھتا ہوں۔"

"میں نے یہ لکھ کر پیچھا چھڑانا چاہا کہ مجلسِ احرار اعانت کرتی ہے لیکن میری رپورٹ ان ریمارکس کے ساتھ واپس آگئی کہ مجلسِ احرار کے حساب و کتاب میں شورش کا نام ہی نہیں۔"

"تو پھر اب کیا رہ گیا ہے؟"

"لکھ آیا ہوں کہ غالباً کرنال شاپ کے مالک شیخ عبدالمالک مدد کرتے ہیں۔"

"یہ لطیفہ آپ نے کس طرح وضع کیا؟"

"قیاس پر، کیونکہ شیخ عبدالمالک سے آپ کے تعلقات گہرے ہیں۔"

مَیں نے زور کا قہقہہ لگایا، اور عرض کیا مولانا مظہر علی سے آپ کے مراسم ہیں وہ آپ کو بتا سکتے تھے، میرے اخراجات ہی نہیں کہ اعانت کی ضرورت ہو، قدرت نے اس گدائی سے محفوظ رکھا ہے میری امداد اللہ کرتا ہے، رزق اُس کے ہاتھ میں ہے، بعض دوستوں نے نظر بندی کے اِن دنوں میں تھوڑی بہت امداد ضرور کی لیکن بالواسطہ، بلاواسطہ نہیں، مثلاً اُن میں سب سے زیادہ احترام کے مستحق مستری شمس الدین تھے جو احرار کے لیے پیدا ہوئے اور احرار ہی پر فنا ہو گئے بعض دوستوں سے انہی کا رابطہ تھا۔ دوسرے صاحب جن کا اخلاص دل پر نقش ہو تا رہا ملک محمد حیات ٹھیکیدار تھے، چائنہ مارٹ انار کلی کے مالک عبدالقادر چشتی بھی اِن آڑے دنوں میں کوئی نہ کوئی تحفہ بھیجتے رہے، راجپوت ٹیلرنگ ہاؤس کے مالک ماسٹر محمد اسمٰعیل نے بھی دوستانہ اِخلاص قائم رکھا، کبھی کبھار کوئی اچکن سی دیتے تو سلائی نہیں لیتے تھے، میاں قمرالدین اچھرہ کے رئیس تھے، شاہ جی انہیں احرار کا چلتا پھرتا بنک کہتے، فیّاض، عابد، زاہد، نیک، متقی، دیندار اور مخیّر، جتنے دنوں نظر بند رہا، گاہے ماہے مدد کرتے رہے، سوال رقم کا نہیں، اِخلاص کا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کا وجود اس گئے گزرے دَور میں غنیمت تھا ـــــــ میاں صاحب میرے لیے کاروبار کی مستقل راہ پیدا کرنا چاہتے تھے، بہت کچھ سوچتے لیکن نقشے بنا کر چپ ہو رہتے، مولانا مظہر علی اس معاملے میں ان کے ہمنوا تھے، آخر باہمی سوچ بچار کے بعد اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ ہوا، میاں صاحب نے دو قسطوں میں دو ہزار روپے دیئے یہ رقم مولانا مظہر علی نے وصول کی اور ان کے میر منشی نے خرچ کی، غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ ادارے کا نام جذباتی فضا میں مکتبۂ احرار رکھا، خیال تھا احرار کے نام سے ادارہ چل نکلے گا، لیکن سخت ناکامی ہوئی۔ تین کتابیں شائع کیں، پہلی خطباتِ احرار

چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی اظہر کے خطبات کا مجموعہ سرورق پر مولانا مظہر علی کی تصویر تھی —— احرار کے دوسرے زعماء بالخصوص شیخ حسام الدین اس سے خشمگین ہوگئے، اوّل تو عام سیاسی برہمی کے باعث مسلمان احرار سے برگشتہ ہو چکے تھے، دوم احرار میں پڑھائی لکھائی کا شوق کمزور تھا، سوم خود احرار میں اس کی اشاعت پر صاد نہ کیا گیا، دوسری کتاب مولانا مظہر علی اظہر کے قلم سے تھی، ہمارے "فرقہ وارانہ فیصلے کا استدراج" —— (جُداگانہ انتخاب سے پاکستان تک)، تیسری کتاب کا نام تھا "مرزا غلام احمد اور ستیارتھ پرکاش"، بظاہر مکتبہ میرے لیے قائم ہوا تھا لیکن میں نے اس سے ٹکا بھی وصول نہ کیا، میاں صاحب نے جس خلوص اور محبت سے روپیہ دیا تھا اُسی درجہ کی بے پروائی اور ناسمجھی سے روپیہ ضائع ہوگیا۔ کل سٹاک میں سے پانچ فیصد کتابیں فروخت ہوئیں، باقی کباڑیوں کے ہاتھ بیچ دی گئیں، یاد آگیا ایک چوتھی کتاب "میرا افسانہ (حصّہ دوم)" مصنّفہ چودھری افضل حق بھی شائع کی گئی، اس کے دو تین سو نسخے بِک گئے لیکن آخر کار ایک ناشر کے ہاتھ سارا سٹاک فروخت کر دیا۔

"نقوش" لاہور کے مالک و مدیر جناب محمد طفیل نے انہی دنوں اپنے ایک دوست لطیف فاروقی کو ساتھ ملا کر مکتبۂ شعر و ادب شروع کیا، میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبات جمع کیے، دیباچہ لکھا اور ان کے ہاتھ یہ مجموعہ دو سو روپے میں بیچ دیا، اکثر ناشروں کے مسودات کی تصحیح کی، پروف ریڈری کرتا رہا، نتیجۃً گذر بسر کی راہیں آسان ہوگئیں، نظر بندی کے باعث ایک چھوٹی سی بیٹھک میں رہ رہا تھا، دن بھر میلا لگا رہتا۔ ادیب، شاعر، خطیب، طلبہ، کارکن، راہنما اور دوست سبھی جمع ہوتے، بعض نئے دوستوں کا ایک خوشگوار حلقہ بنتا گیا، لا کالج کے بعض طلبہ خاصے دوست ہوگئے، ان میں کئی ایک تو اب سرکاری عہدوں پر ہیں لیکن بعض

ہمارے ساتھ ہی سیاسیات کے روزبازار میں آگئے، تقسیم کے بعد انہیں ہندوستان جانا پڑا اور وہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں رچ بس گئے ـــــ شہید وطن سردار بھگت سنگھ کے بھائی سردار کلبیر سنگھ بھی اِس اثنا میں رہا ہو کر آگئے، ہر روز دن بجے صبح میرے ہاں آتے دن بھر گپیں ہانکتے، کبھی کبھی ہم لوگ اُٹھ کر لاء کالج کے ہوسٹل میں چلے جاتے وہاں محفل لگتی، نگینہ بیکری میں جمع ہوتے وہاں دھما چوکڑی مچاتے ـــــ سی آئی ڈی کا غول متعاقب رہتا، حقیقت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ہم کوئی سیاسی بات نہ کرتے، گپیں ہانکتے، لطیفے گھڑتے، قہقہے لگاتے لیکن سی آئی ڈی کے اہلکاروں کو صبح و شام کھٹکا لگا رہتا، کلبیر سنگھ کو شرارتیں ضرور سوجھتی تھیں اور وہ چھیڑ خانی بھی کرنا چاہتا تھا لیکن سی آئی ڈی کے اہلکاروں نے ذہن میں جو نقشہ بنا رکھا تھا وہ کچھ اور ہی تھا، اور حقیقت سے اس کا تعلق ہی نہ تھا ـــــ ایک دن کلبیر سنگھ دو پستول لایا، ہم وہاں سے اُٹھ کر فلیمنگ روڈ پر علّامہ تاجور کے ہاں چلے گئے، دونوں پستول ان کے حوالے کیے، ان سے وعدہ کر آئے تھے کہ صبح واپس لے جائیں گے، لیکن اگلی صبح پو پھٹنے سے پہلے کلبیر سنگھ گرفتار ہو گیا، علّامہ تاجور ہانپتے کانپتے میرے ہاں پہنچے۔

"میاں! یہ حرامی بچے کہاں چھوڑ آتے ہو، سنبھالو انہیں ..."

مَیں نے پس و پیش کی۔ عرض کیا "راوی میں بہا دیجئے"۔

علّامہ میرے ہاں سے اُٹھ کر دریائے راوی پر گئے اور دونوں کو ڈبو دیا۔

مولانا مظہر علی اظہر ان دنوں ہر روز میرے ہاں تشریف لاتے، گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھتے، باتیں کرتے اور چلے جاتے، باتوں باتوں میں ایک دن کہنے لگے میو ہسپتال میں آج کل چار نظر بند بیمار پڑے ہیں، پروفیسر تلک راج چڈھا، سردار کلبیر سنگھ، کامریڈ محمد یا بیو ڈار اور خان سحر گل خان۔ سی آئی ڈی کی اطلاع ہے کہ تم ان سے روزانہ ملتے

ہو، آج کے بعد وہاں قدم رکھا تو پکڑے جاؤ گے، خبردار ہو جاؤ۔ آخر وہاں جانے کی ضرورت کیا ہے ؟

مَیں چوکنا ہو گیا۔ اس کے بعد سی آئی ڈی کو حسرت ہی رہی کہ ادھر سے گزروں اور وہ مجھے پکڑ کر جیل بھیج دے۔

مولانا مظہر علی زور دے رہے تھے کہ شادی کر لوں، پہلے تو ہچر مچر کرتا رہا، لیکن آخر ماموں کے ہاں رشتہ ہو گیا، اس سے پہلے کہ شادی ہوتی اپنے چھوٹے بھائی اقبال یورش کی جواں مرگی کا صدمہ اٹھانا پڑا، یہ ایک جاں گسل سانحہ تھا جس سے سات برس قید کے بعد گزرنا پڑا، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ [۱]

---

[۱] دیکھو پسِ دیوارِ زنداں

جیل کی یادیں

جیل خانے سے نکلا تو میرے ساتھ یادوں کا ایک ذخیرہ تھا، تجربوں کی تجوریاں، مطالعہ کی وسعتیں، مشاہدات کے خزانے، نظریات کی اُمنگیں، تصورات کے سانچے اور خیالات کا ہجوم "پسِ دیوارِ زنداں" میں ان کی تمام و کمال رُوداد موجود ہے، کئی چیزیں حافظہ کے چنگل سے نکل چکی ہیں، بیشتر قلم کی نوک پر آتے آتے رہ گئی ہیں، اور بعض ربع صدی گزر جانے کے باوجود اب بھی کسی کروٹ کے ساتھ جاگ اٹھتی ہیں

۱۹۴۷ء تک میری زندگی کا ہر تیسرا دن جیل خانے میں گزرا، انھیوں نے مجھے مکمل کیا، سب سے بڑی بات جو میں نے حاصل کی دوستوں کا حلقہ اور کتابوں کی صحبت تھی، مجھے اپنی تعلیم کے اُدھورا رہ جانے کا بہت افسوس تھا لیکن جیل خانے کے شب و روز نے مجھے علم و فکر میں ڈبو دیا اور میں ان لوگوں سے بہت آگے نکل گیا جو دوش پر ڈگریوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہے تھے، اگر قید میں یکسوئی ہوتی یا حالات موافق ہوتے اور سر و سامان کی بے مائیگی مانع نہ ہوتی تو میں عمر کی اس منزل میں تھا کہ مختلف زبانوں کا علم بھی حاصل کر لیتا لیکن معاش کی درماندگی ایک ایسی دیوار تھی، جس نے حصُولِ علم کا راستہ روک لیا تھا، آخری سات برس قید کے ابتدائی ساڑھے تین سال مصیبتوں میں گزرے لیکن میری زندگی کے سنوارنے میں اس قید کا بڑا حصہ ہے، لاہور میں جتنے برس گزرے ان کے شب و روز عظیم تھے، بہترین لوگوں کا ساتھ

رہا اُن میں عالم، دانشور، سیاستدان، مُدبّر، مُصنّف، مُعلّم، تاریخ ساز اور تاریخ دان سبھی قسم کے لوگ تھے، مجھے نہ صرف ملک کی پچاس سالہ تاریخ سے آگاہی ہوئی بلکہ اس کے احوال و آثار اور نتائج و مظاہر سے کاملاً واقف ہو گیا، کوئی پہلو ایسا نہ رہا جو پوشیدہ ہو اور کوئی سیاسی راز نہ تھا جو ہمراہیوں کے سینہ میں ہو اور میرے علم میں نہ آیا ہو۔

(۱) اس دوران میں پنجاب لائبریری کا ممبر بھی بن گیا، اور اس کے اردو حصّہ کا تقریباً بڑا حصّہ پڑھ ڈالا۔ نظم، ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، مذہب، جغرافیہ، سیرت، تذکرے حتیٰ کہ علمِ نجوم اور علمِ ہیئت بھی۔

(۲) انگریزی دسویں تک پڑھ چکا تھا لیکن طبیعت اس طرف راجع نہ ہوئی بولنے کا محاورہ نہ تھا، لکھنے میں قدرت نہ تھی لیکن پڑھنے میں خاصی استعداد بہم پہنچا لی، مزاج آشنا ہوتا گیا حتیٰ کہ انگریزی کی بعض دقیقتیں میرے لیے آسان ہو گئیں، تاریخ اور سیاست کے بارے میں انگریزی کی اہم کتابیں پڑھ ڈالیں، ان سے نوٹ بھی لیے اور ان پر اپنے نوٹ بھی لکھے۔

(۳) پروفیسر تلک راج چڈھا سے سبقاً سبقاً مارکسزم پڑھا، سوشلزم اور کمیونزم کے بارے میں تاریخی اور علمی معلومات حاصل کیں ——— ان کے پاس ایک کتاب ہینڈ بک آف مارکسزم تھی، اس طرح ہضم کی کہ پوری کتاب ازبر ہو گئی۔

(۴) اسلامیات سے مجھے غایت درجہ شغف تھا، مولانا محمد گلشیرؒ سے قرآن مجید اور ترجمہ پڑھا، لیکن اسلامیات کے دوسرے مضامین بالخصوص سیرت اور تاریخ خود مطالعہ کرتا رہا، اُردو اور فارسی کی بے شمار کتابیں پڑھیں، مارکسزم نے میرے دماغ کو ہلا ڈالا، اس کی منطق کے سامنے فکر و نظر سپر انداز ہو گئے۔ یہاں تک کہ میں خدا کی نفی پر کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کا ہمنوا ہو گیا، لیکن سیّد سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ پر ایک چھوٹی سی کتاب "خطباتِ مدراس" مجھے دوبارہ مسلمان بنانے کا باعث ہو گئی ——

اس کتاب کے مطالعہ ہی سے مَیں نے یہ نکتہ اخذ کیا کہ دنیا کو اتنا نظریوں نے نہیں اتنا شخصیتوں نے بدلا ہے، اصل چیزیں کتابیں نہیں انسان ہیں، یہ الگ بات ہے کہ انسان کتاب پر ایمان لاتے ہیں انسان پر نہیں، حالانکہ کتابیں بھی انسانوں ہی پہ نازل ہوئی ہیں یا کتابوں کے مصنف بھی انسان ہوتے ہیں، مجھے یقین ہو گیا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے افضل و اکمل کوئی سیرت نہیں، وہی ایک انسان تھے جن کی سیرت نے لاکھوں انسان پیدا کیے اور ان کا فیضان آج تک جاری ہے، یہی انسان زندگی کے ہر شعبہ اور ہر دَور میں انسانوں کے رہبر رہے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اسلام سیاسی طور پر ایک بڑی طاقت نہیں رہا اور اس کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جو اسلام کو اپنے لیے استعمال کرتے تھے لیکن خود اسلام کے لیے استعمال نہیں ہوتے۔

اسلام میں واپسی کے بعد جس کتاب نے مجھے سب سے زیادہ گرویدہ کیا اور مَیں دماغاً پکا مسلمان ہو گیا وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن تھا، ترجمان القرآن نے مجھے "خدا موجود ہے" کے آستانہ پر جھکا دیا، مولانا کا عدالتی بیان تو مَیں بہت پہلے پڑھ چکا تھا اور اس نے ابتلا میں میری سیرت کو چمکا دیا تھا لیکن الہلال کے مطالعہ نے جس کی فائلیں مجھے دستیاب ہو گئی تھیں میرے ذوق و شوق اور میرے کردار و سیرت کو استقامت و قربانی میں پختہ کر دیا، علّامہ اقبال کے کلام نے مجھ میں اسلام کے لیے عصبیت پیدا کی اور میں محسوس کرنے لگا کہ اسلام فی الواقعہ ایک عصری طاقت ہے جس سے مسلمان معاشرے نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

(۵) شاعری کا شوق تو مجھے طالب علمی کے زمانہ ہی سے تھا لیکن سیاست میں قدم رکھنے کے بعد مَیں نے شعر کہنا قریب قریب ترک کر دیا، آخری سات سالہ قید میں دو چار نظموں کے سوا کچھ نہ کہا، جہاں تک مطالعۂ شعر کا تعلق ہے، میں نے

اساتذہ کے کلام کا بیشتر حصّہ پڑھ ڈالا، پبلک لائبریری میں جتنے دیوان تھے میری نظر سے گزر گئے، اشعار کا بڑا حصّہ مجھے زبانی یاد ہوگیا، کوئی پچاس ساٹھ ہزار اشعار ہونگے جو میرے حافظہ پر نقش ہوگئے۔

(۶) خطابت کے متعلق مَیں نے ایک نیا ذوق پیدا کرلیا، فی الجملہ میرا اپنا ایک اسلوب ہوگیا اور یہ سب مطالعہ کی رفاقت کا نتیجہ تھا۔

(۷) میں قومی جدوجہد کے اصولوں سے آگاہ ہوگیا، ایک چیز جس نے میرے دل و دماغ کو متاثر کیا وہ بعض انقلابی دوستوں کی رفاقت اور بعض کانگرسی دیش بھگتوں سے نفرت کے باوجود عدمِ تشدد کا فلسفہ تھا۔ مَیں حکومت کے خلاف عوام کے تشدّد کا سخت مخالف تھا اور ہوں، میرے نزدیک خوں ریز عالمی جنگوں کا تصور ہی وحشت ناک ہے۔ یہ نہیں کہ عدمِ تشدّد میرے نزدیک ایک مذہب ہے یا قومی جدوجہد کا عملی فلسفہ، لیکن جن قومی و غیر قومی حکومتوں سے ہمیں واسطہ پڑا ہے ان کے مظالم سے تشدد کے ساتھ نپٹنا سہل نہیں، ایک بڑا خون خرابہ ہی ایک چھوٹے خون خرابے کو جنبیتا ہے۔

تشدّد میں ہمیشہ اُن لوگوں کو بربادی اور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو عموماً اس میں حصّہ نہیں لیتے، عدمِ تشدّد ایک ایسا ہتھیار ہے کہ جو لوگ اس میں حصّہ لیتے ہیں نقصان ہو تو انہی کا ہوتا ہے اور فتح ہو تو فائدہ سب کو پہنچتا ہے، قربانی یہ نہیں کہ ہم دوسروں کو قربان کردیں، قربانی یہ ہے کہ ہم خود قربان ہوجائیں، فی زمانہ جنگ کے ہتھیار اتنے مہلک ہوگئے ہیں کہ جس جماعت یا فرد کے تصرف میں ملک کے خاص عناصر مثلاً فوج، پولیس اور سول سروس کے افراد ہونگے وہ اپنے ملک کے عوام کو بہ آسانی کچل سکے گا، ڈکٹیٹروں کے ملک اسی اصول پر چلتے ہیں، ایشیا اور افریقہ کے وہ ملک جو پچھلی دو تین دہائیوں میں برطانوی، فرانسیسی، ولندیزی اور

اطالوی شکنجہ سے آزاد ہوئے ہیں ان کی سیاست اتنی گندی ہے کہ ان ملکوں میں اوّل تو استعمار کے پرانے نمک خوار اور ان کے ادنیٰ خدمت گزار حکمران ہیں، دوم بڑی طاقتوں نے ان حکومتوں کا بناؤ اور بگاڑ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے کہ عوام میں اپنی حکومتوں کے آمروں یا کھلاڑیوں سے عہدہ برآ ہونے کی سکت ہی نہیں۔ وہ ہتھیاروں سے مقابلہ ہی نہیں کر سکتے اور اگر کسی غیر ملکی طاقت سے ہتھیار لے کر جنگ کریں تو اپنے ہی ہاتھوں ملک تباہ ہو جاتے ہیں اور عوام کو موت کی حشر آفرینیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، عدم تشدد ہی ایک ایسا فلسفہ ہے جو پسماندہ ملکوں کو استعماری امداد کے پروردہ حکمرانوں سے نجات دلا سکتا ہے، البتہ اس فلسفہ کی تکنیک میں کچھ اور اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔

(۸) توحید و رسالت پر کاملًا ایمان رکھنے کے باوجود تاریخ اسلام کے مطالعہ سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ معاشرہ میں طبقاتی کشمکش ہمیشہ سے رہی ہے اور جب تک سوسائٹی کے ذرائع پیداوار ریاست کی ملکیت نہیں ہوتے اور ریاست نیابتِ الٰہی پر استوار نہیں ہوتی اس وقت تک انسان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا ہے۔

(۹) ایک چیز جس کا مجھے انتہائی دکھ رہا وہ جیل خانہ میں مسلمان ملازموں کی اکثریت کا رویہ تھا، غیر ملکی غلامی ان کی فطرت میں رچی ہوئی تھی، اگر وہ سیاسی قیدیوں سے حسنِ سلوک کرتے تو کسی قومی جذبے سے نہیں بلکہ اپنی انفرادی شرافت سے، اور وہ اس معاملہ میں ہندو اہلکاروں سے زیادہ فیاض تھے، جہاں تک قیدیوں کا تعلق تھا ہندو اور سکھ افسروں کے اردلی وغیرہ عمومًا مسلمان ہوتے خصوصیت سے ان اضلاع کے قیدی جن اضلاع کے لوگ برطانوی فوج میں بھرتی ہوتے اور برطانوی استعمار کا رنگ جماتے تھے۔ اِن قیدیوں کا شیوہ حکام کے اشارۂ ابرو پہ قیدیوں کی پٹائی اور مخبری تھا۔

(۱۰) قیدیوں کو جتنی مراعات حاصل ہوئیں اور جیل خانوں کا استبدادی مزاج بدلا گیا تو اس کا کریڈٹ سیاسی قیدیوں کو دیا جا سکتا ہے یا پھر سکھ قیدیوں کو جو اخلاقی مجرم ہو کر بھی اس استبداد کے خلاف لڑتے رہے، حقیقت یہ ہے کہ جیل خانوں کی اصلاح میں جتنا حصہ ان لوگوں نے لیا مسلمانوں کا دامن اس سے خالی رہا۔

(۱۱) جیل خانے فی الجملہ جرائم کے تربیت خانے ہیں، مقصود سزا دینا ہے سو قانون کی منشا سے کہیں زیادہ سزا دی جاتی ہے اور ایک معمولی سا مجرم بھی جیل خانے میں چھ ماہ رہ کر ایک پختہ مجرم ہو جاتا ہے۔

(۱۲) جیل خانے میں کبھی اس بات کا احساس ہی نہیں کیا گیا کہ انسانی فطرت کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اور ان پر جیل خانہ کا ضابطہ کس سنگینی سے اثر انداز ہوتا ہے؟

(۱۳) جیل خانہ میں حکّام کی اکثریت دل سرد اور بیدرد ہوتی ہے، قیدیوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے، جتنی رشوت جیل میں چلتی ہے اس کی حد نہیں۔

(۱۴) کمسنوں اور نوعمروں کو بڑی عمر کے قیدیوں سے واسطہ پڑتا تو سگریٹ کے ایک کش پر خودسپردگی کا راستہ کھلتا اور وہ اس مطالبہ کو پورا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

(۱۵) جیل خانہ میں گمشدہ یادیں بہت ستاتی ہیں، بسا اوقات عزیزوں کا تصور پہروں پریشان رکھتا ہے ؎

در قفس پہ اندھیروں کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

(۱۶) انسانی فطرت کے غوامض و اسرار سے آگاہی کے لیے جیل خانہ بہترین جگہ ہے، ہر شخص بے نقاب ہو کر سامنے آتا ہے، انفرادی سیرت اور اجتماعی ذہنیت

کی پہچان کے لیے اس سے بڑی کوئی جگہ نہیں، کھرا اور کھوٹا دونوں نکھر جاتے ہیں، سفر اور قید دو پیمانے ہیں جن سے رفیقوں کے ظرف کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

(۱۷) آخری قید کے سات برسوں میں ایک چیز جس نے مجھے خیالات کے اتار چڑھائ میں مدد دی وہ کانگرس کے ہندو رہنماؤں کی اجتماعی ذہنیت کا مطالعہ تھا، عام سوشلسٹوں اور عام کمیونسٹوں کو چھوڑ کر کانگرس کے ہندو رہنما بالطبع ہندو تھے وہ مسلمانوں کو بہر حال پسند نہیں کرتے تھے، کانگرس میں بلاتے ضرور لیکن دروازے بند رکھتے تھے اس کا اندازہ میں نے صاف صاف کر لیا تھا کہ ان کے لیے کسی شخص کا مسلمان ہونا ہی تنفر کا باعث ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کانگرس کے صدر رہے لیکن پنجاب کے کانگرسی رہنما انہیں بُری سے بُری تنقید کا ہدف بناتے، میاں افتخار الدین صرف مسلمانوں میں پیدا ہونے کی وجہ سے ان کے معتوب رہے، حالانکہ انہیں اسلام سے کوئی خاص تعلق نہ تھا کوئی ادنیٰ و اعلیٰ مسلمان ان کی نگاہ میں محبوب و محترم نہ ہو سکا، ان کے نزدیک احرار اور بھی معتوب تھے، اس لیے کہ احرار کے ساتھ اسلام کا لفظ لگا ہوا تھا، وہ شیام پرشاد مکرجی اور ساورکر کو تو قومی ہیرو سمجھتے تھے لیکن عطاء اللہ شاہ اور حسین احمد مدنی کو نہیں ان کے ذہن میں نیشنلزم کے معنی خود سپردگی کے تھے، اسی زمانہ میں آچاریہ کرپلانی نے ایک مضمون لکھا تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس گاندھی جی کے فلسفہ و فکر کا نام ہے، اور جو شخص گاندھی جی کا پیرو نہیں وہ کانگرسی ہی نہیں۔ لیکن ہندوؤں کی نئی پود اس کے باوجود مذہب، خدا، سماج سب کی دشمن تھی اور ان میں ثقافتی و تہذیبی طور مسلمانوں کے اثرات زیادہ نمایاں تھے، پنجاب میں دو ہندو خاندان سچے نیشنلسٹ تھے، ایک لالہ پنڈی داس سورگباشی کا خاندان، دوسرا شہید وطن سردار بھگت سنگھ کے پتا سردار کشن سنگھ کا خاندان۔

مولانا محمد علی کسی زمانے میں کانگرس کے صدر رہ چکے تھے ان کا ضرب المثل

فقرہ ہے کہ:

"وہ ہندو جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ کہتے ہیں دراصل کمیونلسٹ ہیں،
اور وہ مسلمان جو اپنے آپ کو کمیونلسٹ کہتے ہیں خود غرض ہیں۔"

میرا ذہن رہائی کے بعد اس مشاہدے پر راسخ ہو چکا تھا۔

میری شادی

مولانا مظہر علی اظہر کی تحریک، والد کے اصرار اور بہنوں کی خواہش پر مجھے سر جھکا دینا پڑا، اور میں اپنی شادی کے لیے تیار ہو گیا، اصل سوال روپے کا تھا اور میرے پاس یہی نہیں تھا، مولانا مظہر علی اظہر نے ایک خاص رقم دینے کا وعدہ کیا جس کا انتظام منشی شمس الدین کے سپرد تھا، میں اس خیال میں تھا کہ مولانا رقم اپنے پاس سے دے رہے ہیں لیکن مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا جب میں نے یہ سنا کہ انہوں نے مختلف دوستوں سے چندہ لیا ہے۔ دنوں تک پریشان رہا، میرے اضطراب کا یہ حال تھا جیسے کسی نے انگاروں پر لٹا دیا ہو، ممکن ہے راز ہی رہتا لیکن راز کھلا اس طرح کہ لاہور میں ایک بزرگ ملک محمد امین بیرسٹر تھے، ایک دن سرِ راہ مل گئے، فرمایا مولوی مظہر علی آپ کی شادی کے لیے آئے تھے، میں نے سو روپیہ دے دیا تھا، ان کا تو شکریہ ادا کیا لیکن مجھے سرِ بازار پسینہ چھوٹ گیا، زمین میں غرق ہونے کو جی چاہ رہا تھا —— امرتسر میں ایک صاحب جمال الدین بٹ تھے، ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ میں ان کی دو ایک بسیں تھیں، مولانا نے ان سے بھی مدد مانگی تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا، اپنے اس انکار کو بہت دنوں بعد جمال الدین بٹ نے خود مجھ سے بیان کیا۔ میں حیران رہ گیا کہ مجھ پر یہ سانحہ بھی گذر چکا ہے۔

میاں قمر الدین رئیس اچھرہ پہلے ہی شادی کے لیے پانچ سو روپیہ دے چکے تھے،

مَیں ان سے ایک دفعہ ناراض بھی ہوگیا، میرا جوان بھائی اقبال پورش ہر سانس کے ساتھ تپدق سے مر رہا تھا ـــــ شادی اُس کی موت کے انتظار میں رک گئی اور جب مرگیا تو ملتوی ہو گئی، میاں صاحب نے ایک دن شادی کا ذکر چھیڑ دیا، اچانک ان کے منہ سے نکل گیا ڈ پانچ سو روپے بھائی کی بیماری میں تو نہیں لگا دیتے ؟ یہ الفاظ دل میں خنجر کی طرح پیوست ہو گئے، گھر لوٹ کر منشی شمسُ الدّین کو بلوایا، انہی کے پاس وہ روپیہ تھا اُن سے کہا فوراً پانچ سو روپیہ میاں صاحب کو واپس کر آئیں - وہ حیران رہ گئے، معاملہ کیا ہے ؟ آخر میرے اصرار پر میاں صاحب کو رقم لوٹا آئے - میاں صاحب بیمار تھے، مولانا مظہر علی دوڑے دوڑے آئے، معلوم ہؤا کہ میاں صاحب نے ان کو بلا کر ساری کتھا سُنائی اور مجھے یاد کیا ہے، مولانا مجھے کھینچ کھانچ کے ساتھ لے گئے، میاں صاحب نے سرزنش کی، گلا فرمایا اور معذرت چاہی، پھر دیر تک پرچاتے رہے، پانچ سو روپیہ مولانا کے حوالے کیا، انہوں نے منشی شمسُ الدین کو دے دیا، میں دل برداشتہ تھا لیکن پر بودھ کے ساتھ مری چلا گیا۔ شادی کے تصوّر میں محو لیکن شادی کے نظم سے بے نیاز، پربودھ ہی ایک دوست تھا، جو میرے ایام قید کی یادگار تھا، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو گئے تھے، بھائی بھی اتنے سگے نہیں ہوتے جتنا ہم ایک دوسرے کے لیے سگے تھے۔

ہفتوں مری کے تختہ ہائے گل وگلاب کا لطف اٹھاتا رہا، دیو قامت پہاڑ صدیوں سے صدیوں تک شرط باندھے کھڑے تھے، بادلوں کی سرمئی چادریں جیسے شاعروں کے دیوانوں پر جلدیں بندھی ہوں، بنگلوں اور کٹیاؤں میں قمقموں کی جھالریں اپسراؤں کے جھرمٹ معلوم ہوتیں، لکہ ہائے ابر شاعروں کے آوارہ تخیّل کی طرح اڑتے پھرتے، گھٹائیں جوڑے کی گندھاوٹ نظر آتیں، بادل کھُلتے تو بکھرے ہوئے گیسوؤں کا گمان ہوتا، برستے تو خیالوں کا چمن کھِل جاتا۔ روشیں گویا مرصع عبارت ہوں، شاخساروں پر کونپلیں اور کونپلوں پر اوس کے قطرے جیسے کسی نے رقاصہ کے پشواز پر تارے ٹانک دیئے ہیں۔

میرے لیے سردی کا موسم خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، پہاڑوں کی دلفریبیاں میرے لیے اور بھی کافر ہو جاتی ہیں۔ میرا شاعرانہ ذوق ایکا ایکی جاگ اٹھتا ہے، جی چاہتا ہے بادلوں کے عمیق غاروں میں ڈوب جاؤں۔ لالہ وگل رفیق سفر ہوں۔ خلا کے مُغنیوں سے کہوں کوئی نغمہ کوئی تال، کوئی سُر، کوئی راگ، کوئی دُھن، کوئی غزل ——— رقص ہی رقص، نغمہ ہی نغمہ۔ اُن دنوں مری دوسرے پہاڑوں سے زیادہ پاکیزہ تھا، شملہ، ڈلہوزی اور مسوری میں نسوانی جسم ادنیٰ قیمتوں پر فروخت ہوتے تھے، لیکن مری اور اس کے قرب وجوار میں اس کا تصور ہی ناممکن تھا، غربت اور پہاڑوں کی طرح ——— یہاں بھی تھی، لیکن غربت کے ساتھ غیرت بھی تھی ———

سعید ملک جو کچھ دنوں جماعت اسلامی میں شامل رہے اور آج کل مولانا امین الحسن اصلاحی کے ساتھ تارک الجماعت ہو چکے ہیں اس زمانہ میں فارسٹ آفیسر تھے، مری سے پانچ میل دُور ان کا دفتر تھا، انہیں ملنے کے لیے گیا تو راستہ میں نظریں چرواہیوں سے ٹکراتی رہیں، ان کے شوہر، بھائی، باپ، جنگ کی غذا ہو کر سمندر پار گئے ہوئے تھے لیکن ان کی تنہائیاں گناہوں کے ہر تصور سے خالی تھیں، ان کی حیا کے فانوس ان کے چہروں پر جگمگا رہے تھے، ان کی جھکی ہوئی پلکیں بتا رہی تھیں کہ ان کے چہروں پر غیر کی نگاہیں ٹک نہیں سکتی ہیں، ان پھولوں میں نگاہ غیر سے کا نوتا نہیں، یہ اپنی ہی شاخوں کے پھول ہیں، انہیں مائیں جنتیں، کوہستانی سلسلے پالتے، ہوائیں جھلاتی، ڈھور ڈنگر جوان کرتے، باجرہ غذا اور نباتات اور لوک گیت شریانوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں۔

سعید ملک سے مل کر لوٹا تو پربودھ نے ایک تار دیا جو انبالہ سے آیا تھا ——— لکھا تھا "لاہور پہنچو، شادی کی تاریخ بدلی جا رہی ہے"، جھگڑا اس پر تھا کہ خواجہ صادق کاشمیری انبالے میں مشاعرہ کرانا چاہتے ہیں لیکن چونی لال کاوش اور رنبیر دانی جالندھری سے انتظام نہیں ہو رہا تھا، خواجہ صاحب کو دونوں نے معذرت نامہ لکھ دیا، خواجہ صاحب نے

تار لٹکا دیا ــــــ اسی رات سقوطِ برلن ہوگیا، سنی ویو جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے ایک فوجی کیمپ تھا، اس کے میدان میں ایک جشن رچایا گیا، ایک خانہ زاد خان صاحب نے راولپنڈی سے رنڈیوں کو بلوایا۔ شرابیں پانی کی طرح بہ گئیں، بوتلوں کے کاگ اڑائے گئے، رنڈیوں نے مجرا کیا، گوروں کی سمجھ میں خاک آتا، یورپی اور ہندوستانی رقص میں زمین آسمان کا بُعد تھا۔ رنڈیاں ناچ رہی تھیں، گورے غرا رہے تھے، خانصاحب کی مٹھی بھر داڑھی اس پر قطرہ ہائے شراب، گھنگھروؤں کے چھناکے، پیالوں کی کھنک، اوباشوں کے قہقہے دل پر زخم بنے جا رہے تھے، یہی زخم ایک ایسی نظم میں ٹیپ کا بند ہو گئے، جس نے کھٹر دلوں کو گز بھر کی زبانیں مہیا کیں کہ خدا نخواستہ میں نے کوئی کلمۂ کفر کہہ دیا ہے ــــــ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اصل سوال قومی حس اور ملّی غیرت کا تھا۔ جب تک انگریز رہا ٹوڈی مسلمانوں کا شعار رہا کہ ہندو ارادۃً یا غیر ارادۃً مسجد کے پاس سے باجا بجاتے گزرتے تو اسلام کی توہین ہو جاتی، محرم میں تعزیہ گذارنے کے لیے پیپل کے پتے کاٹے جاتے تو ہڑبونگ مچ جاتا لیکن انگریزوں نے مسجدیں ڈھائیں، اسلام کا مذاق اڑایا، ہندوستان میں اہانتِ رسول کی بنیاد رکھی، ذوالجناح کے جلوس پر لاٹھی چارج کیا، خود مسلمانوں نے چکلے قائم کیے، شرابیں بیچیں، پیرِ مغاں سے لے کر مغبچوں تک کے فرائض انجام دیئے، لیکن حکومت کے ان کاسہ لیس مسلمان اکابر کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، پہلی جنگ عظیم میں برطانوی فوج نے خانہ کعبہ کے صحن سے لے کر عبدالقادر جیلانیؒ کے روضہ تک گولیاں برسائیں لیکن ان خود فروشوں کو احساس تک نہ ہوا۔ تحریکِ خلافت کے بعد سے ان لوگوں کی بدولت برِ عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہ کفرِ مغلوب سے لڑتے اور کفرِ غالب سے دبتے تھے۔

مری سے لاہور پہنچا تو پتا چلا مشاعرہ کا انتظام ہو گیا ہے، اب خواجہ صادق

اصرار کر رہا ہے کہ انبالہ کی تاریخ میں اتنا بڑا مشاعرہ پہلی دفعہ ہو رہا ہے، اس کی صدارت مولانا ظفر علی خاں کریں اور وہ اعلان کر چکا ہے، ادھر کاوش علامہ تاجور سے صدارت کے لیے کہہ چکا تھا۔ اب دو مشکلیں تھیں، مولانا تاجور کو ٹالنا غیر شائستہ پن تھا اور مولانا ظفر علی خاں کبرسنی کے اس عالم میں تھے کہ انہیں تیار کرنا مشکل تھا — بہرحال ہم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ اپنی ضعیفی کا عذر کرتے رہے، آخر ہمارے اصرار پر مان گئے۔ چونی لال کاوش نے کہا۔ مولانا ہم شادی کے موقع پر مختلف شاعروں کی تہنیتیں چھاپ رہے ہیں، آپ بھی تبرکاً کچھ فرما دیجیے۔ مولانا مسکرائے، حقہ کا کش لگایا، انگلی پر دائرہ سا بنا، کھٹ سے مطلع ہو گیا۔

یقینی تھا کہ شعروں کی ایک مالا تیار ہو جاتی، اتنے میں اختر علی خاں چند دوستوں کو ساتھ لے کر آ گئے، نتیجۃً مولانا کا ارتجال اور ہماری آرزو دونوں غارت ہو گئے۔ ہم "پھر سہی" کی توقع پر چلے آئے لیکن اگلے ہی روز ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا، خواجہ عبدالرحیم عاجز نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا پیغام دیا کہ وہ انبالہ نہیں جائیں گے۔

"کیوں؟"

"شاہ جی کہتے ہیں، جہاں ظفر علی خاں ہوگا میں نہیں جاؤں گا، شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا، فرمایا ہاں بھئی! "میثاقِ گجرات" کے بعد میں ظفر علی خاں سے نہیں ملا۔ مجھے سخت ناراضی ہے، میں اُس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا، میں نے عرض کیا، مجھے پہلے سے اندازہ ہوتا تو انہیں دعوت نہ دیتا، اصل پس منظر شادی نہیں مشاعرہ ہے شاہ جی کسی طرح نہ مانے، لیکن قدرت نے تیسرے دن راستہ پیدا کر دیا، کاوش شعر لکھوانے کے لیے دوبارہ حاضر ہوا تو مولانا نے پہلا استفسار یہ کیا:۔

"شادی کب ہے؟

کاوش نے کہا "۲۷ مئی کو! تین دن بیچ میں ہیں"

مولانا نے کہا بھائی! مَیں نہیں جا سکوں گا، دو دنوں سے اسہال آ رہے ہیں یُوں بھی اعصاب میں سفر کی ہمت نہیں۔

کاوش نے مولانا کے انکار کو غنیمت سمجھا، ہم دونوں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے عرض کیا کہ مولانا کو روک دیا ہے؟ وہ تیار ہو گئے۔

میری پابندیاں قسط وار اٹھائی جا رہی تھیں، پہلے تھانہ انارکلی کے علاقہ میں گھوم پھر سکتا تھا، اس علاقہ میں یورش کے دقفاتے تک نظر بند رہا اس کو لحد میں اُتار کر اعزہ لوٹے تو تھانیدار نظر بندی کے احکام کی تنسیخ کا آرڈر لیے کھڑا تھا، یہ احکام میری اس درخواست پر صادر ہوتے تھے کہ میرا بھائی موت و حیات کی کشمکش میں ہے اس کا علاج کرانے کے لیے نظر بندی ہٹالی جائے وہ مر کے دفن ہو گیا تو احکام پہنچے ساحر لدھیانوی نے جھنجھلا کر اس آرڈر کی پُشت پر چند شعر لکھے، مَیں نے لفظ شکریہ لکھا اور دستخط کر کے واپس کر دیئے، لیکن زبان بندی کے احکام بدستور چل رہے تھے۔

بہر حال ۲۷ رمئی ۱۹۴۵ء شادی کا دن تھا۔

نو بجے صبح ہوڑہ ایکسپریس پر سوار ہو کر انبالہ روانہ ہو گئے، عزیزوں، دوستوں شاعروں اور سیاسیوں کا ایک قافلہ تھا، کئی دوست راستہ میں شامل ہو گئے۔ کوئی ڈیڑھ دو بجے ہم لوگ انبالہ پہنچے ——— مَیں نے روزمرہ کا لباس پہن رکھا تھا، کھدر کی سفید قمیص، کھدر کا پاجامہ، جواہر جاکٹ، سادہ چپل اور جناح کیپ میں ۱۹۳۰ء سے کھدر پہنتا آ رہا تھا لیکن اجمل کیپ جس کا نام بعد میں گاندھی ٹوپی ہو گیا یا دوپلی، جو دہلی اور یوپی کے شرفاء پہنتے تھے کبھی نہیں پہنی، ہمیشہ سر پہ جناح کیپ رکھی، جناح کیپ بھی جناح کیپ نہیں تھی بلکہ افغانی شرفاء پہنتے تھے، قائد اعظم نے اس کی دیوار نیچی کی جس سے اس کی پھبن میں اضافہ ہو گیا، اجمل کیپ گاندھی جی کے ہاتھ آ گئی، اس کی شکل میں تغیر آ گیا۔

مشاعرہ بھی ہوگیا، شادی بھی ہوگئی، میں اپنی بیوی لے کر لاہور آگیا۔ رہنے کے لیے وہی کلبۂ احزان تھا —— مولانا ظفر علی خان ولیمہ پر تشریف لاتے، میری بیوی کو دعائیں دیں، ارتجالاً فرمایا :—

گجر دم سے کے قاصد یہ مسرت زا پیام آیا
کہ انبالے سے شورش ایک چندنا سی دلہن لایا
مرے دل سے دعا نکلی کہ اس جوڑے کے سر پر ہو
نبیؐ کی رحمتوں کا اور خدا کے فضل کا سایا

پربودھ جی کی سالی سوراج کماری پہلی دفعہ ہمارے اس کلبۂ احزان میں آئیں، بیوی کو ملیں، بہت خوش ہوئیں، مجھے مبارک باد دی، کہنے لگیں :

"آپ چاند کو دُکھی دھرتی پر اُتار لاتے ہیں۔"

خورشیدہ (میری اہلیہ) کے لیے لاہور ایک نیا شہر تھا، گرمی کے دن، شملہ کا دامن چھوڑ کر لاہور میں رہنا اُس کے لیے مشکل ہوگیا۔ ہفتہ عشرہ ہی میں بیمار ہوگئی، اس کے چہرہ پر مہاسے نکل آتے، پھوڑوں اور پھنسیوں سے لدگئی۔

پہلے میں اکیلا تھا اب دو ہوگئے، شادی پر نیوتوں کی شکل میں بہت سا روپیہ جمع ہوگیا، مری سے چلا تو پربودھ نے خاصی رقم دی تھی، خود میں نے قلم کے کام سے ابتداءً پانچ سو روپے حاصل کیے، پھر دو ایک مسودوں سے مزید ڈیڑھ ہزار روپیہ جمع کرلیا، غرض تمام اخراجات کے بعد ایک رقم پس انداز ہوگئی، لیکن سوال وہی مستقل روزگار کا تھا، جماعت سے میں کوئی الاؤنس لینا نہیں چاہتا تھا اور نہ سیاست میرے لیے کوئی ذریعۂ معاش تھی —— آخری قید کاٹنے تک میں نے کسی شخص سے ایک کوڑی بھی نہ لی تھی۔ شادی پر جن لوگوں نے کچھ دیا۔ میں نے ان کا ذکر سوانح زندگی کی امانت سمجھ کر کیا ہے۔ میں قومی جد و جہد میں پیسہ لینا، پیسہ کمانا اور پیسہ کھانا ننگی سمجھتا ہوں، مجھے معلوم تھا کہ

لوگ جماعتی رقمیں کس طرح کھا جاتے ہیں اور قومی روپیہ سے کیا سلوک ہوتا ہے، لیکن تمام زندگی جماعتی اور قومی روپے کو چھونا بھی حرام سمجھا، مولانا مظہر علی اظہر نے مکتبۂ احرار فیل ہو جانے کے بعد احرار اسلام کا مرکزی دفتر میرے حوالے کرنا چاہا، ایک سو پچیس روپے مشاہرہ مقرر کیا، شیخ حسام الدین مجلس کے صدر تھے، اللہ انہیں بخشے اپنی تمام خوبیوں کے باوجود مجھ سے ناخوش تھے، میرے تقرر کو اس طرح لیا گویا ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر میں بیروزگاروں کے آن داتا ہیں اور میں ان کے پاس نوکری کی خواہش لے کر گیا ہوں، معاملہ اتنا افسوسناک تھا کہ میں نے شروع ہی میں ختم کر دیا۔

چودھری افضل حق انتقال کر چکے تھے انہیں مجھ سے لگاؤ تھا اور مجھے آگے بڑھانا چاہتے تھے لیکن اب میں خود ہی آگے بڑھ رہا تھا، میری سات سال قید نے مجھے واقعی آگے بڑھا دیا، مولانا مظہر علی ملتفت تھے لیکن اُن میں چودھری صاحب کا روپ نہ تھا، وہ احرار کو اس نہج پر لے گئے تھے کہ انہیں اپنے ساتھ ایک کمزور صدر کی ضرورت تھی، اور شیخ صاحب سے بڑھ کر کمزور صدر ان کے ہاتھ نہیں آسکتا تھا، شاہ جی بے نیاز طبیعت کے انسان تھے، مولانا حبیب الرحمٰن ابھی تک جیل میں تھے، میرے معاملہ میں شیخ صاحب سے الجھنا مظہر علی اظہر کی مصلحتوں کے خلاف تھا۔

ہری پور ہزارہ میں احرار کا سالانہ اجلاس ہوا، شیخ صاحب نے ورکنگ کمیٹی سے میرا نام اُڑا دیا، حالانکہ میرے ساتھ ہی وہ پہلی دفعہ احرار کے صدر ہوئے تھے اور بڑوں کی موت نے انہیں بڑا بنا دیا تھا، مولانا مظہر علی نے ٹوکا تو میرا نام بھی شامل کر لیا لیکن میرے لیے احرار ورکنگ کمیٹی کا رکن ہونا کوئی فخر کی چیز نہ تھی، شیخ صاحب کی صدارت کے زمانے میں کئی بدھو بھی ممبر ہو گئے تھے۔ شیخ صاحب سبھی کچھ ہونے کے باوجود مُدبّر یا سیاستدان قطعی نہ تھے، اصل چیز عہدے یا اعزاز نہیں ہوتے، کام ہوتا ہے مجھے اپنی قوتِ کار اور قوتِ زبان پر اتنا بھروسا تھا کہ ورکنگ کمیٹی کا حاسد عنصر مجھے کسی میدان

میں شکست نہیں دے سکتا تھا، یہی ہوا۔ احرار میں ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ احرار کی زبان دل اور دماغ ان تینوں تصویروں میں میرا رنگ و روغن اور میرے خط و خال نمایاں ہو گئے میرے قلم کے لاکھوں الفاظ تاریخ کے مہیب دور میں احرار کی مدافعت کرتے رہے۔

خورشیدہ (اہلیہ) کی آمد میرے لیے برکت ثابت ہوئی، مشیت نے معیشت کے دروازے کھول دیئے، میرا قلم میرا معاون ہو گیا۔ کئی مسودوں کی تصحیح کی، کتابوں کی ترتیب اور تحریروں کی نوک پلک سنوارنے کا کام ملنے لگا۔ اس طرح مہینہ میں چار سو پانچ سو روپیہ کما لیتا۔

پربودھ کے ساتھ مل کر پبلشنگ ہاؤس قائم کیا، غبارِ خاطر کا دوسرا ایڈیشن جس میں آخری خط کا اضافہ تھا اس ادارہ ہی نے شائع کیا، اس ایڈیشن کی رائلٹی کے دس ہزار روپے مولانا کو ادا کیے۔ میں اس ادارہ میں ایڈیٹر تھا، میرا مشاہرہ عام الاؤنسوں کے علاوہ پانچ سو روپے تھا۔ غبارِ خاطر کے علاوہ چار کتابیں اور بھی شائع کیں لیکن ملک کے حالات اس تیزی سے فساد، انتشار اور تقسیم کی طرف پلٹ رہے تھے کہ ادارہ بٹوارے کی نذر ہو گیا اور اس کا اثاثہ وقتی مجاہدوں کی مار دھاڑ نے لوٹ لیا ——

غرض میرے لیے شادی ایک نیا عہد اور ایک نیا دور لے کر آئی، اس میں شک نہیں کہ زندگی کے آنگن میں صدموں کا ایک انبار لگا ہوا تھا لیکن اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مصیبت کے تیرہ سال ہوا ہو گئے اور ان کی جگہ فصلِ گل آ گئی ہے، میری اور خورشیدہ کی عمر میں کچھ فاصلہ تھا لیکن ہم دونوں ایک دوسرے سے فاصلہ پر نہیں تھے وہ میرے ماموں کی لڑکی تھی، اور ہم ایک دوسرے کی عزت کے پشتیبان تھے، ہمیں اپنے فرائض کا بھی احساس تھا۔

میرے لیے سیاسی شہرت نے رشتوں کی بہت سی راہیں کھول دی تھیں، کئی بزرگ اپنی فرزندی میں لینے کے لیے تیار تھے لیکن میرا میلان اور بہنوں کا رجحان ماموں کے

ہاں سے گیا۔ کئی گھروں سے رشتے آتے رہے۔ مَیں اپنے حالات اور بیرونی رشتوں کے محرکات سے واقف تھا۔ میرا خیال یہی تھا اور ہے کہ رشتہ داروں میں شادیاں زیادہ مضبوط اور زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔

ہر معاشرہ کی بعض رسمیں یا عقیدے اس کے لیے حیاتین کا درجہ رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں عقد کا طریق سب سے بہتر ہے اس طرح اُن عورتوں میں ادب، احترام، شرافت اور ہر حال میں گذر بسر کی عادت راسخ ہوتی ہے۔ جن عورتوں کو والدین ڈولی میں ڈالتے اور دعاؤں سے رخصت کرتے ہیں۔

مَیں نے خاندانوں سے باہر شادیوں اور معاشقوں کے نتیجوں کو بھی دیکھا ہے۔ میرے اکثر دوست اسی دشت میں آبلہ پائی کے مزے لوٹ چکے ہیں گو اس پر حکم نہیں لگایا جا سکتا لیکن اکثریت کے خواب عموماً ادھورے رہ جاتے ہیں، سب سے بڑی بات جو محبت کی شادیوں میں ضائع ہو جاتی ہے وہ طرفین کا اعتماد ہے، محبت اندھی ہوتی ہے، لیکن عقد کی لڑی سے منسلک ہوتے ہی دل کے آبگینہ میں بال پیدا ہوتا تھی کہ خوابوں کا آبشار بہتے بہتے رُک جاتا ہے۔ نتیجتہً محبتوں کا عروسی جوڑا تلخیوں کے گرد و غبار سے میلا ہو جاتا ہے۔

سیاسی تغیّرات

ہم لوگ ستمبر ۱۹۳۹ء میں قید ہوتے تو ملک کے سیاسی حالات ۱۹۴۵ء کے حالات سے قطعاً مختلف تھے، ان چھ برسوں میں کئی جغرافیے بدل گئے، تاریخ میں اُلٹ پھیر ہو گیا، اتحادی جیت گئے۔ لیکن ہندوستان میں برطانیہ کا سفینہ منجدھار میں آگیا۔ برِ عظیم ذہنی طور پر اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، گاندھی جی نے دورانِ جنگ ایک بڑا تاریخی جملہ کہا تھا کہ اس جنگ میں چھوٹے تشدد کو بڑا تشدد جیتے گا، ہارنے والے تو ہار جائیں گے لیکن جیتنے والے بھی ہر جائیں گے۔

ہندوستان میں برطانیہ کے چار ستون تھے۔

(۱) وہ طبقہ جو اس نے اپنے لیے خواص سے پیدا کیا تھا مثلاً جاگیردار، صنعتکار، تجار، اور خطاب یافتگاں جنہیں ہندوستانی عوام پر مہاجنی اختیارات حاصل تھے۔

(۲) سول سروس کے ہندوستانی اعضاء اور بعض دوسری ملازمتوں کے اہلکار جن کی معرفت ہندوستانی عوام پر حکومت کی جاتی تھی۔

(۳) ہندوستانی فوج

(۴) فرقہ وارانہ مسئلہ

والیانِ ریاست بھی انگریزی حکومت کا ستون تھے لیکن اس حد تک جس حد تک کہ ہندوستان کو اختیارات منتقل کرنے کا مسئلہ تھا ورنہ ہندوستان کے جذبۂ آزادی

کو روکنا ریاستی مہاراجوں اور نوابوں کے بس سے باہر تھا، ہندوستانی عوام ذہنی طور پر آزادی کی سرحد پر پہنچ چکے تھے، ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک آزادی کا جذبہ سلگتا اور بھڑکتا رہا اور اب اُس کا بجھنا ناممکن ہو گیا تھا، صوبجاتی خودمختاری (۱۹۳۷ء) کے انتخابات نے برطانوی حکومت کا "سوشل سٹرکچر" توڑ دیا تھا، ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبے کانگرس کی عملداری میں آ گئے تھے، جہاں کانگرسی وزارتوں نے ایک نئی فضا پیدا کر دی، خود برطانیہ کو سول سروس کے ہندوستانی عناصر پر پہلا سا اعتماد نہیں رہا تھا ـــــــ آئی سی ایس کے اکثر آفیسر اور اس سے مربوط سروسوں کے اہلکار بظاہر خدا تھے لیکن اندرخانہ بالکل ہلے ہوئے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ان کے رعب و ادب کا قلعہ گر رہا ہے۔

فرقہ وار مسئلہ اور ہندوستانی فوج دو عنصر رہ گئے تھے جن پر برطانوی حکومت کے بقیہ ایام کا انحصار تھا لیکن یہ دونوں عنصر بھی اس کی طاقت سے باہر ہو گئے، ہندوستانی فوج کو سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج بنا کر ایسی چوٹ لگائی جس سے انگریزوں کو احساس ہو گیا کہ ان کے اس قلعہ میں بھی شگاف پڑ گیا ہے۔ آزاد ہند فوج کے مقدمے نے نوجوانوں کے ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ انگریزوں کے سان گمان میں نہ تھا کہ ان کی فوج کے پنجابی کبھی کسی شاہنواز کو جنم دیں گے لیکن انگریزی فوج کے لیے یہ حادثہ جانکاہ تھا۔

فرقہ وارانہ مسئلہ انگریزوں کی حکمرانی، ہندوؤں کی تنگ نظری اور مسلمانوں کی پسماندگی سے پیدا ہوا، انگریز اپنی حکومت کو طول دینے کے لیے اس مسئلہ کو بڑھا کر لاینحل رکھنا چاہتے تھے۔ ہندوؤں کا مجلسی نظام معاشی دستبرد اور تعلیمی برتری کچھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود کو مشخص کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو متحدہ قومیت کی آڑ لیتے، حقوق یا سلوک کا مرحلہ آتا تو آنکھیں پھیر لیتے گویا مسلمانوں کا ہندوستان پر کوئی حق نہیں، جناح نے سیاسیات میں ہندو ذہنیت کی تلخیاں چکھی تھیں، مسلمانوں کی

پسماندگی کا بھی انہیں احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس پسماندگی کو اب تک مسلمانوں کے رجعتی عناصر نے اپنی موت ٹالنے کے لیے استعمال کیا ہے، انہوں نے اس ہتھیار کو حکومت کانگرس اور رجعتی مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح چھینا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ جداگانہ انتخاب کی مسافت طے کرنے کے بعد پاکستان کا نصب العین ہوگیا، اور جناح اس استقلال کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹ گئے کہ انہیں ہٹانا یا جھکانا ناممکن ہوگیا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ انگریزوں کا شوشہ تھا تو وہ اس شوشہ کی مار اب خود کھا رہے تھے کیونکہ اس کا نام مسلمانوں کا حقِ خود ارادیت ہوگیا تھا، ہندو۔ کل تک اس مسئلہ کو نظرانداز کر رہے تھے، ایک زمانہ میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے شملہ میں کہا تھا :

"انہیں پہلی دفعہ معلوم ہوا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے فرقہ وار حقوق بھی ہیں"

لیکن اب مہاتما گاندھی بھی اس مسئلہ کو تسلیم کر رہے تھے اور قائداعظم سے کسی حل کے خواہاں تھے، قائداعظم کے نزدیک حل ایک ہی تھا "ہندوستان کی تقسیم" وہ رجعتی مسلمان جو مسلمانوں کے مقدر پر چھائے ہوئے تھے اور جن کے نزدیک فرقہ وارانہ مسئلہ انگریزوں سے وفاداری کی ایک دلآویز فصل تھا ان کے لیے قائداعظم کے سامنے دم مارنا مشکل ہوگیا، وہ ان کے سامنے اس طرح جھکتے جس طرح قرونِ وسطیٰ کی بادشاہتوں میں عمائدینِ سلطنت شہنشاہ گیتی پناہ کی پابوسی پر فخر کرتے تھے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں احرار حکومت کے خلاف "یدھ" رچا کر جیلوں میں چلے گئے، مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے لاہور ریزولیوشن پاس کیا، اس ریزولیوشن کو پاکستان کا نام ہندو اخباروں نے دیا، قائداعظم مارچ ۱۹۴۰ء سے پہلے لفظ پاکستان کے استعمال میں بڑے محتاط تھے لیکن جب ہندو اخباروں نے پاکستان کا ہوّا کھڑا کیا تو وہ اس ناؤ کے ملاح ہوگئے۔ انہوں نے اس لفظ کو اس گرمجوشی سے اپنایا کہ پاکستان اور قائداعظم

ہم معنی ہو گئے، حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کا نام اُن کے بعد آتا ہے، تحریک پاکستان بے شک مسلمانوں کی معنوی طاقت کا اظہار اور ان کے سیاسی نصب العین کا نام تھا لیکن ہندوؤں کا طرزِ عمل اِس تحریک کی عصبیتوں کو مضبوط کرتا رہا۔

ہندوستان کا فرقہ وار مسئلہ نظراً مسلمانوں کا لیکن عملاً ہندوؤں کا پیدا کیا ہُوا تھا اور اب وہ اس کا خمیازہ بھگت رہے تھے، ہندوؤں کے منفیانہ ذہن نے "قرار دادِ لاہور" کو پاکستان کا نام دیا تو وہ پاکستان ہو گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں دو ہی طاقتیں ہیں، برطانوی حکومت اور انڈین نیشنل کانگرس، قائدِ اعظم نے کہا ایک تیسری طاقت مسلمان ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلم ماس کنٹکٹ کمیٹی بنائی، اس کا صدر ڈاکٹر اشرف کو بنایا، قائدِ اعظم نے اس سفینہ ہی کو ڈبو دیا، کانگرسی وزارتوں کا وجود اور بعض وزیروں کی خود سری مسلمانوں کے لیے ناراضی کا باعث ہو گئی، نتیجۃً کردہ وناکردہ گناہوں پر ہنگامہ ہو گیا، اس ہنگامے سے کئی ہنگامے نکلے، جنگ چھڑی تو کانگرسی وزارتیں اس عذر پر مستعفی ہو گئیں کہ ان کی مرضی کے بغیر ہندوستان کو جنگ میں شامل کر دیا گیا ہے، مسلم لیگ نے یوم نجات منایا، قائدِ اعظم کی طاقت بڑھتی گئی، مسلم لیگ کا ذہن پھیلتا گیا، گاندھی جی نے محسوس کیا کہ اب ہندو مسلم مسئلہ صرف مسئلہ ہی نہیں رہا بلکہ دو قومی نظریے پر ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے قائدِ اعظم کو بھی اہنسا کے جوہر دکھلائے، مائی ڈیر قائدِ اعظم لکھا، پیارے بھائی سے مخاطب کیا لیکن قائدِ اعظم حروف کے بنے ہوتے نہیں تھے کہ شکار ہوتے، گاندھی جی کی ملاقاتیں ان کے مطالبہ کو مستحکم کرتی گئیں۔

مسلم لیگ سے باہر مسلمانوں کی جتنی جماعتیں تھیں، قائدِ اعظم نے انہیں لیگ میں مل جانے کے لیے کہا، نیشنلسٹ مسلمانوں کی طاقت کو عملاً کمزور کر دیا، ہم لوگ قرار داد لاہور سے بہت پہلے جیلوں میں چلے گئے تھے۔ ہمارے سامنے سوالات کا نقشہ ہی دوسرا

تھا، انگریزی استعمار سے مقاومت کرنا ہمارے لیے ناممکن تھا، احرار کا ذہن تھا کہ سانپوں اور بچھوؤں سے صلح ہو سکتی ہے لیکن انگریزوں سے نہیں، وہ ۱۸۵۷ء کے مسلک پر قائم تھے اور ایمانداری سے محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان میں برطانوی استعمار کی زنجیریں ٹوٹیں گی تو ایشیا کے مسلمان ممالک بھی آزاد ہوں گے۔

پاکستان کے مطالبہ نے کانگریس پر ہندو جماعت ہونے کی چھاپ لگا دی نیشنلسٹ مسلمانوں کو متروکاتِ سخن بنا دیا، جمعیتہ العلماء، احرار، خاکسار سب لیگ کے جلال کی تاب نہ لاکر ماند پڑ گئے ـــــ قائدِ اعظمؒ نے مسلمان عوام کی عصبیت کو اتنا مضبوط کر دیا کہ ان کے سامنے ابو الکلام کا تبحر، حسین احمد کا تقوی، عطاء اللہ شاہ کی خطابت اور علامہ مشرقی کی عسکریت کا ٹھہرنا ناممکن ہو گیا، ان سب کے چراغ گُل ہو گئے، پاکستان کے مطالبے میں اتنا سحر تھا کہ قربانی و ایثار اور جرأت و استقامت کا جادو بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکا، قائدِ اعظم نے ان سب کو ہرا دیا۔

علامہ مشرقی بڑے جوش و خروش سے خاکسار تحریک لے کر اٹھے، نوجوانوں کا ایک دیوانہ مزاج حلقہ ان کے گرد جمع ہو گیا، مسلمان چاہتے تو اس تحریک سے بڑا کام لے سکتے، خود علامہ محض آمر نہ ہوتے تو اس تحریک کو بے محل تصادم سے بچا کر منزلِ مقصود تک لے جاتے، وہ بہترین تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کے قلم میں الفاظ کا سحر تھا لیکن اپنی تنظیمی آمریت کے زور پر ایک ایسی حکومت سے ٹکرا گئے جو اُس وقت جنگِ عظیم میں دو بڑے آمروں سے ٹکرا رہی تھی۔ لاہور میں لیگ سیشن سے پہلے خاکساروں کا تصادم کوئی معمولی سانحہ نہ تھا، بڑا زبردست معرکہ تھا لیکن ایک بڑی خوں ریزی کے باوجود سرد پڑ گیا۔ علامہ صاحب قید میں چلے گئے، اور ویلور جیل (مدراس) میں رہے، کسی مسلمان حلقے سے ان کی رہائی کے متعلق کوئی تحریک نہ ہوئی، لیگ کو ان معاملات سے دلچسپی نہ تھی، آخر کانگریس کے ایک رہنما پٹابھائی سیتہ رامیہ نے جو سبھاش بابو کے مقابلہ میں صدارتی انتخاب ہار گئے

اور اسی جیل میں تھے رہا ہو کر بیان دیا کہ علامہ اتنی مدت سے ویلور جیل میں روزہ پر ہیں ان کا وزن بہت کم ہو گیا ہے حکومت کو چاہیے انہیں رہا کر دے۔ خاکساروں کے ساتھ مسلمان عوام نے شروع میں بڑی دلچسپی لی، معاونت بھی کی اور ہاتھ بھی بٹایا لیکن رفتہ رفتہ ان کا ولولہ ماند پڑ گیا۔

مسلمان کاسہ لیسوں نے جو کیا ان کی فطرت کے عین مطابق تھا، عبدالمجید سالک کی سرگزشت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کا زلہ خوار طبقہ اپنی فطرت و سرشت کے اعتبار سے کیا تھا اور اس گروہ ایثار کو مٹانے کے لیے کس قسم کے مشورے دیتا تھا اپنوں کی ہمدردی سے خاکسار محروم ہو گئے تو پرایوں کی ہمدردی کا سوال ہی خارج از بحث تھا۔ دیوان چمن لال نے مجھ سے جیل میں کہا:

"جو سلوک سکندر وزارت نے خاکساروں سے کیا کسی کانگرسی وزارت نے کیا ہوتا تو مسلمان قیامت بپا کر دیتے"

میں نے کہا ذرا اس طرح بھی سوچیے کہ:

"جو سلوک سکندر وزارت نے خاکساروں سے کیا کسی ہندو جماعت سے کیا ہوتا تو ہندو نیشنلزم اور ہندو کمیونلزم غدر مچا چکے ہوتے۔"

خاکساروں نے سنہری مسجد لاہور میں مورچہ لگا رکھا تھا وہاں انہیں جواہر لال نہرو دیکھنے گئے، ان کے حق میں ایک بیان بھی دیا لیکن معاملہ اس سے آگے نہ بڑھا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جو استعمار دشمن تھے ان پر تو کاسہ لیسوں کا گروہ، ہندو کانگرس کے ایجنٹ اور گماشتہ ہونے کا طعن کستا تھا اور سادہ دل عوام میں ان کے خلاف جھوٹی سچی ہانکنا اس کا مذہب ہو چکا تھا لیکن خاکسار ایک خالص مسلم تحریک تھی جب تک اس کا ہدف ہندو یا نیشنلسٹ مسلمان رہے مسلمان اخبار اور مسلمان اشرار ان کی قصیدہ خوانی کرتے رہے، جونہی انگریزی حکومت سے ان کی ٹکر ہوئی تو سب سے پہلے

اسی گروہ نے آنکھیں پھیریں، ژاژخائی کا طومار باندھا، حتیٰ کہ مسلمانوں میں ان کے خلاف طوطا مینا اڑائے، آخر کار انہی لوگوں نے اس بے نظیر عسکری تحریک کو تباہ کر ڈالا۔

حقیقت وہی ہے کہ ان کاسہ لیسوں کا شیوہ ہو گیا تھا کہ ہر اس تحریک کو تباہ کرنے میں پیش پیش ہوتے جس کا رُخ انگریزی استعمار کے خلاف تھا، ملک سے باہر بھی ان لوگوں نے یہی کیا۔ پہلی جنگِ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک کس کس اسلامی ملک کے خلاف جاسوس ہو کر یا سپاہی بن کر نہیں گئے، ملک کے اندر کس کس اسلامی تحریک پر چھری نہیں پھیری، تاریخ کو بہر حال یہ ماننا ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں پر ایک دَور یہ بھی گزرا ہے کہ ان کی عنان کاسہ لیسوں کے ہاتھ میں تھی اور عوام ان کے سیاسی اصطبل میں بندھے ہوئے تھے۔

برطانوی حکومت کے نمک پروردہ نواب، جاگیردار، زمیندار، تمندار، اہلکار، رجعت پسند کاسہ لیس، خطاب یافتگان اور فرزندانِ وفادار، مسلمان میں ایک ایسی مخلوق تھے کہ اسلام ان کی حفاظت کرتا رہا اور وہ اسلام سے بغاوت کرتے رہے۔ انہی لوگوں کے ہاتھوں اسلام کو بےحد نقصان پہنچا۔

اسلام پر تاریخ کا یہ چوتھا دَور ہے، پہلا دَور وہ تھا جب قرآن کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے انسانوں نے اسلام کا بول بالا کیا اور اسلام ایک عصری طاقت بن گیا، دوسرا دَور وہ تھا جب اسلام کا مثالی نظام رہ گیا اور اس کی جگہ مسلمان بادشاہتیں آ گئیں، اس دَور میں مسلمان حکومت یا مسلمان حکومتوں کو ایک عالمی طاقت کی حیثیت حاصل ہوئی، مسلمانوں نے زندگی کے مختلف گوشوں میں فتوحات حاصل کیں، تیسرا دَور غلامی کا دَور جس میں اسلامی سلطنتیں یورپی استعمار کے گوناگوں حملوں کا شکار ہونے لگیں، ان کا تیا پانچا ہو گیا اور ان کے جوہر ادراک اور طاقت و املاک پر یورپ کے استعماری حکمران مسلط ہو گئے جن کی ہم سخنی و ہم رکابی سے مسلمانوں میں امراء کا ایک

گروہ پیدا ہو گیا، کاسہ لیسوں نے جنم لیا، اور انگریزی تعلیم نے ان کی سلطنت کے لیے کل پرزے پیدا کیے، یورپی فتوحات نے مفتوحہ و مقبوضہ مسلمان ملکوں میں خاندان غلاماں پیدا کر دیا، جن کا کام یورپی استعمار کے لیے فکر و نظر اور تعلیم و سیاست کے سانچے میں ڈھلنا اور نئی پود کو ڈھالنا تھا۔ نتیجۃً افریشیائی ممالک کی وہ مسلمان ریاستیں جو یورپی استعمار کے پنجہ سے پچھلی دو تین دہائیوں میں آزاد ہوئیں اسی استعمار کے ڈھلے ہوؤں کی جانشینی کے اختیار میں ہیں اور وہاں کے عوام من حیث الجماعت ان کی شطرنج کا مہرہ بنے ہوئے ہیں۔ لیگ میں مسلمانوں کا یہی خاندان جمع ہو گیا تھا، آزادی ہندوستان کا مقدر ہو چکی تھی، پاکستان مسلمانوں کی ملی خواہش کا نصب العین تھا، ان ٹوڈیوں نے محسوس کیا کہ جو سلوک یہ لوگ قومی تحریکوں سے کرتے رہے ہیں اور مطالبۂ آزادی سے جس رنگ میں انہوں نے غداری کی ہے اس کی سزا انہیں ضرور ملے گی، اپنے اس خوف اور اپنی متوقع تعزیر سے بچنے کے لیے قائداعظم کے گرد حلقہ باندھا ــــ پاکستان کا مطالبہ ان کے لیے حصار ہو گیا اور یہ اس قطری حصار میں پناہ گزین ہو گئے، قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ یہی لوگ قائداعظم کی بے وقت موت کے بعد اس کے وارث ہو گئے۔

استعمار دشمن مسلمان رہنماؤں نے تب تک محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ مسلمان قوم کہاں کھڑی ہے؟ اس کی شکایات کیا ہیں اور پاکستان کا مطالبہ دراصل ہے کیا؟ پاکستان کا مطالبہ ہندوؤں کی بالادستی کے خلاف مسلمانوں کی نفرت کا احتجاج و اظہار ہی نہیں بلکہ گمشدہ اسلامی سلطنت کی بازیافت کا ایک دلفریب تصور تھا، نیشلسٹ مسلمان ابھی تک ماضی میں زندگی بسر کر رہے تھے ان کے لیے ۱۹۴۰ء کا زمانہ بھی ۱۸۵۷ء کا زمانہ تھا، وہ باتیں اسلام کی کرتے تھے لیکن انہیں ایک اسلامی ریاست کے مطالبہ سے اتفاق نہ تھا ان کے ذہن میں صورت حال کا تجزیاتی نقشہ کوئی ہو لیکن عوام کی نفسیات سے انہیں کوئی رابطہ نہ تھا وہ غالباً اس سے بیگانہ تھے کہ عوام نظریوں سے زیادہ نتیجوں کے دلدادہ

ہوتے ہیں۔ انہیں مستقبل قریب سے دلچسپی ہوتی ہے، مستقبل بعید سے نہیں، سیاسی تحریکیں افکار سے زیادہ جذبات پر چلتی ہیں اور قومی تحریکیں فکر کی بجائے سیاست سے اٹھتی ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس زمانہ میں ٹھیک ٹھیک اسی فکر کے نمائندہ تھے جس پر پاکستان کی تحریک کا انحصار تھا، ایک اسلامی ریاست ہی کیوں ؟ کا صحیح صحیح جواب اگر اس عہد کی تحریروں سے مل سکتا ہے تو صرف مولانا ابُوالاعلیٰ مودُودی کی تحریریں ہیں لیکن انہیں وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں تھا جو قائداعظم کو مسلمانوں میں پاکستان کے نصب العین کی بدولت حاصل ہو گیا تھا ـــــ جماعت اسلامی اُن دنوں کسی تحریک کا نہیں ایک ذہن کا نام تھا جو پڑھے لکھے مسلمانوں میں اُبھر رہا تھا۔

ویول پلان، لیاقت ڈیسائی سمجھوتا، شملہ کانفرنس، سرسٹیفورڈ کرپس کی آمد، ہندوستانی زعماء سے اس کی ملاقاتیں ایسے تمام واقعات مسلم لیگ کی طاقت میں حیرت انگیز اضافہ کا باعث ہو رہے تھے، صحیح راستہ تو یہ تھا کہ استعمار دشمن مسلمان جو ہندو مسلم مسئلہ سے پہلے انگریز اور ہندوستان کا حل چاہتے تھے اپنی روشنی پر نظر ثانی کرتے، قائداعظم کی سیادت مولانا اگر ان کی اُنا کو ہلکا کرنا تھا تو ان کے مطالبہ کی مخالفت نہ کرتے، قائداعظم کا مطالبہ ان مسلمانوں سے نہیں تھا بلکہ ہندوؤں سے تھا، مہاتما گاندھی خود مسئلہ کی موجودگی کو تسلیم کرتے اور قائداعظم سے بات چیت کرتے تھے بات چیت ٹوٹتی تو انہیں غیر لیگی مسلمان یاد آجاتے، غیر لیگی مسلمانوں کا فرض تھا، کانگرس پر زور دیتے نہ وہ مسلمانوں سے تصفیہ کرے جب قائداعظم سے بات چیت کرتی ہے تو بات چیت کے ٹوٹنے پر ان کا نام کیوں لیتی ہے ؟ کانگرس خود کوئی حل پیش نہ کر سکی نیشنلسٹ مسلمانوں کے حل کو تسلیم نہ کیا بلکہ وزارتی پلان کے دنوں میں ان کے فارمولے کو پاکستان سے بھی بڑھا ہوا قرار دیا، لیگ سے صلح کی خواہش اور جنگ کا رویہ قائم رکھا، ظاہر ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی خواہشوں اور امیدوں کا محور و مظہر ہو گئی تھی نیشنلسٹ مسلمانوں کے پاس لیگ کی مخالفت کے

جتنے ہتھیار تھے سب کے سب کند ہو چکے تھے لیکن وہ اپنی کچی پکی دیواریں لے کر لیگ کے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے، اگر نیشنلسٹ مسلمان اُس وقت صورتِ حال کے اِس نقشہ پر غور کرتے اور نتیجہ تک پہنچ جاتے تو یقیناً حالات مختلف ہوتے، پاکستان ایک ناگزیر نصب العین تھا، اب مسلمان عوام اس سے ہٹ نہیں سکتے تھے، انہوں نے اپنا سب کچھ حتیٰ کہ دل و دماغ تک قائد اعظم کے حوالے کر دیا تھا اور قائد اعظم بنیان مرصوص بن کر کھڑے تھے، قائد اعظم اس مقام پر تھے کہ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر تبرّیٰ کر دیا، وہ ہر شخص سے متابعت چاہتے تھے، مولوی اے کے فضل الحق نے حکم عدولی کی تو انہیں بیک بینی و دوگوش نکال دیا، مسٹر جی ایم سیّد راندۂ درگاہ ہو گئے، پنجاب میں ملک خضر حیات ٹوانہ کو لیگ بدر کر دیا، اب احرار ہوں یا خاکسار، جماعت اسلامی ہو یا جمعیۃ العلماء وہ انہیں اس حد تک کمزور کر چکے تھے کہ ان کا لیگ میں شامل ہونا یا لیگ سے دُور رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، وہ صرف غیر مشروط وفاداری کے خواہاں تھے، خان عبدالقیوم یہی کر چکے تھے، مولانا داؤد غزنوی نے یہی کیا، ——— اسلامیہ کالج لاہور کی گراؤنڈ میں جلسہ ہو رہا تھا، علامہ مشرقی قائد اعظم کے پاس پاکستان کا مطلب پوچھنے گئے، ابھی پہنچے ہی تھے کہ طلبہ نے پٹائی شروع کر دی، اتنا مارا کہ اُلّو بنا دیا ———

یہ تھے وہ حالات جن سے برِ عظیم گزر رہا تھا، طاقتیں تین ہی تھیں: انگریزی حکومت ——— کانگرس اور لیگ۔

آخری انتخابات

پچھلے چار ساڑھے چار سال میں سیاسی صورتِ حال کا نقشہ یہ ہو گیا تھا کہ اتحادی جیتنے لگے اور محوری شکست کھا رہے تھے، ہٹلر جنگ کے میدان میں اکیلا نکلا تھا، کچھ دنوں بعد مسولینی بھی شریک ہو گیا، لیکن مسولینی کا فاشزم اطالوی قوم کو ایک فعال طاقت نہ بنا سکا، اطالویوں نے گمشدہ روم کی عظمت کے خواب تو ضرور دیکھے، لیکن جنگ کے میدانوں میں دھاک نہ بٹھا سکے۔

برطانیہ کے ساتھ ابتدائً فرانس تھا یا پھر اس کے مقبوضات جو اس کی مرضی سے "شریکِ جنگ" ہو گئے تھے، امریکہ مددگار تو شروع سے تھا لیکن شریک ذرا دیر سے ہوا تھا،

ہٹلر نے فتوحات طوفانی انداز میں کیں، لیکن فتوحات کو بچانا مشکل ہو گیا، ایک عرصہ بعد اس نے رُوس پر حملہ کر دیا، اور سٹالن گراڈ تک جا پہنچا، اب اتحادیوں میں برطانیہ، رُوس اور امریکہ تھے، ہٹلر، مسولینی کی رفاقت کے باوجود تنہا تھا۔ جاپان نے جنگ کا یہ طوفان دیکھا تو اپنے گرد و پیش کی مملکتوں پر حملہ آور ہو گیا اور برما تک آپہنچا بلکہ آسام کی بعض پہاڑیوں میں بھی اس کے پاؤں کی چھاپ لگ گئی۔ آزاد ہند فوج اسی زمانے میں قائم ہوئی، برطانوی فوج کی ہندوستانی پلٹنوں، کمپنیوں اور رجمنٹوں سے اس کا خمیر اُٹھا، ہزاروں ہندوستانی افسر اور سپاہی سبھاش چندر بوس کی سیادت میں

اکٹھے ہو گئے ـــــ لیکن جنگ کا پانسہ اس طرح پلٹا کہ محوری اپنے ہی گھروں میں ہارنے لگے، برلن اور روم اتحادیوں کی زد میں آ گئے، امریکہ نے جاپان میں ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کے جنگ کو خوں ریزی سے ہلاکت آفرینی کے نقطۂ کمال پر پہنچا دیا، با ایں ہمہ مقبوضاتی نظام پورے طور پر ہل چکا تھا، انگریزوں نے جنگ کے دوران مصر اور ایران پر بھی قبضہ کر لیا لیکن اب اپنے مقبوضات کو بھی قابو میں رکھنے کے قابل نہ رہا تھا۔

گاندھی جی نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلا کر، قائد اعظم نے پاکستان کا مطالبہ کر کے اور سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج بنا کر اس برعظیم میں انگریزوں کا قیام ناممکن کر دیا تھا۔ تاریخ جگہ نہ دے، اس کا انحصار مؤرخوں کی تحقیق اور قلم پر ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ احرار سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی اپنی اپنی تنظیموں کے دائرے میں برطانوی حکومت کی بنیادوں کو ہلانے کا باعث ہوئے، برطانیہ محسوس کر چکا تھا کہ جنگ میں کامیابی کے باوجود وہ اپنے نو آبادی نظام کو قائم نہیں رکھ سکتا جنگ کے دوران میں برطانیہ ہندوستان کے رہنماؤں سے گفتگو کرتا رہا لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی سر کرپس "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک سے پہلے ہندوستان آئے اور گفتگو توڑ کر لوٹ گئے، مولانا ابوالکلام آزاد کی روایت کے مطابق کرپس نقطۂ مصالحت تک آ گئے تھے چرچل نے طنابیں کھینچیں اور وہ پھر گئے۔ اس کے باوجود ہندوستان میں برطانوی حکومت کا نقشہ کچھ اس طرح بن گیا تھا کہ پرانے جاہ و جلال کے ساتھ اس کے لیے ٹھہرنا ناممکن تھا۔

(۱) مسلم لیگ کا اکتیسواں سالانہ اجلاس ۲۴ تا ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کراچی میں منعقد ہوا، قائد اعظم نے اِس اجلاس میں فرمایا:

"برطانوی سیاستدانوں کے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ ہندوستان کو اُس کی جائز وارث دو قوموں ـــــ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بانٹ کر

پہلے جائیں۔"

اس سے پہلے قائداعظم دہلی میں کہہ چکے تھے کہ مسٹر گاندھی، آغاخان کے محل سے وائسرائے کو خط پہ خط لکھ رہے ہیں مجھے کیوں نہیں لکھتے؟ وہ کونسی طاقت ہے جو انہیں ایسا کرنے سے روک رہی ہے، وائسرائے کے پاس جانے سے فائدہ؟ وائسرائے کے پاس وفد بھجوانے یا اس سے خط و کتابت کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، حکومت کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ مسٹر گاندھی پاکستان کے اصول کو تسلیم کر کے مجھے خط لکھیں، تو حکومت جرأت کر کے اسے روک سکتی ہے، حکومت نے ایسا کیا تو بڑی نازک صورتِ حالات پیدا ہو جائے گی۔"

گاندھی جی نے قائداعظم کے بیان کو اخباروں میں دیکھا تو فوراً خط لکھا، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خط میں پاکستان کے اصول کو تسلیم کیا تھا یا محض خط ہی تھا۔ بہرحال حکومت نے خط روک لیا، اعلان کیا کہ وہ اس خط کو مکتوب الیہ تک پہنچانے سے معذور ہے، کیونکہ نویسندہ خلافِ قانون اجتماعی تحریک چلانے میں ماخوذ ہے۔

قائداعظم نے حکومت کے اعلان پر بیان دیتے ہوئے کہا کہ مسٹر گاندھی نے مسلم لیگ کو حکومت سے لڑانے کے لیے چال چلی ہے، حکومت نے خط روک کر بُرا نہیں کیا، میرے مفہوم کو غلط سمجھا گیا ہے، میں نے کہا تھا مسٹر گاندھی ۸ اگست کی بمبئی قرارداد (ہندوستان چھوڑ دو) واپس لیں اور مطالبۂ پاکستان مان لیں تو حکومت اس خط کو کبھی روک نہیں سکتی ہے۔

(۲) مسٹر راجگوپال اچاریہ کے متعلق ہمارے ہاں کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ گاندھی جی کے سمدھی تھے، برہمنوں نے مدت تک انہیں ہدفِ تنقید بنائے رکھا کہ برہمن ہو کر اپنی بیٹی ایک ویشی کو دی ہے، اچاریہ انگریزی اور تلنگو کے بہت بڑے مقرر، زبردست سیاستدان اور تاریخ و سیاست کے متبحر عالم تھے، انہوں نے کانگرس ہائی کمان

پر زور دیا کہ پاکستان کو مان لے، ایک فارمولا تیار کیا جو موجودہ پاکستان سے بڑی حد تک مشابہ تھا وہ پاکستان ہی کے مسئلہ پر کانگریس ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔

(۳) اسی زمانے میں لیاقت ڈیسائی فارمولا تیار ہوا، اس فارمولے کا شہرہ تو بہت ہوا لیکن عرصہ تک معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا متن کیا ہے؟ یہ فارمولا دراصل لارڈ ویول کا جواب تھا انہوں نے ۲۵ دسمبر ۱۹۴۴ء کو چیمبر آف کامرس کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی مختلف الخیال سیاسی جماعتیں مفاہمت کر لیں تو برطانوی حکومت اُن سے مصالحت کرنے کو تیار ہو گی، کانگریس ہائی کمانڈ کے زعماء ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک میں قید تھے، بھولا بھائی ڈیسائی مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، لیاقت علی خاں مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر ان دونوں نے لارڈ ویول کے جواب میں مشترکہ فارمولا تیار کیا۔ لیکن اس فارمولے کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریسی زعماء باہر آئے تو بھولا بھائی ڈیسائی ہمیشہ کے لیے سردار ولبھ بھائی پٹیل کے معتوب ہو گئے، حتیٰ کہ انہیں مرکزی اسمبلی کا دوبارہ ٹکٹ ہی نہ دیا گیا۔

(۴) سر تیج بہادر سپرو انہی دنوں نان پارٹی بنیادوں پر مفاہمت کی تلاش میں سرگرم رہے، مسلمانوں اور خالص ہندوؤں کی مساویانہ نیابت کے اصول پر ہندوستان کی مجلس آئین ساز کے چناؤ کا فارمولا تیار کیا، قائداعظم نے ان کے متعلق کہا تھا ان کی مثال اُس بے سپاہ فوج کی سی ہے جس میں سبھی جرنیل ہیں اور سپاہی کوئی نہیں۔

(۵) روس پر حملہ ہوتے کے فوراً بعد کمیونسٹوں نے امپیریلسٹ وار کو پیپلز وار کہنے کا اعلان کر دیا، تقریباً تمام کمیونسٹ رہا کر دیئے، کمیونسٹ پارٹی بحال ہو گئی، ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کا صدر دفتر لندن میں تھا، مسٹر ہیری پولٹ سکرٹری جنرل تھے ان کی معرفت ہندوستان کی پارٹی کو روس کی پارٹی سے ہدایات آتی تھیں، کمیونسٹ مختلف عنوانوں سے مشترکہ پلیٹ فارم بناتے اور اپنے سہ نکاتی پروگرام پر زور دیتے تھے۔

اولاً۔ یہ جنگ پیپلز وار (جنتا کی جنگ) ہے۔

ثانیاً۔ اس جنگ کو لڑنے کے لیے مرکز میں قومی حکومت کا قیام ضروری ہے۔

ثالثاً۔ قومی حکومت کے لیے کانگرس اور لیگ کے درمیان مفاہمت ہونی چاہیے۔

اور یہ مفاہمت تب ہی ہو سکتی ہے جب کانگرس کے لیڈروں کو رہا کر دیا جائے۔

حکومت کا کمیونسٹوں کے لیے صاف دل ہونا غیر ممکن تھا، ایک تو وہ اس کے ڈھب کی چیز نہ تھے، دوسرے وہ اپنے داؤں پر تھے، ان کا دھرم تھا روس مارا گیا تو کمیونزم کی ایک عملی تجربہ گاہ اور ایک عظیم ریاست جو دنیا بھر کے کمیونسٹوں کو طاقتور بناتی ہے فنا ہو جائے گی لیکن حکومت نے زمانۂ امن کی پابندی زمانۂ جنگ میں ہٹا کر صرف یہ حاصل کرنا چاہا کہ ایک فعال طائفہ، جہاں تک جنگ کا تعلق تھا کانگرس کے مقابلہ میں اُس کا ہمنوا ہو گیا، اس کے علاوہ ایک ایسا گروہ انقلابی سرگرمیوں سے رک گیا جو واقعی انقلاب کے خونیں پہلوؤں پر یقین رکھتا اور اندر خانہ توڑ پھوڑ کر سکتا تھا۔

کانگرس من حیث الجماعت ان سے ناخوش تھی لیکن ہندو عوام ان کی باتیں صرف اس لیے سُن لیتے تھے کہ کانگرسی زعماء کی رہائی کا مطالبہ کرتے اور لب ولہجہ سیاسی انقلابی رکھتے ہیں، سوشلسٹوں کو ان سے سخت عناد تھا، وہ انہیں ہندوستان میں روس کے دفترِ خارجہ کا گماشتہ کہتے، ادھر پنجاب میں لیگ کے صوبائی زعماء انہیں صرف اس لیے گوارا کرتے کہ ان کی زبانوں سے بھی لیگ کی واحد نمائندگی کا اعلان ہوتا اور پاکستان کے مطالبہ کا ناد بجتا تھا۔

پاکستان ان کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کا نہیں ہندوستان کی مسلمان اقوام کا حقِ خود ارادیت تھا اور وہ اس کی حمایت کرتے تھے، احرار سے کمیونسٹوں کی ان بن تھی کیونکہ وہ قومی جدوجہد میں سیاسی زبان کے بجائے اسلامی زبان استعمال کرتے تھے،

انہی دنوں قائد اعظم نے کمیونسٹوں کو بُری طرح دھتکارا، اسلامیہ کالج لاہور کے ایک اجتماع میں کہا :

"خبردار کمیونسٹو! تمہارے لیے لیگ میں کوئی جگہ نہیں ہے"

(۶) ملک جن حالات میں سے گزر رہا تھا اس کے پیشِ نظر انگریزوں کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ ہندوستان کی فعال سیاسی طاقت کو نظر انداز کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر اپنی منشا کی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ حالات اس نہج پر تھے کہ حکومت کے ملازمین اعلیٰ و ادنیٰ، وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے لے کر تعلقہ کے تھانے دار تک سب قومی تنظیموں کی طرف ذہنی جھکاؤ رکھتے تھے، ہر سرکاری راز گاندھی اور جناح کی جیب میں ہوتا، سرد سنرد واضح طور پر بیٹ چکی تھیں ـــــ لارڈ ویول احوال و کوائف کا پورا نقشہ لے کر ۲۹ مارچ ۱۹۴۵ء کو دس روز کے لیے انگلستان چلے گئے، وہاں دس ہفتہ قیام کیا، کابینہ سے مذاکرات کیے اور ۵ جون ۱۹۴۵ء کو واپس دہلی آگئے، یہاں ایگزیکٹو کونسل کو برطانوی کابینہ کے فیصلے و نظریے سے مطلع کیا، ۱۵ جون کو ایک نشری تقریر میں اعلان کیا کہ وہ ملک کی سیاسی تنظیموں کے نمائندوں کو نمائندہ حکومت قائم کرنے کے لیے شملہ بلا رہے ہیں۔ گاندھی جی نے شملہ کانفرنس میں شامل ہونے سے اِس عذر پر انکار کر دیا کہ وہ کانگرس کی طرف سے نمائندگی کے مجاز نہیں، کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد ہی گفتگو کر سکتے ہیں، لارڈ ویول نے انہیں دعوت نامہ بھیجا، مولانا نے قبول کر لیا، کل ۲۱ افراد مدعو کیے گئے جن میں مختلف پارٹیوں کے رہنما اور صوبائی وزارتوں (مستعفی و غیر مستعفی) کے وزراءِ اعظم بھی تھے، ۲۴ جون کو وائسرائے نے بعض لیڈروں سے انفرادی ملاقاتیں کیں، ۲۵ جون کو کانفرنس شروع ہوئی۔

ویول کی تجویز تھی کہ ۱۴ ارکان پر مشتمل ایک عبوری ایگزیکٹو کونسل بنائی جائے جس کے پاس فوج کے سوا مالیات اور خارجہ کے صیغے بھی ہوں۔ پانچ ہندو، پانچ مسلمان،

ایک اچھوت، ایک سکھ، ایک اینگلو انڈین اور ایک عیسائی ۔ یہ سب مل کر ملک کے آئندہ آئین کا نقشہ بنائیں انہی کے اہتمام میں صوبائی اور مرکزی انتخابات ہوں ۔
کانفرنس پہلے دن ہی ناکام ہونے لگی تو قائد اعظم کی تحریک پر ۱۴ جولائی تک التوا ہو گیا، آخر لارڈ ویول نے جانبین سے نمائندوں کے نام طلب کیے ۔ قائد اعظم کو اصرار تھا کہ مسلمانوں کی نامزدگی کا حق صرف انہی کو ہے، دوسرا کوئی فرد جماعت یا گروہ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویدار نہیں ہو سکتا، مولانا ابوالکلام آزاد کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس اگر محض ہندو نامزد کرتی ہے تو اپنی تاریخ اور اس کے موقف سے گرجاتی ہے اس قضیہ کو چکانے کے لیے مولانا نے یہ تو مان لیا کہ وہ کسی کانگرسی مسلمان کو نامزد نہیں کرتے لیکن اپنے کوٹے میں سے ایک نشست لیگ سے باہر کسی بھی مسلمان کو دے سکتے ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام لیا، ایک دو اور نام بھی لیے گئے لیکن قائد اعظم مصر رہے کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف لیگ ہی کو پہنچتا ہے نتیجۃً کانفرنس ناکام ہو گئی، — قائد اعظم نے کہا "ہم لارڈ ویول کی تجاویز مان لیتے تو اپنی موت کے وارنٹ پر خود دستخط کرتے، مولانا ابوالکلام آزاد نے بیان دیا کہ کانگرس اگر صرف ہندوؤں کو نامزد کرتی تو وہ گویا اپنے قومی وجود سے دستبردار ہو جاتی ۔

غرض شملہ کانفرنس کی ناکامی مسلم لیگ کی عظیم قوت کے مضبوط و مفید ہونے کا سرآغاز ہو گئی، قائدِ اعظم نے کانگرس کے ہمنوا مسلمانوں کو ایسا جھٹکا دیا کہ ان کے خلاف سب و شتم کی ایک زبردست لہر پیدا ہو گئی ۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے قائد اعظم کو خط لکھا کہ انہیں اپنے مطالبات و شکایات سے مطلع کریں، قائد اعظم نے جواب دیا کہ ان کی حیثیت کانگرس کے شو بوائے کی ہے لہٰذا ان سے کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی، قائد اعظم نے اپنا جواب پریس کو دے دیا، لیگ کے اخبار اور لیگ کے خطباء اس پھبتی کو لے اُڑے، مولانا ابوالکلام آزاد

کے عقیدت مندوں نے بھی جواب آں غزل کا لہجہ اختیار کیا، لیکن ظاہر ہے کہ گالی بہرحال گالی ہے، مولانا ابوالکلام آزاد سے قائداعظم کے اس طعن پر استفسار کیا گیا تو فرمایا — ہر شخص اپنے لب ولہجہ کا مختار ہوتا ہے، مسٹر جناح نے اپنی عزت میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے —

شملہ کانفرنس میں مولانا نے قائداعظم سے مصافحہ کرنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا، ایک اور روایت ہے کہ کانفرنس میں مولانا تقریر کر رہے تھے تو قائداعظم اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذ پر شو لپاٹے کے حروف بنا رہے تھے، مولانا ان چیزوں سے بھڑکتے نہیں تھے ان کا مزاج ہی دوسرا تھا البتہ ڈاکٹر خاں صاحب قائداعظم سے اُلجھ گئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ ہم تم سے بہتر مسلمان ہیں۔ مولانا ابوالکلام کانفرنس سے فارغ ہو کر کلکتہ جا رہے تھے کہ علی گڑھ اسٹیشن پر یونیورسٹی کے طلبہ نے ان کے خلاف زبردست مخالفانہ مظاہرہ کیا، گاڑی روک لی، گالی گفتار کی، اس واقعہ نے مولانا کے مداحوں میں ہیجان پیدا کر دیا، پھر جب تک ملک تقسیم نہیں ہو گیا صورت حال نازک ہی رہی، مولانا اور قائداعظم طیاروں پر سفر کرتے رہے۔

لارڈ ویول نے شملہ کانفرنس کے فوراً بعد مسلم لیگ اور نیشنل کانگرس کے مشترکہ مطالبہ پر جنرل انتخابات کا اعلان کر دیا، ظاہر ہے کہ یہ انتخابات لیگ اور کانگرس کے درمیان تھے اور دونوں اپنے اپنے موقف اور اپنی اپنی طاقت کے اندازہ و اظہار پہ تلے ہوتے تھے۔ احرار کے مظہر علی اظہر نے شملہ کانفرنس کے موقع پر تو یہ بیان دیا تھا کہ کانگرس مسلمانوں کے حقوق کا تصفیہ لیگ سے کرے کیونکہ لیگ ہی اس مسئلہ میں تصفیہ کرنے کی مجاز ہے، لیکن الیکشن کا اعلان ہوا تو مظہر علی اظہر سب سے پہلے لیگ کے مقابلہ میں ڈٹ کے آ گئے، امیر شریعت سرینگر میں تھے، صدر امرتسر میں تھا، ورکنگ کمیٹی کے بیشتر ارکان لاہور میں مولانا حبیب الرحمٰن رہا ہو کر آ گئے لیکن لدھیانہ میں تھے، مظہر علی

نے سب کو طاق پر رکھا۔ ایکا ایکی جلسہ کا اعلان کیا اور جو کچھ تقریر میں کہنا تھا اس کو چار پمفلٹوں میں چھپوا لیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی، یہی وہ جلسہ تھا جس میں مظہر علی نے قائد اعظم کی شادی کا شوشہ چھوڑا اور انہیں کافر اعظم کہا:

اک کافرہ عورت کے لیے دین کو بیچا
یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم

لاہور کے ہندو اخباروں نے اس شعر کو خوب اچھالا، یونی نسٹ پارٹی کے اخبار شہباز نے شہ سرخی جمائی، احرار کو فائدہ کی بجائے نقصان ہوا، عامۃ المسلمین میں اُن کے خلاف غصّے کی لہریں اور شدید ہو گئیں، مظہر علی نے اگلے روز یہی تقریر امرتسر میں کی، میں خود امرتسر کے اس جلسہ میں موجود تھا اور میری زبان بندی کے احکام اسی دن واپس ہوئے تھے، احباب نے زور دیا کہ کچھ کہوں ــــــ کیا کہوں؟ ظاہر ہے کہ قید اور نظر بندی میں سات سال ہو گئے تھے، مظہر علی جو کچھ کہہ چکے وہ اصلاً انتخابی تقریر نہ تھی بلکہ قائد اعظم اور مسلم لیگ کے خلاف ذاتی نوعیت کا ایک استغاثہ تھا، اس استغاثہ کو مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے فوراً مسترد کر دیا، احرار پہلے سے زیادہ مسلمانوں کے مغضوب ہو گئے۔ مَیں نے اپنی تقریر میں مظہر علی کے خیالات کی نفی کی اور کہا کہ میں ایک گنہگار مسلمان ہوں مجھے کسی کی تکفیر کا حق نہیں پہنچتا، ہم سب مسلمان ہیں، مسئلہ دینی اختلاف کا نہیں سیاسی اختلاف کا ہے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ مسلمان کون ہے اور کافر کون؟

الیکشن ان بنیادوں پر ہو رہے تھے کہ ہندوستان کا آئندہ مقام کیا ہے؟ اور مسلمانوں کا اس مقام میں کیا حصّہ ہے لیکن مظہر علی نے قائد اعظم کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے ایک غیر ثقہ کتاب کا سہارا لیا کہ جناح سر ڈینشا پٹیٹ کی بیٹی کو اڑا کر لے گئے اور ان کے ساتھ سول میرج کی تھی۔

مظہر علی میں خطابت کا ولولہ ضرور تھا وہ احرار رضا کاروں کی مسلح جمعیت

کے سائے میں سبھی کچھ کہہ گئے، لیکن یہ سب کچھ احرار کے لیے جماعتی رُسوائی اور سیاسی پسپائی کی بنیاد ہو گیا، مظہر علی نے شادی کے علاوہ مدح صحابہ کی آٹلی، شہید گنج کا قضیہ چھیڑا، لیگی وزارتوں کے بعض رجعتی فیصلوں کا ذکر کیا اور لیگ کی واحد نمائندگی پر تابڑ توڑ حملے کیے لیکن مسلمان عوام کے لیے اس میں تاثیر و تاثر نام کو نہ تھا، مظہر علی احرار کے قلیل التعداد ہمدردوں کی واہ واہ پر لٹو تھے گویا میدان ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ سیاسی محاذ باندھ کر انتخابی قلعہ فتح کر چکے ہیں ــــــــ

مولانا حبیب الرحمٰن انہی دنوں رہا ہوئے اور اس تقریر سے برہم تھے، انہوں نے دفتر احرار میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "تقریر نہیں، تبرّیٰ ہے" ــــــــ ہم لوگ واقعی پریشان تھے کہ مولانا مظہر علی نے زنبیل سے کیا چیز نکالی ہے؟ شیخ حسام الدین کان کے کچے تھے، ہر طاقتور بول سن کر اسی کے ہو جاتے، اس معاملہ میں اُن کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، مظہر علی سے ناخوش تھے لیکن مظہر علی کے ساتھ بھی تھے، مظہر علی نے شاہ جی کے پاس انہیں کشمیر بھیجا کہ ان کی رائے پوچھ لیں، وہاں سے خالی ہاتھ اور خالی ذہن واپس آ گئے، جو کچھ بیان کیا واضح نہ تھا ان کے اکھڑے اکھڑے لہجہ سے محسوس ہوتا تھا کہ شاہ صاحب نے ٹال دیا اور کوئی بات نہیں کی ہے بلکہ الیکشن میں حصّہ نہ لینے پر زور دیا ہے، لیکن مظہر علی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے عادی تھے، ورکنگ کمیٹی کو بھی نچا دیا۔ حافظ علی بہادر جو بمبئی سے چل کر آئے اور مسلم لیگ کے پختہ حریف تھے ان کا بھی یہی خیال تھا کہ الیکشن میں حصہ نہ لیا جائے، مظہر علی کب مانتے؟ دونوں میں سخت الفاظ کا تبادلہ ہو گیا، حافظ جی نے کہا آپ پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں تو ہمیں اتنی دُور سے بلانے کی ضرورت کیا تھی؟ مظہر علی کی دلیل عجیب تھی کہ آپ مجھے قائد احرار کہتے ہیں تو میری بات بھی مانیں، مولانا حبیب الرحمٰن نے کہا: امیر شریعت کس مقصد کے لیے ہے؟ اس سے بھی فتویٰ لیں! لیکن مظہر علی نے سب کو نظر انداز کیا اور ریس کا ٹٹو ہو کر نکل پڑے، حتیٰ کہ

احرار امیدواروں کے ناموں کا اعلان کر دیا ـــــ خود سیالکوٹ کے شہری حلقے سے کھڑے ہوتے، امرتسر سے شیخ حسام الدین، سیالکوٹ کے قصباتی حلقے سے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ، لدھیانہ سے ماسٹر تاج الدین انصاری لاہور کے دیہاتی حلقہ سے سردار محمد شفیع (سالارِ احرار) لاہور کے سول حلقہ سے میاں محمد رفیق (برادرِ اصغر میاں قمرالدین مرحوم) اور خان گڑھ سے نوابزادہ نصراللہ خاں۔

حافظ علی بہادر خاں نے بمبئی لوٹ کر خط لکھا کہ سول میرج کا قصہ محض افسانہ ہے، یہاں مَیں نے تحقیق کی ہے، قائداعظم نے رتن بائی کو باقاعدہ مسلمان کیا اور دونوں کا نکاح ہوا تھا، حافظ جی نے نکاح کی نقل بھجوا دی، لیکن مظہر علی اپنی اس اچھوتی بانگی کو واپس لینے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہ ہوتے، مشہور کالم نویس میاں محمد شفیع المعروف م ش اُن دنوں ڈان کے وقائع نگار تھے، انہوں نے سول کے پرانے فائل تلاش کیے اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے حوالے سے قائداعظم کے نکاح کی خبر نکال لی، اس خبر میں واضح طور پر درج تھا کہ سر ڈنیشا پٹیٹ کی بیٹی رتن بائی نے خلاں مسجد میں اسلام قبول کیا اور مسٹر جناح سے اسلامی اصولوں کے مطابق شادی کر لی ہے ـــــ قائداعظم نے کوئٹہ سے بیان دیا کہ احرار کو میری ذات پر حملہ کرنے کی بجائے میری سیاست سے بحث کرنی چاہیے۔

غرض مظہر علی کی اس غلطی نے احرار کو ایک ایسی آگ میں جھونک دیا جس سے ان کی عزت ہر کہ و مہ کے نرغہ میں آگئی۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری بہت دنوں بعد کہ۔ انتخابی زور بندھ چکا تھا ہزنگر سے واپس امرتسر آگئے، اور گھر میں ٹکے رہے، مظہر علی اور حسام الدین نے بہت چاہا لاہور چلیں۔ راضی نہ ہوتے، ناچار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس انہی کے ہاں بلوایا گیا، شاہ جی پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیتے، ان کے لیے الیکشن کا تصور ہی زہر تھا

جب مظہر علی نے بہت اصرار کیا تو کہنے لگے ــــ "تم نے خدا کے اس قہر کو دعوت دے کر احرار کو اُس کی بھینٹ کر دیا ہے، جناح کے خلاف شادی کا شوشہ چھوڑ کر اپنی بازی ہار چکے ہو، اس کی عفیفہ اور مرحومہ اہلیہ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ اتنی مدت بعد اس کا کفن اتارا ہے، سیاست کا مقابلہ سیاست سے کیا ہوتا ہے؟ اب بھی الیکشن سے دست بردار ہو جاؤ ــــ"

مظہر علی نے کہا ــــ "اب تو آغاز ہو چکا ہے"

"میرے مشورے کے بغیر کوئی آغاز نہیں" شاہ جی نے کہا

مظہر علی چپ ہو گئے، شاہ جی نے فرمایا:

"مجھے دکھاوے کا امیر شریعت بنا رکھا ہے، مَیں تمہارے کھیتوں کی کھاد ہوں، الیکشن سے دست بردار ہو جاؤ، اخباروں میں بیان دینے کا عادی نہیں لیکن یہاں بیان دینے کو تیار ہوں کہ مَیں نے بطور امیر جماعت کو الیکشن میں حصّہ لینے سے روک دیا ہے ــــ احرار پہ دوسری شہید گنج کیوں گراتے ہو؟"

مَیں اور قاضی احسان احمد پہلے ہی اس ذہن کے تھے، ہم نے صاد کیا، تھوڑی سی بحثا بحثی کے بعد شیخ حسام الدین، صاحبزادہ فیض الحسن شاہ اور مولانا مظہر علی راضی ہو گئے، لیکن لاہور پہنچ کر جانے کیا پیچ پڑا کہ مظہر علی پھر گئے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانہ سے لاہور پہنچے، انہوں نے شاہ جی کو شیشہ میں اُتار لیا، اور وہ بجبر و اکراہ انتخاب کے ہمنوا ہو گئے لیکن شرط یہ لگائی کہ اُن امیدواروں کے حلقے میں جائیں گے جن کے پاس احرار کا ٹکٹ ہو گا، اور جو شروع سے احرار کے ساتھ رہے ہیں، پہلا جلسہ امرتسر کے چوک فرید میں ہُوا، شاہ جی نے مولانا مظہر علی اظہر سے قطعی مختلف تقریر کی، انہوں نے فرمایا: مظہر علی نے جن بنیادوں پر انتخابی مہم کا آغاز کیا ہے وہ غلط ہیں،

مجھے ان سے اختلاف ہے، میرا معاملہ سیاسی ہے، قائد اعظم ہندوستان کے مسلمانوں کا حل پاکستان بتاتے ہیں ان کے برعکس میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ اس سے حل نہیں ہوگا ——— وہ دو حصّوں میں تقسیم ہو جائیں گے، جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے وہ نصف سے کچھ ہی کم ہونگے ان کے لیے ہندوستان میں واقعۃً کوئی جائے پناہ نہ ہوگی، وہ مدت تک عبرت کا نقش بنے رہیں گے، قدرت کارساز ہے اور اللہ کے بھیدوں کو جاننا انسانی اختیار میں نہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے جینا محال ہو جائے گا، اُمراء بہر حال پاکستان چلے آئیں گے، عام لوگ تقسیم و تاراج ہو کر آئیں گے، ہندوستان کے سارے مسلمان پاکستان میں نہیں کھپ سکتے، اور نہ پاکستان انہیں کھپا سکے گا۔

تقسیم ہندوستان ہی نہیں ہوگا پاکستان بھی ہوگا ——— ان خیالات کو شرح و بسط سے بیان کرتے ہوئے شاہ جی نے کہا:

"یہ بازار جہاں میں بول رہا ہوں ایک ویرانہ بننے والا ہے، محسوس ہوتا ہے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے، قافلے آرہے اور قافلے جارہے ہیں، ہندوستان مسلمانوں کے لیے ایک زندہ قبرستان ہے۔ تقسیم ہوئی تو امرتسر تک کا علاقہ ہندوستان سے جائے گا۔ پاکستان پر رفتہ وہی لوگ قابض ہو جائیں گے جو آج بھی انگریز کے غمخوار و نمکخوار ہیں، یہ امراء کی ایک جنت ہوگی لیکن ننانوے فی صد عوام کے لیے یہی شب و روز ہونگے، اسلام ایک مسافر کی طرح ہوگا،

میں مسلمانوں میں تصادم نہیں چاہتا نقطۂ نگاہ کی بات ہے، قائدِ اعظم مسلمان جماعتوں کی ایک مجلسِ مشاورت بلائیں، مجھے اپنے نقطۂ نگاہ پر قائل کرلیں تو میں ان کا سپاہی ہو جاؤں گا، مجھے کیا لینا ہے؟ کچھ نہیں

لیکن اس صورت میں ان کی جنگ میں لڑونگا، جنگ مجھ پر چھوڑ دیں ہندو سے بھی لڑوں گا اور انگریز سے بھی ـــــ قائداعظم بڑے ہیں ہم چھوٹے ہیں لیکن بڑوں کا کام چھوٹوں کو دھتکارنا نہیں سمجھانا ہے"

پہلا موقعہ تھا کہ شاہ جی کسی جلسہ میں ننگے سر آئے تھے، فرمایا:

جب سے میری قوم نے حسین احمد کی پگڑی اُتاری ہے میں نے عہد کیا ہے آئندہ سر پر ٹوپی نہیں رکھوں گا" ـــــ واقعہ یہ تھا کہ مولانا حسین احمد مدنی سرحد کے دورہ سے واپس جارہے تھے جالندھر اسٹیشن پر بعض لیگی نوجوانوں نے اپنے ایک ساتھی شمس الحق کی معیت میں مولانا کو بے عزت کیا ان کی پگڑی اُتارلی، طمانچہ مارا اور گالیاں دی تھیں[1]

دوسرا واقعہ جو شاہ جی نے بیان کیا، سری نگر کا وہ مظاہرہ اور سلوک تھا جو علی گڑھ کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کو وہاں پیش آیا تھا شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں نے مولانا کا جلوس نکالا، مولانا کشتی میں سوار تھے کہ لیگ کے ہزاروں ہم نواؤں نے دھاوا بول دیا، پتھراؤ کیا، کالے جھنڈے دکھلائے، گالی گفتار کی، شاہ جی نے فرمایا:

مظاہرین مولانا کی ناؤ اُلٹا کر انہیں ڈبو دینا چاہتے تھے لیکن نیشنل کانفرنس کے

---

[1] ہمارے ایک دوست ڈاکٹر اکرام الحق قریشی جالندھر میں لیگ کے پُرجوش کارکن تھے۔ حمید نظامی مرحوم کے کلاس فیلو رہے اُن کا بیان تھا کہ شمس الحق اپنے اس کارنامہ کا کہ وفرے کر مولانا عظامی کے ہاں پہنچا وہ اُن دنوں مقامی لیگ کے نائب صدر تھے، مولانا عظامی واقعہ سن کر کانپنے لگے، بار بار پوچھتے واقعی تم نے یہی کیا ہے؟ کہنے لگے: میاں! جس نے حسین احمد کے ساتھ یہ کیا ہے اُس کی تو نعش بھی نہیں ملے گی، سب کو معلوم ہے کہ شمس الحق پاکستان آکر قتل ہو گیا اُس کی نعش تک نہ ملی، بلکہ معمہ ہی رہا، اس کا دوسرا ساتھی مہاجرت کے دقت بیاس میں ڈوب گیا۔

رضا کاروں نے زبردست مدافعت کی اور مولانا بال بال بچ گئے، مولانا کو ختم کر دینے کی یہ سازش لاہور میں تیار کی گئی، اس کے محرک و مؤید دو نامور لیگی نوجوان تھے، دونوں ہی پاکستان بنا تو لیگ کی حکومتوں کے معتوب ہو گئے انہیں پاکستان کا سیاسی نقشہ اپنے ان تصورات سے مختلف نظر آنے لگا جن کی خاطر وہ لگاتار جدوجہد کرتے رہے، اور اب "کلمۃ الحق" کی پشتیبانی ان کے لیے سب سے بڑا جرم ہو گئی تھی ــــ اِس ذہنی فضا میں انتخابی مہم کا آغاز ہوا۔

انتخابی جنگ

یدھ معمولی نہیں تھا، گھمسان کا رن پڑا، سب مسلمان تو نہیں جیسا کہ نتائج سے ظاہر ہو گیا لیکن جمہوری معیار کے مطابق مسلمانوں کی بے پناہ اکثریت لیگ کے ساتھ تھی، قائداعظم، مسلم لیگ اور پاکستان کے نام میں بلا کا جادو تھا، عام مسلمان انہی کے ہو گئے۔ یہ پہلا الیکشن تھا جو ہندوستان کے مسلمان کسی اصول، کسی جماعت کسی قائد اور کسی موقف پر لڑ رہے تھے جب سے ہندوستان میں انتخابات کا نظام رائج ہوا مسلمانوں نے کبھی اتنی تنظیم و یک جہتی کا ثبوت نہیں دیا تھا اور اس کے وجوہ تھے ایک تو ملک کی سیاسی جدوجہد ستائیس اٹھائیس برس بعد آخری مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی، دوسرے ملک کی آزادی کے آثار صاف نمایاں ہو گئے اور مسلمانوں کو آزادی کے اس نقشہ میں اپنا مقام متعین کرنا تھا لیگ کے پاس مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کا نصب العین تھا، کانگرس سے مسلمان واقعتہً دل برداشتہ بلکہ بدظن ہو چکے تھے اور اسکی وجہ ہندو اکثریت کی تنگ نظری، مسلمانوں کا معاشی مقاطعہ اور مجلسی کوتاہ اندیشی تھی اس جنگ میں قائداعظم کے ساتھ وہ تمام بزرجمہر شامل ہو گئے جن کا اپنے علاقوں میں مسلمان غرباء پر اختیار تھا، جو عمر بھر انگریزوں کے پشتینی وفادار رہے اور جن کا وظیفہ حیات ہی برطانیہ کی چاپلوسی تھا، غرض یہ لوگ جو آزادی کے بعد اپنا کوئی مقام نہیں رکھتے تھے صرف اس لیے قائداعظم کے ہمرکاب ہو گئے کہ ان کے لیے بس ایک وجود تھا جس کے دامن میں پناہ لینے کے بعد وہ آزادی کے نقشہ میں رہ سکتے تھے،

برطانوی کاسہ لیسی کے جتنے شہ پارے تھے وہ سب قائداعظم کے لیے فرش راہ ہو گئے، حتیٰ کہ ملک فیروز خاں نون جن کی برطانیہ سے وفاداری غایت درجہ مثالی تھی اور جو بہت پہلے کینیڈا میں ڈرہانک چکے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو چکا ہے ایکا ایکی سرکار کی آغوش سے نکلے اور قائداعظم کے قدموں میں آ گئے، ادھر خان عبدالقیوم خاں نے کانگرس کا ساتھ چھوڑ دیا وہ سنٹرل اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر رہتے اور اب انہیں ٹکٹ ملنے کی امید نہ رہی تھی، خان برادر بوجوہ اُن کے مخالف تھے اور ٹکٹ بادشاہ خان کے فرزند خان عبدالغنی خان کو مل گیا تھا، خان عبدالقیوم کانگرس میں کسی بھی قربانی کے لیے تیار نہ ہوتے، ہمیشہ قید و بند سے پہلو تہی کرتے رہے۔ انہیں اقتدار کا چسکا تھا، اس چسکا کے لیے لیگ میں چلے گئے، اس سے پہلے پاکستان کے خلاف گنز اینڈ گولڈ کے نام سے ایک کتاب لکھ چکے تھے بلکہ کانگرس کی مرضی و منشا کے خلاف مہاجن ہندوؤں کے ایک ایسے اجلاس کی صدارت کی تھی جو یونی نسٹ وزارت کے اُن زرعی بلوں کے خلاف لائل پور میں منعقد ہوا تھا جن کا فائدہ عام مزارعین کو پہنچتا، اور اُن سے مہاجنی نظام ڈھیلا پڑتا تھا، لیگ کا اصل مقابلہ تو کانگرس سے تھا، لیکن لیگ کے مقابلہ میں کئی مسلمان جماعتیں خم ٹھونک کر آ گئی تھیں، مثلاً:

(۱) جمعیتہ العلماء ہند (۲) مجلس احرار اسلام (۳) کرشک پرجا پارٹی۔
(۴) مومن کانفرنس (۵) مسلم مجلس (۶) یونی نسٹ پارٹی۔

یونی نسٹ پارٹی عملاً ایک مسلمان جماعت تھی، اس کی مشترکہ کمان کے بڑے بڑے جرنیل رحلت کر چکے تھے، سر فضل حسین صوبجاتی خود مختاری کے ثمر آور ہونے سے پہلے وفات پا گئے، سردار سکندر حیات دوران وزارت انتقال کر گئے، سر سندر سنگھ مجیٹھیا بھی انہی دنوں چل بسے، چودھری چھوٹو رام اس معرکہ سے پہلے سورگباش ہو گئے، اب یونی نسٹ پارٹی حکومت پسند وفاداروں کے ایک انتخابی طائفہ کا نام تھا جس کے ہاتھ میں صوبہ کی عنانِ وزارت

تھی اور ملک خضر حیات ٹوانہ اس کے سردار تھے۔

جمعیۃ العلماء ہند کے اثرات دیوبند کے مدرسۂ فکر پر نسبتہ زیادہ تھے، گو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہا اللہ تعالیٰ لیگ کے ساتھ تھے لیکن مولانا حسین احمد مدنی مقابلۃً زیادہ اثر رکھتے تھے، ان کے تقویٰ و استقامت کا نام ہی دراصل جمعیۃ العلماء ہند تھا، یا پھر اس کے حلقوں میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے اخلاص و خطابت کا چرچا تھا۔

مجلسِ احرار اسلام کا سیاسی رسوخ جو بھی تھا پنجاب میں تھا یا پھر شاہ جی کی خطابت کے اثرات دہلی و سہارنپور وغیرہ میں تھے، سرحد میں بھی مجلسِ احرار تھی لیکن اس کے اثرات قوی نہ تھے۔

کرشک پرجا پارٹی مولوی اے کے فضل الحق کی جماعت کا نام تھا اور وہ اِسی کے ٹکٹ بلکہ اپنی ذات کے ٹکٹ پر دو حلقوں سے منتخب ہوئے تھے، ایک صاحب علی گڑھ میں شیخ عبدالمجید پکے نیشنلسٹ تھے، مسلم مجلس ان کی صدارت میں ایک اخباری نام تھا، علی گڑھ میں اس کا دفتر تھا۔

مومن کانفرنس ملک کے انصار کی جماعت تھی، انبالہ کے ماسٹر ظہیرالدین ایڈوکیٹ اس کے صدر تھے، اور یہ تھا نیشنلسٹ مسلمانوں کا ملغوبہ، ان میں اتحاد یا اشتراک کا ایک ہی پہلو تھا کہ لیگ کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن مسلمان جوش و جہاد اور قہر و غضب کی اِس حالت میں تھے کہ انہیں حسین احمد کے مقابلہ میں قاضی عیسیٰ، عطاء اللہ شاہ کے مقابلہ میں فیروز خان نون اور عبدالغفار خاں کے مقابلہ میں عبدالقیوم زیادہ متقی، خطیب اور بہادر نظر آتے تھے۔

کانگرس بے شک ملک کی سب سے بڑی پولیٹکل جماعت تھی لیکن اس کے اثر و اقتدار کی بے پناہی ہندوؤں تک تھی، ایک سرحد کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے لیکن وہاں

بھی کانگرس کی بہ نسبت سرخ پوشوں کا زور تھا اور اس کے سرخیل عبدالغفار خاں تھے۔
پنڈت جواہر لال نہرو نے سرینگر میں نیشنل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے
اچانک انکشاف کیا کہ وہ ان نوجوانوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے، جو ان دنوں دہلی کے
لال قلعہ میں کورٹ مارشل کا انتظار کر رہے ہیں اور جنہوں نے سبھاش چندر بوس کی آزاد
ہند فوج میں شریک ہو کر برما کے میدانوں اور آسام کی پہاڑیوں میں ہندوستان کی
آزادی کے لیے جنگ لڑی ہے، انہیں انگریزی کمانڈروں نے شکست کھانے کے بعد
دغا دے کر چھوڑ دیا تھا، وہ سبھاس چندر بوس کی سیادت میں اکٹھے ہو گئے، اور آزاد ہند
فوج بنا کر اس وقت تک لڑتے رہے ہیں جب تک جنگ کا پانسہ پلٹ نہیں گیا۔

جواہر لال کا یہ اعلان ہندوستان بھر میں ہیجان و غضب کا طوفان ہو گیا، تمام
ملک جاگ اٹھا ـــــ جگہ جگہ "آزاد ہند فوج کی جے" کے نعرہ ہائے رستاخیز بلند ہونے
لگے، معلوم ہوتا تھا ایک آگ لگ گئی ہے، مسئلہ دلوں کو چھوتا ہو اور رہنما عظیم ہو تو
ہر خیال برقی رو بن جاتا اور یہی برقی رو تحریک بن کر انقلاب کے دروازے پر دستک
دیتی ہے، جواہر لال کی آواز جنگل کی آگ بن کر پھیل گئی، حکومت پہلے سے ہلی ہوئی
تھی اور ہل گئی، یقین تھا کہ ان نوجوانوں کو شوٹ کر دیا جاتا یا تختہ دار پر لٹکا دیئے
جاتے لیکن جواہر لال پوری آزاد ہند فوج کے نگہبان ہو گئے، ان کی جنبش لب
ہزاروں زندگیوں کو بچانے کا باعث ہوئی، بدلی ہوئی فضا کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرکزی
حکومت نے کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کا اعلان کیا، اعلیٰ فوجی افسروں پر مشتمل
ایک ٹریبونل قائم کیا گیا جس نے دہلی کے لال قلعہ میں ٹھیک اسی جگہ مقدمہ چلانے
کا فیصلہ کیا جہاں ۹۰ سال پہلے بہادر شاہ ظفر کو تخت سے اٹھا کر کٹہرے میں کھڑا کیا
گیا اور قیدی بنا دیا گیا تھا، یہ ایک عجیب تماشا تھا کہ تاریخ نوے سال بعد اپنے
ورق الٹ رہی تھی، ۱۸۵۷ء میں بادشاہ کو قلعہ سے اٹھا کر دہلی سے رنگون لے گئے

تھے لیکن ۱۹۴۶ء میں شاہ نواز اور ان کے ساتھیوں کو رنگون سے دہلی لاکر اسی قلعہ میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا، تب غلامی کا آغاز تھا اب اس کا تتمہ لکھا جا رہا تھا، کانگرس نے مقدمہ کی پیروی کا اعلان کر دیا، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی ڈیفنس کونسل کے سربراہ اور ملک کے بڑے بڑے وکلاء ان کے معاون ہو گئے، خود پنڈت جواہر لال نہرو پہلی دفعہ بیرسٹری کا گاؤن پہن کر عدالت میں آئے۔ شاہنواز، سہگل اور ڈھلوں کو سب سے پہلے مقدمہ کے لیے منتخب کیا گیا۔ ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ قائداعظم نے ایک بیان میں کہا کہ کانگرس ان نوجوانوں کے مقدمے کو اپنی انتخابی مہم کا ذریعہ بنا رہی ہے۔ لیگ نے ایک کیپٹن عبدالرشید کو اپنے ڈھب پر لاکر اُس کا مقدمہ لڑا لیکن بات رہ گئی، البتہ شاہ نواز، سہگل اور ڈھلوں کا نام ملک کے ہر کونے کھدرے میں گونج اُٹھا، ہندوستان بھر میں کانگرس کی دھاک بیٹھ گئی، ہر کہیں جلسوں اور جلوسوں کا ایک طوفان بندھ گیا، سلہٹ سے خیبر تک کی ذہنی فضا میں سبھاش چندر بوس اور ان نوجوانوں کا ڈنکا بجنے لگا، عام مقرروں کا مطلع و مقطع یہی نوجوان ہو گئے، حکومت کے لیے مظاہروں پر قابو پانا مشکل ہو گیا، صبح و شام رہائی کا مطالبہ زور پکڑتا گیا، اکثر شہروں میں مظاہرین پر گولی چلائی گئی، عام شہروں میں لاٹھی چارج روزمرہ ہو گیا۔

لاہور میں ہندو خواتین نے ایک جلوس نکالا، اِس جلوس میں کئی ہزار لڑکیاں تھیں، بعض ہندو ججوں اور اکثر ہندو افسروں کی بیٹیاں پیش پیش تھیں، پولیس نے مال روڈ پہ انہیں روکا، وہ آگے بڑھنا چاہتی تھیں، نتیجۃً ان پر لاٹھی چارج کیا گیا، کئی لڑکیاں لہولہان ہو گئیں ــــــ اس زمانہ میں مال روڈ کو کنواری مریم خیال کیا جاتا اور وہاں کسی مظاہرے کی اجازت نہ تھی، سی آئی ڈی کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل میاں انور علی نے جو بعد میں ہوم سیکرٹری ہو کر سبکدوش ہوتے ختم نبوت کی تحریک میں اسی حسرت کا اظہار کیا تھا کہ مال روڈ جو تقسیم سے پہلے مظاہرین کی تگ و دو سے "ملوث"

نہ ہوئی تھی، اب مظاہرین کی گام فرسائی سے" داغدار" ہو رہی ہے۔

سر آکن لک (متحدہ ہندوستان کے آخری کمانڈر انچیف) نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ شاہنواز ایک بہادر نوجوان تھا، میں نے چاہا اس کو اس مخمصہ سے نکالوں، ترغیب بھی دی اور سزائے موت کا چہرہ بھی دکھایا لیکن وہ اتنا ثابت قدم تھا کہ اپنے کیے پر اس کو فخر تھا وہ موت سے بے نیاز ہو چکا تھا، نتیجہ وہی نکلا جو اس حالت میں نکلنا چاہیے تھا، شاہنواز، سہگل اور ڈھلوں کو قانوناً سزائے موت دی گئی، لیکن عملاً رہا کر دیئے گئے، تمام ملک میں ان کا طوطی بولنے لگا، عوام نے آنکھیں بچھا دیں، جگہ جگہ جلوس نکالے گئے جلسے ہونے لگے، کلکتہ سے سرینگر تک اور راس کماری سے خیبر تک ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ ہندو عوام میں کانگرس کا بول بالا ہو گیا، جواہر لال کا وار نشانہ پر بیٹھا کسی رہنما کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے ترکش میں جو تیر ہوتے ہیں وہ ان کے استعمال میں چوکس رہتا اور جب نشانہ باندھتا ہے تو ٹھیک ٹھیک باندھتا ہے۔ جواہر لال نے آزاد ہند فوج کے ہزاروں نوجوان کی جانیں بچا کر کانگرس کو کروڑوں انسانوں کا حکمران بنایا، اس کو انتخاب جیتنے میں زیادہ محنت نہ کرنی پڑی۔

سبھاش بابو جن حالات میں ہندوستان سے گئے تھے تاریخ کے ہر طالب علم کو اُس کا علم ہے، کانگرس ہائی کمانڈ کے ساتھ اُن کی کھلم کھلا ٹکر ہوئی، گاندھی جی نے راجکوٹ میں برت رکھ کر تری پور کانگرس میں ان کی صدارت کو سبوتاژ کر دیا، انہیں کانگرس چھوڑنی پڑی حتیٰ کہ گاندھی جی سردار پٹیل اور راجندر پرشاد کے ہاتھوں عاجز آکر گوشہ نشین ہو گئے، اس گوشہ نشینی میں انہوں نے ملک سے بھاگ جانے کا پروگرام بنایا اور بھاگ گئے، آزاد ہند فوج کی نیو رکھی لیکن خود ملک کی آزادی سے پہلے دوسری جنگ عظیم کے دوران شہید ہو گئے، ان کی متاع جواہر لال کے ہاتھ آ گئی لیکن اُس کی

فصل کانگرس نے کاٹی اور وہی لوگ اس سے متمتع ہوئے جو سبھاش کے سیاسی حریف تھے اور جنہوں نے کانگرس کی صدارت کا تاج اُن کے سر سے اتار لیا تھا۔ مثلاً سردار پٹیل جن کا دل آزاد ہند فوج کے معاملہ میں کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔ شاہنواز وغیرہ لاہور آئے تو انسانوں کا ایک جمِ غفیر اُمڈ پڑا، شاہ محمد غوث کا بازار، دہلی دروازہ سے لے کر اکبری دروازہ تک لوگوں کے ازدہام سے چھلک رہا تھا، یہاں مَیں نے ہی اُن کے تعارف کا فرض ادا کیا۔

جہاں جہاں یہ لوگ گئے کانگرس کی جیت یقینی ہوتی گئی، حقیقت یہ ہے کہ کانگرس کی انتخابی جنگ کا ایک ثلث ان نوجوانوں نے جیتا۔

شاہنواز بمبئی گئے تو وہاں قائداعظم سے بھی ملے، قائداعظم نے انہیں بڑھ کر خوش آمدید کہا، دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی شاہنواز کی روایت کے مطابق اس کا خلاصہ یہ ہے:

قائداعظم۔ شاہنواز لیگ میں آجاؤ۔

شاہنواز۔ قائداعظم! جو لوگ لیگ میں آپ کے دست و بازو ہیں وہ خود اپنی ذات سے مخلص نہیں، آپ سے یا مسلمانوں سے کیا مخلص ہونگے؟

قائداعظم۔ مجھے نوجوانوں کے اخلاص پر بھروسا ہے، آپ بھی ایک مخلص نوجوان ہیں اسی لیے لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دے رہا ہوں۔

شاہنواز۔ ابھی باہر مجھے راجہ غضنفر علی خاں ملے تھے، مَیں نے اُن سے پاکستان کا مطلب پوچھا تو قہقہوں میں ٹال گئے، جب آپ کے نائب آپ کے نصب العین پر ہنستے ہیں تو جو لوگ متفق نہیں اُنہیں آپ کیونکر متفق کر سکتے ہیں۔

قائداعظم۔ چھوڑو، یہ لوگ جو کچھ ہیں مَیں جانتا ہوں، سوال ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہے، مَیں ہندو کی ذہنیت خوب سمجھتا ہوں، تمہیں ایک دن ہندو سے مایوسی ہوگی

اور بہت جلد ہوگی، تمہارے لیے لیگ کے دروازے کھلے ہیں، اس وقت چلے آنا"۔

شاہنواز نے بتایا، قائداعظم نے انہیں پاکستان کے موضوع پر دو کتابیں دیں، ایک کے مصنف مشہور اچھوت لیڈر امبیدکر تھے، دوسری کا مصنف کوئی انگریز تھا جس نے قائداعظم سے ملاقات کے بعد پاکستان کے موضوع پر اپنے تاثرات کا ایک طویل سفرنامہ لکھا تھا۔

انتخابات کا نتیجہ حکومت اور عوام کی توقع سے مختلف نہ تھا، جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی وہاں کانگرس جیت گئی اور اس کو بے پناہ اکثریت حاصل ہوئی جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں لیگ کا بول بالا ہو گیا، البتہ سرحد واحد صوبہ تھا جہاں لیگ کو شکست ہوئی اور کانگرس یا سرخپوش جیت گئے، ہندو صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نوے فی صد نشستیں لیگ کے ہاتھ آگئیں، بنگال میں مولوی اے کے فضل الحق دو نشستوں سے کامیاب ہوتے لیکن باقی تقریباً سبھی نشستیں لیگ لے گئی، پنجاب میں ملک خضر حیات ٹوانہ دو نشستوں سے کامیاب ہوئے ان کے ساتھ پانچ چھ یونی نسٹ، نواب مظفر علی قزلباش، ملک ممتاز ٹوانہ اور مسٹر ابراہیم برق وغیرہ احرار کا بالکل ہی صفایا ہو گیا، حتیٰ کہ مظہر علی اظہر اپنی پکی نشست سے ہار گئے، کانگرس کے مسلمان امیدوار بھی رہ گئے، مولانا داؤد غزنوی دھاریوال کی مزدور نشست سے کامیاب ہوتے، جہاں ہندو اکثریت میں تھے لیگ کو اس کی توقع سے بہت زیادہ کامیابی ہوئی، اس نے ۸۱ میں سے ۷۳ نشستیں حاصل کیں۔ اور یہ سب پاکستان کا جادو تھا۔

خود لیگ کے لیڈر اس محیّر العقول کامیابی پر ششدر تھے، ان کا خیال تھا کہ پنجاب میں نصف یا دو تہائی نشستیں حاصل کر سکیں گے، سندھ میں بھی اسی پیمانے پر لیگ کو فتح حاصل ہوئی، لیکن جہاں تک لیگ کی وزارتوں کا تعلق تھا وہ بنگال اور سندھ کے سوا اور کہیں نہ بن سکیں، سرحد کا سوال ہی خارج از بحث تھا، پنجاب میں زبردست اکثریت کے باوجود کانگرس یونی نسٹ وزارت قائم ہوئی اس وزارت کے معمار مولانا ابوالکلام آزاد

تھے جو کانگرس کی طرف سے مسلمان صوبوں کے انچارج تھے، ان کے خلاف مسلم لیگ کا مشتعل ہونا ایک قدرتی امر تھا، لیکن ملک خضر حیات سمیت تمام یونی نسٹ ممبر لیگ میں شامل ہو جاتے تو بھی لیگ کی وزارت کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا رہتا، کیونکہ کوئی ہندو، سکھ یا عیسائی لیگ کے ساتھ ملنے کو تیار نہ تھا، لیگ کے زعماء کا خیال تھا کہ وہ اکالی پارٹی کے ساتھ گفتگو کر کے وزارت بنالیں گے، لیکن یہ اُن کی بھول تھی جن سکھوں کو راضی کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں وہ دو عملی کر رہے اور قلبا کانگرس کے ساتھ تھے، یہی نتیجہ اُس وقت نکلا جب خضر حیات نے وزارت سے استعفیٰ دیا اور لیگ سکھوں کو راضی کرنے کرتے اُن کے دو ٹوک انکار پر وزارت نہ بنا سکی، متحدہ پنجاب میں لیگ وزارت کا قیام فی الجملہ خارج از امکان تھا۔

بہرحال مولانا ابوالکلام آزاد کو مسلم لیگ کی زبان سے اتنی گالیاں سننی پڑیں کہ مسلمانوں نے اپنا سارا لُغت صرف کر ڈالا ـــــ اُردو میں ایسی کوئی گالی ہوگی جو اُردو کے اس سب سے بڑے خطیب و ادیب کے خلاف نہ برتی گئی ہو۔
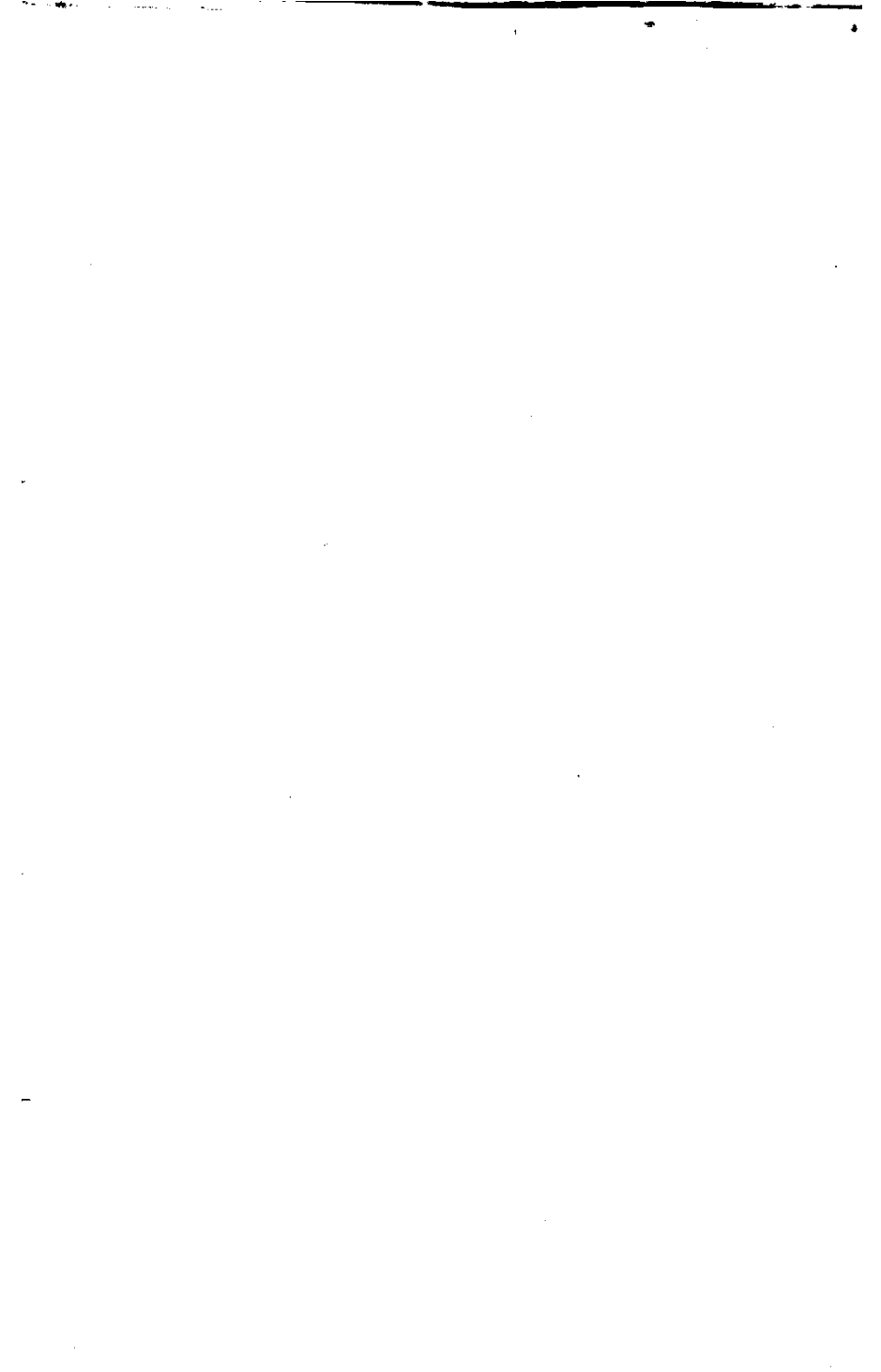
گفتنی و ناگفتنی

(۱) انتخابات میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح کمیونسٹوں کو بھی سخت نقصان اٹھانا پڑا، گاندھی جی نے کمیونسٹ پارٹی کے سکرٹری پورن چند جوشی سے دریافت کیا ——
آپ کی پارٹی کو روپیہ کہاں سے آتا ہے، جوشی نے جواب دیا آپ پنجاب کانگرس کے صدر میاں افتخار الدین سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہم اپنے ہی وسائل پر انحصار کرتے ہیں۔ لیکن کمیونسٹوں کی ہوا اکھڑ چکی اور کانگرس سوشلسٹ پارٹی نے انہیں تمام ملک میں رسوا کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ کمیونسٹ شاذ ہی کوئی سیٹ لے سکے، پنجاب میں سردار سوہن سنگھ جوش، سردار تیجا سنگھ سوتنتر اور سردار کرم سنگھ مان جیسے معروف کمیونسٹوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

(۲) جن کمیونسٹوں سے مجھے واسطہ پڑا، میرا تجربہ ان کے معاملہ میں تلخ ہی رہا۔ عالمی کمیونسٹوں کے متعلق میں کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر ہوں لیکن ہندوستانی کمیونسٹوں کی پنجابی شاخ کے متعلق میرا تجربہ ہمیشہ یہی رہا کہ ان کے نزدیک "دوستانہ وفا" کوئی چیز نہیں، جو چیز انہیں اپنے مقصد اور اپنی منزل تک پہنچا دے وہی جائز اور صحیح ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ موجودہ اخلاقی نظام سرمایہ دار سوسائٹی کا پیدا کردہ ہے اور کمیونزم تک رسائی کے لیے ہر حربہ، ہر ہتھیار اور ہر فریب جائز ہے' جھوٹ اور سچ کے پیمانے مصنوعی ہیں، اخلاقی قدریں بورژوائی نظام کی پیداوار ہیں،

وفاداری صرف پارٹی کے لیے ہوتی ہے جو ساتھ نہیں اس کے متعلق باتیں گھڑنے، الزام لگانے اور جھوٹ پھیلانے کا پورا پورا حق ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ پنجاب، کمیونسٹ پارٹی کے بیشتر ارکان فی نفسہٖ اخلاقی انحطاط کا شکار رہے اور اس پر کبھی متاسف نہ ہوئے۔

(۳) کمیونسٹوں کی عادت ہے کہ اپنے مقصد کے لیے ہمیشہ اُن لوگوں کے خلاف زبان و قلم کو حرکت میں رکھتے جن کے متعلق انہیں یقین ہو کہ وہ کمیونزم کو نہیں مانتے لیکن استبداد سے لڑ سکتے اور عوام میں ان کا اثر بھی ہے جن لوگوں کو مذہب پر یقین ہو اور وہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہوں ان کے خلاف محاذ بنانا کمیونسٹوں کا شعار ہے۔ الیکشن سے پہلے اور الیکشن کے دوران کمیونسٹوں کا سب سے بڑا محاذ پنجاب میں احرار کے خلاف تھا، آج پاکستان میں کمیونسٹوں کے مخالفانہ پراپگنڈے کا سب سے بڑا ہدف جماعت اسلامی ہے۔ کل احرار کے استقامت و ایثار کو اپنی راہ میں روڑا سمجھتے رہے، آج جماعت اسلامی کے فکر و نظر کو اپنے لیے روک سمجھتے ہیں، ایک غیر اشتمالی استبداد دشمن کو زک پہنچانے کے لیے انتہائی استبداد کے ساتھ ذہنی سمجھوتہ کرتے ہوئے بھی انہیں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی، میاں افتخار الدین فکری طور پر کمیونسٹ تھے، انہوں نے لیگ میں شامل ہو کر سب سے زیادہ نقصان احرار کو پہنچایا، وہ ان کے خلاف اس قسم کی باتیں کہتے رہے جو ان کو زیب نہیں دیتی تھیں، پاکستان بن جانے کے بعد جماعت اسلامی کے خلاف سب سے پہلے انہی کے اخباروں نے پراپگنڈا کی نیو رکھی۔

(۴) کمیونسٹوں کے متعلق اس سارے عرصہ میں جو تجربہ مجھے ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فرد کے خلاف ہوں تو اُسے سی آئی ڈی کا ایجنٹ کہتے ہیں، جماعت کے خلاف ہوں تو اسے رجعتی طاقت کا نام دیتے ہیں، جیت جائیں تو جنتا کی فتح، ہر جائیں تو جاگیرداروں یا سرمایہ داروں کی سازش، ان کے پراپگنڈے کی مشینری بڑی طاقتور ہوتی ہے۔

(۵) قائد اعظم اور ملک خضر حیات میں اختلاف و تصادم کے متعلق بعض حقیقتیں سامنے آچکی اور بعض ابھی مخفی ہیں لیکن کمیونسٹوں کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ وہ جاگیرداروں کو آپس میں لڑوا کر عوام کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں، اُن کا خیال تھا کہ پنجاب کے جاگیردار آپس میں دست و گریباں ہونگے تو عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوگا۔

(۶) "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک میں صوبہ کانگرس کے صدر میاں افتخار الدین تھے، قید و بند کا مطلع چھٹا تو اپنے کمیونسٹ دوستوں کے ایما سے لیگ میں آگئے جس سے ان کا انتخابی مستقبل محفوظ ہو گیا، اور اس طعن سے بھی بچ گئے جو غداری کے نام پر پاکستان میں نیشنلسٹ مسلمانوں کو سہنا پڑا۔

(۷) میاں افتخار الدین مستعفی ہو گئے تو مولانا ابوالکلام آزاد کو لاہور آکر آئندہ صدر کا فیصلہ کرنا تھا، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو امیدوار تھے ان کے مقابلہ میں ڈاکٹر ستیہ پال گروپ دیوان چمن لال کے زیر قیادت ڈٹا ہوا تھا۔ لاجپت رائے کے بعد پنجاب کے کانگرسی ہندوؤں کی قیادت ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور ڈاکٹر ستیہ پال میں بٹی ہوئی تھی، ڈاکٹر ستیہ پال مقابلۃً نیشنلسٹ تھے اور جلیانوالہ باغ میں گرفتار ہونے کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے، گوپی چند بھارگو لاجپت رائے کے نائب سمجھے جاتے اور ہندو ذہنیت کے مالک تھے، ان کا جھکاؤ سردار پٹیل کی طرف تھا — ڈاکٹر ستیہ پال ایک غلطی کر چکے تھے، کانگرس کے اندرونی خلفشار یا اپنے حالات کے دباؤ کی وجہ سے وہ دوسری جنگِ عظیم میں ڈاکٹر بھرتی ہو گئے، اب ان کے لیے کانگرس کا دروازہ بند تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو صدارت سے دستکش ہونے پر مجبور کر دیا اور وہ چار و ناچار سپر انداز ہو گئے، مولانا آزاد کا ارادہ تھا مولانا حبیب الرحمٰن کو صدر بنائیں لیکن وہ ابھی احرار سے علیحدگی کا فیصلہ نہ کر پائے تھے، وہ احرار میں تھے بھی اور نہیں بھی، نتیجۃً مولانا داؤد غزنوی صوبہ کانگرس کے صدر ہو گئے۔

(۸) پنجاب میں کانگرس کے ٹکٹ اس طرح تقسیم کیے گئے کہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو یونیورسٹی کا ٹکٹ دیا گیا جو بلا شبہ ایک درد سری تھا، وہ خود لاہور کے شہری حلقہ سے منتخب ہونا چاہتے تھے ـــــــــ بعض ایسے ہندو نوجوانوں کو ٹکٹ دیا گیا جو سچے نیشنلسٹ اور سچے سوشلسٹ تھے جنہیں کسی مرحلے میں بھی کمیونسٹ نہیں کہا جا سکتا تھا، مثلاً گورداسپور سے پربودھ چندر، راولپنڈی سے تلک راج چڈھا۔ ان کا ذکر میں نے مولانا سے کیا اور وہ انہیں ٹکٹ دینے پر رضامند ہو گئے، دونوں کا منتخب ہو جانا محض کانگرس کی وجہ سے تھا، ورنہ دونوں کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی اور نہ اپنے اپنے حلقہ ہائے انتخاب میں متعارف تھے کسی ہندو امیدوار کی کامیابی کے لیے کانگرس کا ٹکٹ سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑی ضمانت تھا، ان کے مخالف امیدوار اپنی ضمانتیں ضبط کرا بیٹھے۔ بھارگو اکالی امیدواروں کے مقابلہ میں نیشنلسٹ سکھوں کے حق میں نہ تھے لیکن مولانا راضی نہ ہوئے نیشنلسٹ سکھوں کو ٹکٹ دیئے گئے، کئی ایک نیشنلسٹ مسلمان کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے ان کا ہار جانا یقینی تھا لیکن صرف اس لیے کھڑے کیے گئے کہ کانگرس اپنے تئیں ایک قومی جماعت ثابت کرنا چاہتی تھی، ان نیشنلسٹوں میں ساری عمر کے کمیونلسٹ، سید حبیب ایڈیٹر سیاست بھی تھے، مولانا داؤد غزنوی کے چچیرے بھائی مولانا عبد الغفار غزنوی میاں افتخار الدین کے مقابلہ میں امیدوار تھے ان کے علاوہ اور بھی دو چار نیشنلسٹ مسلمان امیدوار تھے لیکن کانگرس کا روپیہ ان کی جیب تک پہنچ کر عوام میں تقسیم ہونے سے محروم ہو گیا، سب کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

(۹) ڈاکٹر گوپی چند بھارگو وزارت کے امیدوار تھے، اس سے پہلے صوبائی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر رہ چکے اور سب سے سینئر تھے، انہیں سردار ولبھ بھائی پٹیل کا اعتماد حاصل تھا، دیوان چمن لال ان کے مقابلہ میں وزیر بننے کے خواہاں تھے لیکن

مولانا آزاد نے لالہ بھیم سین سچر کو نامزد کیا، سچر اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور نہ ان کے سان گمان میں تھا۔ بٹوارہ ہوا تو ان کا حلقہ پاکستان میں تھا یہاں کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کو منتقل ہو گئے، لیکن حالات کی ناموافقت کے باعث ہندوستان چلے گئے، وہاں مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ پھر حیدر آباد دکن (مدھیہ پردیش) کے گورنر ہو گئے، کسی ایک آدھ ملک میں سفیر بھی رہے، بہر حال وہ ایک سچے نیشنلسٹ اور بے تعصب انسان تھے۔

(۱۰) پاکستان کے نصب العین نے مسلمانوں کو واقعی مسخر کر لیا تھا، چودھری عبدالرحمٰن راہوں جالندھر کی مسلم دیہاتی نشست سے احرار کے امیدوار تھے اور زمانے سے لیجسلیٹو کونسل کے ممبر چلے آ رہے تھے، اُن کا اپنے حلقے میں بے حد اثر تھا، خود بڑے زمیندار تھے، وسیع برادری تھی اور انتہائی دیانتدار تھے، لیگ نے بہت زور دیا کہ اس کا ٹکٹ لے کر بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں، ان کے عزیزوں نے بھی اصرار کیا لیکن آمادہ نہ ہوئے، مقابلہ کیا اور ہار گئے، لیگ نہ ہوتی تو انہیں شکست دینا ناممکن تھا۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر عالم کے مقابلہ میں ملک فیروز خاں نون کھڑے ہوتے، وہ اعلان کر چکے تھے کہ سبز پٹا باندھ کر کتا بھی آ جائے تو ووٹ اُسی کو دو، ڈاکٹر عالم ان کے ہاتھوں بُری طرح پٹ گئے، ان کا نام ہی ڈاکٹر لوٹا پڑ گیا، اِس پھبتی کے مصنف علّامہ حسین میر کاشمیری زمیندار کے مدیر مخابرات تھے، علّامہ صوبائی محکمہ اطلاعات کی معرفت لاہور ریڈیو کے لیے پنجابی پروگرام کی خبریں تیار کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے کسی پھبتی سے برافروختہ ہو کر انہیں نکلوا دیا، علّامہ نے زمیندار میں ایک خبر گھڑی، عنوان تھا "ڈاکٹر لوٹا"، اور ڈاکٹر لوٹا آناً فاناً زبان زدِ عام ہو گیا، ڈاکٹر عالم جہاں جاتے ان کا استقبال لوٹوں سے کیا جاتا، حتیٰ کہ پولنگ اسٹیشن پر بھی لوگوں نے لوٹے لگا دیئے، لاہور میں مزنگ روڈ پر ان کی کوٹھی تھی، منچلوں نے ایک رات ان کی کوٹھی پر لوٹوں کو جھنڈیوں کی

طرح سجا دیا، آخر اسی صدمے سے نڈھال ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

(۱۱) ملک فیروز خاں نون اس انداز سے عوام میں کبھی نہ آئے تھے اب انہیں اپنے حلقۂ انتخاب کے علاوہ دوسروں کے حلقہ ہائے انتخاب میں بھی گھومنا پڑا۔ تقریر کے فن سے نا آشنا تھے، جہاں جاتے مسلمانوں کو کلمہ پڑھواتے اور کلمہ ان کے نزدیک بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تھا، لیکن بسم اللہ بھی صحیح نہ پڑھ سکتے، بالکسر کو بالفتح اور بالفتح کو بالکسر، ملک صاحب کو پنجاب کے نوجوان لیگی لیڈروں نے قائد اعظم کے حکم سے قبول کیا، اور ٹکٹ بھی انہی کے ایما پر دیا تھا ورنہ وہ خود ان سے ناخوش تھے اور اپنے لیے مستقبل میں ایک وزارتی خطرہ سمجھتے تھے۔

(۱۲) رائے عامہ سے ٹکرانا بڑی خطرناک شے ہے، مسلمانوں کی وہ جماعتیں جو پاکستان کے مطالبہ سے ٹکرا رہی تھیں حقیقتہً ایک طوفان کی زد میں تھیں، مسلمانوں کی سیاسی خواہش سے الجھ کر ان کے لیے سب و شتم کا ایک بازار کھل گیا، حتیٰ کہ دشنام ہو کر رہ گئیں، ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو ان جماعتوں میں تھے نہ تو سب کے سب غیر مخلص تھے اور نہ بد دیانت بلکہ ہندوستان سے غیر ملکی غلامی کو ختم کرنے کے لیے اپنی زندگی کا بڑا حصہ قید و بند میں گزار چکے تھے، لیکن عوام کے علاوہ لیگ کے زعماء نے بھی انہیں بے نقط گالیاں دیں، اور یہ سلسلہ لگاتار چل رہا تھا انہی ننگی گالیوں کی وجہ سے لدھیانہ کا ایک نوجوان محمد صدیق جو میری اہلیہ کا خلیرا بھائی تھا احرار کے ایک رضا کار کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ محمد صدیق ایک پُرجوش نوجوان تھا۔ اُس نے احرار کو گالیاں دیں، احرار رضا کار نے ٹوکا اُس نے چاقو اٹھا لیا، رضا کار نے چھین کر اُس کو وہیں ٹھنڈا کر دیا——— تمام مسلمان جرائد خواہ اکثریت کے صوبوں میں تھے خواہ اقلیت کے، انہیں معلوم تھا کہ پاکستان بن جانے کی صورت میں بھی نصف سے کچھ کم مسلمان ہندوستان ہی میں رہ جائیں گے لیکن پاکستان کی تحریک میں وہ ننگی تلوار تھے۔ عام مسلمانوں کا ولولۂ عشق سرگرم رہنے کے

باوجود زبان کے جوش و خروش تک محدود تھا، اور وہ بھی زیادہ تر اپنوں ہی کے خلاف تھا، لیکن ہندو اور سکھ متوقع حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

(۱۳) میری واضح اور قطعی رائے ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم قضیہ کا حل جب پاکستان قرار دیا جا چکا تھا اور مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اس پر جمع ہو گیا تھا تو نیشنلسٹ مسلمانوں کا اس کی مخالفت میں پیش پیش ہونا اس دور کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی اس غلطی کی انہیں بڑی سخت سزا ملی، اور ان لوگوں کے ہاتھوں ملی جو خود بڑی سزا کے مستحق تھے لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے اور چاروں طرف سے ایک منظم و متمول قوم کے نرغے میں تھے ان صوبوں کو پنجاب اور سندھ کے مقرروں کا لب و لہجہ عطا کرنا تاریخ کی بعض دل آزار کہانیوں کو اچھالنا اور گاندھی و نہرو کی اہانت پر تل جانا خلافِ مصلحت تھا، یہ چیزیں ہندو قوم کے دلوں میں زہر بھر رہی تھیں، اور یہی زہر تقسیم ملک کے بعد ہلاہل ہو گیا کہ آج تک ہندوستانی مسلمانوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے[1]۔

(۱۴) میں نے بہار اور یوپی کے بعض اضلاع کے قصبات و دیہات کا دورہ کیا لکھنؤ اور پٹنہ کا مزاج دیکھا، بہرائچ سے نانپارہ اور نیپال کی سرحد تک گیا، وہاں سے آگرہ کی طرف لوٹا، کانپور سے فرخ آباد چلا گیا، قنوج وغیرہ کے علاقہ میں گھوما پھرا، سہارنپور

---

[1] اس موضوع پر بعض دوسرے مباحث بھی ہیں لیکن ان کے تذکرے کا یہ محل نہیں۔ یہ کتاب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ بٹوارے کے نتائج و عواقب اس کا حصہ نہیں۔ مؤلف زندہ رہا اور اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی تو اس کتاب کی جلد دوم میں بیان ہوگا کہ جو کچھ پیش آیا اس کی صحیح صحیح صورت کیا ہے اور کن عوامل و عناصر پر ان حالات و مظاہر کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تاریخ قوموں کی اجتماعی سرگذشت کے تجزیہ و تنقید کا نام ہے۔

سے مجلسِ احرار یوپی کے صدر خان محمود علی خاں امیدوار تھے، ان کے حلقہ میں گیا۔ ڈیرہ دون پہنچا، غرض یوپی اور بہار کا سفر کیا۔ نتیجۃً میں اپنی رائے کو چھپانا نہیں چاہتا کہ ان دُور افتادہ مسلمانوں کو پاکستان کا نشہ اتنا چڑھا ہوا تھا کہ وہ اس کے لیے اپنے مستقبل سے غافل ہو گئے تھے انہیں آئندہ حادثات و سانحات کا قطعی احساس نہ تھا، وہ جذبات کے سفینہ میں بہ رہے تھے، انہیں قطعی احساس نہ تھا کہ وہ من حیث المجموع ہندوؤں کے چنگل میں ہیں، ان کے پاس تعلیم نہیں، روپیہ نہیں، زمین نہیں اور ان کے مکانوں سے پاکستان کا راستہ بہت دور اور بہت کٹھن ہے لیکن ہزار کی ہندو آبادی میں ایک مسلمان کے لیے بھی یہ نعرہ بہت پرکشش تھا کہ "جیسے لیا تھا ہندوستان ویسے ہی لیں گے پاکستان" یا "بولو بھیا ایک زبان ——— بن کے رہے گا پاکستان"۔

ان مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ لیگ ان کا جوابی حملہ اور پاکستان ان کی عافیت کا حصار ہے، ان علاقوں کے مسلمان عوام، بالخصوص مسلمان کسان اندوہناک غربت کا شکار تھے ان کی وضع قطع یکساں تھی، لباس بھی تقریباً ایک سا تھا، کوئی پہچان تھی تو ایک خاص قسم کی دوپلی تھی یا گھٹے پر سجدوں کی رگڑ ——— نیپال کی سرحد سے ذرا ادھر میں نے ایک مسلمان کسان کو روک کر "اسلام علیکم" کہا تو وہ رک گیا اور "وعلیکم اسلام" کہا۔

فرمایئے اس نے پوچھا،

"کہو بھائی طبیعت کیسی ہے؟"

وہ تاڑ گیا الیکشن کے شکاری ہیں،

"اللہ کا شکر ہے" اس نے جواب دیا

اللہ کا شکر ہے، ایک پاکیزہ کلمہ جو مراکش سے لے کر چین تک کا مسلمان زبان کے اختلاف لیکن معانی کی ہم آہنگی کے ساتھ بولتا ہے،

"ووٹ کسے دوگے" مَیں نے سوال کیا،
اس نے غور سے دیکھا اور لاٹھی بڑھا کر چل پڑا، مَیں نے پیچھے سے آواز دے کر
پوچھا:
"بھائی کچھ تو کہہ جاؤ"
"میاں! ہمارا ووٹ کلمہ کے ساتھ ہے"
"کلمہ کے ساتھ؟"
"جی ہاں"
"کلمہ سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"
"مسلم لیگ"

۲۴ سال ہوتے ہیں اُس کسان کی تصویر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے ان الفاظ کو تحریر کرتے وقت مَیں اس کو اپنے سامنے موجود پا رہا ہوں، مجھے کامل یقین ہے کہ وہ کسان پاکستان نہیں آیا ہوگا اور نہ وہ آسکتا تھا، یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ وہ زندہ ہے یا مارا گیا، لیکن جس یقین کے ساتھ اُس نے جواب دیا وہ میرے دل پر نقش ہے، اس کا یقین ان بے یقین تعلقداروں سے کہیں زیادہ مضبوط تھا جو اپنے مفادات اور تحفظات کے لیے اُسے استعمال کر رہے تھے۔

رفیع احمد قدوائی دو حلقوں سے اُمیدوار تھے، ایک یونیورسٹی کی نشست تھی، دوسری بہرائچ کا دیہاتی حلقہ، قدوائی یوپی میں کانگرس کے روح و رواں تھے، یوپی کا الیکشن ہمیشہ اُنہی کے سپرد رہا، لیکن خود کبھی اپنے حلقے میں نہ گئے، دو دفعہ یوپی میں وزیر رہے، آزادی کے بعد مرکز میں وزیر ہوگئے اور ہندوستان کی خوراک کا مسئلہ حل کیا ——— وہ ایک مثالی انسان تھے، اپنی تنخواہ تک غریبوں میں بانٹ دیتے، انہوں نے تقسیم کے بعد مسلمانوں کو بڑا سہارا دیا، ہندوستانی کابینہ میں ان کی آواز

بڑی مؤثر تھی، انتقال ہوگیا، مقروض نکلے، ان کی نعش ان کے گاؤں پہنچی تو پنڈت جواہر لال نہرو ان کا گھر دیکھ کر حیران رہ گئے، ایک دیہاتی مکان جس کی چھتیں تک نہیں لپی تھیں، پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کی اہلیہ پر زور دیا کہ حکومت مرمت کرا دیتی ہے لیکن اس عفیفہ نے انکار کر دیا کہ جو بات میاں خود اپنی زندگی میں نہیں کر سکے اب وہ کس کے لیے کرنا ہے۔

نانپارہ رفیع احمد قدوائی کے حلقۂ انتخاب میں تھا، نواب سعادت علی خاں اس تعلقہ کے واحد اجارہ دار اور راجہ نانپارہ کہلاتے تھے، ان کی "رعایا" کا غالب حصّہ ہندو کسانوں پر مشتمل تھا، بہرائچ سے نانپارہ تک کچی پکّی سڑکوں کا راستہ تھا لیکن نانپارہ کے حد آغاز سے راجہ کے محل تک پختہ سڑک تھی راجہ نے نانپارہ کے سرے پر برگد کا ایک کٹا ہوا درخت ڈلوا کر راستہ روک دیا تھا موٹر کے لیے اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس سفر میں مشہور شاعر شمیم کرہانی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان کے علاوہ نانپارہ سے پنجاب کے چند نوجوان جو آزاد ہند فوج میں رہے تھے، ہمارے ساتھ ہو گئے، انہی نے بتایا کہ راجہ نے موٹر روکنے کے لیے درخت کٹوایا اور پھنکوایا ہے، ہماری آمد کا اعلان ہوا تو راجہ بوکھلا گئے، رعایا کو حکم دیا ہے کوئی آدمی جلسہ میں نہ جائے، جو جائے گا اس کے جسم سے کھال ادھیڑ لی جائے گی۔

راجہ کا پُر شکوہ محل سامنے نظر آ رہا تھا، اس کی بلند بُرجیاں کسانوں کی جھونپڑیوں پر کھلکھلا رہی تھیں، ان کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا عجیب و غریب تھا، مثلاً راجہ صاحب شراب پیتے ہی نہیں اس میں نہاتے ہیں، محل کے اندر ایک تالاب بنا رکھا ہے جو شراب سے ہمیشہ پُر رہتا اور راجہ صاحب عموماً خوش جبینوں کے ساتھ اس میں تیرتے ہیں وہ ہر شام ـــــ گھوڑے پر سوار ہو کر ریاست کے بازار کا چکر لگاتے، دوسرے گھوڑے پر ان کی بیٹی سوار ہوتی اور رعایا سے سلام وصول کرتے تھے۔

ہم دیر تک کھڑے سوچتے رہے، اتنے آدمی نہ تھے کہ برگد کے اس بوڑھے درخت کو ہٹاتے، راجہ نے ایک اور تماشا کیا، اپنی رعایا کے کوئی چھ سات درجن لوگ بھجوا دیئے وہ ہمیں تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن ٹکڑ پر کھڑے ہو کر "راجہ نانپارہ کی جے" اور "مہاتما گاندھی مردہ باد" کے نعرے گونجانے لگے، ہم نے حوصلہ کیا، موٹر کو وہیں کھڑا رکھا اور ریاست کے واحد بازار میں چلے گئے، راجہ کے حواریوں نے روکنا چاہا لیکن ہم کہاں رکتے؟ لطف یہ تھا کہ وہ کانگرسی جو ہمارے ساتھ آئے تھے اور جنہیں معلوم تھا کہ انتخابات کے بعد انہی کی حکومت ہوگی وہ بھی ڈر رہے تھے۔ ایک پنجابی نوجوان نے میری ہدایت پر ڈھونڈی پیٹی کہ محل کے سامنے چوک میں جلسہ ہوگا، ایک آدھ جگہ سے اینٹیں آئیں، ہم نے واشگاف اعلان کیا کہ اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا، راجہ کو بھی کھری کھری سنائیں، آن واحد میں فضا یکسر بدل گئی، کسانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، نہایت زور کا جلسہ ہوا، راجہ رعایا کو مرعوب کرنے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل آیا، وہ غرور سے گزر رہا اور میں اس وقت کہہ رہا تھا۔

"ہم نے سب سے بڑی سلطنت کو ہندوستان سے نکل جانے پر مجبور کر دیا ہے، آزادی آچکی ہے، انقلاب آرہا ہے، اس انقلاب میں راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور تعلقہ داروں کی چمڑی سے کسانوں کے جوتے تیار کیے جائیں گے۔"

اس بے خوفی نے کسانوں کے حوصلے بلند کر دیئے، انہوں نے راج محل کے سامنے مظاہرہ کیا۔ یہ ریاست میں پہلا مظاہرہ تھا اور کسان ہمارے ساتھ گا رہے تھے —— راج محل میں آگ لگی ہے آگ۔

ہم وہاں سے نواب گنج گئے، جلسہ کیا، یہاں کسی نے مزاحمت نہ کی، نواب گنج قزلباش نوابوں کا تعلقہ تھا اور اس کا بڑا حصہ ذوالجناح کے نام پر وقف تھا۔

لوٹے تو معلوم ہوا راجہ صاحب نے جلسہ کیا اور فرمایا ہے کہ ہمیں خدا نے حکمراں بنایا ہے ہم خاندانی نواب ہیں اور نا فرمانوں کو ٹکٹکی پر بندھوا کر بید لگوانا جانتے ہیں، ——— تعزّمن تشاء وتذلّ من تشاء۔ عزت اللہ کی طرف سے ہے تو کنگال کیا کر سکتے ہیں جبکہ ان کے مقدر میں ذلت لکھی جا چکی ہے۔

تعلقہ داروں، نوابوں، مہاراجوں، جاگیرداروں، زمینداروں کا یہی گروہ تھا جو ہندوستانی مسلمانوں کی بربادی کا باعث ہوا، ان لوگوں نے پہلی غداری ۱۸۵۷ء میں کی ——— ان کا وجود عوام الناس کے لیے ناسور کا پھوڑا ہو گیا، مسلمانوں کو استعمال کیا، لیکن خوشحال نہ کیا، جب سفید فام آقا رخصت ہونے لگے اور ان کا رختِ سفر بندھ گیا تو انہیں عمر بھر کی کمائی یاد آگئی، طوائفوں کی جمعیتیں، جو ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں، سیر و سیاحت کے طائفے جو ان کا مشغلہ تھے، شاہد و شراب کی مجلسیں جو ان کی زندگی کا نقطۂ عروج تھا، اسراف و تبذیر کے ہنگامے، جن سے یہ خود زندہ تھے ——— اب یہ ٹھاٹھ ختم ہو رہے تھے اور جس کھونٹے پر ناچ رہے تھے وہ ٹوٹ رہا تھا، بنجارے نے اپنا سامان سمیٹ لیا تھا۔

لکھنؤ کا قیصر باغ ان خانزادگانِ کبیر کا مشترکہ دارالاقامت تھا جہاں لکھنؤ آکر دادِ عیش دیتے یا سیاست رچاتے تھے، جن لوگوں کے ہاتھ مسلمانوں کی فرقہ دارانہ سیاست تھی وہ قیصر باغ کے ان شہزادوں کی شطرنج کے مہرے تھے، ان لوگوں کا ان تعلقہ داروں سے وکالتی رشتہ تھا لیکن انہی کے اشاروں پر سیاست کے بہت سے ناٹک رچاتے جاتے، ان کی خیرات اور سخاوت صرف اپنے وجود کی بقا کے لیے تھی۔

کبھی ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کا تذکرہ لکھا گیا تو اس کا سرآغاز ان تعلقہ داروں سے ہوگا جنہوں نے مسلمانوں کو ہر طرح استعمال کیا لیکن ان کے مصائب میں ان سے دغا کر گئے ———

ہندوستان کی تقسیم کے فوراً بعد لکھنؤ میں مسلمانوں کی ایک کل جماعتی کانفرنس مولانا آزاد کے زیرِ صدارت ہوئی، اس کانفرنس میں راجہ نانپارہ نے بھی تقریر کی اس کا ریکارڈ دہلی ریڈیو سے نشر ہوا، راجہ صاحب نے فرمایا: ہم ہندوستانی مسلمان آج سوچتے ہیں: ع

جن کی تقدیر اُلٹ جاتی ہے کیا ہوتے ہیں

(۱۵) یوپی ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ اور اس کے قلب میں واقع ہے، تب ۴۸ اضلاع تھے، گویا وحدت مغربی پاکستان کے اضلاع سے بھی زیادہ مغلوں کے عہد سے یہی صوبہ علم و تہذیب کا مرکز رہا۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی دل و دماغ کی رعایت سے اس کا طوطی بولتا رہا، ہندوستان اور پاکستان کے سب سے بڑے لیڈر مہاتما گاندھی اور قائداعظمؒ گجرات کاٹھیاواڑ کے تھے لیکن بہترین سیاستدان اسی صوبہ نے پیدا کیے، زبان کو یہاں سے جلا ملی، ادب یہاں سے پروان چڑھا، تعلیم کو یہاں سے فروغ ہوا، غرض فہم و ذکا اور دین و نظر کے بہت سے سرچشمے اسی صوبے سے پھوٹے، نہرو خاندان اسی صوبہ کا تھا، علی برادران اسی صوبے کے تھے، دہلی کو اس کی آب و ہوا سے الگ نہیں کیا جا سکتا، دارالحکومت ہونے کی وجہ سے الگ رہا لیکن اس کا ضمیر و خمیر بھی اسی مٹی کا تھا،

اس سرزمین پر ہماری بہترین یادگاریں مثلاً تاج محل، لال قلعہ، قطب مینار، مٹیا محل، جامع شاہجہانی وغیرہ، ہمارے عہدِ حکومت کے سات آٹھ سو برس کی تاریخ کے آثار ہیں، انگریزی عہد میں بھی ہمارے نشو و نما، فکر و نظر، علم و تہذیب اور دین و سیاست کی یادگاریں اسی خاک پر استوار ہوئیں، علی گڑھ، دیوبند، ندوہ، جامعہ وغیرہ! اکثر دیہات و قصبات کے نام تک اسلامی تھے، مثلاً خداگنج، مصطفیٰ گنج، علی گنج وغیرہ، فی الجملہ مسلمانوں کے آثار، تاریخ کے اوراق کی طرح بکھرے پڑے تھے۔

قنوج ـــــ عطر کا شہر تھا اور قدیم ترین شہروں میں سے ایک، اس کی جامع مسجد کے متعلق روایت تھی کہ محل کے ایک حصّہ پر بنی ہوئی ہے اور اس میں جو فرش لگا ہے وہ اسی محل کے مندر کا ہے مجھے یہ سب کچھ ایک ہندو ایم-ایل اے دکھا رہا تھا اس نے مسجد کے فرش کی دو چار سلیں اُلٹ کر دکھائیں تو اس پر بُت ترشے ہوئے تھے، جن ہزار ڈیڑھ ہزار افراد نے یہاں میرا استقبال کیا وہ اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے، اسی ایم ایل اے نے بتایا کہ یہ سب ہندو ہیں ان میں کوئی ٹاواں ٹاواں مسلمان ہوگا، عام مسلمان ان کے جلسوں میں شرکت ہی نہیں کرتے، اب سوچتا ہوں کہ محل کی اس مسجد پر کیا گزری ہوگی؟ اور عطر کی خوشبو میں خون کی خوشبو کہاں تک رچی ہوگی؟ میرا دل لرز اُٹھتا ہے، اور میں سوچ کے دائرے بناتا بناتا قیادت کی آبادیوں سے ہوتا ہوا آتا سیاست کے ویرانے میں اُن مرتی قبروں کو گھورنے لگتا ہوں جن کے کتبے میرے تصوّر و تخیل کی جولان گاہ سے اپنی وفات کے قطعہ ہائے تاریخ لے کر صبحِ محشر کے انتظار میں سرنگوں ہو چکے ہیں۔

قنوج کی وجہ تسمیہ معلوم ہوئی کہ راجہ پرتھی راج کی سات بیٹیاں تھیں اور ساتوں کُبڑیاں تھیں، ان کے لیے راجہ نے یہاں محل بنوایا تھا ـــــ سنسکرت میں کنیا کے معنی بیٹی اور قبج کے معنی ہیں کبڑا، اس سے کنیا قبج بنا جو امتداد زمانہ سے قنوج ہو گیا[1]۔ یہ شہر ایک منہدم قلعہ پر آباد ہے اس کی خستگی و درماندگی پر صدیوں کا گرد و غبار چھایا ہوا تھا لیکن عطر کا یہ حال تھا کہ نالیوں سے بھی خوشبو اُڑ رہی تھی۔

(۱۶) نواب زادہ محمود علی کیلاش پوری، سہارنپور سے امیدوار تھے، ڈیرہ دون ان کے حلقہ میں تھا ہم وہاں پہنچے تو جن صاحب نے اپنا مہمان ٹھہرایا تھا وہ

---

[1] اس واقعہ کی تاریخ سے تائید نہیں ہوتی، قنوج کا راجہ پرتھوی راج نہیں جے چند تھا۔

اندر خانہ لیگ کے ساتھ تھے، کھانے میں ایسا زہر ملا دیا جس سے تمام رضا کار بے ہوش ہو گئے، میں ایک دوسرے دوست کے ہاں تھا، وہاں سے واپس آیا تو سبھی رضا کاروں کو بیہوش پایا۔ ایک دو کی حالت سخت خراب تھی، ڈاکٹر بلائے، اور ان کی حالت قابو میں آ گئی۔

(۱۷) بہرائچ میں سالار مسعود غازی کا مزار ہے، انہی کی نظرِ فقر کا نتیجہ تھا کہ اسلام قرب و جوار کے اضلاع میں پھیل گیا، سالار مسعود صاحبِ نظر بھی تھے اور صاحبِ سیف بھی، اِس علاقے کے تمام مسلمان اور بیشتر ہندو ان کے مزار پر آتے، مَیں بھی ایک دوست کے ہمراہ فاتحہ پڑھنے چلا گیا، مزار کے اندر چاروں طرف سیخوں میں عرضیاں لٹکی ہوئی تھیں مَیں نے مجاور سے پوچھا تو اس نے بتایا، حاجتمند لوگ آتے، کاغذ پر سوال لکھتے، تاریں پروتے اور سوا روپیہ صندوقچی میں ڈال کر چلے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کی مراد معیّنہ مدت کے اندر اندر پوری کر دیتے ہیں۔

مَیں مجاور کے جواب پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"بھئی یہاں زندہ پیر عرضیاں نہیں لیتے، یہ بزرگ تو سو رہے ہیں۔"

"جی! آپ آزمالیں"۔

مَیں نے مختلف عرضیوں کو دیکھنا اور ٹٹولنا شروع کیا، اکثر سوالات یکساں نوعیت کے تھے، مثلاً اولاد کی خواہش، امتحان میں کامیابی، مقدمہ سے نجات، شادی کی آرزو، محبوبہ سے ملاقات وغیرہ، مَیں نے سفید کاغذ لیا، قلم نکالا اور لکھا:

"السلام علیکم، آپ اہل اللہ میں سے ہیں، مَیں چاہتا ہوں اس ملک سے اواخر ۴۴ء تک انگریز نکل جائیں اور ملک آزاد ہو جائے، یہ میری دلی آرزو ہے۔"

دستخط: شورش کاشمیری

مَیں نے درخواست لکھ کر تاریں پردی، سوا روپیہ صندوقچی میں ڈالا فاتحہ پڑھی اور چلا آیا، ظاہر ہے کہ برِعظیم کی آزادی اس عرضی کا نتیجہ نہ تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ انگریز ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان چھوڑ گیا۔

احرار کا تجزیہ

سیاست میں ہار نا رسوائی ہے، اور جتنا فرماں روائی، احرار سیاسیات کے جس طوفان سے نکلے یا ان کی جدوجہد پر آخری زمانہ میں جو گزری وہ ایک تاریخی المیہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں برطانوی استعمار کے خلاف احرار سے بڑھ کر کسی مسلمان جماعت نے ذہنی آبیاری نہیں کی، تنہا احرار تھے جن سے یہاں کے مسلمانوں نے غیر ملکی غلامی کے خلاف جدوجہد کا ذوق حاصل کیا، پنجاب برطانوی سلطنت کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا، ہندوستان میں انگریزی حکومت کا انحصار زیادہ تر پنجاب کے سپاہی اور جاسوس پر رہا، سارے ہندوستان میں دو قومی مسئلہ تھا، یہاں تین قومی ہندو، سکھ اور مسلمان خود مسلمان کئی خانوں میں تقسیم تھے، اور ہر خانہ اپنی جگہ ایک دوسرے سے اُلجھا ہوا تھا، یہاں بڑے بڑے زمینداروں کو مسلمانوں میں طاقت و رسوخ حاصل تھا، اس کے علاوہ سرکاری اہلکاروں اور سب سے بڑھ کر اُن گدی نشینوں یعنی پیروں کا اثر تھا جن کا خانقاہی نظام ان کے ذہنوں پر عنبیدۂ چھا چکا تھا پنجاب کا خانقاہی نظام مسلمانوں کے ذہن میں اتنا رچ بچ گیا تھا کہ —— ع

مانند بتاں پجتے تھے کعبہ کے برہمن

پیر پرستی نے پنجابی مسلمانوں کی عقلوں کو اس طرح ماؤف کر دیا کہ وہ ایک عجیب الخلقت غلامی کا شکار ہو گئے، اسلام جہاں تھا رک گیا، یہاں کے مسلمان معاشی

اعتبار سے اتنے پسماندہ نہیں تھے جتنا روحانی اعتبار سے درماندہ ہو گئے، پیروں نے
ان کی عقلوں پر، زمینداروں نے ان کے جسموں پر اور افسروں نے ان کے رزق پر قبضہ
کر لیا تھا، پنجاب صدیوں فاتحوں کی گزرگاہ رہا، کم ماہتاب تھے جو اس کے اُفق پر چمکے،
سکھوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمانوں کی رہی سہی حمیت اور ٹوٹی پھوٹی ہمت مجروح
کر دی، ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے پنجاب کے گنے چنے خاندانوں سے اتنا
فائدہ اٹھایا کہ پورا صوبہ حکومت کا بازوئے شمشیر زن ہو گیا، پنجاب کے وفاداروں
نے سارے ہندوستان کی غلامی کو استحکام بخشا، حتیٰ کہ مسلمانوں کے اقتدار کی آخری
شمع گل کرنے میں جن مشرف بہ اسلام خاندانوں نے حصہ لیا وہی خاندان مسلمانوں کی تقدیر کے مالک
بن گئے، جس صوبے کے لوگوں نے سب سے پہلے اپنا ملک فتح کر کے دیا ہو پھر ہندوستان
سے باہر جا کر انگریزی استعمار کی خدمت کی ہو، پہلی جنگ عظیم میں فرانس کے میدانوں
میں برف کے ساتھ برف ہو گئے ہوں، خلافتِ عثمانیہ کا اپنے ہاتھوں خاتمہ کیا ہو، حتیٰ کہ
قسطنطنیہ کے میدانوں سے لے کر کعبہ کے صحن تک تاخت و تاراج کی ہو، پھر جن کے ہاتھوں
نہ تو امام حسینؑ کا روضہ بچا ہو اور نہ شیخ عبدالقادر جیلانی کا مزار اور جو ملک میں رہے ہوں
تو ملک کی ہر تحریک کو کچلا ہو جن کا دوسری جنگِ عظیم تک ایک ہی شعار رہا ہو کہ
برطانوی حکومت ان کا ملجا و ماویٰ ہے اور وفاداری بشرطِ استواری ان کا فرض و منشا،
اُن لوگوں میں آزادی کی خواہش پیدا کرنا پتھروں میں جونک لگانا تھا، وفاداری کی
اس بہتات کے باوجود انگریزوں نے پنجاب کو مسلمانوں کی حد تک گدیوں ہی میں تقسیم
نہیں کیا بلکہ دین کے اعتبار سے بھی ساقط کر ڈالا، وہ خدا سے ہٹ کر پیمبر کے بندے
اور پیمبر سے ٹوٹ کر پیروں کے غلام ہو گئے، اور پیر انگریزوں کے حلقہ بگوش الٰہی
پیروں نے (الا ماشاء اللہ) خلافتِ عثمانیہ کی تباہی کے بعد سر مائیکل اڈوائر کو
سپاسنامہ پیش کیا تھا کہ برطانیہ فضلِ خداوندی سے فاتح رہا، اور خلافتِ عثمانیہ فساد

فی الارض کے جرم میں پاش پاش ہوگئی اس سپاسنامہ کی مطبوعہ نقل راقم کے پاس بھی ہے۔

جہاد مسلمانوں کے لیے دورانِ خون تھا اور انگریز اس سے سخت پریشان تھے، پنجاب جیسے عسکری صوبہ میں جہاد کے تصوّر کا باقی رہنا انگریزوں کے لیے خطرہ کا موجب تھا، چنانچہ سیالکوٹ کچہری کے ایک عرائض نویس میرزا غلام احمد کی آبیاری کی گئی وہ پہلے مناظر اسلام کی حیثیت سے سامنے آیا اور فساد کا بیج بوتا رہا، پھر مجدد بنا، آخر میں نبی بن بیٹھا، اس کے چالاک و عیّار فرزند میرزا بشیر الدین محمود احمد نے خلافت کی آڑ میں باپ کی نبوّت، انگریزوں کی وفاداری اور جہاد کی تنسیخ کو اور بھی پختہ کیا، بلکہ دنیائے اسلام سے ہر نوعی تعلق ختم کرنے کے لیے اپنے سے باہر تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا، یہاں تک کہ انہیں ذُرّیّۃُ البغایا (فاحشہ عورتوں کی اولاد) کہا، پہلی جنگِ عظیم میں بغداد و سمرنا کے سقوط پر چراغاں کیا القصہ میرزا بشیر الدین محمود نے مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں وہی کردار ادا کیا جو لارڈ لارنس نے عربوں کی سیاسی زندگی کو تہس نہس کرنے میں سرانجام دیا تھا۔

پنجاب میں سیاسی زندگی کی تاریخ بڑی پیچیدہ ہے، ایک ہشت پہلو تاریخ کے حقیقی صفحات ابھی تک صیغۂ راز میں ہیں، اور اس کی وجہ بڑی حد تک یہی ہے کہ وہی لوگ اقتدار میں ہیں جن کا ماضی شرمندہ ہے، اور جو برطانوی حکومت کے تیسے پیدا ہوئے، یا جنہیں برطانوی حکومت نے پیدا کیا تھا، سندھ اسلام کی ابتدائی گذرگاہ تھا لیکن اسلام یہاں بھی کوئی طاقت نہ بن سکا، پہلے بھی عاجز تھا آج بھی عاجز ہے، سیاسی زندگی آج تک ابتر چلی آرہی ہے، بلوچستان ہمیشہ کی طرح قرونِ مُظلمہ میں زندگی بسر کر رہا ہے اس نے قبائلی عصبیتوں کے آنگن میں انگڑائی لی ہے، سرحد کو سرخپوشوں نے طویل جد وجہد کے بعد سرزمینِ بے آئین سے باآئین بنایا، لیکن اس کی عوامی روح سیاسی شعور کی تب و تاب کے باوجود کچلی جا چکی ہے، انگریزوں کے عہد میں سرحد

کا وجود پہلا مدافعتی پڑاؤ تھا یا پھر قبائلی علاقے کو انگریزوں نے اپنی جنگی مشقوں کے لیے چن رکھا تھا، یہیں سے برطانوی ہندوستان کی حفاظت کی جاتی، پھر ان متصل صوبوں میں زبان و مزاج کے اختلاف تھے مسلمان سب تھے لیکن اسلام شاذ ہی تھا، اس گرد و نواح اور مزاج و سیرت کے پنجاب میں کسی استعمار دشمن تنظیم، تحریک اور افراد کا پیدا ہونا بلاشبہ ایک معجزہ تھا، اس فضا میں احرار قدرت کا عطیہ تھے، لیکن ان کو زندگی بھر کی جد و جہد کے بعد جو کچھ ملا اور وہ جس طرح سیاسیات کے میدان میں شکست کھا گئے ایک المیہ ہے، اس المیہ کا جائزہ لینا اور تجزیہ کرنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی، آسان اس لیے کہ عصری حالات زخمی ہونے کے باوجود محفوظ ہیں اور مشکل اس لیے کہ فضا ناسازگار ہے اور تاریخ اُن لوگوں کے تصرّف میں ہے جن کا اپنا وجود الف لیلیٰ کی ایک کہانی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی آزادی کا علم لیگ کے ہاتھ میں آگیا اور وہ ایک آزاد مملکت دلوانے میں کامیاب ہو گئی، لیکن آزادی قمار خانہ کا روائتی داؤں نہیں جیمخانہ کا جام نہیں، ترُپ کی بازی نہیں، گھڑ دوڑ کی شرط نہیں، شطرنج کا مہرہ نہیں آزادی کا حصول کسی تحریک کا تسلسل ہے اور یہ تسلسل ایک طویل تگ و دو سے قائم ہوتا ہے تب آزادی ہاتھ آتی ہے، آزادی پہلے ذہنی انقلاب چاہتی، پھر جسمانی انقلاب کا رستہ کھلتا اور لوگ منزل تک پہنچتے ہیں۔ انگریزوں نے جس بُری طرح ہندوستان کو جکڑا اور جس خون خرابے کے بعد یہاں قبضہ کیا وہ شکنجہ کوئی اس طرح ڈھیلا نہیں ہوا کہ یکایک ایک آواز اُٹھی اور انگریزوں نے بندھن توڑ دیئے، آزادی کی لہر نوے برس تک پرورش پاتی رہی، ۱۸۵۷ء میں ایک زمین بنجر ہو گئی تھی۔ علمائے حق نے اپنے لہو سے اس کو سیراب کیا، تحریک لاتعاون کی ۱۹۲۱ء میں بجائی کی گئی، ۱۹۳۱ء میں اِس کھیت نے سرسبز ہونا شروع کیا، ۱۹۳۷ء میں اس کی ایک فصل کاٹی گئی، ۱۹۳۹ء میں چھاجوں مینہ برسا، ۱۹۴۰ء میں پاکستان کا تصور کھلا، ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک

اٹھی جس نے برِعظیم کو ہلا ڈالا، ۱۹۴۵ء میں فصل تیار ہو گئی، کسان سے لے کر مہاجن تک سب جمع ہو گئے، آخر اگست ۱۹۴۷ء میں کھیت تقسیم ہو گیا فصل بونا فصل اٹھانا فصل کاٹنا فصل بیچنا اور فصل کھانا ہمیشہ ہی مختلف ہاتھوں میں رہا ہے، ہر موڑ ایک نئی منزل پر ختم ہوتا اور ہر مرحلہ ایک نئی ملکیت کو جنم دیتا ہے، جن لوگوں نے آزادی کو پسینہ اور لہو دیا تھا وہ صبح طلوع ہوتے ہی ستاروں کے ساتھ ڈوب گئے، اور جن کا پیشہ شعار اندھیروں کی نگہداشت رہا۔ وہ صبح کے وارث ہو گئے، گویا یہ سب کچھ انہی کا تھا، پاکستان میں یہ کہنا مشکل ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی آزادی میں مسلم لیگ کے علاوہ کسی اور کا بھی حصہ ہے اور اس کو تاریخی حقائق سے الگ نہیں کیا جا سکتا، تاہم حقیقت یہی ہے کہ اس برِعظیم کو جو آزادی ملی، ہندوستان آزاد ہوا یا پاکستان بنا اس میں اوّلاً ہندوستان کی تمام قوموں کی اجتماعی جدوجہد شامل ہے، ثانیاً ان جانبازوں کی شجاعت اور قربانی کو دخل ہے، جنہوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اس معرکہ کو سر کیا اور خود فنا ہو گئے، ثالثاً، ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے اسلامی ہندوستان کی وہ تحریکیں ہیں جو مختلف عنوانوں سے سرفروشی کا سفر طے کرتی رہی ہیں، جن میں ابتداءً علمائے حق کا ولولہ جہاد تھا، تحریکِ خلافت کے مجاہدانہ تطائر تھے، جمعیتہ العلماءِ ہند کے اکابر کا ایثار تھا، احرار کی بے جگری تھی، خاکساروں کا معرکہ رستاخیز تھا، سرخپوشوں کا خون گرم تھا اور حُرّوں کے خون کی ارزانی تھی ــــــ لیکن اس سے یہ بات کم نہیں ہوتی کہ پاکستان قائدِاعظم کی استقامت اور مسلم لیگ کی سیادت کے سانچے میں ڈھلا اور بنا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کی شخصی کمزوریوں سے قطع نظر، اور کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں؟ ان کا "زمیندار" پنجاب میں برطانوی استعمار کی بنیادوں کے خلاف پہلا کلمۂ رستاخیز تھا، سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے آخری دنوں دہلی دروازہ لاہور کے ایک جلسۂ عام میں مولانا ظفر علی خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا تھا ــــ ظفر علی خاں تیرے ستارۂ صبح نے میرے

جگر میں آگ لگا دی تھی اور یہ تب کیا تھا جب پاکستان میں تحریکِ ختمِ نبوت کا آغاز ہو رہا تھا، مولانا عمر کی آخری سرحد پر کھڑے تھے۔ اور دنیا کو معلوم تھا کہ شہید گنج کی تلخیاں جانبین کے تعلقات کو منقطع کر چکی ہیں۔

احرار بلاشبہ علماء کے ذہن، خلافت کی تحریک، الہلال کی فکر اور زمیندار کے قلم کی پیداوار تھے لیکن ان کا انفرادی اور اجتماعی وجود پنجاب کے سیاسی گورستان میں صورِ اسرافیل تھا، ان کی خطابت کا سحر ایک نیا پنجاب پیدا کر رہا تھا، یہ پنجاب پیدا ہُوا لیکن اس پنجاب ہی نے احرار کو پسپا کر دیا اور یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اِس پسپائی و رسوائی میں احرار کی اپنی سیاسی غلطیوں کا ہاتھ بھی شریک تھا۔

احرار تحریکِ خلافت (۱۹۲۱ء) میں اُٹھے اور ۱۹۳۰ء تک کانگرس کے ساتھ رہے، مسلمانوں کے ادنیٰ متوسط طبقے کا ایک گروہ تھا جس کا ذہن سیاسی و اسلامی تھا، یہ ایک ملغوبہ تھا جس میں انگریز دشمنی، اسلام دوستی، حب الوطنی، سرمایہ سے بیزاری، رجعت سے عناد، ایثار سے محبت، ظلم پر احتجاج، انقلاب کی خواہش اور جہاد کا ولولہ جمع ہو گئے تھے، کانگرس کا بورژوائی ذہن، ہندو معاشرے کی عصبیتیں تلخ سیاسی تجربے، اپنی انفرادیت کا احساس اور مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کا تصور احرار کی تشکیل کا باعث بنا، لیکن کانگرس سے قطع تعلق کے باوجود آخر تک قطع ذہن نہ ہو سکا ذہن ان کا وہی تھا جو کانگرس کا تھا، یعنی غیر ملکی استبداد کا خاتمہ، زبان ان کی اسلامی تھی اور وہ محض وطنیت یا محض قومیت کی بنیاد پر ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کے نزدیک انگریزی حکومت کو تہس نہس کر دینا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ نصاریٰ کی حکومت تھی اور نصاریٰ قرآن کی رو سے مغضوب تھے، ان سے اسلام کو لگاتار نقصان پہنچ رہا تھا، تمام دنیائے اسلام پر ان کی گرفت تھی، قرآن و سنت کی تعلیمات کو ان سے صدمات پہنچ چکے اور پہنچ رہے تھے، ظاہر ہے کہ

ہندوستان سے برطانوی حکومت کے محو ہو جانے پر افریشیائی ملکوں کی آزادی کا انحصار تھا۔

شاہ جی کی روایت یہ تھی کہ ۱۹۲۹ء میں مولانا ابُوالکلام آزاد نے انہیں مجلسِ احرار قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کہتے تھے احرار کا قیام اس مشورے سے قطعی مختلف بنیادوں پر ہُوا تھا اور آئندہ جو اقدامات بھی کیے گئے ان میں مولانا کا مشورہ نہیں تھا بلکہ مولانا آزاد انہیں ملکی و قومی مصلحتوں کے منافی سمجھتے تھے، احرار ہر حالت میں جمعیتہ العلماء کے اکابر مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا احمد سعید دہلوی کا احترام کرتے، انہیں مولانا ابُوالکلام آزاد سے بھی بے پناہ عقیدت تھی، اور گاندھی و نہرو کا نام بھی عزت سے لیتے تھے اُن کا ہدف عموماً دو طرح کے لوگ تھے۔

اوّلاً: انگریز اور ان کے کاسہ لیس، ثانیاً اسلام میں عمرو عیّار قسم کے لوگ تجزیتہً یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ:

(۱) احرار جان گنتھر کے الفاظ میں ایشیا کی پہلی مسلمان سوشلسٹ تحریک تھے، ممکن ہے بعض طبقوں کو اس اصطلاح پر اعتراض ہو اور اب تو یہ اصطلاح تجزیتہً خطرناک ثابت ہو چکی ہے لیکن احرار واقعی ایک ایسی تحریک تھے جو عقیدہ و رسالت پر اعتقاد کے ساتھ معاشی مساوات کو عینِ اسلام سمجھتے اور جن کا عقیدہ تھا کہ اسلام کی مظلومیت تب سے شروع ہوتی ہے جب سے خلافتِ راشدہ کا نظام درہم برہم کر کے جانشینی کا نظام پیدا کیا گیا جس نے عصری ملوکیّت کو جنم دیا جب تک سرمایہ داری نظام زندہ ہے تب تک اسلام کی نشأۃ ثانیہ ناممکن ہے۔

(۲) مسلمانوں کا طبقۂ اُمراء، اپنی افتادِ طبیعت کے باعث فقراء کے اس گروہ سے خائف تھا، اس کا کام ان کی غریبی کا مذاق اڑانا ان پر الزام لگانا، اور ان کے

خلاف بہتان تراشنا تھا، احرار کا کام اس طبقۂ ضالّہ کے خلاف مسلمانوں میں نفرت پیدا کرنا، ان پر پھبتیاں کسنا اور ان کی بنیادیں ہلانا تھا، چونکہ اُمراء خود غیر ملکی استبداد کے حاشیہ بردار تھے لہٰذا ان کے نزدیک استعمار دشمنی کا مطلب تھا ہندو دوستی اور وہ احرار کے خلاف ہندو ایجنٹ ہونے کا طعن دھرنے میں کوئی خوف محسوس نہ کرتے تھے۔

(۳) کانگرس کے رہنماؤں سے احرار کا میل جول تھا لیکن وہ انہیں پسند نہیں کرتے تھے، ہائی کمانڈ ان سے طبیعتًہ ناخوش تھا، اس کا خیال تھا کہ احرار نے ۱۹۳۱ء میں کانگرس سے علیحدہ ہو کر کانگرس کو مسلمانوں میں کمزور کیا، مذہبی ذہن کی آبیاری کی اس آبیاری ہی سے پاکستان کا پودا اکھوا ـــــ اس ضمن میں چند واقعات بھی تھے مثلاً:

(۱) مجلس احرار کی بنیاد رکھتے وقت مخلوط انتخاب کی بہ نسبت جداگانہ انتخاب کی حمایت کی گئی جس سے کانگرس کے قوم پرور حلقے ناراض ہو گئے۔

(۲) تحریک کشمیر گاندھی جی کے نزدیک جیسا کہ انہوں نے اعلان کیا ایک فرقہ وارانہ تحریک تھی، بعض کانگرسی رہنما احرار پر کھلم کھلا الزام لگاتے کہ دفاعی انتظامات کے لیے چونکہ گلگت کا علاقہ انگریز لینا چاہتے تھے لہٰذا ان کے گماشتوں کی معرفت یہ تحریک اٹھائی گئی، اس پر چودھری افضل حق مرحوم نے تاریخ احرار میں لکھا کہ ان لوگوں کو شاید یاد نہیں رہا کہ ریاست کشمیر بھی برطانوی حکومت ہی کا حصّہ ہے اور وہاں دوہری غلامی ہے۔

(۳) احرار کی تبلیغی سرگرمیاں، شرک و بدعت سے اجتناب کی دعوت اور قادیانی امّت کی زبردست مزاحمت ایسی چیزیں تھیں کہ ان کا مزاج وہ نہاد کانگرس کی غایت و منشا کے خلاف تھا۔ ۱۹۳۶ء میں میرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت پر لاہور ریلوے اسٹیشن پر قادیانیوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کا استقبال کیا اور سپاسنامہ پیش کیا۔ گویہ استقبال انتقاماً تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے قادیانی مسئلہ پر علّامہ

اقبال سے اختلاف کیا تھا لیکن اس کے پس منظر میں یہ لاگ بھی تھی کہ احرار کانگرس سے کٹے ہوئے تھے۔

(۴) احرار نے ۱۹۴۷ء میں اپنا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں کیا تو کانگرس کے جنرل سکرٹری اچاریہ کرپلانی کو دعوت نامہ بھیجا۔ لیکن کرپلانی نے شامل ہونے سے انکار کر دیا اور لکھا کہ آپ کی جماعت ایک فرقہ وارانہ تنظیم ہے، بہتر یہی ہے کہ احرار کو توڑ کر کانگرس میں شامل ہو جایئے۔

(۵) اِن اچاریہ کرپلانی نے احرار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا — احرار سیاسی قومیت کی چراگاہ میں مذہبی اونٹ ہیں۔

(۶) مولانا حبیب الرحمٰن اور شیخ حسام الدین سے کرپلانی نے عندالملاقات کہا کہ لیگ سے ہماری لڑائی محض سیاسی حقوق اور ان کے تعین و تقسیم کی لڑائی ہے جس کا بہر حال کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا لیکن جمعیتہ العلماء اور مجلس احرار کی ہمنوائی ہمارے لیے سخت خطرناک ہو گی، وہ لوگ زندگی کے ہر پہلو میں ہم سے مختلف ہیں ان کے لباس ان کے عمل، ان کی زبان ان کی نظر غرض ہر چیز میں پاکستان موجود ہے ان سے مصالحت کرنے کی بجائے مسلم لیگ سے مفاہمت کریں تو کہیں بہتر ہو گا۔

(۷) یہ صحیح ہے کہ احرار اور کانگرس میں کھل کے لڑائی نہ ہوئی لیکن اس کا باعث دونوں کے مراتب کا فرق اور دونوں کی طاقت کا فاصلہ تھا، کانگرس بہر حال ملک کی سب سے بڑی جماعت تھی اور اس کا مقابلہ حکومت یا لیگ سے تھا۔ احرار سے نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں میں اختلاف نہ تھا، اختلاف تھا اور ضرور تھا۔ ایک دفعہ احرار رہنماؤں میں سے ایک نے گاندھی جی سے کہا، مسلمانوں کے حقوق سے متعلق آپ ہم سے بات کریں، گاندھی جی مسکرائے اور کہا:

"نالی بجانے والا مسلمان آپ کے ساتھ اور ووٹ دینے والا مسلمان

جناح کے ساتھ ہے۔"

(۸) احرار نے دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں کانگرس سے بہت پہلے حکومت سے ٹکر لی لیکن گاندھی جی نے صاد نہ کیا۔ احرار پر سخت سے سخت مظالم کیے گئے گاندھی جی نے دو حرفی بیان تک نہ دیا، جواہر لال ایک دفعہ بیان دے کر چپ ہو گئے، صوبہ سرحد کے مہاسبھائی لیڈر رائے بہادر مہر چند کھنہ کے استفسار پر گاندھی جی نے "ہری جن" میں لکھا اور ان کا یہ جواب تمام ملک میں نشر ہوا کہ احرار کلہاڑی رکھتے ہیں اور کلہاڑی تشدد کا نشان ہے جو کسی بھی ستیہ گرہی کی نشانی نہیں ہو سکتا۔

(۹) گاندھی جی کے انفرادی ستیہ گرہ کا زمانہ تھا، انہی دنوں گوجرانوالہ میں ایک احراری نوجوان پکڑا گیا۔ مجسٹریٹ نے اس کو سزا دیتے ہوئے لکھا کہ "احرار چونکہ ستیہ گرہی نہیں ہیں لہذا انہیں سیاسی قیدی قرار نہیں دیا جا سکتا، ان کے ساتھ اخلاقی قیدیوں کا سلوک ہونا چاہیے" اس کے خلاف کوئی کانگرسی رہنما نہیں بولا اور نہ کسی نے احتجاج کیا۔

(۱۰) شہید گنج کے قضیہ میں احرار نے جو رائے اور رویہ اختیار کیا، سکندر حیات نے آخر کار عملاً وہی رویہ اور رائے اختیار کی لیکن احرار پر سب و شتم کی بوچھاڑ ہوتی رہی، حتیٰ کہ وہ اس کے ملبہ میں دب گئے، کسی نے ان کے رویہ اور رائے کو سراہا نہیں، سکندر حیات نے ملک برکت علی کی قرارداد پر اسی رائے اور رویہ کا اظہار کیا تو مولانا ابوالکلام آزاد نے بحیثیت صدر کانگرس انہیں مبارک باد دی اور ان کی رائے کو دانشمندانہ قرار دیا، لیگ کا رجحان بھی عملاً یہی تھا۔

(۱۱) سرحد میں احرار کا سالانہ اجلاس ہوا تو خان بھائیوں نے جماعتی طور پر مقاطعہ کیا، کوئی سرخپوش ان کے استقبال کو موجود نہ تھا، اور نہ کوئی اجلاس میں شریک ہوا۔

(۱۲) سرحد اور پنجاب کی کانگرس کمیٹیوں اور زعمائے احرار میں کٹا چھنی رہتی، آخری انتخابات میں بھی احرار نے کانگرس کے امیدواروں یا کانگرس نے اُن کے امیدواروں کا مقابلہ کیا۔

(۱۳) مولانا مظہر علی اظہر ملک خضر حیات کی تحریک پر وزارت میں لیے جا رہے تھے لیکن مولانا ابُوالکلام آزاد نے صاد کرنے سے انکار کر دیا اور وہ رہ گئے۔

(۱۴) لکھنؤ میں مدح صحابہ کی تحریک عملاً کانگرسی وزارت کے خلاف تھی، تحریک کے سرخیل احرار تھے، کانگرس ہائی کمانڈ کو اس کا شدید احساس تھا۔

(۱۵) وزارتی مشن کے دنوں میں احرار اور جمعیتہ العلماء نے مل کر ہندو مسلم تصفیہ کے لیے ایک فارمولا تیار کیا جو وزارتی مشن کے علاوہ گاندھی جی کو بھی پیش کیا اس فارمولا کا نام مدنی فارمولا تھا، کانگرس نے کوئی جواب نہ دیا، جب مولانا حفظ الرحمٰن اور شیخ حسام الدین نے ورکنگ کمیٹی سے استفسار کیا تو گاندھی جی نے انہیں بلا کر نہ صرف فارمولا مسترد کر دیا بلکہ فرمایا کہ اس سے پاکستان بہتر ہے آپ لوگ لیگ میں شامل ہو جائیں تو زیادہ اچھا ہے۔

احرار کا لُبّ لباب یہ تھا کہ

(۱) ان کے پاس اسٹیج تھا پریس نہیں تھا، زبان تھی قلم نہیں تھا، وہ ان اسباب و وسائل سے محروم تھے جن پر اس زمانہ کی سیاسی تنظیموں اور قومی قیادتوں کے عروج و اقبال یا نتائج و آثار کا انحصار تھا۔

(۲) زمانہ کی کھکھیڑیں اٹھا کر وہ ایک قبیلہ ہو گئے تھے، ان میں قومی سیاست سے کہیں زیادہ باہمی رفاقت کا احساس کارفرما تھا۔

(۳) دنیا کو اتنا اصولوں نے نہیں ہلایا جتنا شخصیتوں نے ہلایا ہے، چودھری افضل حق واحد شخصیت تھے جنہیں احرار کا شہ دماغ کہا جاتا اور جو مختلف حلقوں کی

سیاسی چالوں سے کما حقہ واقف تھے، وہ پنجاب کے عملی پالٹیکس میں واحد شخصیت تھے جنہوں نے مسلمانوں کے اجتماعی زوال پہ دلسوزی کے ساتھ سالہا سال غور کیا، اور اس کے اسباب و علل تلاش کیے، وہ سیاستدان بھی تھے اور مدبر بھی، لیکن اِن سے بڑھ کر وہ ایک مفکّر تھے، اس عہد کے پنجابی رہنماؤں کی مسلمان جماعت میں پہلے شخص تھے جنہوں نے سرمایہ داری کو اسلام کے زوال کی جڑ قرار دیا، ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک سرمایہ داری کی مضرتیں ختم نہیں ہونگی اس وقت تک مسلمان ریاستوں میں اسلام کی تجدید و احیاء ناممکن ہے وہ ایک غیر متزلزل مسلمان "سوشلسٹ" تھے، اور احرار کو اسی نہج پہ لارہے تھے لیکن اُن کی قبل از وقت موت سے قصر احرار میں ایسے شگاف پڑ گئے کہ ان سے دل کی سچائیوں کے باوجود دماغ کی غلطیاں ہوتی گئیں، چودھری صاحب احرار کے لیے تین چیزیں چھوڑ گئے تھے، افسوس کہ پسماندگان احرار نے ان پر عمل نہ کیا۔

اوّلاً، پاکستان کی مخالفت کر کے شہید گنج کی غلطی کا اعادہ نہ کرنا، پاکستان دکھی دلوں کی فریاد ہے۔

ثانیاً۔ اُمراء سے ہر حال میں دامن بچانا، ان سے زیادہ کسی جماعت یا فرد کے ہاتھوں اسلام کی رُوح مجروح نہیں ہوئی ہے۔

ثالثاً، اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور مسلمان ریاستوں کے اقبال کا انحصار، معاشی انصاف اور خدا کے خوف پر ہے جب تک استحصال کا استیصال نہ ہوگا۔ ہم ایک مثالی ریاست اور اسلامی معاشرہ پیدا نہیں کر سکتے۔

مظہر علی جو اُن کی موت کے بعد قائد احرار ہو گئے، انہوں نے نہ تو اس ترکہ کو سنبھال کے رکھا اور نہ اِس پیغام ہی کو بڑھا سکے، نتیجۃً احرار کا زور ٹوٹ گیا، اور وہ پسپا ہو گئے۔

(۴)، احرار لیگ سے اس لیے متنفر تھے کہ اس کے رہنماؤں کا ذہن طبقاتی تھا،

ان میں جرأت و ایثار اور قربانی و استقامت کا فقدان تھا اس میں شک نہیں کہ لیگ میں کاسہ لیس اور رجعت پسند اکٹھے ہو گئے تھے لیکن اس کا جواب قائداعظم خود ایک دفعہ مظہر علی کو دے چکے تھے، میاں عبدالباری کے واسطے سے ملاقات ہوئی مظہر علی نے قائداعظم سے کہا:

"آپ کھوٹے سکّے لے کر سیاست کے سفر کو نکلے ہیں۔"

قائداعظم نے جواب دیا:

"مظہر علی اچھے سکّے دشمن کی جیب میں ہوں تو کھوٹے سکے بھی کام آجاتے ہیں۔"

احرار لیگ سے اس لیے بھی کشیدہ خاطر تھے کہ اکثر لیگی رہنما کسی سیاسی کردار کے مالک نہیں تھے بلکہ مزاجاً انگریز پرست تھے احرار یہ سوچتے ہی نہیں تھے کہ جو کچھ مسلم لیگ کہتی ہے اس کا مسلمان قوم کے ضمیر سے کتنا گہرا تعلق ہے؟ اور ان رجعت پسندوں کی زبان عام مسلمانوں کے سیاسی شعور سے کتنی قریب ہے؟

جو کچھ لیگ کہتی وہ محض رجعت پسندی کی آواز نہ تھی بلکہ مسلمانوں کے تجربات سے پیدا شدہ خدشات کا ایک حل تھا احرار نے خطابت کے زور پر سیاست کا مقابلہ کرنا چاہا، نتیجۃً پچھڑ گئے بلکہ مسلمانوں ہی سے بچھڑ گئے، خطابت ہار گئی، سیاست جیت گئی، مظہر علی نے مختلف وجوہ کی بنا پر حکومتِ الٰہیہ کا نصب العین وضع کیا لیکن یہ کانگرس سے فرار اور لیگ سے گریز تھا مسلمان یہ سوال کرنے میں حق بجانب تھے کہ اسلامی مملکت کے بغیر حکومتِ الٰہیہ کہاں قائم ہوگی، ہر شے اپنی تیاری کے لیے ایک سانچا چاہتی اور کوئی تجربہ معمل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، حکومت الٰہیہ قائم کرنی ہے تو پاکستان ہی میں ہوگی، ہندوستان میں نہیں پہلے خطہ حاصل کرو پھر حکومت کی بحث کرنا کہ اس قلعہ کی تعمیر و اساس اور رنگ و روغن کیا ہو ــــــ حکومتِ الٰہیہ کا مطالبہ پاکستان کے بغیر اس طرح ہے جس طرح کوئی شخص ڈور کے بغیر پتنگ اڑانا چاہے۔

(۵) جماعت آل انڈیا کہلانے کے باوجود آل انڈیا نہ تھی اس کے زعماء شہرت کی وسعت کے باوجود پنجاب، یا پھر سرحد و سندھ کے بعض اضلاع تک مقبول و معروف تھے، ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ احرار کا دائرہ کار مغربی پاکستان کے ایک تہائی حصہ تک محدود تھا ان کے رسوخ و اثر کی حدیں شہروں یا قصبوں میں پھیلی ہوئی تھیں لیکن صوبے کے دیہات سے ان کا واسطہ بہت کم تھا۔ پنجاب کے شہروں میں لدھیانہ، جالندھر، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، لائل پور، منٹگمری، ملتان، مظفرگڑھ، کسی حد تک میانوالی، کیمبل پور یا پھر سرگودھا، جھنگ اور گجرات میں ان کا نام اور کام تھا۔ سرحد میں رسوخ تھا لیکن سیاسی نہیں مذہبی، ان کے علاوہ دہلی میں بھی احرار کا دفتر تھا، یوپی کے بعض شہروں میں بھی جماعت کی شاخیں تھیں۔ صوبائی دفتر سہارنپور میں تھا، مرادآباد میں رضاکاروں کا ایک مضبوط نظام تھا، بنگال میں سیّد بدرالدجیٰ احرار میں شامل ہو گئے، بمبئی میں حافظ علی بہادر کرتا دھرتا تھے لیکن عملاً احرار پنجاب ہی کے نامور خطیبوں اور آتش بجاں کارکنوں کی ایک استعمار دشمن تنظیم کا نام تھا۔ سرحد سے جو دو چار بزرگ احرار میں شامل تھے اس کی وجہ غالباً خان بھائیوں سے ان کا اختلاف تھا، یا شاید اس لیے کہ سرخپوش خالص سیاسی تنظیم تھے اور ان بزرگوں کا مزاج دین و سیاست سے مرکب تھا۔

(۶) احرار من حیث المجموع ایک ایسی جماعت تھے جن میں ایثار زیادہ تھا علم کم، جذبہ زیادہ تھا سوچ کم، تقریر زیادہ تھی تنظیم کم، وہ سیاسی مخلصین کا ایک ایسا گروہ تھا جو اپنی جدوجہد میں ہر خوف سے بے نیاز تھا اور نتیجہ کے لیے مضطرب نہیں ہوتا۔

(۷) ان میں ایسی کوئی مرکزی شخصیت نہ تھی جس سے تمام ہندوستان کے مسلمان متاثر ہوں، وہ ان بادلوں کی طرح تھے جو صحراؤں پر برستے ہوئے نکل جاتے ہیں سیّد

عطاء اللہ شاہ بخاری احرار کی زبان تھے، عام احرار انہی سے متاثر تھے، لیکن امیر شریعت کہلانے کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی کی طرح شیخ الاسلام نہ تھے کہ ملک کے طول و عرض میں ان کے شاگرد علماء ہوتے، ذہناً اتنے متبحر نہ تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح بغیر عوام اپنا مقام پیدا کر لیتے، خان عبدالغفار خاں کی طرح منتظم نہ تھے کہ سرخ پوش تنظیم پیدا کرتے، قائداعظم نہ تھے کہ قوم انہی کی ہو کے رہ جاتی گاندھی و نہرو کی طرح پنپنے کا سوال ہی نہ تھا، عمر بھر خطابت کا سحر پھونکا لیکن خود نزع کی ہچکی ہو کر ختم ہو گئے۔

ان احوال و آثار کے باوجود احرار نے اعمال و افکار کی ایک ایسی ترنگ اور امنگ پیدا کی جس نے پنجاب کی شہری زندگی کو ایک نیا ذوق عطا کیا اور وہ صوبہ جو محض انگریزوں کا خوشہ چین ہو کر رہ گیا تھا ان کے استعمار کا نکتہ چین ہو گیا، تاریخ احرار کے شریفانہ تذکرہ سے خالی ہے لیکن زیادہ دیر خالی نہیں رہ سکتی کہ

(۱) احرار نے پنجاب کی استعماری روایت کے برعکس ایک ایسی روایت پیدا کی جس کا مقصد غیر ملکی غلامی کے خلاف جد و جہد کی روح پیدا کرنا تھا۔ اور وہ روح ایک محدود جماعت ہی میں سہی لیکن پیدا ہو گئی۔

(۲) احرار نے مسلمانوں میں آزادی کی لگن عام کی جس سے مسلمان نوجوانوں میں ایک فعّال عنصر پیدا ہو گیا جس نے خطابت و سیاست کے میدانوں میں نام پیدا کیا اور تحریک آزادی میں اپنا فرض ادا کیا۔

(۳) ہندوستان کی تمام قوموں میں احرار کے آتش بجانوں اور شعلہ بیانوں نے ایک نئی روح پھونکی، حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان نے احرار سے بڑے خطیب پیدا نہیں کیے، اردو شاعری میں جو مقام علامہ اقبال کو حاصل ہے اردو خطابت میں وہی مقام سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو حاصل رہا، مولانا حبیب الرحمٰن خطابت کے میر درد

تھے، منظہر علی مبرا تھیں، شیخ حسام الدین امام بخش ناسخ، قاضی احسان احمد اکبرالہ آبادی مولانا تاج محمود (لائل پوری) نظیر اکبرآبادی اور مولانا محمد علی پنجابی زبان میں غالب آشفتہ سر۔

(۴) استعمار سے عناد کے علاوہ احرار نے جو سب سے بڑا کام کیا یہ تھا کہ پنجاب میں علماء کا وقار گرتی ہوئی دیوار تھا، اور بڑے بڑے زمیندار اپنے ہاں کے مولویوں کو کمیوں میں جگہ دیتے تھے، احرار نے ان کی عزت کا تحفظ و تعین کیا۔ اس صورتِ حال کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں آج سے چالیس پچاس برس پہلے کے حالات کا علم اور اندازہ ہے۔

(۵) جس باب میں تاریخِ اسلام ان کی شکر گزار ہوگی وہ قادیانیت کا تعاقب اور اس کی سرکوبی ہے، احرار نے اس جماعتِ غدار کا جس بے جگری سے پیچھا کیا اس کے نتائج اسلام اور مسلمان دونوں کے لیے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً:

ا۔ قادیانیت لفظاً و معناً بے نقاب ہوگئی، مسلمانوں کو اندازہ ہوگیا کہ اس کا وجود ان کی وحدت اور اسلام کی مرکزیت کے لیے مہلک و مضر ہے۔

ب۔ قادیانیت کا تبلیغی دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا، عامۃ المسلمین اس کا شکار ہونے سے بچ گئے

ج۔ قادیانیت کا مذہبی وجود اپنے سیاسی خد و خال سمیت آشکار ہوگیا جس سے اسلام مصئون اور مسلمان محفوظ ہوگئے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ برِعظیم کے مسلمانوں کی صحیح تاریخ کب لکھی جائے گی، کئی باب اوجھل ہو چکے اور کئی باب اَدھورے پڑے ہیں، تاریخ میں یہی ہوتا رہا ہے کہ بیشتر صداقتیں یونہی دفنا دی جاتی ہیں اور اکثر جھوٹ ملمع سازوں کی بدولت سونا ہو کر چمک اُٹھتے ہیں، جس زمانہ سے ہم گزر رہے ہیں پراپاگنڈے کا دَور ہے، اور

پراپاگنڈا ایک ایسا لفظ ہے کہ دوسری تمام زبانیں اس وسیع المعنی لفظ کا مترادف پیدا نہیں کر سکی ہیں۔

اس زمانے کی بے شمار حقیقتیں فریب پر اُستوار ہوئی ہیں، مؤرخ بھی انسان ہیں ان کے ساتھ بھی ذاتی رجحانات کا ایک اُلجھاؤ ہوتا ہے، تجزیہ و تحقیق بڑی محنت چاہتے ہیں لیکن ان کی تلاش اُس وقت ہوتی ہے جب عصری تعصّبات کا دَور گزر جاتا اور صدف سے موتی نکالنا مشکل ہوتا ہے۔

یہ قرطاس و قلم کی رونقوں کا زمانہ ہے، حقائق و بصائر کے اعتراف کا نہیں، تاریخ کی جگہ افسانہ، اور تذکرہ کی جگہ کہانی نے لے لی ہے، واقعات کی جگہ قیاسات اور حالات کی جگہ خواہشات کا زور بندھا ہوا ہے۔

ان "غلطیہائے مضامین" کو دیکھ کر جو آج علم و دانش کی معرفت ہم تک پہنچ رہی ہیں اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ ہر دَور میں قلم، مصلحتوں کا شکار رہے ہیں، صداقتوں کو عموماً دفنایا گیا، اور بہتانوں کو اکثر اچھالا گیا ہے تاکہ لوگ مغالطوں کو من و عن تسلیم کر لیں، اُمویوں نے اپنے دَور میں ہاشمیوں کا خون حلال کر لیا نتیجتاً ان کا سچا تذکرہ ایک گھناؤنا جرم ہو گیا، حضرت علیؓ اور ان کی اولاد پر منبر و محراب پر تبرّیٰ ہوتا رہا، اور یہ سلوک قرنِ اوّل کے مسلمانوں کا رسول اللہ کے اہلِ بیت سے تھا، ہر دَور میں تاریخ اسی طرح مجروح ہوتی رہی، صداقتوں کو برسوں کی مسافت کے بعد جگہ ملی، مثلاً شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان سے اس عہد کے مسلمانوں نے کیا سلوک کیا؟ شاہ عبدالعزیز کے پانچے توڑ دیئے، ان کے بدن پر چھپکلی کا تیل ملا، جس سے انہیں برص ہو گیا، آج دعوت و عزیمت اور فکر و نظر کی محراب میں ان کا نام گونج رہا ہے، تو اس گونج کے پیدا ہونے میں پوری ایک صدی صرف ہوئی ہے۔ جو ابنِ ہزارہ کی غدّاری سے سکھوں کے ہاتھوں

سید احمد شہید ہو گئے تو ان کی سیرت تقریباً ایک صدی تک گرد و غبار میں دبی رہی، اعتراف و ستائش کے الفاظ گنگ ہو گئے، خود مسلمانوں نے ان کے خلاف گز بھر کی زبانیں تیز رکھیں، اب کہیں جا کر اُن کا نام اور کام اُبھرا ہے اور مسلمانوں نے تحریک آزادی کے ڈانڈے ان کی جد و جہد سے ملاتے ہیں۔ احرار کی کمزوریاں انسانوں کی کمزوریاں تھیں، ان کمزوریوں سے انسان کبھی خالی نہیں رہ سکتا، لیکن احرار کی خوبیاں قدرت کا انعام تھیں، دنیا نے ان کے بارے میں سبھی کچھ کہا ہے لیکن تاریخ ان کے بارے میں ابھی صحیح تجزیہ نہیں کر سکی، ہار جانا کوئی شے نہیں، اصل شے لڑ جانا ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں تک استبداد و ارتداد سے لڑ جانے کا سوال ہے کوئی سی جماعت اِس تاب و توانائی کے انسان پیدا نہیں کر سکی ہے۔

ملاح یا سفاح

بارہا نظرثانی کے باوجود میں اپنی اس رائے کو تبدیل نہیں کر سکا کہ جس شخص نے مجلس احرار کو ڈبویا وہ مظہر علی اظہر تھے، مظہر علی اعلیٰ درجہ کے جوابی مقرر تھے، طبیعت کے سادہ خوف سے بے نیاز، آلائش نفس سے مبریٰ، بدن کا گناہ ان کے تصور سے بھی ہو کر نہیں گزرا تھا، لیکن ضد ان کا شیوہ تھا، اپنے بیٹوں کو اعتماد میں لے سکتے تھے، رفقاء کو نہیں ان کے ہاں بہت سے راز تھے اور وہ خود بھی ایک راز تھے ——— جماعتی امور میں امیر شریعت سے راز رکھتے، مجلس کے جنرل سکرٹری تھے لیکن کئی باتیں صدر کو نہیں بتاتے تھے اپنی ذات کے سوا انہیں کسی پر اعتماد نہ تھا، فی الجملہ چودھری افضل حق کی موت نے انہیں قائد احرار بنا دیا اور وہ اپنے تئیں اس کا مستحق سمجھتے تھے، ان کی نگاہ میں کوئی بڑے سے بڑا رہنما بھی نہیں جچتا تھا خود اپنے ساتھیوں کے متعلق ان کا یہی خیال رہا، اور یہ زعم ان کے دماغ میں نقش ہو چکا تھا کہ ان کے ساتھی فہم و تدبر میں ان سے ہیٹے ہیں، علامہ اقبال کی شاعری پر تبریٰ تولتے، حالانکہ ایک عدد تخلص کے باوجود انہیں شاعری کا فہم ہی نہ تھا، مولانا ابوالکلام آزاد کے تبحر علمی اور علو انشا کے سرے سے قائل ہی نہ تھے مولانا حسین احمد مدنی کا تذکرہ حقارت سے کرتے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت کو الفاظ کی بھول بھلیاں کہتے، گاندھی کا استہزاء کرتے، نہرو کو سیاسی احمق کہتے، قائد اعظم کا مذاق اڑاتے، جب ان بڑے لوگوں کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا تو اپنے عام ساتھیوں

کے متعلق ان کی رائے کیا ہوگی؟ ان کے نزدیک کوئی شخصیت تھی تو ان کا اپنا وجود تھا، اس احساسِ برتری نے جو ان کے رگ و پے میں سما چکا تھا، انہیں خود سر بنا دیا، یہی خود سری احرار کی جان لیوا ہوگئی، انہیں کانگرس سے کدتھی اور لیگ سے تنفر تھا، احرار رہنما کانگرس سے الگ ہو کر بھی کھدر ہی پہنتے تھے، لیکن مظہر علی نے کبھی کھدر نہ پہنا، ان کے دل میں کسی کانگرسی یا لیگی رہنما کے لیے کوئی احترام یا اخلاص نہ تھا۔

احرار پانچ ذہنوں کا مرکب تھے، اوّلاً کانگرسی ذہن جس کے رہنما مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تھے، دوسرا جمعیتی ذہن یعنی علماء کا اجلال و احترام اور ان کی استعمار دشمن روایتوں سے ربط و ضبط، اس کے علمبردار سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور دوسرے بڑے کانگرسی رہنماؤں سے انہیں جو تعلق خاطر تھا وہ اس کی محافظت کرتے تھے، ان کے نزدیک انگریزوں کا ہندوستان سے انخلاء سب سے بڑا مسئلہ تھا، باقی سب مسائل ثانوی تھے، تیسرا ذہن اسلامی "سوشلسٹ" تھا جس کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ تمام خرابیوں کی جڑ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے اس کے نزدیک لیگ کا سرمایہ دار اپاہج تھا اور اپنی بقا کے لیے مسلمانوں کو استعمال کرتا تھا، کانگرس کا سرمایہ دار متحرک اور ایثار پسند تھا، لیکن قولاً و فعلاً خطرناک۔ اس ذہن کے رہنما چودھری افضل حق تھے، جب تک زندہ رہے ان کا ذہن احرار کارکنوں کے دماغوں کی پرورش کرتا رہا، چوتھا ذہن فرقہ وارانہ نوعیت کا تھا، اس کا خیال تھا کہ لیگ کا نعرہ حق ہے لیکن مقصد باطل، کانگرس کے ایثار کا اعتراف تھا لیکن شمول سے خوفزدہ، اس ذہن کے رہنما مولانا مظہر علی اظہر تھے، پانچواں ذہن اس سے بھی خوش اور اس سے بھی خوش، جدھر لے چلو آمادۂ جہاد، اس گروہ میں شیخ حسام الدین طبعاً کانگرسی اور سردار محمد شفیع مزاجاً لیگی تھے، ان مختلف الذہن عناصر کو انگریز دشمنی، باہمی دوستی کی یکرنگی اور خطابت کی جولانی نے اکٹھا کر رکھا تھا، احرار سے باہر ان کے لیے کوئی

مقام نہ تھا، اصلاً ایک قافلۂ درویشاں تھا جو پُرسوز جان اور دل نواز سخن لے کر سیاسی جد و جہد کے میدان میں کود پڑا تھا، احرار کے تخیل کی نیو رکھتے وقت تو مولانا ظفر علی خاں بھی ان کے ساتھ تھے لیکن جماعت کی بنیاد اٹھاتے وقت اُن کے تلوّن کی وجہ سے انہیں علیحدہ رکھا گیا، مولانا داؤد غزنوی، شہید گنج کی تحریک کے دوران عملاً گوشہ نشین ہو گئے، چودھری افضل حق کی زندگی تک احرار کا چیپ وراست صحیح رہا، ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو پوری عمارت ہل گئی، ایک مرکزی وجود ختم ہو گیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں احرار آزمائش و ابتلا کے جان لیوا نرغہ میں آ گئے۔ چودھری صاحب گو رکنارے پہنچ کر رہا ہوئے، مظہر علی ۱۲۴ الف میں ایک سال قید کاٹ کر چھوٹے، شاہ جی سنگین مقدمات میں ماخوذ ہو گئے، لیکن لدھارام کے انحراف و اقرار کی بدولت رہا ہو گئے، مولانا حبیب الرحمٰن کانگرس سے بچت و پرکر رہے تھے کہ نظر بند کر دیئے گئے، شیخ حسام الدین کو تین سال قید ہوئی لیکن ڈیڑھ سال بعد مرافعہ میں رہا ہو گئے، سردار محمد شفیع سالار تھے لیکن بااختیار نہ تھے، ایک میں ہی تھا جو سب سے طویل قید گزار رہا اور احرار ورکنگ کمیٹی کی طے شدہ پالیسی کے مطابق مرافعہ کرنے سے انکار کر چکا تھا۔

جماعت کا مذہبی گروہ مثلاً مولوی غلام غوث، قاضی احسان احمد، مولانا محمد علی جالندھری قید و بند سے دامن کشاں تھا، چودھری صاحب کی موت کے بعد مظہر علی نے پانسہ پلٹا، کانگرس کو رد کیا، لیگ کو طاق پر رکھا اور مقاطعہ جنگ کے اُس فیصلہ پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا جس کی نیو بے نظیر قربانیوں پر رکھی گئی تھی، مظہر علی نے ایکا ایکی حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ ایجاد کیا، جس کا مطلب تھا اِدھر نہ اُدھر۔ احرار کی دینی ذہنیت کے لیے یہ نعرہ خوش آئند تھا لیکن مظہر علی نے جس مرحلے پر یہ نعرہ وضع کیا اور جس موڑ پر یہ نعرہ احرار کا نصب العین بنا وہ معناً پُراسرار تھا، حکومت نے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا، "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک (۱۹۴۲ء) کے دنوں میں حکومتِ الٰہیہ کی قرارداد

سہارنپور کے اجلاس میں پاس کی گئی اور ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک سے اس عذر پر لاتعلقی کا اظہار کیا گیا۔ کہ اس مرحلہ میں کوئی تحریک اُٹھانا کسی اور غیر ملکی طاقت مثلاً جاپان وغیرہ کو ملک پر قابض ہونے کی دعوت دینے کے ہم معنی ہو گا — قرارداد میں پاکستان کو لیگ کے رجعت پسندوں کا کھیل قرار دیا گیا اور حکومت الٰہیہ کو ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مسئلہ کا حل لیکن حکومتِ الٰہیہ کیا تھی؟ مظہر علی اظہر کی تقریریں جن میں ایک منفی تنقید کے سوا کوئی واضح فکر اور مربوط لائحہ عمل نہ تھا، یہی وہ موڑ تھا جہاں مظہر علی نے اپنے رفقاء کے ساتھ تقیہ اور ملک خضر حیات خاں سے میثاق کیا، غالباً احرار کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مظہر علی کا نام اور احرار کی اس قرارداد کو آل انڈیا ریڈیو سے کئی دفعہ نشر کیا گیا۔

قرارداد سہارنپور (حکومتِ الٰہیہ) قرارداد امرتسر (مقاطعہ جنگ) کے خلاف تھی، ساتھیوں کو قید و بند میں ڈلوا کر بنیادی فیصلے سے منحرف ہو جانا مظہر علی کی ذہنی اُپج کا شاہکار تھا۔

قائد اعظم سے ملک خضر حیات کی اَن بَن ہو گئی تو مظہر علی خضر حیات کی طرف اور جھک گئے، مَیں نے محسوس کیا کہ وہ ملک خضر حیات کے خلاف ہلکی سی تنقید سُننا بھی گوارا نہیں کرتے، بلکہ نجی محفلوں میں اُن کا دفاع کرتے، احرار میں صرف وہی ایک فرد تھے جن کی سیاسی تقریروں پر کوئی پابندی نہ تھی، عام جلسوں میں لیگ اور کانگرس دونوں کو رگیدتے، لیگ کے خلاف جو منہ میں آتا کہہ جاتے، شاہ جی بھی ان پابندیوں سے مستثنیٰ تھے لیکن ان کا وقت زیادہ تر تبلیغی جلسوں میں کٹتا، شیخ حسام الدین کی پنجاب میں زبان بندی تھی، مولانا حبیب الرحمٰن پہلے منٹگمری سنٹرل جیل میں رکھے گئے، پھر دھرم سالہ جیل میں پڑے رہے، ان کی رہائی مدتوں خواب و خیال ہی رہی، مَیں خود طویل قید گزارنے کے باوجود پیسہ اخبار کے تھانہ میں نظر بند رہا،

تقریر و تحریر پر پابندی لگی رہی، مولانا سے بارہا کہا کہ وہ خضر حیات سے ملتے ملاتے ہیں اُن پر زور دیں کہ مولانا حبیب الرحمٰن کو چھوڑ دیں، شیخ صاحب اور میرے خلاف جو پابندی لگی ہوئی ہے اُسے واپس لیں، لیکن مظہر علی ہُوں ہاں کر کے ٹال جاتے، اوّل تو مظہر علی مولانا حبیب الرحمٰن کے معاملہ میں صاف دل نہ تھے، دوم وہ خضر حیات سے کہہ سکتے تھے یا کہتے ہونگے لیکن سی آئی ڈی کا ریکارڈ مانع تھا، مظہر علی، خضر حیات کو قائل معقول کرنے کی بجائے خود قائل معقول ہو جاتے، شیخ حسام الدین کا ذکر آتا تو ان کی رائے یہ ہوتی کہ اُنہیں زبان پر قابو نہیں ہے، زبان کھلی تو پھر اندر چلے جائیں گے میرے بارے میں ان کا خیال تھا کہ فی الحال نظر بندی اور زبان بندی ٹھیک ہی ہے حکام کو یقین نہیں آتا کہ تمہارے قول و فعل سے حکومت محفوظ رہ سکتی ہے چونکہ قید کا بڑا حصّہ تم نے سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے ساتھ گزارا ہے اس لیے انہیں اندیشہ ہے کہ تمہارے ذہنی رشتے اس گروہ کے ساتھ استوار ہو گئے ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن کا خاندان ان کی بے میعاد نظر بندی سے سخت پریشان تھا، مولانا بیمار تھے اور بیماری ہی کے باعث دھرم سالہ جیل میں رکھے گئے تھے، ان کے گھریلو حالات بھی کچھ بہتر نہ تھے، تنگی اور ترشی کا عالم تھا، ظاہر ہے کہ ان حالات میں مزاج چڑچڑا ہو جاتا اور طبیعت میں جھنجھلاہٹ آ جاتی ہے، یہی وجہ تھی کہ مولانا حبیب الرحمٰن کے فرزند خلیل الرحمٰن اور عزیز الرحمٰن کھلم کھلا الزام لگاتے کہ ان کے والد کی نظر بندی میں طوالت کے ذمہ دار مظہر علی اظہر ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن کے والد مولانا محمد زکریا اس الزام میں پوتوں کے ہمنوا تھے، وہ مظہر علی کو جلی کٹی سناتے اور بُرا بھلا کہتے، مظہر علی کے دل میں گرہ پڑی ہوئی تھی، ان کا الزام تھا کہ مولانا کی طویل نظر بندی کے ذمہ دار ان کے بیٹے ہیں، دوسرے وہ احرار کی وجہ سے نظر بند نہیں ہوئے ان کی نظر بندی مولانا ابو الکلام آزاد کی وجہ سے ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے شملہ کانفرنس کے موقع پر خضر حیات سے کہا نتیجۃً ان کی رہائی کے احکام صادر ہو گئے، خضر حیات نے شملہ سے سلطان علی رانجھا کو فون پر خبر دی، سلطان علی رانجھا نے مولانا مظہر علی پر احسان دھرا، مظہر علی فوراً دفتر احرار میں آ گئے، اتفاق سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری موجود تھے، انہیں مطلع کیا، مجھے بلوا کر لدھیانے بھیجا گیا کہ مولانا کے گھر میں اطلاع کر دوں، میں راتوں رات لدھیانہ پہنچا، صبح ان کے دولت کدہ پہ حاضر ہوا تو مولانا کی اہلیہ بہت مسرور ہوئیں لیکن مولانا کے والد غصہ سے آگ بھبوکا ہو گئے، فرمایا:

"مظہر علی نے کونسا تیر مارا ہے؟ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو خط لکھا تھا، عزیز وہ خط لکھ کر شملہ گیا —— مولانا نے خضر حیات سے کہا اور رہائی ہو گئی ہے"

مولانا حبیب الرحمٰن دس سال سے رہا ہو کر لدھیانہ جا رہے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر، راقم الحروف اور بیسیوں رضا کار امرتسر کے اسٹیشن پہ ان سے ملے، مولانا نے ہر ایک سے معانقہ کیا، سرگوشی فرمائی، مظہر علی نے کہا، ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہو رہا ہے لاہور چلیں، کہنے لگے مولانا ابوالکلام آزاد نے رہا کرایا ہے کل ان کا شکریہ ادا کرنے شملہ جا رہا ہوں، مولانا مظہر علی اس بھرپور طنز کو سہ گئے، لیکن ان کے دل کی گرہ اور مضبوط ہو گئی، میں مولانا حبیب الرحمٰن کے ساتھ لدھیانہ چلا گیا، مولانا نے "اندرونِ پردہ" کا ذکر چھیڑا، معلوم ہوا ان کا دل مظہر علی کے خلاف پھوڑا ہو چکا ہے، ان کی عادت تھی گلہ کرتے تو آہ سے شروع ہو کر آہ پہ ختم کرتے، گلہ کا پیرایہ ایسا ہوتا گویا گلہ نہیں کر رہے کوئی واقعہ سنا رہے ہیں۔

انہوں نے حکومتِ الٰہیہ کے نعرے کو سیاسی فراڈ سے تعبیر کیا، کہنے لگے، حضرت علیؓ کے زمانہ میں اِنِ الحُکمُ اِلّا لِلّٰہ کا نعرہ خارجیوں نے شروع کیا تھا یہ اسی طرز کی

اچھوتی بانگی ہے، یہ بھی فرمایا کہ "احرار نے ۱۹۳۱ء میں کانگرس سے علیحدہ ہو کر غلطی کی، اور ۱۹۴۲ء کی تحریک سے علیحدگی ایک ظالمانہ فعل تھا" انہوں نے چودھری افضل حق مرحوم پر بھی تنقید کر ڈالی کہ وہ احرار کے قومی ذہن کو پاکستانی ذہن بنانے کی کوشش کرتے رہے۔

لدھیانہ اسٹیشن پر مولانا کا زبردست استقبال ہوا، ایک جم غفیر اُمڈ آیا، مولانا نے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"آپ کی محبت کا شکریہ، مولانا ابوالکلام آزاد میرے مذہبی اور سیاسی پیشوا ہیں، مَیں شملہ جا رہا ہوں، ان سے مشورے کے بعد ہی اس قابل ہونگا کہ آپ سے کچھ کہہ سکوں ——!"

اگلے روز مولانا شملہ چلے گئے، وہاں بھی یہی بیان دیا، اپنے ایک معتمد کو لاہور بھیجا کہ مجلسِ احرار لارڈ ویول کو اس مقصد کا ایک تار دے کہ ان کے رہنما مسٹر جناح نہیں مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، مظہر علی کہاں مانتے وہ مولانا حبیب الرحمٰن سے پہلے ہی خار کھائے بیٹھے تھے، انہوں نے لاہور میں ایک جلسۂ عام منعقد کر کے اعلان کر دیا کہ احرار اس قضیہ میں کسی کے ساتھ نہیں، جو طاقت مسلمانوں کے حقوق کا تصفیہ کرنا چاہتی ہے وہ لیگ سے بات کرے، مسلمانوں کی طرف سے بات چیت کرنے کی مجاز وہی ہے، مولانا حبیب الرحمٰن نے اس کو اپنے خلاف حملۂ ترکانہ سمجھا، دونوں کا ذہنی بُعد اور بڑھ گیا، دونوں احرار کی طاقت بانٹنے میں لگ گئے، مولانا حبیب الرحمٰن گفتگو کرتے تو ان کا لہجہ شکوے کا ہوتا، انداز تنقید کا، الفاظ نپے تُلے، غصہ کی ہلکی سی آمیزش، معانی کڑوے کسیلے، مظہر علی نسبتًہ احتیاط برتتے، لیکن کاٹ مقراض کی ہوتی، اُن کے ذہن سے انتقام کا نکلنا مشکل تھا۔

مولانا مظہر علی نے ملک خضر حیات سے اتنی مناسبت پیدا کر لی تھی کہ مولانا

گلشیر کا قتل بھی وزارت کی مصلحتوں میں گم ہو گیا ـــــ مسلم لیگ نے جلسۂ عام میں اس قتل کی مذمت کی اور خضر حیات کی وزارت کو آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ قاتلوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔ لیکن مولانا مظہر علی نے جلسۂ عام کرکے الٹا لیگ کو مطعون کیا کہ لیگ کو مولانا گلشیر کے خون سے کیا دلچسپی ہے؟ کہیں اس قتل میں اس کا ہاتھ تو نہیں ہے؟ مولانا مظہر علی جانتے تھے کہ قتل کیوں ہوا ہے؟ اور قاتل کون ہے؟ لیکن وہ یونی نسٹ وزارت کو پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے ہم نے مولانا سے اصرار کیا کہ اصل مجرموں کی گرفتاری کے لیے خضر حیات پر زور دیں، لیکن آخر تک کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ لیگ شور مچاتی رہی، مولانا چپ سادھ کر بیٹھ گئے، ان کا جواب تھا کہ لیگ ہمیں خضر حیات سے الجھانا چاہتی ہے۔ اور یہ مظہر علی کا ناقابلِ معافی جرم تھا۔

گو ہم پہلے اندازہ نہ کر سکے لیکن جب راز فراہم ہو گئے تو یہ چیز کھل گئی کہ مولانا مظہر علی اظہر نے انتخابی مہم کا آغاز ملک خضر حیات کے مشورہ سے کیا تھا، اور وہ ان سے باقاعدہ مالی امداد لے چکے تھے، یہ ایک بڑا جرم تھا، ایک ایسی جماعت جس کا سارا اثاثہ ہی فقر و استغنا رہا ہو اور جس کی تاریخ قربانی و استقامت میں ڈھلی ہو اس کو دھوکا دے کر ایک رجعتی جماعت کے استعماری سرخیل سے گٹھ جوڑ کرنا ایک سنگدلانہ فعل ہی نہیں بلکہ ایثار فروشی کا ایک ایسا جرم تھا کہ اس عیاری کی شرح ہی نہیں ہو سکتی ہے، مظہر علی اسی جرم کے مرتکب ہو تے تھے، انہوں نے احرار کو الیکشن میں الجھا دیا، لیکن امیرِ شریعت سے مل کر صدر احرار تک اور صدرِ احرار سے لے کر مجلسِ عاملہ تک کسی سے مشورہ نہ کیا اور نہ ان کو اعتماد میں لیا۔ شملہ کانفرنس کے موقع پر لیگ کا ساتھ دیا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف اسی کو پہنچتا ہے لیکن نمائندگی کی سند حاصل کرنے کا مرحلہ آیا تو اس کے مقابلہ میں ڈٹ کے آ گئے،

کانگرس اور یونی نسٹ پارٹی دونوں سے روپیہ اینٹھا، لُطف کی بات یہ ہے کہ جن مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے تھے انہی کی سفارش اور عنایت سے پچاس ہزار وصول کیے، الیکشن تک تو روپے کا معاملہ اخفا میں رہا، الیکشن ہو چکا تو افشا ہونے لگا۔ مولانا حبیب الرحمٰن اس روپے کے راز دار تھے، شیخ حسام الدین کے کانوں میں بھی بھنک پڑ چکی تھی لیکن ان کا اپنا کوئی اثر یا دخل نہ تھا۔ سیّد عطا اللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد عوام الناس میں قسمیں اٹھاتے پھرے کہ احرار نے اگر یونی نسٹوں یا کانگرس سے روپیہ لیا ہو تو الٰہ العالمین انہیں شکست فاش دے، بسا اوقات مظہر علی بھی ان جلسوں میں شریک ہوتے لیکن دُعا سن کر چپ ہو رہتے، آخر وہی ہوا، شاہ جی اور قاضی صاحب کی دُعا قبول ہو گئی، احرار کے متوقع امیدوار بھی شکست کھا گئے۔

مظہر علی دو خوش فہمیوں کا شکار تھے، ایک اندازہ لگانے میں بہت زیادہ سخی تھے، دوسرے اپنی تقریر پر انہیں اتنا ناز تھا کہ ہمیشہ اس زعم میں رہے کہ آن واحد میں وہ شہر کے شہر پلٹ سکتے ہیں، انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور کامیاب ہونگے اور وزیر لیے جائیں گے، لیکن ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

ملک خضر حیات اس داؤں پر تھے کہ احرار اور لیگ کی لڑائی میں ان کا فائدہ ہے، دونوں کے ٹکراؤ کی مصروفیتوں سے وہ اتنی دیہاتی نشستیں ضرور لے جائیں گے جس سے انہیں ایک مستحکم وزارت بنانے میں آسانی ہو گی، اس نیت ہی سے انہوں نے لیگ کے خلاف احرار کا محاذ کھلوا دیا، لیکن وہ طوفان کی رفتار کا اندازہ نہ کر سکے کہ لیگ کی اصل طاقت زعما نہیں، عوام ہیں، اور سوال انتخابی مزاحمت کے تقسیم یا محدود ہونے کا نہیں بلکہ پاکستان اور اس کے حصول کا ہے، ہر محاذ پر مسلمان عوام خود ایک طاقت بن گئے تھے۔

کانگرس کے رہنما احرار سے واقعی ناخوش تھے لیکن اب مالی معاونت پر صرف اس لیے آمادہ ہو گئے تھے کہ:

(۱) لیگ سے مقابلہ ہو رہا تھا (۲) یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے (۳) احرار میں خطابت و مداهنت کی بے پناہ قوت تھی۔

ملک خضر حیات کو معلوم تھا کہ احرار کسی نشست سے شاید ہی کامیاب ہوں لیکن انہوں نے مظہر علی کی معرفت احرار کو لیگ سے اس طرح بھڑا دیا کہ پاکستان کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ اس حالت میں نصف سے زائد نشستیں لے سکتے تھے، کئی دیہاتی نشستوں سے احرار امیدوار خواہاں تھے کہ یونینسٹ ان کا مقابلہ نہ کریں لیکن ملک خضر حیات نہ مانے، ایک دو جگہ کانگرس چاہتی تھی کہ احرار ان کے امیدوار کو جگہ دیں، مظہر علی راضی نہ ہوئے۔ نوابزادہ نصراللہ خاں کے مقابلہ میں لیگ کے ٹکٹ پر سردار عبدالحمید دستی امیدوار تھے اور تیسرا امیدوار یونینسٹ تھا، مظہر علی سے کہا گیا کہ خضر حیات سے کہہ کر اس امیدوار کو بٹھوا دیں لیکن مولانا ٹکا سا جواب دے کر آگئے، مولانا حبیب الرحمٰن نے خضر حیات سے کہا تو انہیں بھی یہی جواب ملا کہ نصراللہ خاں دست بردار ہو جائیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے سرحد کے بعض احرار امیدواروں کو کانگرس کے امیدواروں کے مقابلہ میں بیٹھ جانے کے لیے کہا تو مظہر علی اکڑ گئے، غرض یہ ایک عجیب اتحاد اور ایک عجیب تضاد تھا، مظہر علی نے پوری جماعت کو جیب میں ڈال رکھا تھا۔ اور جماعت ایک طویل ذہنی رفاقت کے تحت ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ لیگ نے ۱۹۳۷ء میں انتخابات سے قبل احرار سے فرار کیا اور ایسی شرطیں لگا دیں جو ان کے حسب حال نہ تھیں، لیکن جو کچھ بھی تھا باہمی کشمکش کا آغاز تھا اور سیاسیات میں ابھی اتنے بھنور بھی نہیں پڑے تھے۔

لیگ کے عوام میں پہنچنے اور پاکستان کے موقف کو اپنانے کے بعد قائداعظم

نے میاں عبدالباری کی معرفت مظہر علی سے ملاقات کی لیکن مظہر علی طرح دے گئے، کہ آپ جن سکوں کو لے کر سیاسی سفر پر نکلے ہیں وہ کھوٹے ہیں، ضرورت پڑی تو کام نہیں آئیں گے، قائد اعظم نے جواب دیا کھرے سکے دشمن کی جیب میں ہوں تو کھوٹے سکوں ہی سے کام لینا پڑتا ہے، آپ لیگ میں آئیں، کھروں کے ہوتے ہوئے کھوٹوں کا چلنا مشکل ہوگا ، ایک دفعہ میں نے خود سردار عبدالرب نشتر کو دفتر احرار میں مظہر علی سے ملوایا لیکن مولانا ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے، قائد اعظم کو ملاحیاں سنانے لگے، سردار صاحب اُٹھ کر چلے گئے۔

الیکشن سے قبل اور الیکشن کے دوران لیگ کے صوبائی رہنماؤں نے بڑی کوشش کی کہ احرار سے مفاہمت ہو جائے لیکن مظہر علی نے پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیا۔ نوابزادہ نصراللہ خاں میاں ممتاز دولتانہ سے چند نشستوں کی مشروط پیش کش لے کر آئے، مظہر علی نے غور تک نہ کیا ان کا ذہنی عقد ملک خضر حیات سے ہو چکا تھا، اور وہ کانگرس کے روپے سے متمتع کر رہے تھے۔

لاہور کے اندرونی و بیرونی حلقوں سے لیگ کے دو امیدوار تھے، میاں امیرالدین اندرونی اور میاں عبدالعزیز بیرونی حلقے سے، لیکن ان دونوں کے کاغذات مسترد کر دیئے گئے، میاں امیرالدین کے مقابلہ میں ملک محمد دین یونی نسٹ امیدوار تھے، ملک صاحب پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہ چکے تھے اور کسی زمانہ میں علّامہ اقبال کے مقابلہ میں شکست کھائی تھی، اسی حلقے سے احرار کے ایک رضا کار ملک وزیر محمد نے بھی از راہِ تفنّن کاغذات داخل کیے تھے، بیرونی حلقے سے میاں عبدالعزیز کے مقابلہ میں اچھرہ کے احرار امیدوار میاں محمد رفیق تھے یا مزنگ کے کانگرسی کارکن بابو محمد دین تکلفاً کھڑے ہو گئے تھے، میاں امیرالدین اور میاں عبدالعزیز کا پتا کٹا تو ملک محمد دین اور میاں محمد رفیق کے ساتھیوں نے احاطہ کچہری ہی میں انہیں ہار پہنا کر

مبارکباد دی ۔ ملک وزیر محمد ایک غریب الحال رضا کار تھا اور بابو محمد دین بطور امیدوار محض صفر۔

لیگ نے راتوں رات ملک وزیر محمد کو اپنا اُمیدوار نامزد کر دیا، بابو محمد دین بھی لیگ کے ٹکٹ پر راضی ہو گئے، ان کے والد کو اس خوشی میں پھولوں کے ہار پہنائے گئے، لیکن یہ صورتِ حال میاں محمد رفیق اور ملک محمد دین کی خاندانی وجاہتوں کے لیے نازک ہو گئی، ملک محمد دین اور میاں محمد رفیق دونوں ہی پریشان تھے، کیا کریں؟ ان کا خیال تھا کہ وزیر محمد اور محمد دین دونوں گھڑے کی مچھلی ہیں لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ ڈٹ گئے، وزیر محمد کی تہی دامنی کو ترغیبیں دی گئیں، تحریص کا رشتہ تہدید تک پہنچا، لیکن کوئی چیز بھی کارگر نہ ہوئی، اس نے مظہر علی سے کہا میرے ایم ایل اے بن جانے سے آپ کا نقصان کیا ہے؟ تقدیر کا کھیل ہے اب میں اس لیے بیٹھ جاؤں کہ غریب ہوں، اور ملک محمد دین اس لیے ہو جائے کہ دولتمند ہے، کونسی تک ہے اس میں؟

یونینسٹ پارٹی نے وزیر محمد کو تقریباً پچیس ہزار روپے پیش کیے، دو مربعے زمین کا لالچ دیا، اس نے سب کچھ ٹھکرا دیا، مولانا داؤد غزنوی نقد پچیس ہزار روپیہ لے کر گئے، وزیر محمد نہ مانا، مولانا سے کہا:

> "آپ لوگوں ہی نے کل تک یہ پڑھایا اور لکھایا ہے کہ پالٹکس میں خود کو بیچنا سب سے بڑا گناہ ہے، اب آپ خود ہی خریدنے کے لیے آئے ہیں، میں کسی کے ٹکٹ پر کھڑا نہیں ہوا تھا، اپنے طور پر کاغذات داخل کیے تھے، اب اگر لیگ کا ٹکٹ لے لیا ہے اور کامیابی کے واضح آثار موجود ہیں تو آپ کے لیے اس میں کونسی خرابی یا خلل ہے۔"

مولانا نے اُس سے وعدہ لینا چاہا کہ وہ کامیابی کے بعد ان سے آملے گا، لیکن اُس نے انکار کر دیا کہ یہ قرآن و اسلام دونوں کے منافی ہے، وہ چاہتا تو اس سے

ٹکنی چونگنی رقم لے کر بیٹھ سکتا تھا، اس نے ہر چیز سے انکار کیا، اس نے اپنے تمام بزرگوں اور دوستوں سے کہا "ہر غریب بکاؤ مال نہیں ہوتا، اور نہ ہر تنگ دست کو زیر دست کیا جا سکتا ہے، وہ منتخب ہو گیا تو میاں امیرالدین وغیرہ نے کوشش کی کہ کچھ دے دلا کر بٹھا دیں لیکن اُس نے دو ٹوک انکار کر دیا، اور جلسۂ عام میں احتجاج کیا کہ امراء غرباء کو صرف خریدنا جانتے ہیں لیکن اُنہیں اپنی صف میں جگہ نہیں دیتے، متحدہ ہندوستان کی کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کا چناؤ تھا، کچھ بزرگوں نے ووٹ خریدنا چاہا اس نے مُنہ توڑ جواب دیا، اور اپنا ووٹ کھُلے بندوں ڈالا، ملک خضر حیات نے اپنے ساتھ ملانے کے لیے بہت سے لالچ دیئے لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں، نواب ممدوٹ کے ساتھ تھا، آخر تک ان ہی کے ساتھ رہا، پاکستان بن جانے کے بعد دولتانہ گروپ نے ساتھ ملانے کے سینکڑوں جتن کیے، نہ مانا ——— انعام اس کو یہ ملا کہ پاکستان میں صوبہ کا پہلا الیکشن ہُوا تو کسی نے گھاس تک نہ ڈالی، عمر کا آخری حصہ پریشان حالی میں گزرا، نواب ممدوٹ نے لاہور کارپوریشن کا رکن بنوانے میں مدد نہ کی، میر علی احمد تالپور ری پبلکن وزارت میں وزیر خوراک تھے، انہوں نے صرف اس صلہ میں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا خدمتگذار رہا ہے ڈپو الاٹ کر دیا، ایوبی مارشل لاء میں یہ ڈپو اس لیے منسوخ ہو گیا کہ ایوب پر نکتہ چینی کی ہے اِسی جرم میں مہینا بھر قید رہا، عمر کے آخری ایّام اِس کے لیے بڑے ہی کڑے تھے، لیکن حوصلہ و حمیّت سے بسر کیے، آخر ایک دن اختلاج کا دورہ پڑا اور اللہ کو پیارا ہو گیا ——— وہ چاہتا تو اپنے لیے بہت کچھ بنا سکتا تھا لیکن اس نے اپنا کچھ نہ بنایا البتہ غریبوں کا نام حمیّت کی لوح پر کندہ کر کے رخصت ہو گیا ———

بابو محمد دین پکے کانگرسی تھے ان کا تعلق ستیہ پال گروپ سے تھا، لیگ نے ان کے والد اور بھائی کو راضی کر لیا لیکن محمد دین سے دستخط نہ لے سکی، مظہر علی نے

ڈھب پر لانے کی بہت کوشش کی۔ میاں محمد رفیق کی طرف سے روپیہ بھی پیش کیا، بارہ ہزار روپیہ اس نے وصول بھی کر لیا، لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی، روپیہ لوٹا دیا، نہ کانگرسی دوستوں کی مانی، نہ مظہر علی سے رام ہوا، اس کے نام پر لیگ کے ٹکٹ کا اعلان بھی ہو گیا لیکن حلف نامہ پر دستخط کرنے سے ہچکچاتا رہا، ہر شخص عاجز آ گیا، اس گومگو میں پانسہ پلٹ گیا، میاں محمد رفیق کے چچیرے بھائی میاں محمد شریف لیگ میں تھے، انہوں نے میاں محمد رفیق سے لیگ کے ٹکٹ پر دستخط حاصل کیے اور لیگ نے محمد دین کا ٹکٹ منسوخ کر کے میاں محمد رفیق کو امیدوار نامزد کر دیا، بابو محمد دین ضمانت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ میاں محمد رفیق ممبر ہو گئے، مولانا مظہر علی اظہر نے اندر خانہ میاں محمد رفیق کو شیشہ میں اُتار لیا اور وہ کامیاب ہو کر لیگ سے منحرف ہو گئے، میں نے میاں صاحب کو مشورہ دیا کہ ایسا نہ کریں، عہد شکنی ہو گی اور نتائج بھی خوشگوار نہ ہوں گے لیکن مظہر علی کا جادو ایسا چڑھا کہ ان کے ہتھے چڑھ گئے۔

لیگ کا برہم ہونا قدرتی امر تھا عوام نے احتجاج کیا، مظہر علی نے رضاکار رول کو بھڑا دیا، اور یہ سب کچھ صرف اس لیے ہو رہا تھا کہ مظہر علی ہار جانے کے باوجود وزارت میں شامل ہونے کے خواہاں تھے، ملک خضر حیات کو صوبہ میں ایک عوامی جماعت کی ضرورت تھی اور بظاہر مظہر علی ہی اس ضرورت کو پورا کر سکتے تھے، ملک صاحب نے مظہر علی کو وزیر بنانے کا فیصلہ کیا، گورنر سے رسمًا منظوری بھی حاصل کر لی، اب اگر مظہر علی اُس شام حلف اُٹھا لیتے تو وزیر ہو جاتے، ان کے بیٹے وزیر تعلیم کا بنگلہ بھی دیکھ آتے تھے اور دوستوں کی ثقہ روایت کے مطابق کمروں کی تقسیم بھی ہو چکی تھی، حتٰی کہ ملک خضر حیات نے ان کے مکان واقع بلال گنج (عقب داتا گنج بخش) میں سرکاری کار بھی روانہ کر دی تھی، لیکن معاملہ دو چار ہاتھ رہ گیا، ہوا یہ کہ مولانا کی نئی اچکن تیار نہ ہو سکی، وہ خضر حیات سے گفتگو میں اتنے محو ہو گئے کہ حلف صبح پر

اُٹھا رکھا۔ اس اثنا میں احرار کے آفس سکرٹری اور مولانا کے معتمد چودھری ثناء اللہ بھٹّا نے کاتب بلوا کر ایک پوسٹر بھی کتابت کروا لیا :

"مَیں نے وزارت کیوں قبول کی

مولانا مظہر علی اظہر آج ۸ بجے شب دہلی دروازہ کے باہر جلسۂ عام سے

خطاب کریں گے !"

مظہر علی نے مولانا حبیبُ الرحمٰن کے سوا کسی کو اعتماد میں نہ لیا، عین ممکن تھا مولانا حبیب الرحمٰن کو بھی اعتماد میں نہ لیتے، کیونکہ ان کی طرف سے ان کا دل صاف نہ تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ مظہر علی اس طرح صرف چھ ماہ تک وزیر رہ سکتے تھے اس اثنا میں ان کا ممبر منتخب ہونا ضروری تھا اور تجویز یہ تھی کہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو ہائی کمانڈ کی ہدایت پر یونیورسٹی کی نشست سے استعفیٰ دے دیں گے تو ان کی جگہ مظہر علی کو منتخب کرایا جائے گا، اور یہ عقدہ صرف مولانا حبیب الرحمٰن ہی حل کر سکتے تھے، ڈاکٹر گوپی چند سے ان کے مراسم تھے، مولانا ابُو الکلام آزاد سے نیازمندی تھی۔

مَیں ایک ہی دن قبل سہارنپور سے لاہور آیا — مظہر علی سے میری عقیدت کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا وہ میرے دل و دماغ کے سامنے بالکل ایک عام انسان کی طرح کھڑے تھے، اور میں ان کے چہرے سے بیسیوں تلخ حقیقتیں اُبھرتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ واقعات کا ایک انبار تھا جس نے میرے شیشۂ دل کو مکدر کر دیا تھا، ایک چیز جس نے میری عقیدت کو نفرت میں بدل دیا وہ ان کے حلقۂ انتخاب میں خنڈیالہ گورو کے پولنگ اسٹیشن کا ہنگامہ تھا، میں وہاں قتل ہوتے ہوتے بچا، مظہر علی کو معلوم تھا کہ وہاں خون خرابہ ہوگا، اپنے بیٹے خاقان بابر کو اسی باعث میرے ساتھ جانے سے روک دیا، ورنہ ہر جگہ کرتا دھرتا ان کے بیٹے تھے، کانگرس اور یونی نسٹ پارٹی سے روپے کی بڑی بڑی قسطیں بھی انہی کی معرفت وصول کی تھیں، آج بھی اس ہوشربا تصوّر

سے مجھ پر ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔

دوسری چیز جو میرے نزدیک جماعت احرار کی ویرانی کا باعث ہوئی اور جس کا علم سب سے پہلے مجھی کو ہوا وہ روپیہ تھا جو مظہر علی نے کانگرس اور یونی نسٹ پارٹی سے وصول کیا اور اپنے گھر میں رکھا تھا۔

مولانا داؤد غزنوی اوّلاً دس ہزار روپے کی پہلی قسط لے کر دفتر احرار میں آئے تو اس وقت مظہر علی کے پاس صرف میں تھا، مجھے کہا ذرا نیچے چائے کے لیے کہہ آؤ، میں نیچے گیا۔ مولانا نے دس ہزار کے نوٹ غڑپ سے جیب میں ڈال لیے، میں ابھی لوٹا نہیں تھا کہ مولانا داؤد غزنوی مسکراتے ہوئے نیچے آ گئے، میں نے کہا مولانا چائے آ رہی ہے کہنے لگے "چائے پی اور بلا آیا ہوں"۔ پچاس ہزار کی دوسری قسط (تفصیل آئندہ صفحوں میں آئے گی) مولانا نے لالہ بھیم سین سچر کی معرفت وصول کی، یونی نسٹ پارٹی کا روپیہ اس کے علاوہ تھا۔

مظہر علی وزارت میں چلے جاتے تو احرار پر ایک ایسی تباہی آتی کہ اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا، مظہر علی کا اقتدار احرار کی کاملاً تباہی پر منتج ہوتا۔ میں نے ذہناً فیصلہ کر لیا کہ یہ تمام راز شاہ جی اور مجلس عاملہ کے نوٹس میں لاؤں تاکہ مظہر علی کی متوقع وزارت کا پتہ کٹ جائے۔ صوبہ کانگرس کے زعماء سے میرے آبرومندانہ تعلقات تھے وہ میرے ساتھ جیل میں رہے تھے اور میری طبیعت کی بے نیازی و حوصلہ مندی کے باعث میری قدر کرتے تھے، میں نے ان سے پختت و پز کر کے مظہر علی کا وزارتی خواب پراگندہ کر دیا۔

(۱) ڈاکٹر گوپی چند بھارگو مولانا مظہر علی کے متعلق پہلے ہی خوش رائے نہ تھے، انہوں نے مجھے جیل میں بتایا تھا کہ سکندر وزارت کے زمانے میں مظہر علی کا خیال تھا کہ فلاں فلاں یونی نسٹوں سے علیحدہ کر کے نئی وزارت قائم کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ کانگرس ان کا

ساتھ دے، مَیں (بھارگو) نے وعدہ کیا بلکہ بعض دفعہ کرایہ بھی ادا کیا لیکن وہ کسی شخص کو تیار نہ کر سکے۔

بھارگو بظاہر یہی کہتے رہے کہ مولانا آزاد نے حکم دیا تو وہ یونیورسٹی کی نشست سے مستعفی ہو جائیں گے، اور مولانا کو منتخب کرانے میں مدد دیں گے، لیکن سردار پٹیل کو جو ہائی کمانڈ میں تھے راتوں رات مطلع کیا کہ مظہر علی ہر لحاظ سے ناموزوں ہے، اُس نے کانگرس کو ہمیشہ سبوتاژ کیا اور ۱۹۴۲ء کی تحریک میں قطع تعلق کا خنجر گھونپا تھا۔

(۲) سردار پٹیل نے مولانا آزاد سے کہا، دونوں نے مشورہ کیا کہ مظہر علی کانگرس کی نشست چاہتے ہیں تو کانگرس کا ٹکٹ لیں مظہر علی نے انکار کر دیا جس سے ہائی کمانڈ کے ہاتھ مضبوط ہو گئے۔

(۳) مولانا داؤد غزنوی کانگرس کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے، ملک خضر حیات چاہتے تو انہیں وزیر لے سکتے تھے لیکن وہ بہمہ وجوہ مظہر علی کو چاہتے تھے، قدرتاً مولانا داؤد نے بھی مولانا ابوالکلام اور سردار پٹیل کو مظہر علی کے وزیر بنوانے سے روکا۔

(۴) ڈاکٹر عالم نے خضر حیات سے واویلا کیا۔

(۵) بعض دوستوں نے مولانا آزاد کو فون کیا کہ مظہر علی کو وزارت میں لینا ایک بڑی غلطی کا باعث ہو گا۔

(۶) مولانا کو معلوم تھا کہ مظہر علی خلقتہً ان کے مخالف ہیں اور ہمیشہ اُن پر نکتہ چینی کرتے رہے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ احرار اور کانگرس کے درمیان دیوار کھینچنے میں انہی کا ہاتھ رہا ہے۔

(۷) مولانا حبیب الرحمٰن اور شیخ حسام الدین دل سے نہیں چاہتے تھے کہ مظہر علی وزیر بنیں۔

(۸) مولانا ابوالکلام آزاد یُوپی میں تحریک مدح صحابہ ختم کرانا چاہتے تھے، لیکن

مظہر علی شورش چھوڑ چکے تھے اور رُکتے نہیں تھے، کئی لوگوں نے مولانا آزادؒ سے کہا کہ "مداخلت کریں اور روکیں"۔۔۔۔۔ مولانا نے فرمایا،

"اختلاف مسئلہ کا ہو تو حل دو منٹ میں ہو سکتا ہے، لیکن یہاں تو اغراض کا اختلاف ہے۔"

مولانا نے ایک دفعہ مظہر علی سے بھی کہا کہ سیاسیات میں اختلافات سے نمٹنے کی بہت سی راہیں ہیں، مذہب سے فائدہ اٹھانا دماغوں کی آب و ہوا کے لیے عموماً مضر ہوتا ہے۔ آپ شیعہ ہو کر سُنّیوں کی وکالت کرتے ہیں؟

اس پس منظر میں مظہر علی اگلی صبح حلف اٹھانے کے لیے خضر حیات کے ہاں گئے تو انہوں نے کہا: "مولوی صاحب مولانا آزاد کا بمبئی سے فون آیا ہے، انہوں نے روک دیا ہے۔

مظہر علی پر گھڑوں پانی پڑ گیا، منہ لٹکا کر واپس آ گئے، حلف اٹھانے جا رہے تھے تو شیخ صاحب نے روکا! مولوی صاحب ہم آپ سے کچھ باتیں کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ مولانا جھنجلائے، اور کہا۔

"ابھی فرصت نہیں"۔ لوٹ کے آئے تو خوابوں کا آئینہ چور چور ہو چکا تھا اب اُنہیں فرصت تھی اُدھر "استغاثہ" تیار ہو چکا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن نے پوچھا؛ مولوی صاحب خیریت ہے؟ کہنے لگے" ابوالکلام نے بیڑا غرق کر دیا ہے"

"آخر کیا ہُوا؟"

"ہوتا ہوا تا کیا؟ ابُوالکلام نے روک دیا ہے"

حبیب الرحمٰن نے مظہر علی کی حالت غیر دیکھی تو آپس میں صلاح مشورہ کر کے مولانا آزاد کو بمبئی فون کیا، دفتر احرار کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے، مظہر علی،

حبیب الرحمٰن، حسام الدین اور میرے سوا وہاں کوئی اور نہ تھا، مولانا آزاد نے تسلیم کیا کہ اُنہی کے ایماء پر انکار کیا گیا ہے، مولانا نے فرمایا:

"مسئلہ بڑا واضح ہے، برطانوی حکومت سے عنقریب ہی گفتگو شروع ہو رہی ہے، اب اگر ہم نے مظہر علی کو وزارت میں شریک کر لیا تو مسلم لیگ یہ کہنے میں حق بجانب ہو گی کہ جن لوگوں کو اس نے انتخابی میدان میں شکست دی، انہیں کانگریس وزارت میں ٹھونس کر مسلم اکثریت کے صوبوں میں دھاندلی کر رہی ہے۔ جس آدمی نے انتخاب نہ لڑا ہو اس کو چھ ماہ کے لیے وزیر لینے میں مضائقہ نہیں، لیکن جو لڑ کے ہار چکا ہے اس کو وزیر لینا پارلیمانی روایتوں کے خلاف ہے اور ہمارے سامنے ایسی کوئی نظیر نہیں ہے، ہم کہیں بھی مسلم لیگ کے لیے جائز شکایت پیدا کرنے کے خواہاں نہیں، اس سے ہمارا مقدمہ خراب ہو جائے گا ـــــ آپ احرار میں سے کسی اور کا نام لیں جس نے الیکشن نہ لڑا ہو یا جو ہارنے کے بعد کسی اَور نشست سے منتخب ہو سکتا ہو اور وہ نشست خالی ہو تو منتخب ہونے کے بعد اُسے وزیر لیا جا سکتا ہے یا پھر خضر حیات یونی نسٹ پارٹی کے نام سے چاہیں تو انہیں اپنے کوٹے میں شامل کر سکتے ہیں۔"

مولانا حبیب الرحمٰن نے کہا:

"حضرت! مجلسِ احرار اس وقت کانگریس کے دروازے پر کھڑی ہے، آپ چاہیں تو اس کو اندر بلا سکتے ہیں۔"

مولانا نے فرمایا ـــــ "میرے بھائی! مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے جواب میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔"

مظہر علی اِس جواب سے اَور بھی سرد پڑ گئے، مولانا حبیب الرحمٰن نے سوچا، وزارت ملتی ہے تو نواب زادہ نصراللہ خاں بھی ہیں، خضر حیات زمینداروں کی ایک نشست خالی کر رہے ہیں، نواب زادہ کا ووٹ بھی ہے اُنہیں کھڑا کیا جائے، مولانا حبیب الرحمٰن نے مظہر علی سے کہا۔ مظہر علی تاؤ کھاکے بیٹھے تھے، نصراللہ خاں کا نام سُن کر جھنجھلا گئے، کہنے لگے :

اگر کسی اور کے متعلق سوچنا ہے تو پھر قیصر مصطفیٰ ہے۔

قیصر مصطفیٰ مولانا کا بڑا لڑکا تھا، اس نے اِس سال ہی ایل ایل بی کیا تھا۔

مولانا کی زبانی قیصر کا نام سُن کر ہم مسکرا دیئے،

یہ جو کچھ ہو رہا تھا شاہ جی کے علم میں نہیں تھا، اس سے پہلے کہ مولانا احرار سے نکلتے مَیں نے ذہناً فیصلہ کیا کہ ان واقعات کو شاہ جی اور دوسرے بے خبر دوستوں کے سامنے رکھا جائے، تاکہ مظہر علی نے احرار کی رسوائی و پسپائی کا جو سامان کیا ہے ڈھکا چھپا نہ رہے، چودھری ہری سنگھ لہری خضر وزارت میں کانگرس کی طرف سے وزیر بلدیات تھے، انہوں نے لاہور کارپوریشن کی خاص نشست کے لیے قیصر مصطفیٰ کو نامزد کیا، قیصر اندر پہنچتے ہی میئرشپ کے امیدوار ہو گئے، مقابلہ میاں امیرالدین اور نواب مظفر علی قزلباش کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی قزلباش میں تھا، رسہ کشی اس نقطہ پر تھی کہ ایک ووٹ کا فرق تھا، وزارت کا قیصر کے ووٹ پر استحقاق تھا، قیصر نے آنکھیں پھیر لیں کہ مجھے میئر منتخب کرو نہیں تو ووٹ امیرالدین کو دُونگا اور یہی ہُوا، اپنا ووٹ لیگ کو دے کر ذوالفقار کو ہرا دیا، جماعت نے قیصر کی اس حرکت پر مظہر علی سے استفسار کیا تو وہ جھنجھلا گئے۔

"قیصر نے کونسی غلطی کی ہے ؟ وہ کانگرس کا زرخرید نہیں"

——— "سوال زر کا نہیں، زر تو آپ لے چکے ہیں، سوال اصول کا ہے، اوّلاً

آپ نے صوبہ بھر میں لیگ کا مقابلہ کیا، ثانیاً قیصر کو وزارت نے نامزد کیا ہے، اُس کے امیدوار کو ووٹ دینا اس کا اخلاقی فرض تھا، پہلے وہ خود امیدوار کھڑا ہو گیا، سودا کرنا چاہا، بات نہ بنی تو لیگ کو ووٹ دے کر پانسہ پلٹ ڈالا، احرار سے پوچھا تک نہیں بلکہ اُلٹا احرار کے خلاف بغاوت کی ہے ——— شیخ صاحب نے کہا ——— مظہر علی تیز ہو گئے۔

"قیصر نے جو کیا درست کیا، وہ کسی سے فیصلہ لینے یا کوئی اس پر فیصلہ تھوپنے کا مجاز نہیں اور نہ اسے کسی نے خریدا ہے"

شیخ صاحب بولے ——— "بہر حال اس کا فعل احرار کی رُسوائی کا باعث ہوا ہے" اس کو دو سال کے لیے جماعت سے خارج کر دینے کی تجویز آئی ہے، مظہر علی بھڑک اٹھے، ڈنڈا اٹھا کر جانے لگے، شاہ جی نے روکا ——— مولوی صاحب، کہاں جا رہے ہیں آپ؟ تشریف رکھیں آپ کے خلاف شورش نے کچھ الزام لگائے ہیں، مولوی صاحب ٹھٹھک کر ٹھہر گئے۔

مظہر علی نے جہاں سے جو کچھ لیا تھا میں نے اس کی تفصیلات پہلے ہی قاضی احسان احمد کو بتا دی تھیں، وہ پھوٹ پھوٹ کے روتے رہے، پھر مولوی غلام غوث کو آگاہ کیا انہیں تعجب ہوا کہنے لگے ثابت کر سکو گے؟ میں نے کہا ضرور ——— فرمایا، نہ ہو سکا تو؟ میں نے کہا تو مجھے جماعت سے نکال دیجیے گا، مولانا حبیب الرحمٰن کانگرس کی رقم کے راز دار اور حصہ دار تھے، انہوں نے ٹالنا چاہا مگر شورش برپا ہو چکی تھی۔

میں نے استغاثہ شروع کیا، "کانگرس سے مولانا نے ساٹھ ہزار روپیہ لیا، دس ہزار کی پہلی قسط اور پچاس ہزار کی دوسری قسط۔ پہلی قسط مولانا داؤد غزنوی نے دفتر احرار میں دی تھی، دوسری قسط لالہ بھیم سین سچر کی معرفت آئی، صاحبزادہ فیض الحسن اس رقم میں سے اپنا حصہ لے چکے تھے اس لیے معاملہ ٹھپ کرنا چاہتے تھے، اجلاس

اگلی صبح پر ملتوی ہو گیا صاحبزادہ مجھے رات بھر مولانا کے مکان پر لے جا کر سمجھاتے رہے میں دوسرے دن اجلاس میں ذرا تاخیر سے پہنچا تو معلوم ہوا صاحبزادہ صاحب نے کہا ہے کہ شورش اپنا الزام واپس لیتا ہے، مجھ سے پوچھا گیا، میں نے انکار کیا ـــــ قصہ کوتاہ مظہر علی مان گئے، کہ انہوں نے کانگرس سے ساٹھ ہزار روپے وصول کیے ہیں، یونی نسٹ پارٹی کے روپیہ کا ذکر چھڑا تو ایک صاحب نے مجھ سے کہا: آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟ میں نے کہا، ایک سرکاری ملازم دستخطی رسیدیں دکھانے کے لیے تیار ہے لیکن وہ آپ کے اور شاہ جی کے سوا کسی اور کو دکھانے پر آمادہ نہیں، مظہر علی نے تیس ہزار روپے کی یہ رقم بھی مان لی، اس کے علاوہ تین ہزار روپے احرار کی مختلف شاخوں سے اکٹھا ہو کر آتے تھے، مظہر علی نے کل بچانوے ہزار روپیہ کی رقم تسلیم کی، لیکن کہا یہ کہ نصراللہ خان کے سوا ہر امیدوار کو حصہ رسد پہنچا ہے ـــــ امیدواروں نے کہا: ہمیں الیکشن لڑنے کے لیے رقم ضرور ملی ہے لیکن یہ کبھی نہیں بتایا گیا کہ کانگرس یا یونی نسٹ پارٹی سے آئی ہے، ہمیں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ جماعت کا اپنا روپیہ ہے، مظہر علی نے کل رقم کا نصف جماعتی اخراجات پر ڈالا، تقریباً تیس ہزار احرار امیدواروں میں تقسیم کر چکے تھے۔ باقی بیس ہزار میں سے دس ہزار اپنے الیکشن کا خرچ بتایا، دس ہزار روپے کے بارے میں کہا کہ وہ روزنامہ آزاد کے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔

شاہ جی یہ کتھا سنتے ہی ڈھائیں مار مار کر رونے لگے، مظہر علی تم نے ہمیں ڈبو دیا، مجھے نیلام کر دیا، احرار کی رہی سہی گنوا دی، ہماری قربانی کو جنس بنا دیا، کیا خبر تھی کہ عمر بھر کا دوست اس طرح دغا دے گا، میری بوڑھی ہڈیوں ہی کا سودا کرنا تھا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مظہر علی چھڑی اٹھا کر دفتر احرار سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے، اور وہ دس ہزار روپیہ جو اخبار کے لیے بچ رہا تھا انہی کی بھینٹ ہو گیا۔

مختصرات

بعض احرار دوستوں کا خیال تھا مظہر علی نے جو کیا اگرچہ صحیح نہیں لیکن انہیں تنہا چھوڑ دینا مناسب نہ ہوگا، یہی بہتر ہے کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔ لیکن جانبین کے آئینہ میں بال آچکا تھا۔ شاہ جی نے ایسی چپ سادھی کہ چپ شاہ ہو گئے، مولانا حبیب الرحمٰن اپنی بات منوانے سے قاصر اور دوسرے کی بات ماننے سے معذور تھے، وقت ہی ایسا تھا کہ احرار اپنی تمام خردیں ہار چکے تھے، کانگرس میں جا نہیں سکتے تھے کہ اس کا وقت گزر چکا تھا لیگ سے مقابلہ کر کے پٹ چکے تھے وہاں اب سر کے بل جانا بھی مفید نہ تھا، اور لیگ میں جاتے تو کس منہ سے؟ مظہر علی نے کُھرکس نکال دیا تھا، حبیب الرحمٰن کانگرسی ذہن کے تھے، جب سے رہا ہوئے مولانا آزاد کی خواہش و استفسار کے باوجود کوئی فیصلہ نہ کر پاتے تھے، احرار سے کہتے کانگرس کا ساتھ دو، خود کانگرس میں جانے سے گھبراتے، عجیب مخمصہ تھا، کسی نے مظہر علی سے کہا، احرار کو اس منجدھار میں پھنسا کر خود کنارے پر چلے گئے ہو انہیں بھی کنارے تک پہنچنے کا نسخہ بتاؤ وہ رُوٹھ کے بیٹھے تھے کہ مجھے مناؤ اور جو غلطی یا غداری مَیں نے کی ہے اس کی معافی مانگو ــــــ معافی کون مانگے؟ مجلسِ عاملہ اُن سے متنفر تھی، ایک دفعہ بعض چیزیں معلوم کرنے کے لیے انہیں یاد کیا گیا تو آگئے، فرمایا کہ وہ پاکستان کے حامی ہیں، شاہ جی نے کہا یہ بات آپ نے بہت دیر بعد بتائی، کیا اس سے پہلے تقیہ کر رکھا تھا؟ آپ اگر پاکستان کے حامی تھے

تو لیگ کا مقابلہ نہ کیا ہوتا ؟ احرار کو انتخاب میں اُلجھایا اور پٹوایا، اب آپ پاکستان کے ہو گئے ــــــ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

بسم اللہ کیجیے، لیگ میں چلے جائیے،

مظہر علی نے کہا اُنہیں پاکستان سے نہیں اس کی لیڈر شپ سے اختلاف ہے۔

"تو گویا آپ قائد اعظم کو نہیں مانتے؟" ہم میں سے کسی نے کہا۔

"بالکل نہیں!" مظہر علی نے جواب دیا۔

اگلے روز مظہر علی نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا، احرار چاہتے تو مظہر علی کو چارج شیٹ دے کر علیٰحدہ کر سکتے تھے ان کی پوزیشن بھی صاف ہو جاتی مگر انہوں نے عمر بھر کی رفاقت کا احساس کیا لیکن مظہر علی نے اپنی خود سری سے احرار کو آتش فشاں پہاڑ پہ کھڑا کیا اور وہ کھڑے ہو گئے، آخر کار خود کھسک گئے، استعفا میں لکھا کہ وزارتی مشن سے گفتگو کرنے کی مجاز لیگ ہے اور وہ (مظہر علی) پاکستان کے حامی ہیں، استعفاء احرار کی روایت کے مطابق منظور ہوا نہ مسترد۔

مظہر علی نے اپنے بیٹے قیصر مصطفیٰ کی صدارت میں دفتر احرار کے عین سامنے جلسہ عام کیا، انہیں احساس تک نہ رہا کہ عمر بھر کے ساتھیوں کو مطعون کر رہے ہیں، جب تک کانگرس اور احرار کو جلی کٹی سناتے رہے، لوگوں نے واہ واہ کے ڈونگرے برسائے، لیگ کا نام لیا تو شور مچ گیا۔

"لیگ میں آجائیے"

مظہر علی نے چمک کر کہا: "لیگ نے فلاں فلاں غلطی کی ہے، آوازیں آئیں "قائد اعظم کی متابعت کیجیے" مظہر علی بھڑک اُٹھے: "قائد اعظم چاہتے ہو یا پاکستان؟" جلسہ بول اُٹھا ــــــ "قائد اعظم!"

ٹھیک وہی جگہ تھی جہاں مظہر علی نے قائداعظم کو کافرِاعظم کہا تھا اور کسی کو ان کے خلاف انگلی اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا تھا، اب یہ حال تھا کہ نوجوانوں نے ہلّہ بول دیا، قیصر مصطفیٰ نے کہا۔ میں وہی ہوں جس نے لاہور کارپوریشن میں ووٹ دیکر لیگ کے امیدوار کو ممبر بنوایا ہے، میرے باپ کی بات سنو، آوازیں آئیں سٹینڈنگ کمیٹی کی چیئرمینی بھی تو حاصل کی ہے، ہم تمہارے باپ کی نہیں سنیں گے؛ عوام نے دیکھا احرار رضاکاروں میں سے کوئی بھی ساتھ نہیں تو مظہر علی پر چڑھائی کر دی، کافرِاعظم کہنے کا بدلہ چکایا، اچکن چیر ڈالی، قمیص پھاڑ دی گھونسے رسید کیے۔ شاہ جی پیچھے سے یہ سبھی کچھ دیکھ رہے تھے فوراً رضاکاروں کا ایک دستہ بھیجا جس نے مولانا کو لوگوں کے نرغہ سے نکالا، تانگہ پر سوار کرایا اور گھر روانہ کیا ———

اس اثنا میں مولانا مظہر علی کی جگہ نواب زادہ نصراللہ خاں کو مجلسِ احرار کا جنرل سکرٹری چُن لیا گیا۔

اب چونکہ وزارتی مشن لندن سے آرہا تھا لہٰذا دہلی ملک کی تمام سیاسی جماعتوں اور اہم شخصیتوں کا مرکز بن گیا، احرار رہنما بھی دہلی میں اکٹھے ہو گئے۔

ہندوستان کی تاریخ کے اتنے نازک دن تھے کہ سیاست کا طوفان لحظہ بہ لحظہ کچھ سے کچھ ہو رہا تھا، کانگرس کو یقین ہو چکا تھا کہ ملک آزادی کی سرحد پر کھڑا ہے، لیگ کو بھی احساس تھا کہ شطرنج کی بازی بدی ہوئی ہے، اور اس بازی پہ جیت ہار کا انحصار ہے، عام سپاہی جنگ سے سبکدوش ہو کر واپس آرہے تھے، انہی دنوں ہم نے صوبائی لیگ کے رہنماؤں کو بتا دیا کہ پنجاب کی سکھ ریاستیں اکالی دل وغیرہ کی معرفت سکھوں میں ہتھیار بانٹ رہی ہیں، ہندوؤں کا حال بھی قریب قریب یہی تھا، وہ بھگوال و تمام لیس کا نشانہ ہو رہے تھے، ان میں ہندو ریاستوں، ہندو مہاجنوں، ہندو سوداگروں، ہندو صنعت کاروں اور ہندو رہنماؤں کی معرفت اسلحہ

تقسیم ہو رہا تھا، خضر حیات اس سے مطلع ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں کے معاملات کچھ ایسے ہی تھے کہ جوش زیادہ ہوش کم۔

مسلمان اُمراء میں (الاماشاءاللہ) شروع سے نحست رہی ہے، جس بانکپن کے ساتھ مسلمانوں میں پاکستان کے لیے جوش و جذبہ تھا، اُس نسبت سے، بلکہ اس کا عشر عشیر بھی وہ منظم نہ تھے اور اس کا احساس تو شاید کسی کو نہ تھا کہ آزادی کے مرحلہ میں فسادات کی شکل کیا ہو گی؟ ہندوؤں اور سکھوں کی تمام جماعتیں آئندہ حالات سے نمٹنے کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی تنظیم کا مسئلہ صرف راشٹریہ سیوک سنگھ یا اکالی دل وغیرہ تک نہیں رہا تھا بلکہ کانگریس کے بعض صوبائی اور مرکزی ہندو بھی انہیں مزاحمت و مدافعت کے نام پر مسلح کر رہے تھے۔

آزاد ہند فوج کے جنرل موہن سنگھ اسی کام میں جُت گئے، سردار پٹیل نے موہن سنگھ کو بلا کر ہندوؤں اور سکھوں کی جتھہ بندی کے لیے مقرر کیا تھا،

غالباً سہروردی ایک ہی شخص تھے جو اس خدشے کو بھانپ گئے، انہوں نے پنجاب آکر یہاں سے دو سو کے لگ بھگ پولیس کنسٹیبل بھرتی کیے اور ساتھ لے گئے کلکتہ میں ان کنسٹیبلوں کی موجودگی سے ہلچل مچ گئی، ہندو اخباروں نے بڑا واویلا کیا، لیکن سہروردی اپنی ذات اور پرایوں کے غل پر شاذ ہی توجہ دیتے تھے۔

لیگ کی نیشنل گارڈ اس اعتبار سے تہی داماں تھی، مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کو لیگ کی واحد نمائندگی نے ختم کر دیا تھا، اور اب ان میں اُبھرنے کا حوصلہ ہی نہ تھا، خاکسار اور احرار مزاحمت کا کام کر سکتے تھے لیکن دونوں لیگ کے ایجاب و قبول سے خارج تھے، بلکہ مسلمان انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے ـــــــ علامہ مشرقی نے انتخابات میں لیگ کا مقابلہ کیا اور ایک اچھا خاصا منشور چھاپا تھا، لیکن بیوہ کے آنسو کی طرح اس منشور کو ہمراز ملا نہ ہمدرد، بے سہارا ختم ہو گیا۔

ان دنوں سب سے قابلِ رحم حالت کمیونسٹوں کی تھی، یہ لوگ جو اپنے نصب العین کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں، پورے ملک میں ڈانواں ڈول تھے، ان کے نزدیک تاریخ کا جدلی عمل ہی سب کچھ تھا، کمال ان کا یہ تھا کہ ملک کے نوجوان اہلِ قلم ان کے ساتھ تھے، سارے ملک میں پشاور سے کلکتہ اور مدراس سے سری نگر تک نوجوان ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کا ایک جمِ غفیر ان سے منسلک ہو چکا تھا اور وہ ترقی پسند مصنفین کے نام سے اُڑے پھرتے تھے، ان سب نے ملک کے ادبی رسالوں اور اُسوقت کے بعض اخباروں پر تسلط جما رکھا تھا، بڑی بات یہ تھی کہ مسلمان اہلِ قلم کی نوجوان پود بھی ان کے ساتھ تھی، ترقی پسند تحریک اپنے مثبت و منفی نتائج کے اعتبار سے بڑے گہرے تجزیہ کی مستحق ہے، ترقی پسند مصنّفین میں سے ایک بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے پاکستان کی تحریک میں اپنے فن کے ساتھ حصّہ لیا، پنجاب میں فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی ترقی پسندوں کے سرخیل سمجھے جاتے تھے، ان کے قلم سے تحریک پاکستان کے بارے میں کوئی مواد نہیں، جن اہلِ قلم کا دعویٰ تھا کہ وہ اس دور میں شعر و انشاء کی نمائندگی کرتے ہیں، اور ان کا قلم عوام کا قلم ہے، ان کے قلم سے سٹالن، لینن، کارل مارکس وغیرہ پر تو شاعری کے ذخیروں میں بہت کچھ جمع ہو گیا لیکن قائد اعظم کی رحلت پر بھی ان کا قلم گنگ رہا، پاکستانی قومیت کے نشو و نما میں ان کے ادب نے کبھی دلچسپی نہیں لی، یہ گویا پاکستان کے اشتراکی فرزند تھے۔
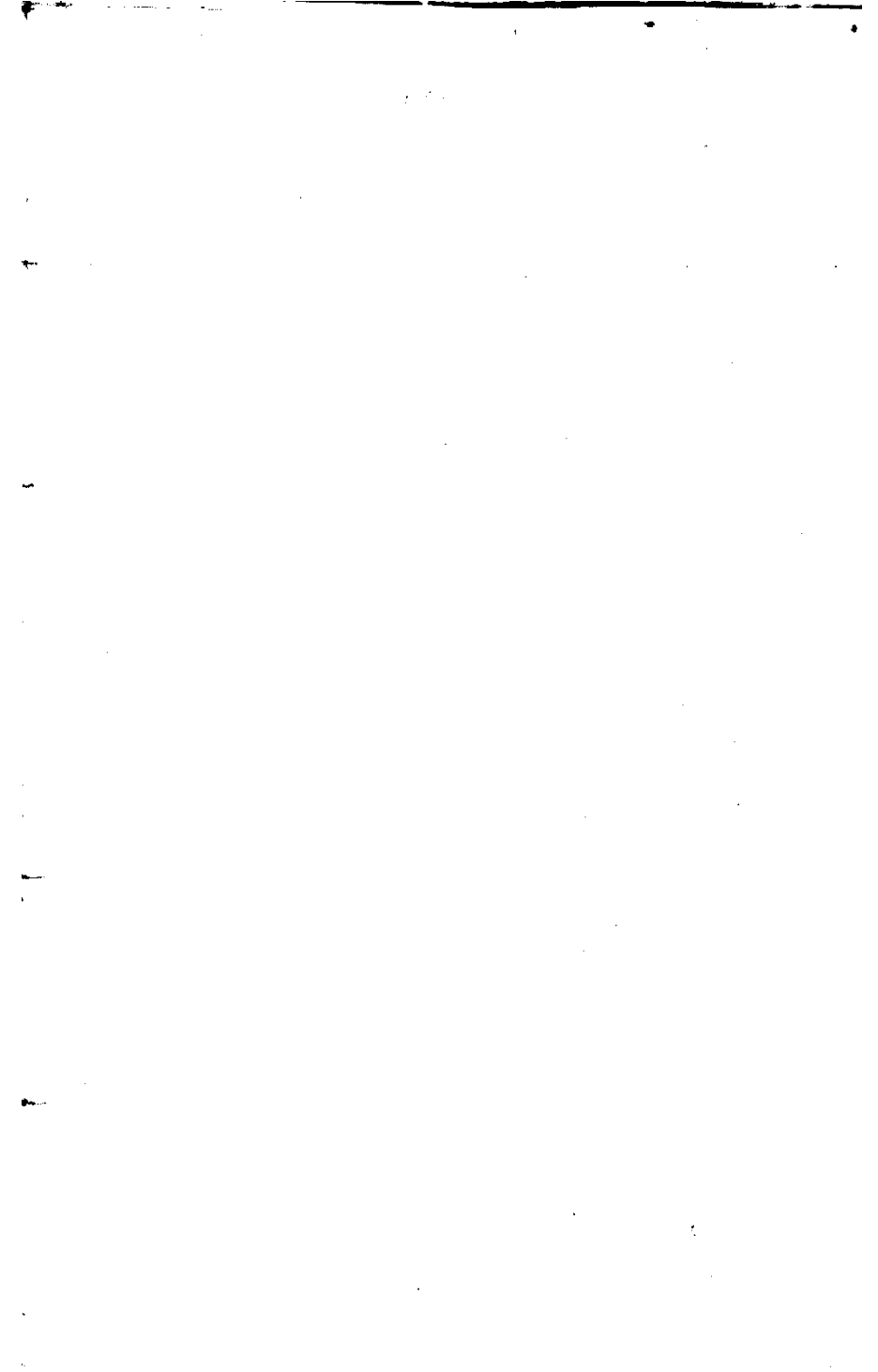
وزارتی مشن

وزارتی مشن [1] کی آمد ہندوستان کی آزادی کے اعتراف کا آغاز تھی، برطانوی حکومت کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ ہندوستان کو غلام نہیں رکھ سکتی اور نہ اس کے پرانے ہتھکنڈے کام آسکتے ہیں، پورا ملک جاگ اٹھا تھا۔

خود ہندوستان کے لیڈروں کو اندازہ نہیں تھا کہ برطانوی حکومت اتنی جلدی جانا چاہتی ہے، ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے سوال پر لندن میں گول میز کانفرنسیں ہوتی تھیں، اُس وقت آزادی کا مسئلہ ایک خواب تھا، اب پندرہ سال بعد آزادی کا خواب ایک حقیقت تھا لیکن ہندوستان کے زعماء دفعتہً ششدر تھے کہ آزادی آرہی ہے یا وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں، سردار عبدالرب نشتر نے پاکستان بن جانے کے بعد گورنری کے دنوں میں مجھ سے بیان کیا تھا کہ وزارتی مشن ان دنوں ہندوستان چھوڑ دینے پر اس طرح مضطرب تھا جس طرح کوئی عورت اپنی لغزش کے اسقاط حمل پر حیراں ہو، جواہرلال نے ایک نجی گفتگو میں کہا تھا ہم انگریزوں کو روکنا چاہتے تو بھی روک نہیں سکتے تھے، گاندھی جی کے الفاظ تھے ہندوستان میں انگریزوں کے دن پورے ہو گئے ہیں وہ ملبے ملبے ڈگ بھرتا ہوا نکل جانا چاہتا ہے، پورے ہندوستان کی نگاہیں دہلی پر لگی ہوئی تھیں، تمام جماعتوں کے چیدہ چیدہ رہنما سیاسیات کے اس آخری ڈراپ سین کو دیکھنے جمع ہو گئے تھے لیکن گفتگو کا حقیقی محور کانگریس تھی یا لیگ، پورا ملک انتظار میں تھا کہ پردۂ غیب سے کیا طلوع ہوتا ہے، اضطراب

---

[1] وزارتی مشن لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند۔ سر سٹیفورڈ کرپس اور مسٹر الیگزینڈر پر مشتمل تھا۔

کے ساتھ برہمی کے آثار بھی تھے، اضطراب لیگ کو بھی تھا اور کانگرس کو بھی، کانگرس کو خطرہ تھا کہ ہندو مسلم سوال عقدۂ لاینحل ہو گیا ہے، جس سے ملک میں زبردست کشیدگی راہ پا گئی ہے، لیگ اس سوچ میں تھی کہ پاکستان سے کیا سلوک ہوتا ہے ۔مسلمان برہم تھے کہ ہندو اپنی اکثریت کے زعم میں پاکستان ہڑپ کر جانا چاہتے ہیں، ہندو مضطرب تھے کہ مسلمان بھارت ماتا کے ٹکڑے کر رہے ہیں، انگریز ان حالات کو اُلجھا کر سلجھا رہا تھا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا ــــــ

دہلی میں مختلف صوبوں کے فسادی اکٹھے ہو رہے تھے، روز افواہیں اُڑتی تھیں کہ فلاں صوبہ سے فلاں غنڈہ آیا ہے، اور فلاں جگہ فلاں خطرہ پیدا ہو گیا ہے، برلا کے متعلق مشہور تھا کہ اُس نے اتنے ہزار بلم، چھریاں، چاقو اور ریوالور ہندوؤں میں تقسیم کیے ہیں، ہندوؤں میں کیا غُل تھا، ہم اندرخانہ سے ناواقف تھے لیکن انہیں بھی پنجابی مسلمانوں کا وجود مسلح نظر آ رہا تھا، ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال جانبین کے لیے خوش آئند نہ تھی، شاہ جی نے گاندھی جی سے ذکر کیا، گاندھی جی نے وائسرائے سے کہا، شام کی پرارتھنا میں بیان کیا، کہ انہیں ایک ذمہ دار انسان نے دہلی میں فساد کے خطرہ سے آگاہ کیا ہے ــــــ اس انتباہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی ۱۵ اگست ۴۷ء تک فساد سے محفوظ ہو گیا لیکن فساد کا التوا ہو گیا، انسداد نہ ہو سکا۔

مشن نے کانگرسی رہنماؤں مولانا آزاد، مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو سے بہت سی ملاقاتیں کیں، لیکن لیگ کی جانب سے صرف قائداعظم ہی ملتے رہے، چودھری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل میرٹھی نے اپنے طور پر مولانا آزاد سے خفیہ ملاقات کی، یہ کہنا مشکل ہے کہ اس ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں۔ لیکن بعض ثقہ روایتوں کے مطابق انہوں نے یہ کہا کہ وہ صورتِ حال سے بے خبر ہیں، قائداعظم ورکنگ کمیٹی کو اعتماد میں نہیں لیتے، اور جو کچھ کہہ سن رہے ہیں ان کے اپنے صوابدید پر ہے، مولانا آزاد نے وزارتی مشن سے ذکر

کیا اور تجویز کی کہ دونوں جماعتوں کی ورکنگ کمیٹی کو بلاکر گفتگو کر لی جائے، لیکن قائدِ اعظم نے شروع ہی میں ورکنگ کمیٹی سے اعتماد نامہ حاصل کر لیا کہ قائدِ اعظم ہی تنہا گفتگو کے مسئول و مجاز ہیں، آخر کریپس کی تجویز پر دونوں طرف کے چار چار نمائندوں پر مشتمل مشترکہ کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ہو گیا، کانگرس کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور خان عبدالغفار خان، لیگ کی طرف سے قائدِ اعظم، خان لیاقت علی خان، نواب اسمٰعیل میرٹھی اور سردار عبدالرب نشتر ——— خان عبدالقیوم خان کی حیلہ سازی کے باعث سردار عبدالرب نشتر انتخاب میں ہار گئے تھے۔ لیکن خان عبدالغفار خاں کی نامزدگی انہیں چپکا گئی۔

گرمی کا موسم تھا، مشن نے کانفرنس کا انعقاد شملہ میں کیا، ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو چار چار نمائندے مانگے گئے، ۳۰ اپریل کو ان نمائندوں کی فہرست دی گئی، ۵ مئی کو دس بجے صبح کانفرنس شروع ہوئی، پہلے دن تین روز کے لیے ملتوی ہو گئی، ۸ مئی کو دوبارہ اجلاس ہوا، پھر ایک روز کے لیے ملتوی ہو گیا، ۹ مئی کو پنڈت جواہر لال نہرو مفاہمت کی تلاش میں قائدِ اعظم سے ملے، یہی ملاقات ۱۱ مئی کو دوبارہ ہوئی، لیکن ۱۲ مئی کو کانفرنس کی ناکامی کا اعلان ہو گیا۔

اپنے قیام کے تقریباً ڈھائی مہینوں میں وزارتی مشن نے بعض دوسری جماعتوں اور مختلف فرقوں کے رہنماؤں سے بھی ملاقات کی، ان ملاقاتوں میں ماسٹر تارا سنگھ، ڈاکٹر امبیدکر، ملک خضر حیات خاں ٹوانہ، ڈاکٹر خاں صاحب، مسٹر این ایم جوشی، نواب چھتاری، نواب بھوپال، سرت چندر بوس، اور کانگرسی صوبوں کے وزرائے اعظم وغیرہ شامل تھے نیشنلسٹ مسلمانوں کا متحدہ محاذ خواہاں تھا کہ وزارتی مشن سے اُن کی ملاقات ہو، چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی سفارش پر مولانا حسین احمد مدنی (صدر جمعیۃ العلماء ہند)، شیخ حسام الدین (صدر مجلسِ احرار اسلام)، شیخ ظہیر الدین (صدر مومن کانفرنس)

اور خواجہ عبدالمجید (صدر مسلم مجلس) کا چار رکنی وفد ۶ ۲ر اپریل کو مشن سے ملا۔ اس ملاقات میں لارڈ پیتھک لارنس غیر حاضر تھے، لارڈ ویول اثنائے گفتگو میں اُٹھ کے چلے گئے، سر کرپس کے استفسار پر ارکانِ وفد نے اپنا اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا، مولانا مدنی علیہ الرحمۃ کی ترجمانی کے فرائض حافظ ابراہیم نے انجام دیئے، مولانا سے کرپس نے سوال کیا آپ کی جماعت کے متبعین کی تعداد کتنی ہے؟ مولانا نے فرمایا دو کروڑ، شیخ ظہیر الدین نے کہا کہ وہ انصار کے رہنما ہیں، اُن کی تعداد کوئی ساڑھے تین کروڑ ہے، خواجہ عبدالمجید نے دو کروڑ کے لگ بھگ اپنے ہم خیالوں کی تعداد بتائی، شیخ حسام الدین نے کہا کہ احرار نے پنجاب میں پچیس فی صد ووٹ حاصل کیے ہیں اور گلہ کیا کہ آج تک انہیں اخبار نکالنے کی اجازت ہی نہیں دی گئی، کرپس نے تعجب کا اظہار کیا اور روزنامہ آزاد اِس استعجاب ہی کا نتیجہ تھا، کرپس نے شیخ صاحب سے پوچھا آپ کے پیروکار کتنے ہونگے؟ شیخ صاحب نے کہا پچاس لاکھ، کرپس مسکرائے، کہنے لگے آپ لوگوں نے اپنے اپنے پیروکاروں کی جو تعداد بتائی ہے وہ مل جل کر آٹھ کروڑ بنتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مسٹر جناح کس خطہ کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں؟

بہرحال اس ملاقات کا ایک نتیجہ ضرور نکلا کہ احرار کو روزنامہ آزاد کا ڈیکلریشن مل گیا، زمانہ ایسا تھا کہ جنگ کی وجہ سے کوئی سا نیا اخبار مرکزی حکومت کی اجازت کے بغیر نکل نہیں سکتا تھا، نیوز پرنٹ کنٹرول تھا اور اس کا پرمٹ مرکزی حکومت کی منظوری سے جاری ہوتا تھا۔

شیخ صاحب اور ماسٹر صاحب میں کچھ دنوں انگریزی استعداد کے متعلق لطیفہ بازی رہی، شیخ حسام الدین کہتے آپ کا لہجہ اس طرح تھا گویا کرکہ چل رہا ہے، ماسٹر ظہیر الدین کہتے آپ نے انگریزی کو نئی صرف ونحو مہیا کی، جس سے کرپس کی بھی اصلاح ہوگئی ہے۔

ہشت رکنی شملہ کانفرنس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کی طبیعتوں کا طیش اور بڑھ گیا، انہی دنوں مسلم لیگ کی صوبائی اسمبلی پارٹیوں کا ایک کنونشن دہلی عربک کالج میں

ہوا، اس کنونشن میں زناٹے کی تقریریں ہوئیں، ملک فیروز خان نون نے اپنی تقریر میں کہہ دیا پاکستان نہ بنا تو ہم چنگیز و ہلاکو بن جائیں گے، ہندو اخبار حسبِ عادت اس فقرے کو لے اُڑے، ملک بھر میں ہنگامہ برپا ہو گیا، ہندو اور سکھ پہلے سے تیاری کر رہے تھے، مزید تیاری کرنے لگے، مسلمانوں کے پاس الفاظ تھے وہ الفاظ ہی کی پتنگیں اڑاتے رہے۔

آزاد پارک دہلی میں شاہ جی کی ایک تقریر تھی، چاروں طرف انسانی سمندر کا جوار بھاٹا نظر آرہا تھا، تقریر کیا تھی، الفاظ کا جادو، مطالب کی مینا کاری، قرآن کا سحر، قرأت کا جمال و جلال، مسٹر اے ڈی اظہر کا بیان تھا کہ انہوں نے ہاؤس آف کامنز میں چرچل کی تقریریں بھی سنی ہیں، چونکہ انگریزی کا بول بالا ہے لہٰذا اپنے زمانے کا وہ سب سے بڑا خطیب مانا گیا لیکن فی زمانہ شاہ جی سے بڑا خطیب کسی زبان نے پیدا نہیں کیا۔ الفاظ اُن کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض لیے کھڑے ہوتے تھے کہ ہمیں استعمال کریں۔

مولانا حبیب الرحمٰن اپنے طور پر گاندھی جی، جواہر لال نہرو، اور مولانا آزاد کو بھی دعوت دے آتے تھے، مہاتما اور مولانا کہاں آتے؟ جواہر لال اپنی بیٹی اندرا کو لے کر آ گئے، اور اپنے ساتھ کرپس کو بھی لے آئے، تاکہ وہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیں، کرپس تو مجمع پر نگاہ ڈال کر واپس چلے گئے لیکن نہرو ایک کونے میں کھڑے ہو کر ہجوم اور اس کا تاثر دیکھنے لگے، شاہ جی کو پتا چلا تو پنڈت جی کو اسٹیج پر بلا لیا، عوام نے نعرہ ہائے تحسین سے خیر مقدم کیا۔ پنڈت جی نے حاضرین کے اصرار پر چند کلمات کہے اور وہ بھی ملک فیروز خان نون کے جواب میں:

"افسوس اُس قوم کے فرزند چنگیز و ہلاکو کا نام لیتے ہیں جن کی تاریخ میں عمر فاروق جیسے نامور حکمران گذرے ہیں۔"

مجمع بھڑک اُٹھا، جواہر لال چند الفاظ کہہ کر چلے گئے، واہ واہ بھی خوب ہوئی، لیکن فضا میں بدستور چنگیز و ہلاکو اور شیواجی و بندہ بیراگی بھڑک رہے تھے۔

لارڈ ویول نے ان حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے پنڈت نہرو سے کہا کہ ملک میں سول وار چھڑ جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

پنڈت جواہر لال نے جواب دیا:

"سول وار کا اندیشہ محض اندیشہ ہے، جس چیز کو آپ سول وار کہتے ہیں، اس سے ابھی ہندوستان آشنا نہیں، زیادہ سے زیادہ یہاں بڑے پیمانہ پر ہندو مسلم فسادات ہوں گے، ملک کا مزاج جس سطح پہ آگیا ہے اس کے پیش نظر ایسا ہونا ناگزیر سمجھنا چاہیے۔"

لارڈ ویول کا خیال تھا کہ مسلمان جسمانی طور پر ہندوؤں سے مضبوط ہیں، پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ:

"مسلمان اپنے تمام خصائص کے باوجود انقلابی نہیں رہا، اس کی رجعتی لیڈر شپ نے اس کو من حیث الکل کوتاہ فکر اور کوتاہ ہمت کر دیا ہے، اس کے برعکس ہندو انقلابی لیڈر شپ کی وجہ سے تنظیماً بہت آگے نکل چکے ہیں، جہاں کہیں فساد ہوا چند ایک مستثنیٰ صورتوں کے سوا علاقائی اکثریت ہی کو غلبہ حاصل ہو گا۔"

یہ تمام باتیں پنڈت نہرو کی زبانی میر احمد حسین شملوی کے مکان پر معلوم ہوئیں ہم ان کے اوچھے پن سے آگاہ تھے، لیکن کھری بات سب سے زیادہ جن لوگوں کو بری لگتی ہے اپنے ہوتے ہیں، مسلمانوں کی تقدیر جاگیرداروں کے ہاتھ میں رہی یا پھر برطانوی حکومت کے اہلکار ان کا مقدر تھے، ان لوگوں کا مسلمانوں سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا کسی زمانے میں صاحب کا خانساماں سے ہوتا تھا۔

تحریک پاکستان سے پہلے سرکاری آفیسر شاذونادر ہی مسلمانوں کی ملی و قومی تحریکوں کے کام آتے تھے، ان میں حمیت کا جذبہ ہی نہ تھا، مثلاً: مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ

ہی کا سوتیلا بھائی مظہر علی تھانوی پولیس میں تھا، اس نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن علیہ الرحمۃ کے ساتھ جو سلوک کیا انتہائی شرمناک تھا۔ حضرت مدنیؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے انگریز افسروں سے بھی زیادہ سنگدل اور سخت گیر تھا۔ پنجاب، سرحد اور سندھ میں مسلمانوں کی جتنی تحریکیں ابھریں ان سب کو ان افسروں نے ملیا میٹ کیا، ان کے مظالم شقاوتِ قلبی کی انتہا کو پہنچ گئے تھے، کسی زمانہ میں ان مظالم کی تاریخ لکھی گئی اور اس بات کا محاسبہ کیا گیا کہ ان خاندانوں نے دولت کس طرح پیدا کی؟ القابات کیونکر حاصل کیے اور بڑی بڑی اراضی کیسے حاصل کیں؟ تو یہ راز کھل کے سامنے آجائے گا کہ ان کے آباؤ اجداد کے رگ و پے میں جو خون دوڑ رہا تھا وہ ان کی غداریوں ہی سے سرخ یا سپید ہوا تھا۔

مظہر علی نے ایک موقعہ پر ممدوٹ اور خضر حیات دونوں کو سکھوں کی مسلح تیاری سے مطلع کیا، خود یونینسٹ وزارت نے سی آئی ڈی کی معرفت اسلحہ کی تقسیم و تنظیم کے متعلق معلومات حاصل کیں، وزارت کے علم میں تھا کہ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کا بے پناہ روپیہ اسی کام میں صرف ہو رہا ہے، اس کے علاوہ مہاراجہ پٹیالہ اور دوسری سکھ ریاستوں کے مخفی عزائم کا حال بھی معلوم تھا لیکن وزارت کے بزرجمہر کوئی ایکشن لینے سے قاصر تھے، پولیس میں مسلمانوں کا زور تھا لیکن ان کا نزلہ زیادہ تر مسلمانوں ہی پر گرتا، امرتسر، جالندھر، ہوشیارپور، فیروزپور اور لدھیانہ کے اضلاع میں سکھوں کے پاس بے شمار اسلحہ تھا، مگر اس کا برآمد کرنا مشکل تھا، سکھ اور ہندو افسر انہیں قبل از وقت مطلع کر دیتے اور وہ ان افسروں سے تعلقات کے باعث محفوظ ہو جاتے۔ مغربی پنجاب کے اضلاع میں پولیس کا سپیشل سٹاف نمبرداروں اور ذیلداروں کے ساتھ اودھم مچاتا رہا، مسلمان پولیس افسروں کے لیے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ، عہدہ پر ترقی، چھوٹا موٹا خطاب، اور ایک آدھ مربع اراضی حاصل کرنا ہی عاقبت کا نوشتہ تھا، پولیس کے لٹھ مار مختلف دیہات میں جا کر وہاں کے نوجوانوں کو اکٹھا کرتے، پھر ان کے چوتڑوں پر جوتے لگاتے اور اس طرح اسلحہ نکلواتے تھے۔

ماسٹر تارا سنگھ کا ایک مضمون انہی دنوں (۱۹۴۷ء) روزنامہ اجیت میں چھپا تھا، اس مضمون میں لکھا تھا کہ انہیں یقین تھا جاپان نے حملہ کیا تو انگریز ہندوستان میں ٹھہر نہیں سکیں گے، لہٰذا سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کرنے اور مہاراجہ پٹیالہ کو مسندِ اقتدار سونپنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چودھری افضل حق کا بھی یہی خیال تھا کہ اس جنگ میں انگریز جیت بھی گیا تو وہ ہندوستان میں نہیں ٹکے گا، اس صورت میں وہی جماعت ملک پر قابض ہو گی جس کے پاس رضاکاروں کی طاقت ہو گی، احرار رضاکاروں کی تنظیم وہ اسی لیے وسیع اور مضبوط بنانا چاہتے تھے، انہیں زندگی نے مہلت نہ دی، خاکسار اپنوں سے پٹ گئے، لیگ کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ ذہن ہے تنظیم نہیں، پاکستان بنا تو اس ذہن کو تنظیم نہ ہونے کے باعث سب سے زیادہ نقصان اپنے ہی ہاتھوں سے پہنچے گا۔

پاکستان میں تاریخ کا صحیح ذوق اس لیے مفقود ہے کہ طاقت ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو کل تک پولیس اور فوج میں انگریز کے نوکر تھے، آخر یہ راز کب تک مخفی رہے گا کہ سٹینو گرافر انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے پر کس طرح پہنچے؟ اور پولیس کپتان کیونکر گورنر ہو گئے یا جن لوگوں نے برطانوی تاج کی وفاداری کا حلف اٹھایا تھا اور کمیشن لے کر اس کی خاطر اسلامی ملکوں اور اسلامی خون پر حملہ آور ہوتے رہے وہ کس اسلام دوستی کے صلے میں تاجِ خسروی پہن کر مسلمانوں کی تقدیر کے مالک بن گئے، اور اپنے افکار و سوانح کو طائرِ لاہوتی کی سرگذشت کہنے لگے۔

میرے ذہن میں ان لوگوں کی ایک مکمل تصویر ہے، یہ تصویر انگریزوں کے عہد میں بھی تیار ہوتی رہی، اور اب بھی تیار ہو رہی ہے، مَیں عمر کی اس منزل میں ہوں کہ مجھے کوئی طلب یا خواہش نہیں تاہم میرے سامنے یہ دلگداز حقیقت ضرور ہے اور کبھی کبھار میرے قلم سے مطالبہ کرتی ہے کہ اُن چہروں کو بے نقاب کروں جن کے ضمیر و خمیر میں انگریزوں کی وفاداری کے سوا کچھ نہ تھا جنہوں نے پاکستان اور ہندوستان کی ناقہ سیاست سے

لیلائے آزادی کو اغوا کیا اور اپنے حرمِ اقتدار میں لے گئے۔ گو اظہار کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں لیکن احساس قریب قریب یکساں ہوتا ہے، بہ قولِ اقبال ؎

شبے ایں انجمن آراستم من!
چو مہ از گردشِ خود کاستم من!

وزارتی مشن ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو دہلی پہنچا، ۱۲ مئی تک لیڈروں سے گفتگو کرتا رہا، باہمی مصالحت کا راستہ بند ہو گیا تو ۱۶ مئی کو اس نے اپنے پلان کا اعلان کر دیا، سب سے پہلے اس اعلان میں وزیر اعظم برطانیہ مسٹر کلمینٹ اٹیلی کی تقریر کا حوالہ دیا کہ "وزارتی مشن ہندوستان کو آزادی سونپنے جا رہا ہے، لیکن اِس حق آزادی کے خط و خال بنانے اور سنوارنے کا واحد حق خود ہندوستان کو حاصل ہے" مشن نے سب سے زیادہ بحث پاکستان کے موضوع پر کی، بظاہر پاکستان کے مطالبہ کو تسلیم نہ کیا لیکن پلان کے خاکے میں پاکستان کے مطالب ضرور مضمر تھے، وزارتی مشن نے پاکستان کے خلاف جو دلائل دیئے وہ بہ تلخیص حسب ذیل ہے۔

(۱) اگر پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان، آسام اور بنگال کے تمام صوبوں کا ایک بڑا پاکستان بنایا جاتا ہے تو اس میں غیر مسلموں کی بہت بڑی تعداد رہ جاتی ہے۔

(۲) اور اگر ان صوبوں کے غیر مسلم علاقوں کو نکال کر پاکستان کی نیو رکھی جاتے تو صوبائی تقسیم سے بنگال اور پنجاب کی قومیں جن کا ایک مخصوص کلچر ہے منقسم ہو جائیں گی اور سکھ دو ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے۔

(۳) رسل و رسائل کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے سے دونوں علاقوں کو نقصان پہنچے گا۔

(۴) ہندوستان کی تقسیم سے دیسی ریاستوں کے لیے دقتیں پیدا ہوں گی کہ کس حصّہ میں شامل ہوں۔

(۵) مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان سات سو میل کا فاصلہ ہو گا۔

اندریں حالات حکومتِ برطانیہ، ہندوستان کے دو ٹکڑوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ اقتدار سونپ کر نہیں جا سکتی، مشن نے اپنی سفارشات کو چھ دفعات پر مشتمل کیا۔

اوّلاً، برطانوی ہند اور ریاستوں کی ایک یونین ہوگی جس کے ہاتھ میں امورِ خارجہ، دفاع اور نقل و حمل کے محکمے ہوں گے، ان امور کے واسطے روپیہ حاصل کرنے کا یونین کو اختیار ہوگا۔

ثانیاً، یونین کی ایک مجلسِ قانون ساز ہوگی اور ایک مجلسِ عاملہ جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔

ثالثاً، جو معاملات ہندوستانی یونین کے سپرد کیے گئے ہیں ان کے سوا تمام امور صوبوں کے اختیار میں ہوں گے جن میں باقی اختیارات بھی شامل ہیں۔

رابعاً، ان امور کے سوا جو یونین کے تحت ہوں گے تمام اختیارات ریاستوں کے ہاتھ میں ہوں گے۔

خامساً، صوبوں کو گروہ بندی کا اختیار ہوگا اور اُن کی وحدت اپنی الگ مجلسِ مقننہ اور مجلسِ منتظمہ رکھ سکے گی، ہر گروہ کو یہ حق ہوگا کہ وہ طے کر دے کہ کتنے صوبجاتی اختیارات مشترک کر لیے جائیں۔

سادساً، یونین اور گروہ کے دستور میں ایک شرط یہ بھی شامل ہوگی کہ کوئی صوبہ اگر انڈین یونین یا اپنے گروہ کے دستور پر نظرِ ثانی کرانا چاہے تو وہ اپنی اسمبلی کی اکثریت سے اس طرح کی تجویز پاس کرا کے نظرِ ثانی کرا سکے گا۔

مندرجہ بالا بنیادوں پر وزارتی مشن نے دستور ساز اسمبلی قائم کی، اس کے ممبر ۳۸۵ تجویز کیے گئے، جن میں ۲۱۰ ہندو، ۷۸ مسلمان، ۴ سکھ اور ۹۳ دیسی ریاستوں کے نمائندے تھے، اس کے علاوہ دہلی، اجمیر، بلوچستان اور کورگ سے ایک ایک نمائندہ شامل کیا گیا، ہر دس لاکھ کے پیچھے ایک نمائندہ رکھا گیا، ان نمائندوں کا پہلا کام یہ تھا کہ جمع ہوں،

اپنا صدر چنیں، چند بنیادی شہری حقوق طے کریں، پھر مندرجہ ذیل تین گروہوں میں بٹ جائیں:

(۱) یو پی، بہار، سی پی، اڑیسہ، بمبئی اور مدراس ان چھ صوبوں کا ایک گروپ ہوگا، جو اے گروپ کہلائے گا، اس گروپ میں ۱۶۷ ہندو اور ۲۰ مسلمان ہوں گے۔ (یہ عملاً ہندو گروپ تھا)۔

(۲) دوسرا گروپ پنجاب، سرحد، اور سندھ پر مشتمل ہوگا، جس میں ۲۲ مسلمان ۹ ہندو اور ۴ سکھ یعنی کل ۳۵ ارکان ہونگے (یہ گروپ عملاً مسلم گروپ تھا) اس کے سپرد اپنے صوبوں کے دستور کی تیاری تھی۔

(۳) تیسرے گروپ میں آسام اور بنگال تھے جس میں ۳۶ مسلمان اور ۳۴ ہندو یعنی کل ۷۰ ممبر رکھے گئے تھے۔ اس گروپ کو سی گروپ کا نام دیا گیا۔

دہلی اجمیر اور کورگ کے تین نمائندے اے گروپ میں اور بلوچستان کے ایک نمائندے کو بی گروپ میں شامل کیا گیا۔

۹۳ نمائندے ریاستوں کے تجویز کیے گئے، جنہیں ریاستوں کی دستور سازی کا کام سپرد کیا گیا۔

یہ ارکان گروہوں میں تقسیم ہونے سے پہلے اپنا مرکزی دستور تیار کر سکتے اور اگر نہ چاہیں تو پہلے گروہوں کا دستور بنانے کے مجاز تھے، اگر کسی گروپ کی اکثریت یہ فیصلہ کرے کہ گروپ نہ بنے تو بھی یہ ارکان اس کے مجاز تھے۔

پلان کے شائع ہوتے ہی ایک سناٹا چھا گیا، کانگرس اور لیگ دونوں کے رہنما کچھ دنوں لیے دیئے رہے، ہندو اخباروں نے ابتداءً خوشی محسوس کی کہ پاکستان کا استرداد ہو گیا لیکن جب لیگ نے پلان پر صاد کیا تو انہیں رفتہ رفتہ پلان میں پاکستان نظر آنے لگا، یہ پہلا موقع تھا کہ لیگ نے فیصلہ کرنے میں پہل کی، کانگرس کے رہنما چھوٹے'

تعبیروں اور تاویلوں کے چکر میں پڑ گئے، اصل بگاڑ عبوری حکومت کے مسئلہ سے ہُوا، لیگ نے شمول پر رضا مندی ظاہر کی، کانگرس بگڑ گئی، ویول منحرف ہو گیا، پنڈت نہرو دوبارہ مَن گئے تو لیگ شمول کی قرارداد واپس لے چکی تھی ——— نظر بہ ظاہر پلان میں کانگرس کے موافق حسب ذیل نکات تھے ۔

(۱) کانگرس نے ہندوستان کی مکمل آزادی یعنی برطانیہ سے قطع تعلق کا مطالبہ کیا تھا وہ بڑی حد تک تسلیم کر لیا گیا ۔

(۲) کانگرس نے سارے ہندوستان کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی کا مطالبہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا ۔

(۳) کانگرس نے متحدہ ہندوستان یعنی سارے ہندوستان کے لیے ایک مرکز پر زور دیا تھا وہ پُورا ہُوا اور ہندوستان کی وحدت قائم رہی ۔

(۴) کانگرس دستور ساز اسمبلی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی مساوی نمایندگی پر تیار نہ تھی بلکہ آبادی کے لحاظ سے نمائندگی پر زور دیتی تھی، یہ مطالبہ بھی پُورا ہُوا ———

کانگرس کے خلاف نکات :

(۱) ہندوستان کا مرکز کمزور رکھا گیا ۔

(۲) صوبوں کو اپنے علیحدہ علیحدہ گروپ بنانے کی اجازت دی گئی جس سے ہندو مسلم اساس پر ایک وحدت کے تین خانے ہو گئے ۔

(۳) اقلیتوں کے ہاتھ میں یہ حربہ دے دیا گیا کہ کوئی فرقہ وار مسئلہ جو اس فرقہ کی اکثریت کے خلاف ہو، انڈین یونین میں پیش نہیں کیا جا سکتا ۔

مسلم لیگ کے موافق حسب ذیل نکات تھے :

(۱) صوبوں کی گروہ بندی کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا، اگر مسلم صوبے اپنا گروہ بنانا چاہیں تو ایسا کر سکتے تھے ——— تین صیغوں یعنی فوج، خارجہ اور مواصلات کے

سوا صوبے ہر معاملہ میں آزاد و خود مختار رکھے گئے۔

(۲) بی اور سی گروپ اپنے اپنے حلقہ میں جس قسم کا آئین چاہیں بنا سکتے تھے۔

(۳) یہ شرط کہ کسی فرقہ کی اکثریت کے بغیر کوئی فرقہ دار مسئلہ یا اس کے متعلق مسودۂ قانون، دستور ساز اسمبلی اور انڈین یونین میں پیش نہ ہو سکے گا مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک زبردست حربہ تھا جس سے وہ ڈیڈلاک تک پیدا کر سکتے تھے۔

(۴) صوبوں کو یہ حق دیا گیا کہ دس سال بعد وہ دستور پر نظر ثانی کی درخواست کر سکتے اور ہندوستان سے علیحدگی کی تحریک کر سکتے ہیں، یعنی دس سال بعد مجرّد پاکستان بن سکتا تھا۔

مسلم لیگ کے خلاف نکات:

(۱) ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم نہ کیا گیا۔

(۲) دو دستور ساز اسمبلیاں نہ مانی گئیں۔

(۳) ہندوستان متحد رہا، لیگ کے مطالبہ کے مطابق تقسیم نہ کیا گیا۔

(۴) صوبوں کو اختیار دیا گیا کہ نئے چناؤ کے بعد جو اسمبلی بیٹھے گی اس میں کوئی صوبہ گروپ سے علیحدگی کا فیصلہ کر دے تو متعلقہ صوبہ علیحدہ ہو سکے گا۔

(۵) دستور ساز اسمبلی میں لیگی مطالبہ کے مطابق مساوی یا تہائی نمائندگی بھی نہ دی گئی، یہاں تک کہ ایک چوتھائی نمائندگی سے بھی محروم رکھا گیا، یعنی ۳۸۵ کے ایوان میں صرف ۷۹، گویا ۲۲ فی صد۔

(۶) مسلم صوبوں کو بی اور سی دو گروہوں میں دو ٹکڑے کر دیا گیا۔

یہ اُس وقت کے تجزیے اور تبصرے کا خلاصہ تھا۔

یہ ذکر پہلے آچکا ہے کہ مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شمول کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن کانگرس نے ۲۰ جون کو شامل ہونے سے انکار کر دیا، لارڈ ویول کا فرض تھا کہ

مسلم لیگ کو کابینہ بنانے کی دعوت دیتے لیکن اندر خانہ جانے کیا پیچ پڑا کہ وہ منحرف ہو گئے، قائداعظم نے لارڈ ویول کو اس بدعہدی پر آڑے ہاتھوں لیا ——— نتیجۃً چند روز تک عبوری حکومت کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا رہا، کچھ دنوں بعد لارڈ ویول اور پنڈت نہرو میں جانے کیا باتیں ہوئیں کہ انہوں نے عبوری حکومت بنانے کا فیصلہ کیا، پنڈت نہرو رسمی دعوت لے کر قائداعظم کے پاس گئے، قائداعظم شمول کی قرار داد واپس لے چکے تھے انہوں نے انکار کر دیا، پنڈت نہرو نے خود کابینہ یا ایگزیکٹو کونسل ترتیب دے لی، مسٹر آصف علی کو کانگرس کے کوٹے میں شامل کیا گیا، مسلم لیگ کے لیے پانچ ارکان کا کوٹہ تھا، اعلان کیا گیا کہ لیگ جب چاہے شامل ہو سکتی ہے، اُس کی غیر حاضری میں کام چلانے کے لیے سر شفاعت احمد اور سید علی ظہیر کو شامل کیا گیا۔

مسلمانوں کا بھڑک اٹھنا قدرتی امر تھا ان کے لیے حکومت اور کانگرس کا یہ اتحاد و اقدام انتہائی اشتعال انگیز تھا۔ شہید سہروردی نے ایک بیان میں کہا کہ بنگال اس مرکزی حکومت کو تسلیم ہی نہیں کرتا، مسلمانوں کی حق تلفی کی گئی تو ہم اس مرکز ہی سے قطع تعلق کر لیں گے۔

غرض سارے ملک میں فرقہ وار آب و ہوا سموم و صرصر سے بھی زیادہ تیز ہو گئی ——— ایک نوجوان نے شملہ میں سر شفاعت احمد پر قاتلانہ حملہ کر دیا اور وہ بال بال بچے۔

چیدہ چیدہ واقعات

(۱) مظہر علی گئے تو شیخ حسام الدین امیدوار ہو گئے، لیکن مظہر علی صوبائی وزارت کے امیدوار تھے، شیخ صاحب کے دماغ میں ایگزیکٹو کونسل کا سودا سما گیا، اُن سے جانے کس نے کہہ دیا کہ ان کا نام بھی جواہر لال کے زیر غور ہے اور کنجی مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ میں ہے، مولانا حبیب الرحمٰن کو بھجوایا کہ دہلی جا کر ٹوہ لگائیں، مجھے ساتھ کر دیا۔ شیخ صاحب کا خیال تھا کہ مولانا آزاد سے میں قریب ہوں، ممکن ہے اُن سے کہہ سکوں۔ خیر ہم دونوں دہلی گئے۔ مولانا آزاد اسی صبح مسوری جا چکے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن نے آصف علی سے ملاقات کی اور پوچھا:

"مزید دو ممبروں کے لیے کس کے نام قرعۂ فال پڑ رہا ہے؟

آصف علی نے لاعلمی ظاہر کی۔ مولانا نے پوچھا: "شیخ حسام الدین کا نام تو زیر غور نہیں؟"

آصف علی نے چہرے کی مسکراہٹ کو سمیٹتے ہوئے کہا:

ان کا ذکر تو کہیں نہیں آیا، البتہ ماسٹر ظہیر الدین دو ایک دفعہ پھیرا ڈال گئے ہیں لیکن ان کا لیا جانا خارج از بحث ہے۔"

وہاں سے ہم جواہر لال نہرو کے ہاں گئے۔ پنڈت جی اس وقت اپنے سرکاری بنگلے میں ترنگا لہرانے کی تیاری کر رہے تھے، سروجنی نائیڈو نے جھنڈا لہرایا، اندرا گاندھی

بھی وہیں تھیں، اِن تینوں نے مؤدّب ہو کر ترنگے کو سلام کیا، فارغ ہوئے تو پنڈت جی مجھے اور مولانا کو ساتھ لے کر ایک کمرے میں چلے گئے وہاں کوئی دو گھنٹہ مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی، مولانا نے شیخ صاحب کا ذکر کیا تو انہیں حیرت ہوئی، کہنے لگے:

"اصل فیصلہ تو مولانا آزاد کے ہاتھ میں ہے، لیکن لوگ جتنا اس کام کو سہل سمجھتے ہیں اتنا سہل نہیں، یہ ایک بڑا ہی دشوار منصب ہے، حکومت ہند کا کاروبار ایک چیستاں ہے، ہر بات بیسیوں ترازوؤں میں تُل کے آتی ہے، مرکز کے سیکرٹری بالخصوص انگریز اتنے کائیاں واقع ہوتے ہیں کہ تلوار کی دھار سے بھی زیادہ باریک بات کرتے ہیں، آسمان میں تھگلی لگا لیتے اور فرش پر سورج اتار لاتے ہیں۔ اس سے پہلے کابینہ کے اکثر ارکان ان کی جیبی گھڑی تھے، چھوٹی سُوجھ بوجھ کا آدمی تو ان کے سامنے ٹک ہی نہیں سکتا، ان لوگوں کا وتیرہ ہو گیا تھا کہ اپنے ممبر سے مشورہ کیے بغیر سیدھا گورنر جنرل کے پاس چلے جاتے اور اہم فیصلے کرا لیتے تھے، مَیں نے چارج سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ گورنر جنرل سے سکرٹریوں کی ڈائریکٹ ملاقاتیں روک دیں، جز بز ضرور ہوئے لیکن بے سُود، ہمارے پیشرو ان کے کاموں میں مداخلت نہ کر کے روپیہ کماتے تھے۔"

پنڈت جی نے پچھلی کابینہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ خوراک کے ہندو ممبر نے جنگ میں کس سنگدلی سے روپیہ پیدا کیا اور رشوت کے کیسے کیسے ریکارڈ قائم کیے۔ شیخ صاحب کے مسئلہ پر مزید کہا کہ یہ بھاری پتھر ہے اُن سے نہیں اُٹھ سکے گا، یہ جواب پا کر مولانا حبیب الرحمٰن مولانا آزاد سے ملنے مسوری چلے گئے، مولانا آزاد نے فرمایا۔

"میرے بھائی! شیخ صاحب کا معاملہ تو زیرِ غور ہے۔
مَیں ان کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ ضرور پیدا کروں گا، رہا عبوری حکومت کا معاملہ تو وہ ان کے ڈھب کی چیز نہیں، وہی شخص اس سے عہدہ برا ہو

سکتا ہے جو عمرو عیار قسم کے سکرٹریوں سے نپٹ سکتا ہو۔"

کچھ عرصہ بعد لالہ بھیم سین سچر (وزیرِ خزانہ) اور سیٹھ سدرشن سے پتا چلا کہ مولانا نے شیخ صاحب کے لیے پنجاب میں تعلقاتِ عامہ کے ڈائریکٹر کا عہدہ تجویز کیا تھا، ظاہر ہے کہ شیخ صاحب کے لیے وہ عہدہ فروتر تھا خضر حیات سے کہا جاتا تو وہ شاید تقرر سے انکار کر دیتے۔

(۲) پنڈت نہرو نے اثنائے گفتگو میں انکشاف کیا کہ حال ہی میں گورہ فوج نے آزاد سرحدی قبائل پر گولہ باری کی ہے، لیکن انہیں اس کی خبر ہی نہیں دی گئی، خان عبدالغفار خان نے سرحد سے آکر اس خونریزی کا ذکر کیا تو پنڈت جی نے دفاع و خارجہ کے سکرٹریوں سے رپورٹ مانگی، انہوں نے تسلیم کیا کہ ایسا ہوا ہے۔ پنڈت جی نے ان سے کہا اتنا بڑا واقعہ اور میرے علم و مشورہ کے بغیر؟ سکرٹریوں نے کہا یہ معمول کی چیز ہے، آپ چاہیں تو کاغذات ملاحظہ کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں۔"

پنڈت جی نے کہا —— اچھا تو اس "حربی مشق" کو فوراً روک دیا جائے اور آئندہ مجھ سے پوچھے بغیر ایسی کارروائی مطلقاً نہ ہو، پنڈت نہرو کے چہرہ سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس سے پریشان ہیں، انہوں نے مولانا سے کہا آپ اس واقعہ کو کسی پبلک جلسہ میں بیان کریں، میرا حوالہ نہ دیں لیکن حکومت پر زور دیں کہ وہ جواب دے اس سے ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں گے اور آئندہ یہ سلسلہ بھی رک جائے گا۔

مولانا حبیب الرحمٰن نے دہلی کی جامع مسجد میں بمباری کے اس واقعہ کا انکشاف کیا، دوسرے دن اخبارون میں آکر خبر عام ہو گئی، لیکن مرکزی حکومت کا جواب جو ان سکرٹریوں نے تیار کیا، چالاکی و عیاری کا شہکار تھا اس میں کہا گیا کہ بمباری اس لیے کی گئی ہے کہ قبائلی پٹھان ہندوؤں کو اغوا کر کے لے گئے تھے، یہ دودھاری تلوار تھی، جن مسلمانوں نے آزاد قبائل کی بمباری کو کبھی اہمیت نہ دی تھی انہوں نے ملک کے

برہم حالات کو تیز رکھنے کے لیے اس بمباری کو کانگرس کے کھاتے میں ڈالا، اُدھر ہندو اخباروں نے اغوا کے افسانے کی آڑ میں بمباری کی حمایت کی، اور اس طرح موتی لال کا بیٹا جواہر لال خود ہی مجرم ہوگیا، حالانکہ اُس نے اِس واقعہ کا انکشاف۔ ازالہ و انسداد کی غرض سے کیا تھا۔

آزاد قبائل کا مسئلہ ہمیشہ یہی رہا، ان کے علاقہ کو برطانوی حکومت نے شروع دن سے جنگی مشقوں کی جولان گاہ بنائے رکھا، پچھلی صدی کے نصف آخر سے اس صدی کے آغاز تک، آزاد قبائل کو مجاہدین بالاکوٹ اور علمائے حق کے ذوقِ جہاد کی سزا دی گئی، جب یقین ہوگیا کہ اس علاقہ پر قابو پانا مشکل ہے تو پھر اس کو جنگی مشقوں کے لیے منتخب کر لیا اور ہمیشہ اپنے گماشتوں کی معرفت بمباری کا جواز پیدا کیا، سرحد کے پولیٹیکل ایجنٹ اس زمانہ میں عمرو عیار سے کم نہ تھے، ان مسلمان ایجنٹوں اور ان کے نامرد سرداروں نے آزاد قبائل کے ساتھ جو سلوک کیا وہ طلسمِ ہوشربا کا ایک باب ہے، آج تک صداقت کا قلم اس داستانِ سربستہ کی چہرہ کشائی کا منتظر ہے، خدشہ ہے کہ تاریخ کی آنکھیں اس انتظار میں پک کر بے نور نہ ہو جائیں، خان بہادر علی قلی خاں اور اسکندر مرزا استعمار کی انہی زنجیروں کے حلقے تھے، موخرالذکر نے پاکستان میں صدارت کا عہدہ سنبھالا اور سارے ملک کو قبائلی علاقے بنا دیا، اسی کی ذہنی عیاریوں کا نتیجہ تھا کہ ہماری آزادی مجروح ہوگئی اور ہم ابتدائی بنیادی حقوق سے محروم ہوگئے۔

آزاد قبائل کے پٹھان کچھ کرتے تو وہ انگریزوں کے جارحانہ عمل کا ردّعمل تھا لیکن بمباری کے جس تسلسل کو قائم رکھا گیا اُس کے لیے حالات پیدا کیے جاتے اور اس کے مطابق واقعات ڈھالے جاتے تھے ——— سر ونسٹن چرچل نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ میں ابتداءً فوج میں کمشنڈ افسر تھا تو میں نے اس قبائلی علاقہ ہی میں جنگی مشقیں کی تھیں، جب کبھی انگریزی فوج اور اس کے ہندوستانی اعضاء کو فوجی مشق مطلوب ہوتی

یا اپنے بارود کو متروک ہونے سے قبل استعمال میں لانا چاہتے تو قبائلی علاقے کو منتخب کرتے اور کھل کھیلتے۔ ان جنگی مشقوں کے لیے ایجنسیوں کے ایجنٹ فضا فراہم کرتے اور یہی ان کے اعزاز و انعام کا ذریعہ ہوتا، ہندوستان کی قومی تحریک کو احتجاج سے دور رکھنے یا اس کا نکتہ چین بنانے کے لیے قبائل پر بمباری کو فرقہ وار رنگ دیا جاتا، اگر کوئی ہندو لڑکی یا ہندو افراد اغوا ہوتے تو اس اغوا میں خود پولٹیکل ایجنٹوں کا ہاتھ ہوتا، اور وہ بمباری کے لیے اس قسم کے حالات پیدا کر دیتے تھے۔

جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال پہلے شخص تھے جنھوں نے مرکزی اسمبلی میں حکومت ہند کی فارورڈ پالیسی کے خلاف احتجاج کیا۔ اُس زمانے کے انگریز سکرٹری نے اسمبلی میں بیان دیا کہ قبائل کے پٹھان، ہندو عورتوں اور ہندو مردوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں، پنڈت موتی لال نہرو نے اس بیان کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، انہوں نے اسمبلی ہی میں اعلان کیا کہ وہ اپنی بیٹی اور بہو کے ہمراہ قبائلی علاقے میں جا کر خود دیکھنا چاہتے ہیں کہ حکومت کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے؟ ہوم ممبر نے پنڈت موتی لال نہرو کی اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو خان عبدالغفار خاں کی دعوت پر سرحد گئے، اور حکومت کے سینئر نائب صدر کی حیثیت سے قبائلی علاقہ کا دورہ کیا، لیکن اس دورہ میں ملک کی برگشتہ سیاست نے ان سے جو سلوک کیا اور حکومت کے ساتھ مل کر خانزادگان کبیر نے جس آہنگ اور رنگ کے ساتھ پتھراؤ کیا وہ سیاست کے نزدیک صحیح ہو تو ہو لیکن شرافت کے نزدیک صحیح نہ تھا، فی الجملہ خان بہادروں، سروں، او بی ای اور ایم بی ای قسم کے فرزندوں کا گھناؤنا کردار غلامی میں حد درجہ شرمناک رہا، اور اس پر کوئی فخر نہیں کر سکتا۔

تحریک پاکستان بلاشبہ مسلمانوں کی قومی آزادی کا مطالبہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے دامن میں بعض رجعتی لیڈروں اور قومی غداروں نے اس طرح پناہ لی کہ ان کے

نامہ ہائے اعمال ہر گرفت سے محفوظ ہو گئے۔

(۳) مسلم لیگ چند ہفتے عبوری حکومت سے الگ رہی، پھر نواب بھوپال کی درمیان داری سے شامل ہو گئی، سردار پٹیل نے لیگ کو محکمۂ داخلہ نہ دے کر فنانس حوالے کیا۔ ان کا خیال تھا کہ لیگ شاید اس کی اہل نہیں، یا اس محکمہ کی اہمیت مقابلتہً ثانوی ہے، لیکن لیگ نے فنانس کا محکمہ لے کر عبوری حکومت کو جس طرح پریشان کیا اور چودھری محمد علی نے خان لیاقت علی خاں کا مالی مشیر بن کر جو اڑچنیں پیدا کیں اُس کی نشاندہی مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح عمری "ہماری آزادی" سے ہوتی ہے، اس چیز ہی نے سردار پٹیل کو زچ کیا اور وہ پاکستان مان لینے کے لیے ذہناً تیار ہو گیا۔

(۴) مولانا حبیب الرحمٰن مسوری میں مولانا ابوالکلام آزاد سے مل کر واپس آئے تو بتایا کہ پاکستان ناگزیر ہو چکا ہے، کانگرس تیار ہے کہ پاکستان مان لے کیونکہ پاکستان کی وجہ سے ہندوستان کی آزادی میں تاخیر نہیں کی جا سکتی۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی روایت، مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں۔

"ملک اپنی منزل تک اب اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ کانگرس اور مُسلم لیگ میں مفاہمت کی جو رسی ٹوٹ چکی ہے وہ جوڑ دی جائے اور یہ رسی اِسی صورت میں جڑ سکتی ہے کہ جو چیز مانع ہے ختم ہو، اب زیادہ دیر تک نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیے ملک کی گاڑی کو روکے رکھنا کسی تدبّر کی علامت نہیں، ایک بڑے مقصد کے لیے اپنے آپ کو قربان کرنا ایسا اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔"

(۵) میرٹھ میں کانگرس کا سالانہ اجلاس اچاریہ کرپلانی کی صدارت میں ہوا، یہ اجلاس بڑے سخت لب و لہجہ کا حامل تھا، فسادات سارے ملک کے سر پر سوار تھے، کرپلانی کا خطبۂ صدارت فرقہ وارانہ ذہن کا شہ پارہ تھا، سردار پٹیل نے بڑی سخت فرقہ وارانہ تقریر کی۔ گو مولانا

ابوالکلام آزاد کی تقریر اس زہر کا تریاق تھی لیکن تریاق کام نہ آسکا، زہر کارگر ہوگیا ـــــ یہ اُس عمل کا ردِعمل تھا جو لیگ اور کانگریس کے مابین ہو رہا تھا، پنڈت جواہر لال نہرو نے میرٹھ کے اجلاس میں لیگ کے ارکان پر الزام لگایا کہ وہ حکومت کی راہ میں روڑے اٹکاتے اور انگریز سکرٹریوں کے اشارہ پر چلتے ہیں، خان لیاقت علی خان نے پنڈت نہرو کو چیلنج کیا کہ وہ اس کا ثبوت دیں؟

غرض ملک ایامِ حشر کے نزدیک آچکا تھا اور منتظر تھا کب صورِ اسرافیل پھنکتا ہے انسان پاگل ہوگیا اور اس کا پاگل پن اپنے شباب پر تھا، بس بارش کا پہلا قطرہ ٹپکنے کا انتظار تھا۔

(۶) اس زمانے ہی میں روزنامہ آزاد نکلا، شیخ حسام الدین نیوز پرنٹ کا کوٹہ بڑھانے کے لیے سول سپلائی کے وزیر راجگوپال اچاریہ سے ملے اور ان سے ذکر کیا کہ پنجاب میں نیشنلسٹ مسلمانوں کا ایک ہی روزنامہ ہے تو اچاریہ نے ان سے کہا:

"نیشنلسٹ مسلمان تو سارے ہندوستان کے لیے پرابلم بن گئے ہیں"۔

(۷) "آزاد" کی ایڈیٹری" کا سوال پیچیدہ ہوگیا، یہ ایک تلخ سی کہانی ہے اس کا حذف کر دینا ہی بہتر ہے۔ اصولاً تو مجھے ایڈیٹر ہونا چاہیے تھا لیکن شیخ صاحب اڑ گئے، جب صدر مجلسِ احرار بھی وہی تھے تو ایڈیٹر بھی انہی کو ہونا چاہیے تھا، بدقسمتی سے ان کا شعار یہ تھا کہ میرے معاملہ میں وہ زندہ باد کا نعرہ سُن کر بھی خوش نہیں ہوتے تھے۔

بہر حال شیخ صاحب مدیرِ مسئول ہو گئے، ان کے نیچے ماسٹر تاج الدین انصاری کا نام منیجنگ ایڈیٹر کے طور پر آگیا، دائیں طرف یہ دو نام تھے، بائیں طرف نوابزادہ نصراللہ خاں کا اور میرا نام دیا گیا، اور ہم دونوں ادارۂ تحریر تھے۔ اخبار کا ورکنگ ایڈیٹر میں ہی تھا، نواب صاحب شاذ و نادر قلم اٹھاتے، ماسٹر جی ایک آدھ نوٹ لکھتے یا بہرہ مطائبات، شیخ صاحب قلم کے غبی تھے، مَیں ہی ان کے بہت سے اداریے لکھتا رہا، البتہ ایک چیز میں یکسانی رہی کہ جب تک اخبار چلتا رہا ہم قریب قریب اعزازی خدمت کرتے رہے

دوسو روپے ماہانہ فی کس الاؤنس تھا لیکن اخبار اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا، اس کا پہلا دور تقسیم سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

(۸) سال ڈیڑھ سال کا یہ زمانہ آزمائشوں سے اَٹا ہوا اور مشکلوں میں گھرا ہُوا تھا۔ اِدھر ہندو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کھڑے تھے، اُدھر مسلمان میدانِ رستاخیز میں ڈٹے ہوئے تھے، دونوں قوموں کے درمیان ذہنی طور پر گھمسان کی جنگ ہو رہی اور جسمانی طور پہ بلا کا رَن پڑنے والا تھا۔ انگریزوں کا ذہنی جھکاؤ کانگریس کی طرف تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ہندوستان کی قومی لیڈر شپ کے دوست بن جائیں، لیگ میں ایک ہی شخصیت تھی اور وہ قائد اعظم تھے، مایوسیوں کا ایک طوفان، ایک زلزلہ اور ایک سیلاب، چاروں طرف سے اُمڈ آیا تھا، لیکن قائد اعظم اس قدر مضبوط اعصاب کے انسان تھے کہ وہ ہر معرکے ہر مورچے، ہر موڑ اور ہر محاذ پر ایک ہی نعرہ دے رہے تھے ــــــ پاکستان اور صرف پاکستان۔

انہوں نے نہ صرف اپنے اَعصاب کے غیر متزلزل ہونے کا معجزانہ ثبوت دیا بلکہ مسلمانوں کی عصبیت کو اتنا مضبوط کر دیا کہ ان کے دل، دماغ اور زبان پر صرف دو لفظ تھے ــــــ قائد اعظم اور پاکستان

دہلی کی یادیں

مَیں شروع مارچ ۱۹۴۶ء سے اواخر اپریل تک دہلی میں رہا، دلّی دیکھی، دلّی والے دیکھے، ہر گوشہ دیکھا اور جی بھر کے دیکھا، پرانی دلّی کو اس کے رگ و ریشہ میں اُتر کے دیکھا، اس کے مکانوں کو دیکھا، اس کے مکینوں سے ملا، نئی دہلی کے نقش و نگار دیکھے، دلی کتنی ہی دفعہ پرانی ہوئی اور کتنے بار نئی۔

صدیوں کی تاریخ اس ایک نام میں سمٹی ہوئی ہے، اس کے ویرانوں میں آبادیاں سوئی پڑی تھیں، اور اس کی آبادیوں میں ویرانے جاگ رہے تھے، جب تک دہلی میں رہا ایک شاعر کی حیثیت سے اس کے کوچہ و بازار کو تکتا رہا، ایک انشا پرداز کے طور پر اس کے مظاہر و آثار پر غور کیا، اور ایک خطیب کا احساس لے کر اس کے کھنڈروں سے موضوع چنتا رہا، دہلی صرف شاعر و ادیب اور مصوّر و خطیب کی نگاہ ہی سے دیکھی جا سکتی ہے، دلّی نے تاریخ سے قبل اور تاریخ کے بعد کا زمانہ گزارا ہے، کئی سلطنتوں کا جاہ و جلال اس کا ہم آغوش رہا، اور کئی حکومتیں اس کی مٹی میں آکر مٹی ہو گئیں، اس کا سینہ بڑی بڑی بادشاہتوں کا مدفن ہے، یہ کجکلاہوں کا حصار اور فقیروں کی چوکھٹ ہے، یہاں کے شرفاء اس کی پیشانی کا نور اور یہاں کے قدح خوار اس کے آبگینوں کی آبرو تھے، تاریخ کے اس معتبر ترین شہر کو زمانہ نے یادوں کا ایک خزانہ سپرد کر رکھا تھا، مسلمانوں نے اس شہر کو تاریخ کی پوری توانائی سے مالا مال کیا، انسان اپنے ماضی سے محبت کرتا ہے، یہ شہر اس قول

کی دلیل تھا لیکن دل مرگیا دلی زندہ ہے ہمارے قلم سرسید کے "آثار الصنادید" سے لے کر شاہد احمد دہلوی کے رپورتاژ تک اس کی کہانیاں لکھتے رہے۔ مسلمانوں کے نو سو سال اس شہر میں دفن ہیں، ۱۸۵۷ء میں ان کی سلطنت کا چراغ اسی شہر میں گل ہوا تھا، پھر نوے سال بعد ۱۹۴۷ء میں ان کے وجود کا چراغ بھی اس شہر میں گل ہو گیا۔ یہاں بیسیوں کھنڈر تھے جہاں قبریں بولتی تھیں، مینار جھانکتے تھے، مسجدیں پکارتی تھیں، گمشدہ جلال چلاتا تھا اور قلعہ کی رونقیں دہاڑتی تھیں، دیوان خانوں میں آگ لگ رہی تھی، کھنڈروں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور قافلے پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ آبروئیں قصابوں کی دوکانوں پر لٹکا دی گئی تھیں اور عزتوں کا نیلام چکایا جا رہا تھا، غالب کا یہ مصرع سنگ و خشت کی عمارتوں کا سرنامہ تھا کہ۔ ع

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

نئی دہلی، پرانی دہلی ہی کے کھنڈروں پر مبنی تھی مگر اس کی تعمیر میں شوکت نہ سہی سطوت ضرور تھی، بظاہر برطانوی قانون کی طرح نازک بباطن سنگین۔ اس کے چہرے سے کتنی ہی لطافت برستی ہو لیکن اس کی شکنوں سے خشونت ضرور ٹپکتی تھی، گورنمنٹ آف انڈیا کے دفتر اور وائسریگل لاج دونوں پہلو بہ پہلو تھے، جہاں تک اسمبلی ہال کا تعلق تھا اس پر باہر سے کسی مہاجن کی توند کا گمان ہوتا، اور جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کے دفاتر کا تعلق تھا اس کی سیڑھیاں اس طرح صدر دروازہ کو چلی گئی تھیں، گویا پشواز بچھا ہوا ہے اور اندر کسی مارواڑی عورت کا پیٹ پھول گیا ہے، البتہ وائسریگل لاج میں جلال کے ساتھ جمال بھی تھا فنِ تعمیر کا عشق نہ سہی حسن ضرور تھا، پھر اس کے سامنے گیٹ وے آف انڈیا تک دو رویہ چمن بندی کے بیچوں بیچ فوارے عجیب دلکشی پیدا کرتے تھے، معلوم ہوتا تھا کسی طویل مرصّع نظم کے مصرعے چہرۂ ارضی کا جھومر بنے ہوئے ہیں، درخت سنتریوں کی طرح کھڑے تھے، رات کو قمقموں کی قطاریں ان اپسراؤں کے آنسو معلوم ہوتیں، جن کا پیار بچھڑ جاتا اور جن کی پلکیں شام ہوتے ہی تنہائی کے تصور سے

جگمگا اٹھتی ہیں۔

غرض نئی دہلی ایک مجلد کتاب تھی جس کے ورق جلد جلد اُلٹے جا رہے تھے۔

پُرانی دہلی تب دو حصّوں میں تھی، ایک حصّہ اُن لوگوں کا گھر تھا جو مغلیہ عہد کی روایتوں کے وارث تھے، مثلاً جن کی حویلیاں گئے گزرے زمانہ کی کھرچن رہ گئی تھیں اور جہاں مغلیہ دور کا عالمِ نزع سانس لے رہا تھا، ۱۸۵۷ء کی لُٹی پِٹی دہلی اِس حصّہ میں آباد تھی ـــــــــ، دوسرا حصّہ مغلیہ عہد کی یادگاروں کا تھا، کہنے کو تو محمد تغلق کے قلعہ کی ہڈیاں بھی موجود تھیں اور اس سے پہلے کی یادگاریں بھی، مثلاً قطب مینار، مسجد قوت الاسلام اور اکابر اولیاء کے مقبرے یا ان بزرگوں کے مدفن جو عوام کالانعام کی ارادتوں کا مرجع نہیں تھے لیکن اللہ کی رحمتوں کا مسکن ضرور تھے اور ہیں، مثلاً مہندیاں کا قبرستان، جہاں شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے، یہی دہلی تھی جس کا چپّہ چپّہ کہانیوں کی گذرگاہ اور تاریخ کی اقامت گاہ تھا، ہر بڑی چیز جس کا صدیوں کے ساتھ تصور کیا جا سکتا ہے، مثلاً اہل اللہ اور ان کے مزار، فرمانروا اور ان کے آثار، تاریخ اور اس کے نقش و نگار، تہذیب اور اس کے برگ و بار، زبان اور اس کا بیان و اظہار سب کچھ یہاں موجود تھا، بادشاہوں نے تو دلی کو لبایا ہی تھا لیکن بزرگوں نے اس کو اٹھایا اسی لیے دہلی کو بارہ خواجہ کی چوکھٹ بھی کہتے تھے۔

مَیں نے جس وقت دہلی دیکھی اس وقت دہلی کی پرانی آب کو گھن لگ چکا تھا، زبان تھی لیکن کچ مچ، صرف چند خاندانوں میں اُردو کی نفاست اور لہجہ کی نزاکت رہ گئی تھی باقی بولی ٹھولی کا نخرہ تھا یا قلعہ کے گھسے پٹے محاورے جنہیں گھن سے لے کر چھٹن تک زبان پر لیے پھرتے تھے، یا پھر اُردو بازار ـــــــ جہاں چوڑی دار پاجامے اور پھولدار اچکنیں پہلے وقتوں کی یادگار تھیں، جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ کٹورہ بجتا تھا لیکن مجذوب یا قلندر کوئی نہیں تھا، صرف فقیر ہی فقیر تھے، جن کی آوازوں

میں خرخرا آگیا تھا۔

جامع مسجد کباڑیوں اور کبابیوں میں گھری ہوئی تھی، جیسے مغویہ لقوں کے ہاتھ آگئی ہو، شہر کے دروازے پر بزازی کے کھوکھے تھے جس سے اس کے حسن میں چاچ پڑ گئے تھے، معلوم ہوتا تھا مسجد نے دانت نکوس دیے ہیں، یا بیت اللہ کی اس بیٹی کو گنواروں نے اپنے چنگل میں لے رکھا ہے، لاہور کی جامع مسجد سے دہلی کی جامع مسجد اکہری ہے اور اس میں حشمت سے زیادہ نزاکت ہے لیکن طویل ماضی کی مسلسل اذانوں کا شکوہ اس طرح چھلکتا تھا کہ وجدان خود بخود متحرک ہو جاتا، اور جذبات میں لہریں سی اٹھنے لگتیں۔

اس کے بالکل سامنے لال قلعہ تھا اور وسط میں سرمد کا مزار ذرا آگے مٹی کی ایک اور ڈھیری تھی جو اس وقت تک پکی نہیں ہوئی تھی —— یہ ڈھیری مولانا شوکت علی کا مزار تھا، بی اماں کا بڑا بیٹا جان بیٹا خلافت پہ دے دو، محمد علی جوہر کا بڑا بھائی، کبھی خود ایک قیامت تھا اب قیامت کا صور پھنکنے تک سو رہا تھا۔

قلعہ اور مسجد کے ٹھیک وسط میں اب مولانا ابوالکلام آزاد کا مزار بن گیا ہے لیکن یہ مزار اس دہلی کا نہیں جس کے شب و روز پر یہ تحریر لکھی جا رہی ہے میرے مشاہدات ۱۹۴۶ء کے ہیں جب مولانا آزاد زندہ تھے اور انہیں مسلمانوں کی زبانوں نے اپنے نیزوں پر لٹکا رکھا تھا۔

لال قلعہ اس طرح نظر آ رہا تھا گویا ایک بڑا کارواں چلتے چلتے ٹھہر گیا ہے اس کے ارکان مارے گئے، خیموں کی رسیاں ٹوٹ گئیں لیکن تنبو کھڑے ہوتے ہیں، سرخ سلوں پر خیالات کی لہریں اٹھ اٹھ کر نکل جاتیں، جانے کتنے بے حروف نوشتے ان پر کندہ تھے اور کتنی سوانح عمریاں جنہیں نطق یا آواز نہ ملی، اس کے پتھروں پر دم توڑ چکی تھیں۔

قطب مینار کو دیکھ کر میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ انسان واقعی عظیم ہے، اس سے مسلمانوں کے تخیل کی رفعت کا اندازہ ہوتا، کہ دہلی پر ان کی فرماں روائی کا پہلا نشان

یہی قطب مینار تھا جس سے پتا چلتا کہ اسلام میں غلاموں کے لیے بھی سرفرازی ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین نظام الاولیاء کے مزار پر حاضری دی تو وہاں فقیروں کا ایک جمگھٹا پایا، ان کی گدایانہ آوازیں زائروں کی جیبوں کو جھوڑتی اور بجھا کر رہی تھیں مجاوروں کا تعاقب ان سے بھی دلچسپ تھا، وہ گویا تصحیح نامہ کی طرح چپک جاتے تھے۔

عشق ہمیشہ زندہ رہتا ہے، سلطان جی سے امیر خسرو کا عشق ظاہر وباہر تھا، ان کے مزار سے پہلے امیر خسرو کا مزار ہے اور وہاں پہلے فاتحہ پڑھتے ہیں، ان کے بعد ایک اور زندہ مزار کی زیارت کی، یہ ان سے دوسری ملاقات تھی۔ اور وہ تھے خواجہ حسن نظامی، بقول ظفر علی خاں گیسو دراز جنگ، قوال حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ کی چوکی بھر رہے تھے، اُن کی آواز میں لٹک تھی نہ کھنک، بس گا رہے تھے۔

ہم ہر روز کسی نہ کسی جگہ سے ہو آتے لیکن بعض کھنڈروں کی طرف جاتے ہوئے خوف آتا، حالات اتنے مخدوش تھے کہ صبح وشام فساد کی باتیں ہو رہی تھیں، ہم دیکھ رہے تھے کہ فساد گھنگھور گھٹا کی طرح تُلا کھڑا ہے، برکھا ہو گی اور ضرور ہو گی، چھاجوں پانی برسے گا، یہ ایک تلوار ہو گی جس سے گردنوں کی فصلیں کٹیں گی، سروں کی شاخیں توڑی جائیں گی، آبروؤں کی کلیاں ٹوٹیں گی، عزتوں کی شاخیں مرجھائیں گی اور خاندانوں کے چمن اُجڑ جائیں گے ——— ہم نے ہواؤں میں بادلوں کو سونگھ لیا تھا، ہندوؤں کے محلے مسلمان راہگیروں کو اس طرح گھورتے تھے جس طرح بوڑھا کنجن جوان چھوکریوں پر نگاہ رکھتا ہے اور مسلمان لالاؤں کو اس طرح تاک رہے تھے جس طرح شہر کے اوباش خاندانی عفتوں پر گرہ لگاتے ہیں، غرض فساد پَر پُرزے نکال رہا تھا، ملک کے حالات نتیجہ نکال چکے تھے اور اب نتیجہ حالات کو نکالنے کی تگ ودو میں تھا ——— اس فضا میں ہم دہلی کے کھنڈروں میں گھوم پھر کر تاریخ کے گمشدہ سفینوں کی سیر کرتے، عجب دن تھے، ہم دہلی کے ایک رئیس میر احمد حسین شملوی کے ہاں چاندنی چوک کوچہ رحمان (اب رائے مان) میں ٹھہرے ہوئے

تھے، ان کا حوصلہ اور ظرف تھا کہ لگاتار ڈھائی ماہ تک کوئی ڈیڑھ درجن سیاسی لونڈوں کی تواضع کرتے رہے، مہمان تو ان کے صرف شاہ جی تھے، ہم لوگ تو ان کے درویش تھے، میر صاحب شرافت، وضعداری اور روایت کی چلتی پھرتی تصویر تھے، بلاشبہ ان کا خرچ سو پچاس روپے روز سے کم نہ ہوگا لیکن وہ سہہ رہے تھے۔

سب سے بڑا فائدہ اس قیام سے مجھے یہ پہنچا کہ میں نے برسوں کا تجربہ ہفتوں میں حاصل کر لیا، سیاسیات کے اتار چڑھاؤ سے آگاہ ہوتا رہا، تاریخ میرے سامنے بن رہی تھی اور میں قریب ہو کر اس کی آواز سن رہا تھا، یہ ایک عظیم تاریخی دَور تھا جس سے ہم گزر رہے تھے، اتنا بڑا دور جو شاید اس سے پہلے ہندوستان پر کبھی نہیں آیا تھا، تقریباً ایک صدی کی غلامی کا رخصتی سفر ہمارے سامنے ہو رہا تھا، برطانوی حکومت کا نالۂ جانکنی بلند ہو رہا تھا اور ہمیں یقین تھا کہ صبحِ آزادی طلوع ہو رہی ہے۔

اس سے پہلے جو دَور گذر چکے تھے ہم نے ان کے حالات تاریخوں میں پڑھے تھے یا پھر دہلی کی عمارتوں میں ان کا جلال و جمال دیکھا تھا، اب ہم تاریخ کو اپنی نگاہوں کے سامنے بنتا دیکھ رہے تھے، ہمارے سامنے وہ انسان بھی تھے جو تاریخ کو سانچوں میں ڈھال رہے تھے جو ایک عہد تھے، ایک ادارہ تھے، ایک انجمن تھے، بلکہ خود ایک تاریخ تھے، ان کا وجود تاریخ بنا رہا تھا وہ اس کو آوازیں مہیا کر رہے اور اس کو الفاظ دے رہے تھے، ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ تاریخ کے کانوں میں بالیاں بن کر چمک رہا تھا۔

ہندوستان نے سیاست کے میدان میں اس سے پہلے اتنے بڑے لوگ شاید کبھی پیدا نہ کیے تھے، ہندوستان واقعی ان پر ناز کر سکتا تھا، بیسویں صدی کا نصف اوّل ہمیشہ ان پر ناز کرتا رہے گا۔

میں نے جو دس سال میں حاصل کیا تھا اس سے بڑھ کر ان دس ہفتوں میں حاصل کر چکا تھا،

تمام چہرے میرے سامنے بے نقاب ہو گئے، خوبصورت، قبول صورت، صاف ستھرے مکروہ، بدنما، گھناؤنے، خطرناک اور ہیبتناک عظیم چہروں کی دلکشی دیکھی اور مہیب چہروں کا خوف محسوس کیا، ملک کا قافلہ انہی کے ہاتھوں آگے بڑھ رہا تھا ــــــ

مَیں ہندوستان کے اسّی فی صد بڑے انسانوں کے ساتھ ان دو مہینوں میں گھل مل گیا، ان سے روابط گہرے ہوتے گئے، بعض کا عقیدت مند ہی نہ رہا بلکہ ہمراز بھی ہو گیا، یگانوں اور بیگانوں کی صورتیں حقیقی خط و خال سمیت نمایاں ہو گئیں، شاہ جی کی عظیم الشان سیرت، ڈھائی مہینوں کی اس یکجائی میں کھل کے واضح ہو گئی، وہ دو چیزوں کے سوا کسی مسئلہ میں بھی سنجیدہ نہیں تھے، پہلی چیز اسلام اور اس کے مقتضیات مثلاً توحید و رسالت، ختم نبوت کا مسئلہ، شرک کی بیخ کنی، اور علماء کی توقیر، دوسری چیز انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ بالخیر یا بالجبر وہ برطانوی ملوکیت کے اتنے بڑے دشمن تھے کہ انہیں ہر عیب میں فرنگی چھپا ہوا محسوس ہوتا، وہ سوروں کے اُس ریوڑ کا منہ چومنے کے لیے بھی تیار تھے جو انگریزوں کو کاٹ کھائے اور یہ استعمار سے اُن کی نفرت کا منتہیٰ تھا۔

شاہ جی دن بھر ہنستے ہنساتے، زبان ان کی لونڈی تھی، اُردو بولتے تو دہلی و لکھنؤ انہی کے ہو جاتے، پنجابی بولتے تو وارث شاہ اور فضل شاہ کی زبانیں شرما جاتیں، انہیں اکثر اضلاع کی بولیوں پر عبور تھا، ہزاروں شعر اُن کے حافظہ میں تھے، قرآن پڑھنا تو ان پر ختم تھا، قرأت کرتے تو معلوم ہوتا قرن اوّل کے غزوات نے نقابیں اٹھا دی ہیں، ہزاروں لطائف از بر تھے، بذلہ سنجی کے شہسوار، ضلع جگت کے پھکیت، پھبتی کے شہریار، برجستہ گوئی کے بادشاہ۔

دیوبند کے مدرسۂ فکر کے ہمنوا تھے، لیکن انور صابری کو ساتھ بٹھا کر سماع کی محفل جماتے اور گھنٹوں قوالی کرتے، مولانا حبیب الرحمٰن ناراض ہوتے تو جھنجلا کے فرماتے تم وہابی ہو! تمہارا کیا؟ مَیں چشتی ہوں اور انور صابری میرا خسرو ہے ــــ خسرو۔
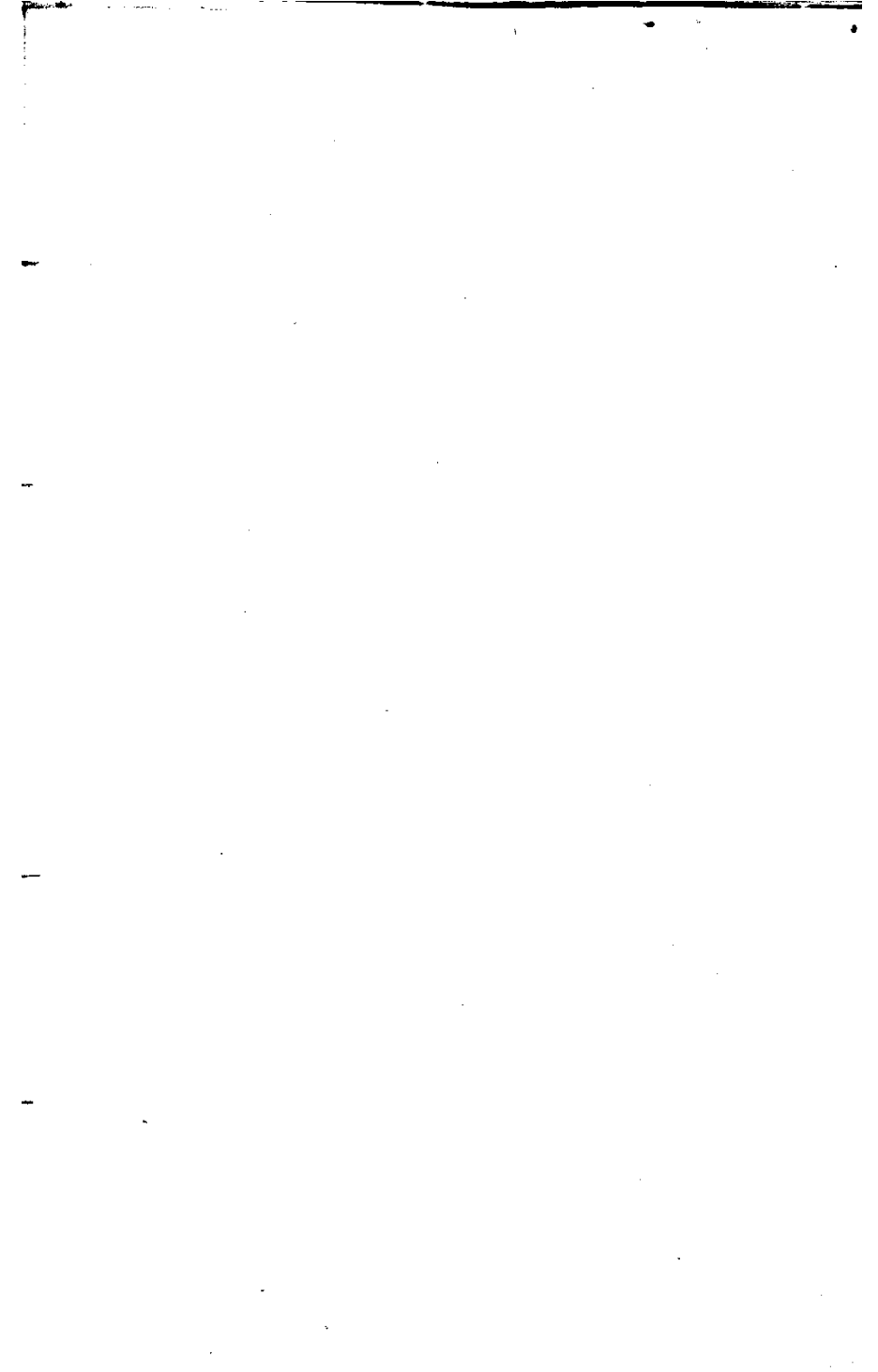
مشاہیر سے ملاقاتیں

مولانا حبیب الرحمٰن کے بیٹے عزیز الرحمٰن جامعی نہایت ہوشیار نوجوان تھے انہیں
شوق تھا کہ بڑے بڑے آدمیوں سے ملتے، والد کا ذکر کرتے اور کوئی نہ کوئی خبر اڑا لاتے
اُن دنوں زعمائے احرار کی خبروں کا منبع عزیز الرحمٰن ہی تھے، گاندھی، نہرو، آزاد وغیرہ
کے ہاں تو ان کا آنا جانا روز ہی کا تھا ان سے ملاقات نہ ہوتی ان کے سکرٹریوں سے مل
آتے، سکرٹریوں سے نہ ملتے تو ان کے سٹینو گرافروں سے مل آتے لیکن خبریں زور کی
لاتے، اور اکثر خبریں صحیح نکلتی تھیں، ایک دن میں نے اور نوابزادہ نصر اللہ خاں نے ان
سے کہا کہ گاندھی جی سے ملنے کی راہ نکالو، عزیز نے کہا ابھی چلو، گاندھی جی نے بھنگی کالونی
میں کٹیا ڈال رکھی ہے، کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی ——— ہم تیار ہو گئے، میں، نوابزادہ،
انور صابری اور عزیز الرحمٰن بھنگی کالونی پہنچے تو گاندھی جی وائسرگل لاج گئے ہوئے تھے،
اُن کی کٹیا ہری جنوں کی بستی کے بیچوں بیچ ایک چھوٹے لیکن کھلے میدان میں تھی، کوئی تیس گز
اِدھر بانس بندھے ہوئے تھے اور یہ کھلا دروازہ تھا، یہاں سے قریب ہی ایک خیمہ تھا جس
میں رضا کاروں کا سالار رہتا، اِدھر اُدھر کچھ چارپائیاں پڑی تھیں، کرسیوں کا نشان تک نہ تھا،
گاندھی جی کا تمام حصہ فرشی تھا، کچھ دیر تو ہم بعض دوسرے مشتاقین کے ساتھ بانس کے دروازے
پر کھڑے رہے، پھر عزیز الرحمٰن نے ہمت کی اور پیارے لال کو کہلوایا، اُس نے بلوا لیا۔ پیارے
لال گاندھی جی کا سیکرٹری تھا، عزیز الرحمٰن نے اُس سے کہا کہ ہم اس غرض سے آئے ہیں وہ

نیم راضی ہوگیا، کہنے لگا آپ سامنے درخت کی چھاؤں میں بیٹھیں، باپو ابھی آتے ہیں، اُن کی مصروفیتوں کا تو آپ کو اندازہ ہے، ممکن ہے کوئی اور وقت دیں، ہم ٹھہر گئے، نوابزادہ نصراللہ خاں نے ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی، میں اُن دنوں کھدر پہنتا لیکن سر پہ جناح کیپ رکھتا تھا، انور صابری نے قلندروں کا جھول پہن رکھا اور عزیزالرحمٰن مولویوں کے چوغہ میں تھا، کوئی چالیس منٹ ٹھیرے ہونگے کہ گاندھی جی کی آمد آمد کا غل ہُوا۔ اتنے میں درجن ڈیڑھ درجن دیویاں بھی آگئیں، گاندھی جی کی کار سٹر سے اندر داخل ہوئی، دیویوں نے پابوسی کرنی چاہی لیکن گاندھی تیر کی طرح نکل کر ہمارے پاس رُک گئے، ہم نے ہاتھ اٹھا کر آداب کیا، مسکرائے،

"آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟"

"پنجاب سے"

"آپ نے بہت تکلیف کی؟"

"جی نہیں ہم آپ کے درشن کرنے آئے ہیں"

عزیزالرحمٰن نے کہا:

"مہاتما جی، میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا بیٹا ہوں"

"اچھا، وہ مولوی صاحب جو مجھ سے بہت لڑتے ہیں"

عزیزالرحمٰن نے ہم تینوں کا تعارف کرایا، گاندھی جی مسکراتے رہے، ملاقات کا وقت مانگا، گاندھی جی نے حامی بھر لی، کہا:

"آپ لوگ پرسوں پانچ بجے شام آدھ گھنٹے کے لیے آجائیں"

عزیز نے کہا آپ کے سکرٹری ٹرخا دیتے ہیں، ذرا ان سے بھی کہہ دیں،

گاندھی جی نے کہا ——— کوئی بات نہیں، یہ کھڑے ہیں ان سے میں نے کہہ دیا ہے مزید کہا:

"کل بھی آپ کو بلا سکتا ہوں، لیکن کل میرا مون برت ہے، آپ باتیں
کریں تو میں سلیٹ پر لکھ کر جواب دوں گا، کچھ کہنا سننا ہے تو پرسوں کا
وقت ٹھیک رہے گا۔"

ہم نے صاد کیا، گاندھی جی نے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے
کٹیا میں داخل ہو گئے، دوسرے لوگ ہمیں حیرت سے تکتے رہے، ہم باہر نکلے تو بعض
جرنلسٹوں نے گھیر لیا، آپ لوگ کہاں سے آتے ہیں؟ گاندھی جی نے آپ سے کیا کہا؟"
بعض بوڑھی عورتیں جو دور سے مہاتما کے درشن کر رہی تھیں ہمیں دھن واد کہنے
لگیں، ان کا خیال تھا کہ ہم لوگ خوش قسمت ہیں جو ایک رشی سے باتیں کر آئے ہیں۔
تیسرے روز ٹھیک پونے پانچ بجے ہم بھنگی کالونی پہنچ گئے، ہمارے ساتھ کناٹ
پلیس کے ایک ہندو بزاز بھی تھے، جو میر صاحب کی دوکان سے قریب کپڑے کی تجارت
کرتے اور غالباً نیو دہلی کے سب سے بڑے کلاتھ مرچنٹ تھے، ان دنوں سرج (کالی
اچکن کا گرم کپڑا) بازار میں ناپید تھا، لاہور میں ڈھونڈھا نہ ملا، دہلی میں تلاش کیا محروم رہا،
میر احمد حسین مجھے ان کی دوکان پر لے گئے، انہوں نے وعدہ کیا کہ ہفتہ عشرہ تک مہیا کر دیں گے،
اب جو انہیں معلوم ہوا کہ ہم گاندھی جی سے ملنے جا رہے ہیں تو متعجب ہوئے،
"کیا آپ مجھے ساتھ لے جا سکتے ہیں؟"
"کیوں نہیں؟"

"میری خواہش ہے انہیں قریب سے دیکھوں، وہ بھارت کے سب سے بڑے
رشی ہیں، ہم انہیں ساتھ لے گئے، ابھی پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ امریکی صدر
ٹرومین کا ذاتی نمائندہ جو غذائی حالت کا جائزہ لیتے دنیا بھر کا سفر کر رہا تھا، وارد ہو گیا،
پیارے لال نے اسے گاندھی جی کے کمرہ میں پہنچا دیا، ہم نے پیارے لال سے کہا پانچ بجے
ہمارا وقت ہے، آپ نے اس کو بھیج دیا ہے، اس نے کہا آپ مطمئن رہیں، ٹھیک پانچ بجے

آپ کی ملاقات ہوگی اور یہ پانچ منٹ ہی میں نکل آئے گا، وہی ہوا وہ باہر آگیا، ہم اندر چلے گئے، گاندھی جی حسبِ معمول مسکراتے ———— یہ پہلا موقع تھا، مَیں نے گاندھی جی کو قریب سے دیکھا، تمام نشستیں فرشی تھیں، خود گاندھی جی کوئی چھ اِنچ اونچی چوکور نشست پر بیٹھے تھے، ایک طرف سیکرٹری دوسری طرف راجکماری امرت کور، ادھر لالہ برج لال چاندی والا، مہاتما جی کی پوتی ان کے سر کو برف کی ٹکور کر رہی تھیں، گاندھی جی نے انگوروں کے چند دانے پیش کیے، ہم نے تو کھا لیے لیکن اُس تاجر نے رومال میں لپیٹ کے رکھ لیے، اگلے دن اپنی کوٹھی میں ایک بہت بڑا اکٹھ کیا اور وہ دانے ایک من انگور میں ملا کر لوگوں میں تقسیم کیے، ہمارا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ تھکتا نہیں تھا کہ ہم نے اسے ایک عظیم رشی سے ملوایا اور اُس نے ان کے چرنوں میں بیٹھ کر درشن کیے ہیں ———— واپس آکر اس نے مجھے اسی وقت اچکن کے لیے سرج کا ٹکڑا دیا، قیمت پوچھی تو اس نے کہا:

"مہاتما جی کے درشن"

مَیں نے اصرار کیا اس نے انکار،

"آپ نے مجھے اتنے بڑے انسان سے ملوایا ہے کہ اب اس ٹکڑے کی کوئی سی قیمت نہیں ہے، میری طرف سے تحفہ قبول کریں"

گاندھی جی نے معمولاً مسکراتے ہوئے کہا،

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں"

مَیں نے کئی سوالات کیے میرا پہلا سوال تھا،

"عام خیال ہے کہ وزارتی مشن گفتگو کی طرح ڈال کر ملک کے جوشِ آزادی کو مدھم کرنا اور حصولِ آزادی کو التوا میں ڈالنا چاہتا ہے، ممکن ہے یہ لوگ پہلے کی طرح دھوکا دیں، جیسا کہ کرپس نے پچھلی دفعہ کیا تھا:

گاندھی جی ہنسے،

"میرا خیال ہے اب کے یہ بات نہیں ہوگی اور نہ آزادی کا جوش فریب دہی سے دبے گا، ہندوستان کی آزادی اٹل ہو چکی ہے۔ رہا یہ سوال کہ وزارتی مشن دھوکہ دے گا تو کسے ؟ خود کو ؟ ہم تو جدوجہد کے سفر میں ہیں، جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ ایک چیز دینا ہی چاہتا ہے تو آپ اس کو کیسے بے ایمان کہیں گے ؟ جب تک کہ وہ منحرف نہ ہو یا آپ اس سے انکار نہ سن لیں۔ فرض کیجیے انگریز آزادی دینے سے انکار کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کے سامنے اخلاقی طور پر مجرم ہوں گے، تمام دنیا انہیں جھوٹا کہے گی، ہمارا کیا جاتا ہے ؟ ہم تو آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں، ہماری لڑائی محض قانون توڑنا ہی نہیں بلکہ یہ بات چیت بھی اُس لڑائی ہی کا حصہ ہے۔"

"کیا مسلم لیگ سے صلح کا کوئی امکان ہے ؟" میں نے پوچھا،

"میں تو یہی چاہتا ہوں اور قائداعظم سے کتنی ہی ملاقاتیں کر چکا ہوں لیکن وہ نہیں مانتے۔"

(واضح رہے گاندھی جی قائداعظم کو قائداعظم ہی کہتے اور لکھتے تھے)

"تو آپ بار بار ان سے ملنے کیوں جاتے ہیں ؟ وہ بھی آپ کے پاس کبھی آتے ہیں ؟" عزیزالرحمٰن نے کہا،

"یہ اعتراض اور لوگوں نے بھی کیا ہے لیکن یہ کوئی اعتراض نہیں، قائداعظم میرے بھائی ہیں، بھائی کو منانا جرم نہیں، اور نہ اس میں کوئی ہتک ہے، روٹھے ہوؤں کو منانا ہی پڑتا ہے، گھریلو جھگڑا ہے طے ہو جائے گا۔" گاندھی جی بولے

"لیکن آپ کے ایسا کرنے سے کانگرس کو دھکا لگتا اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی پوزیشن

کمزور ہوتی ہے۔"

"مجھے آزادی حاصل کرنا ہے، قربانی سے ملے یا گفتگو سے، خون دے کر ملے یا بھیک مانگ کر، مقصد سامنے ہو تو ذات کوئی چیز نہیں، میں ملک کو اونچا کرنا چاہتا ہوں، خود کو نہیں، جب آزادی کے لیے ہم لوگ جیل چلے جاتے ہیں تو قائد اعظم کے گھر جانے میں کیا عیب ہے، اور آپ جانتے ہیں کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا، پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے۔ مجھے آزادی چاہیے، میں اس کے لیے ہر دروازہ پر جانے کے لیے تیار ہوں، سوال میرے یا کانگرس کے وقار کا نہیں، سوال آزادی اور صرف آزادی کا ہے، مقصد کے لیے جان دینا یا مال لٹانا ہی قربانی نہیں، بسا اوقات عزت بھی گنوانی پڑتی ہے اور یہ بھی ایک قربانی ہے، سچا عشق ہر شے کی قربانی مانگتا ہے۔"

"نیشنلسٹ مسلمانوں کی ناکامی کا باعث کیا ہے؟"

گاندھی جی کھلکھلا کر ہنس پڑے،

"میں سمجھتا ہوں ان میں کوئی شخص بھی فقیری کرنا نہیں چاہتا، بلکہ فقیری سے اُٹھ کر شہنشاہی کر رہا ہے، قومی خدمت صرف فقیری کرنے ہی سے ہو سکتی ہے"

میرا خیال ہے گاندھی جی کے ذہن میں اُس پچیس لاکھ روپیہ کی غارت زدگی کا احساس تھا جو عام انتخابات میں نیشنلسٹ مسلمانوں پر صرف کیے گئے، لیکن بعض لوگ صرف دینے کیلیے امیدوار ہو گئے تھے مال اینٹھا، ہڑپ کیا اور بیٹھ گئے۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے گاندھی جی سے سوال کیا،

"آپ پنجاب کیوں نہیں آتے؟

"اس کے انچارج ابو الکلام ہیں۔"

"آپ بھی تو تشریف لائیں"
گاندھی جی ذرا رُک گئے، پھر عادتاً مسکراتے، اور کہا
"معاف کرنا وہ جاسوسوں کا صوبہ ہے"
ہم لوگ ایک لحظہ کے لیے شرمسار سے ہو گئے، بات ٹھیک تھی تاہم میں نے پلٹ کر کہا:
"جی نہیں! جلیانوالہ باغ کا صوبہ ہے"
"ہاں یہ بات بھی ہے" گاندھی جی کھکھلا کر ہنس دیئے،
میں نے سوال کیا، آپ کے نزدیک ہندوستان کی قومی زبان کونسی ہے؟
"ہندوستانی"
ہندوستانی سے آپ کی مراد کیا ہے؟
"جس میں عربی اور سنسکرت کے موٹے موٹے شبد نہ ہوں"
"مثلاً آپ مولانا ابوالکلام کے خطبۂ رام گڑھ کی زبان کو ہندوستانی کہیں گے؟"
"بالکل"
"خود مولانا ابوالکلام کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے"
"ایشیا میں اتہاس (تاریخ) کے بہت بڑے عالم ہیں، میں اُن سے تاریخ اور جواہر لال سے پالٹیکس پڑھتا اور سیکھتا ہوں"
ہم نے گھڑی پر نظر ڈالی، دو منٹ باقی تھے،
"آپ دو منٹ اور بیٹھ سکتے ہیں" گاندھی جی نے کہا
شاہ جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں، عزیز الرحمٰن بولا،
"کون شاہ جی"
"سید عطاء اللہ شاہ بخاری"

گاندھی جی بہت ہنسے ، اچھا وہ ڈنڈے والے شاہ جی"۔

"جی ہاں"۔

"اب بھی وہ چھ چھ گھنٹے تقریر کرتے ہیں؟"

"جی ہاں"

"تھکتے نہیں"

"جی نہیں"

"انہیں معلوم نہیں کہ دنیا بہت چھوٹی ہوگئی ہے، اچھا! تو ان سے کہیے مجھ سے ضرور ملیں"۔

"وہ کچھ بیمار ہیں"

"مَیں طبیب بھی ہوں علاج بھی کروں گا"۔

شاہ جی کے لیے ایک دن کے وقفہ سے یہی پانچ بجے کا وقت دیا۔ گاندھی جی نے گھڑی اٹھائی، مطلب تھا وقت ختم ہوگیا ہے، اتنے میں لاٹھی اٹھا کر پرارتھنا کے لیے چلے گئے، ہم باہر نکلے تو ہمارے عمومی تاثرات یہ تھے کہ گاندھی جی واقعی ایک مہاتما ہیں، جنہوں نے ہندوستان میں ایک ایسی سلطنت کو ہلا ڈالا جس کے اُفق پر کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔

شاہ جی کے ساتھ بھی، ہم ملاقات کو حاضر ہوئے، گاندھی جی نے شاہ جی کو دیکھتے ہی پھریری لی، جیسے کھڑے ہوکر خوش آمدید کہنا چاہتے ہوں، مصافحہ کیا، انگوروں کا ڈبہ پیش کیا۔ کچھ دیر ملک میں فسادات کے امکان پر گفتگو ہوتی رہی، گاندھی جی نے ان سے پوچھا:

"آپ نے ہندی سیکھی ہے"

"جی نہیں"

"مَیں نے اُردو سیکھی ہے، نہ سیکھتا تو اپنا ہی نقصان کرتا"۔

سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کا ذکر ہونے لگا، شاہ جی الصمد کے معنی پر گفتگو کرتے

رہے، زیر بحث نکتہ یہ تھا کہ ہندوستانی میں اس کا صحیح سے صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے گاندھی جی نے بتایا کہ وہ اپنی پراتھنا میں شاہ عبدالقادر اور مولانا آزاد کے ترجمہ پر انحصار کرتے ہیں، شاہ جی نے ہندی کے متبادل الفاظ بتائے، اس گفتگو ہی میں وقت کٹ گیا، ہم نے شاہ صاحب کو اشارہ کیا کہ وقت ہو گیا ہے، گاندھی جی کی گھڑی میں دو منٹ باقی تھے، شاہ جی نے کہا "چھوڑو میاں! میرے اور گاندھی جی کے درمیان وقت کی کوئی قید نہیں" گاندھی جی ہنسکر چپ ہو رہے، جونہی دو منٹ گزرے، گاندھی جی نے گھڑی اٹھائی، اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا:

"شاہ جی! میں آپ سے کہہ سکتا ہوں کہ پراتھنا کا وقت ہو گیا ہے اور میں جا رہا ہوں"

اور گاندھی جی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکل گئے، عزیز الرحمٰن نے گاندھی جی سے آٹوگراف لینا چاہا، گاندھی جی نے کہا، پانچ روپے لاؤ، شاہ جی نے کہا اس کے پاس پانچ روپے کہاں ہیں؟

گاندھی جی مسکرائے، نہیں شاہ جی مولوی لوگ بہت زیادہ روپیہ کماتے ہیں، دستخط تو پانچ روپے ہی میں ملیں گے، شاہ جی نے اصرار کیا لیکن گاندھی جی اصول کے پکے تھے، آخر عزیز الرحمٰن نے پانچ روپے پیش کیے، اور گاندھی جی نے اردو میں لکھ دیا:

م ک گاندھی

اگلے روز ہم خان عبدالغفار سے ملنے گئے، تو انہیں کم آمیز پایا، ان میں گاندھی جی کا سکوت زیادہ تھا، تکلم کم، وہ کسی بھی موضوع پر نہ آتے، اُن کے ماتھے پر شکن آجاتی یا مسکرا دیتے، جواباً یہی کہتے کہ خدائی خدمت گار ہوں، مجھے سیاسی جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں، البتہ اپنے طور پر یہ کہا کہ:

"خدائی خدمت گاروں کا نام سرخپوش (RED SHIRTS) انگریزوں نے رکھا تھا، اور صرف اس لیے کہ روس کے بالشویکوں سے نسبت دے کر انہیں کچلا

جاتے، سرحدی گاندھی کہلانا عیب نہیں، لیکن مسلمان اخبار تعریضاً استعمال کرتے اور ہندو اخبار تعریفاً، حالانکہ ہر انسان کا اپنا وجود ہوتا ہے۔"

وزارتی مشن کے متعلق سوال کیا تو کہنے لگے:

"یہ سیاست دانوں کے معاملے ہیں اور وہ انہیں بخوبی نپٹا رہے ہیں میں تو صرف دیکھ رہا ہوں۔"

ملاقات مختصر تھی، لیکن اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص دھن کا پکا ہٹ کا پہاڑ اور طبیعتہً کم سخن ہے،

ایک دن عزیز الرحمٰن برلا ہاؤس لے گیا وہاں سردار پٹیل اور راجن بابو ٹھہرے ہوئے تھے، برلا ہاؤس کا ڈرائنگ روم دیکھ کر حیرت ہوئی، درمیان میں ایک بت نصب تھا، ڈیڑھ دو لاکھ روپے سے کیا کم ہوگا، راجن بابو اور سردار پٹیل، سر مرزا اسمٰعیل سے فرش پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے، بابو راجندر پرشاد نے دیکھا تو اٹھ کر آ گئے، رسماً مزاج پرسی کی، چند منٹ میں سردار پٹیل بھی آ گئے، کوئی گھنٹہ بھر ہم ان سے باتیں کرتے رہے۔ راجندر پرشاد نے تو ایک آدھ فقرہ بھی کہا لیکن پٹیل منجمد کھڑے رہے، ان کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا انہیں کانگریس میں مسلمانوں کی ضرورت نہیں، ضرورت ہے تو گاندھی جی کو ہوگی یا جواہر لال کو۔

راجن بابو، خوش مزاج، خوش طبیعت اور خوش گفتار انسان تھے، سردار پٹیل ترش رو متکبر اور آہن مزاج، اور یہ تھا ان دو بڑے رہنماؤں کے متعلق ہمارا پہلا تاثر، یوں بھی برلا ہاؤس ایک مندر تھا اور یہ دونوں رہنما اس میں مورتی کی طرح تھے، ہم نے بھی یہی خیال کیا کہ ہم انسانوں کے بجائے مورتیوں سے مل کر آئے ہیں۔

آصف علی سے ملے تو وہ اردو کا نسخہ نکلے، ماتھے پر روزمرہ کی شکنیں اور زبان کے محاورے کا چسکا، آنکھوں میں ٹکسالی اردو کا خمار، بولی ٹھولی اوڑھنا بچھونا، آواز اتنی

باریک گویا ریشم کا لچھا ہو، اُردو کا ذکر آگیا تو کہنے لگے دہلی میں ایک آدھ گھرانا ہے جہاں اُردو صحیح بولی جاتی ہے، باقی لوگ تو ابھی کل ہمارے سامنے آکے آباد ہوتے ہیں، کچھ لوگ دوسری یا تیسری پُشت سے رہ رہے ہیں، اُن کی زبان ذرا منجھ گئی ہے، بیشتر لوگ پنجاب وغیرہ سے آکے دہلی میں آباد ہوگئے۔ اور اب دہلوی کہلاتے ہیں۔ چند اہلِ زبان تھے، لیکن ان کی اولاد انگریزی پڑھ لکھ کر باپ دادا کی چال بھول گئی ہے ڈھال کا تو ذکر ہی کیا۔

"محمد حسین آزاد کا خاندان؟"

یہاں کہاں؟ بیٹی کے ایک بیٹے رہتے ہیں ان کی زبان کو بھی لونی لگ گئی ہے،

"نذیر احمد کا خاندان"؟

ان کے پوتے ماہنامہ ساقی نکالتے ہیں، غنیمت ہیں۔"

"راشد الخیری"؟

ان کے بچے بھی اُردو سے شُدبُد رکھتے ہیں لیکن باپ کی ٹھک اور رکھ رکھاؤ کہاں؟

"خواجہ حسن نظامی"؟

وُہ اُردو میں سرکس چلاتے ہیں، پاکھنڈی زیادہ ہیں، ادیب کم،

"اور خواجہ شفیع"

"کون خواجہ شفیع؟"

عزیز الرحمٰن نے حدودِ اربعہ بیان کیے تو کہنے لگے:

"ارے ہاں، وہ مشاعروں کے صدر؟ کسبیوں کی بولی بولتے ہیں، انہیں دہلی کی زبان کا شعور کہاں —— اندھوں میں کانا راجہ سمجھو،

مولانا احمد سعید کے متعلق کیا رائے ہے آپ کی؟

"بھئی ملا ہیں کبھی کبھی اُردو کو عربی میں غسل دے دیتے ہیں۔"

"مولانا ابوالکلام"
"انہیں کی کہیے، دہلوی کیسے ہو گئے؟"
"ملّا واحدی"
"ہاں وہ دو تہائی اُردو جانتے ہیں"
"آصف صاحب نے ذرا اونچے سُر میں کہا:
"میاں لے دے کے ایک ہمارا گھرانا ہے جہاں اب بھی اگلے وقتوں کی زبان اور اس کی بھینی بھینی خوشبو موجود ہے، کانوں میں رس گھلتا ہے، ورنہ اُردو میں بیسیوں کترنیں لگ چکی ہیں، زبان کیا رہی کچرا ہو گیا، چاندنی چوک کے بعض محلوں مثلاً کوچہ چیلاں، اور بلیماراں میں کچھ مکان تھے جہاں سے محاورہ اور روزمرّہ کی لطافت کانوں تک پہنچتی تھی، اب وہ گھر بھی اُجڑ گئے ہیں۔"

آصف علی بلاشبہ دہلی کے بڑے آدمیوں میں سے تھے، مولانا آزاد نے اُٹھایا اور بالا کر دیا، لیکن ان کی زندگی دو حادثوں کا شکار ہو گئی، ایک تو وہ مسلمان تھے اور نیشنلزم کی حدیں، کانگرس کے ہندو ذہن تک محدود ہو گئی تھیں، دوسرے ان کی شادی محبت کی شادی تھی، اور محبت کی شادی پالیٹکس میں شاذ ہی پروان چڑھتی ہے، یہ کہنا مشکل ہے کہ ارونا آصف علی ان کی وجہ سے آگے آئیں یا وہ ارونا آصف علی کی وجہ سے پیچھے رہ گئے۔

انور صابری مجھے اور نوابزادہ صاحب کو حسن نظامی کے ہاں لے گئے، ہم نے خواجہ صاحب سے پہلے غالب کے مزار پر حاضری دی، مزار کیا تھا، بس ایک ٹوٹی پھوٹی قبر تھی جس کا چبوترہ محفوظ پڑا تھا۔ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کی قبر تھی اس کا پختہ تعویذ سر کرشن پرشاد نے بنوایا تھا، آزادی کے بعد اس کو ایک چھوٹے سے مقبرے کی شکل

سہراب مودی نے دی جو غالب فلم کے ہیرو اور ڈائرکٹر تھے ۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

خواجہ صاحب کو اطلاع کرائی، کتب خانہ میں تھے، تشریف لاتے،

"شورش کاشمیری"؟

"جی ہاں! صابری میاں ان سے کون واقف نہیں"!

"نوابزادہ نصراللہ خاں - پنجاب کے ضلع مظفر گڑھ ان کی تعلقہ داری ہے"

"تعلقہ داری"؟

خواجہ صاحب انہی کے ہو گئے،

"نواب صاحب! آپ پنجاب کے ایک دُور افتادہ ضلع میں رہ کر ٹکسالی اُردو بولتے ہیں"

پُشت کی دیوار پر بہت سے سائن بورڈ آویزاں تھے،

"سماع نصف عبادت ہے"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بچیوں کے دف بجانے کو پسند فرمایا ہے - وغیرہ"

"ٹھہرئیے ابھی تھوڑی ہی دیر میں محفلِ سماع ہو گی" خواجہ صاحب نے کہا،

عرض کیا کہ "ہمیں جانا ہے، اجازت بخشیئے"، کہنے لگے۔

"کیوں آپ قوالی نہیں سنتے"؟

"جی نہیں"، میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"وہابی ہو"؟

"جی نہیں صحافی ہوں"!

"صحافی تو فنونِ لطیفہ ہی کے ہوتے ہیں"۔

"توسماع فنونِ لطیفہ میں سے ہے۔"

خواجہ صاحب مسکرا کے طرح دے گئے، کہنے لگے آپ ایڈیٹر لوگ لکھتے خود ہیں لیکن اداریہ میں ہم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں، اس کے معنی کیا ہیں؟

میں چکرا گیا، کیا سوال ہے؟

خود ہی فرمایا — میاں! — ہم ہندو کی ھ اور مسلم کی م سے مرکب ہے —

خواجہ صاحب الفاظ کے کاریگر تھے، اردو میں ایک محاورہ ہے بال کی کھال اُتارنا الفاظ کے معاملے میں واقعی بال کی کھال اُتارتے، ان کا دل کہاں تک کسی آدمی کو کھینچ سکتا تھا، اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں، لیکن ان کی زبان ضرور کھینچ لیتی تھی، اُس وقت عمر اُن کی ڈھل چکی تھی، بال کھچڑی ہو گئے تھے، لانبے قد میں خفیف سا خم آگیا تھا، لیکن لب و لہجہ کا زور جُوں کا توں تھا، حاضر جواب، برجستہ گو، دلچسپ اور پُرکشش، انہیں دیکھ کر پُرانے لوگ یاد آتے۔ بال اتنے لمبے تھے کہ ان کے چہرے کی تشبیب معلوم ہوتے، کانوں کی لووں تک گلدستہ کھلا ہُوا تھا، ہمارے شاہ جی انہیں ادیب نہیں مانتے تھے، الفاظ کا شعبدہ باز کہتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سادہ نثر لکھنے اور بات سے بات پیدا کرنے میں بے مثال تھے، ان کی زبان میں کرارا پن نہیں تھا، لیکن جو لکھتے خوب لکھتے، اور مزے مزے میں لکھتے، حلیہ نگاری میں سب سے پہلے اُنہی کا قلم جولاں ہُوا، سلوچنا د قلم اشارہ سے قائد اعظم تک کا چہرہ لکھا، گاندھی، نہرو، ابُوالکلام، ظفر علی خاں کے قلمی خاکے کھینچے، غرض الفاظ میں تصویریں بنا دیں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ الفاظ میں جوت جگاتے تھے، عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ کا ان کے ہاں گزر تک نہ تھا، قاری پھول چنتے اور سامع سر دھنتے تھے —

سی پارۂ دل، بیگمات کے آنسو اور دل کی بپتا، ان کے طرزِ انشا کے جواہر پارے ہیں، خواجہ صاحب پیروں کی سی کرامات رکھتے تھے یا نہیں؟ لیکن اپنے دَور کی دہلی کے ادیبوں میں واحد ادیب تھے جن کی نگارش میں کرامات تھیں — خواجہ صاحب سیاسیات میں

شریک نہیں تھے لیکن ان کی ادبیات میں سیاسیات کے نشتر صاف طور پر چھپے ہوتے،
انہوں نے مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خاں، سردار دیوان سنگھ مفتون وغیرہ سے بیسیوں
قلمی لڑائیاں لڑیں، ان میں ہارے بھی اور جیتے بھی، لیکن ان کی ہار جیت میں ہمیشہ ایک
کھلاڑی کی خو بو ہوتی۔

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کا دفتر اُن دنوں سالار عبدالستار کے مکان
کی نچلی منزل میں تھا، شناسائی نو سال پہلے ہو چکی تھی لیکن آپ کے ہم جلد ہی ایک دوسرے
کے دوست ہو گئے، سردار دیوان سنگھ مفتون ہفتہ وار صحافت کے نپولین تھے جنہیں حالات
کی سیاہ نے شکست دے کر ڈیرہ دون کے ہیلنا میں نظر بند کر دیا۔ ایک ہی ایڈیٹر تھے
جن سے ریاستی ایوانوں کے کنگرے ہلتے رہے، ملک آزاد ہو گیا۔ ریاستیں معدوم ہو
گئیں۔ دیوان سنگھ گوشہ نشین ہو گئے۔

تارا سنگھ سکھوں کے بہت بڑے لیڈر تھے بلکہ سب سے بڑے لیڈر، ان کا انجام
اچھا نہ ہوا، ایک معمولی شکست ان کے لیے قعرِ گمنامی میں جا گرنے کا باعث ہو گئی، ان کا
آبائی وطن راولپنڈی کے ضلع میں موضع کہوٹہ تھا، آخری فساد میں غنڈوں نے ان کے اعزہ
کو قتل کر دیا اور ان کی والدہ کو چیر ڈالا، ماسٹر جی کو ہمیشہ مسلم راج کا خوف رہا، بات بات
میں کرپان لہرانا اور چمکانا ان کی سیاسی عادت ہو گیا تھا، لاہور میں فسادات کا آغاز ان کی
کرپان سے ہوا اور سارے پنجاب میں پھیل گیا، نتیجۃً سارا ہندوستان اُس کی لپیٹ میں آ
گیا۔ نسلاً کھتری تھے اور کھتری ہی سے سکھ ہوئے تھے، لیکن سکھ دھرم کے لیے شاید اُن سے
بڑا بے غرض رہنما کوئی نہ تھا۔ وہ ایک سکھ ریاست چاہتے تھے، لیکن بے بس تھے، مسلمانوں
سے غالباً انہیں طبعی نفرت تھی، پاکستان بن جانے کے بعد انہیں اپنی نفرت کے نتائج کا شدید
احساس ہوا، انہوں نے سکھ ریاست کے لیے مرن برت رکھا، لیکن جواہر لال برت کا مقابلہ
کرنے پر تُل گئے، ماسٹر تارا سنگھ موت کے دروازے پر پہنچ گئے تو گرد و پیش کے اصرار پر

برت توڑ دیا، یہ ایک کھلی شکست تھی، اکال تخت نے ماسٹر جی کو یہ سزا دی کہ دہلی کے گوردوارہ میں تین دن جُوتے صاف کرنے پر لگا دیا، ایک امریکی نامہ نگار نے دیکھا تو سکھوں کو سخت سُست کہا۔ آخر ماسٹر جی سیاسیات سے ریٹائر ہوگئے، ان کی جگہ سنت فتح سنگھ نے لی، لیکن سکھ ریاست کا خواب اُدھورا رہ گیا، ایک چھوٹی سی لغزش ایک بڑے لیڈر کو قعرِ رُسوائی میں ڈال دیتی ہے اور وہ مدت العمر اُبھر نہیں سکتا بلکہ اس کی آگ میں بھسم ہوجاتا ہے، تارا سنگھ کا انجام بھی یہی ہوا، لیکن تارا سنگھ سے مل کر جو چیز مَیں نے محسوس کی۔ یہ تھی کہ وہ واقعی سکھ ریاست قائم کرنے کے متمنی تھے، انہیں اپنی قوم کی بہادری پر ناز تھا لیکن وہ غالباً یہ اندازہ نہیں کر پاتے تھے کہ کروڑوں کی اکثریّت میں لاکھوں کی ایک اقلیت کا بار آور ہونا بڑا مشکل ہے، ماسٹر جی ابتداءً اسکول ماسٹر رہے تھے، اپنی قوم سے بھی انہوں نے ایک اسکول ماسٹر ہی کا سلوک کیا، بلکہ صحیح یہ ہے کہ ڈرل ماسٹر کا۔ نتیجۃً سکھ قوم سیاسی گرداب کا شکار ہوگئی اور اب تک اس کا مستقبل مخدوش ہے لیکن مستقبل کے متعلق کوئی واضح پیشگوئی کرنا چنداں آسان نہیں، سکھوں کا واسطہ ایک ایسی قوم سے ہے جو ان کی بہ نسبت بہت زیادہ کائیاں واقع ہوئی ہے، ہندو بنیا طاقتور نہ سہی لیکن دُور اندیش ضرور ہے، مَیں نے اس دوران دہلی کے کارونیشن ہوٹل میں ماسٹر جی سے کہا تھا:

"آپ جس انداز میں شطرنج کھیل رہے ہیں اس سے تو آپ کے مہرے مات کھا جائیں گے۔"

ماسٹر جی نے کہا:

"سجنو، چھڈو ساڈی فکر نہ کرو، اپنی چنتا کرو، اسیں اِہناں لالیاں نوں سمجھ لواں گے۔"

(ترجمہ: دوستو، چھوڑو! ہماری فکر نہ کرو، اپنی فکر کرو، ہم ان لالاؤں سے

نپٹ بیں گئے)۔

ماسٹر جی آخر کار ہند و لیڈر شپ کے ہاتھوں پٹ گئے اس طرح پٹے کہ سنبھالا لینا مشکل ہو گیا حتیٰ کہ سور گباش ہو گئے۔

"اسلام میں کوئی برہمن نہیں" مفتی کفایت اللہ اس عالمگیر سچائی کی سند تھے، مولانا حبیب الرحمٰن کے الفاظ میں اپنے زمانے کے ابو حنیفہ، برسوں جمعیتہ العلماء ہند کے صدر رہے، بطور فقیہ ان کا بیحد احترام تھا، سیاسیات میں بھی ان کی رائے کا ہمیشہ احترام کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ جو قرار داد ایک دفعہ ان کے قلم سے نکل جاتی اس پر دوبارہ قلم لگانے کی ضرورت نہ ہوتی، کانگرس ہائی کمانڈ بھی ان کی توقیر کرتا، غرض ہر گوشہ میں ان کی سوجھ بوجھ کا اعتراف و احترام تھا، پالٹکس کی اندرونی خرابیوں سے بیزار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے، مدرسہ امینیہ کی نیو رکھی تھی اور اسی کے صدر مدرس رہے —— ہندوستان نے ان کے تبحر سے بہت کم فائدہ اٹھایا، مسلمانوں نے ان کے علم پر توجہ ہی نہ کی، انہیں ایک ایسا زمانہ ملا جس کا پہلا روپ اُجڑ رہا تھا اور دوسرا رُوپ بن رہا تھا۔

ہم شیخ حسام الدین کے سلسلہ میں جواہر لال اور آصف علی سے ملتے ملاتے مفتی صاحب کے دولتکدے پر حاضر ہوئے، اُن سے جو گفتگو ہوئی وہ میری یادداشتوں میں درج ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے مفتی صاحب سے شیخ صاحب کی خواہش کا ذکر کیا تو اور باتیں بھی کھُل گئیں۔ مَیں نے کہا:

"شیخ صاحب کی خواہش سے قطع نظر اصل سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کو لیگ کی جگہ لیا جا رہا ہے ان کا انتخاب عارضی ہے، اگر لیگ آج ہی عبوری حکومت میں شامل ہو جائے تو انہیں لازماً نکلنا پڑے گا۔ اور یہ بظاہر زیادہ دن کی بات معلوم نہیں ہوتی، جو لوگ اس وقت عبوری حکومت میں ہیں وہ مسلمان ضرور ہیں لیکن مسلمانوں کے نمائندے نہیں، یہ بالکل

انگریزوں جیسی حرکت ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو ایگزیکٹو کونسل میں شریک کر لیتے اور حکومت چلاتے تھے، دعویٰ اُن کا یہ ہوتا کہ ہندوستانی موجود ہیں لیکن وہاں ہندوستان نہیں ہوتا تھا۔ کانگرس کی پالیسی بھی اس وقت یہی ہے، لیگ سے لڑائی ہو تو نیشنلسٹ مسلمانوں کی آڑلی جاتی ہے، صلح کی طرح ڈالی جائے تو لیگ مسلمانوں کی نمائندہ ہو جاتی ہے، یہ دوغلہ پن سخت خطرناک ہے۔

مفتی صاحب نے میری تائید کی، مولانا سے کہا صورتِ حال تو یہی ہے، مفتی صاحب نے فرمایا:

"پاکستان ناگزیر ہو چکا ہے، اسباب و علل اور نتائج و آثار سے قطع نظر مسلمانوں کی زبردست اکثریت اس کی پشت پناہ ہے، آپ یقین رکھیں گاندھی جی اور جواہر لال سب اس کو تسلیم کر لیں گے، سردار پٹیل اور راجندر پرشاد پہلے ہی اس ذہن کے ہیں، آچاریہ اسی نزاع پر کانگرس سے علیحدہ ہو چکے ہیں، ہندوؤں کا عام ذہن بھی یہی ہے کہ دو تین صوبوں کے لیے سارے ملک کی آزادی کو روکے رکھنا حماقت ہے، اُن میں یہ خیال راسخ ہو گیا ہے کہ تقسیم کی صورت میں ایک ایسا ہندوستان انہیں ملے گا جس میں ہندو مسلم مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا، تب حقوق کی جنگ بالکل نہیں رہے گی، مسلمانوں کو اپنا وجود بچانا مشکل ہو جائے گا۔ وزارتی پلان کے مضمرات میں مسلمانوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں، لیکن جواہر لال نے اپنے معانی پہنا کر لیگ کو مشتعل کر دیا ہے، مسٹر جناح اس پلان کو ضرور ٹھکرا دیں گے، کیونکہ ان کے ذہن میں یہ بات نقش ہو چکی ہے کہ ہندو سیاست میں کبھی سیدھی بات نہیں کرتا۔"

نیشنلسٹ مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ مولانا حبیب الرحمٰن نے پوچھا:

"کیا بنے گا؟ ——— مفتی صاحب نے کہا اصل سوال تو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہے

میں نے کہا" ان حالات میں تو نیشنلسٹ مسلمانوں کو جناح کے ساتھ مل جانا چاہیے"
" بالکل نہیں" مفتی صاحب نے فرمایا ایک تو اس کا موقع نکل چکا ہے،
دوسرے اب یہ دیر آید درست آید نہیں، بلکہ اس میں بہت سی خرابیاں ہیں، مثلاً لیگ
کہے گی :

(۱) نیشنلسٹ مسلمانوں نے پاکستان کے سامنے سر نہیں جھکایا بلکہ حالات سے عاجز
آکر سپر انداز ہو گئے ہیں،

(۲) نیشنلسٹ مسلمانوں کو اپنی جد و جہد اور اس کی قربانیوں پر اعتبار نہیں رہا۔
صرف نتیجہ کی ناکامی کے آگے سپر انداز ہو گئے ہیں۔

(۳) ہندوؤں کے ذہن میں مزید اشتعال پیدا ہوگا، نتیجۃً وہ مسلمان جو پاکستان
میں جانے سے بچ رہیں گے ان کے قہر و غضب کا شکار رہوں گے اور ان کی مدافعت
کرنے والا کوئی نہیں رہے گا ــــ اس وقت نیشنلسٹ مسلمانوں کی لیڈر شپ مغضوب
و متروک ضرور ہے لیکن پاکستان اور ہندوستان بن جانے کے بعد یہی لیڈر شپ ہندوستان
کے بحرانی دور میں مسلمانوں کا دامن تھام سکتی ہے، نتائج کتنے ہی منفی ہوں لیکن ان کا
سہارا ضرور کام آئے گا۔

(۴) مسلم لیگ کی لیڈر شپ اس مرحلے میں ان نیشنلسٹ مسلمانوں کو من حیث الجماعت
قبول نہ کرے گی، بلکہ ان کی پوزیشن ایک مفتوحہ ذہن یا جماعت کی ہوگی۔

مولانا حبیب الرحمن نے کہا کہ مسٹر جناح علماء کو ساتھ ملانے یا انہیں کوئی پوزیشن
دینے کے لیے تیار نہیں، وہ زیادہ سے زیادہ لیگ کے ساتھ نتھی کر سکتے ہیں، آج حالات
نے انہیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ وہ غیر مشروط متابعت کے سوا کچھ نہیں چاہتے ــــ
وہ علماء کے انسٹی ٹیوشن ہی کے قائل نہیں، آپ کو یاد ہوگا ناگپور کانگرس میں تقریر کے
دوران انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کو "مسٹر" کہا تو لوگوں نے "مولانا" کہنے پر زور دیا،

انہوں نے دوبارہ "مسٹر" کہا تو لوگوں نے پھر اصرار کیا، اب لوگ کہہ رہے ہیں "مولانا" محمد علی اور جناح کہہ رہے ہیں "مسٹر" محمد علی۔ چاروں طرف غل مچ گیا، آخر اسی فضا میں جناح بیٹھ گئے، آپ جانتے ہیں کہ دونوں میں آخری وقت تک کھنچاؤ رہا، مسٹر جناح اپنی تعلیم اور اپنے مسلک کے اعتبار سے بھی علماء کو پسند نہیں کرتے۔ اپنی سیاست کے زور پر انہوں نے علماء کی دینی وجاہت کو ختم کردیا، اور عوام الناس کے دلوں سے علماء کا احترام اٹھا دیا ہے ——— اور یہ موجودہ سیاسیات کا منطقی نتیجہ ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے بھی گاہے ملہے ملاقات ہوتی رہی وہ تقریر کرتے یا موتی رولتے تھے ان کا دل آئینہ تھا، مدنی فارمولا ان کے قلم سے تھا، متحدہ محاذ والوں نے الفاظ میں حک و اضافہ کیا، مولانا آزاد نے نوک پلک سنواری لیکن گاندھی جی نے فارمولا کے متعلق فرمایا کہ اس سے پاکستان بہتر ہے، مولانا حفظ الرحمٰن خطیب ہی نہیں عالم بھی تھے اور ادیب بھی، ندوۃ المصنفین سے ان کی ایک کتاب "اسلام کا معاشی نظام" بہت پہلے شائع ہو چکی ہے، ان بُرے حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کی جو خدمت اس مردِ خدا نے کی اس کا اجر تو اللہ کے پاس ہے، لیکن بہ آسانی اُسے فراموش نہیں کیا جا سکتا، انہوں نے علی گڑھ کا دفاع کیا، دیوبند کی وکالت کی اور لوک سبھا میں ان مظالم کا پردہ چاک کرتے رہے جو ہندوستانی مسلمانوں کی تقدیر کا نوشتہ بن چکے تھے، ابھی ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی، غالباً پچاس سال کے پیٹے میں ہونگے کہ سرطان ہو گیا، سنا وقت آگیا اور اللہ کو پیارے ہو گئے، اللّٰہم اغفرہ۔

جمعیتہ العلماء کے دوسرے بزرگوں سے میں نہ مل سکا لیکن ایک بات جو میں نے محسوس کی وہ جمعیتہ کے دفتر کی ایک خاص ذہنی فضا تھی، احرار، جمعیتہ کے اکابر پر جان چھڑکتے تھے لیکن جمعیتہ کا دل احرار سے کشیدہ تھا۔

مولانا مدنیؒ کو دیکھا ضرور، نیاز بھی حاصل کیا، ان کی صحبت میں آدھ پون گھنٹہ

بیٹھا بھی لیکن شرفِ مکالمت سے محروم رہا، ان کے اِجلال و احترام کا یہ حال تھا کہ علماء ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے۔

جن علماءِ حق کا تذکرہ کتابوں میں دیکھا ہے وہ ان کی ہُو بہُو تصویر تھے، فقر و استغناء کا مجسمہ، علم و نظر کا پیکر، حدیث و فقہ کا گنجینہ، غیرت و حمیت کا پُتلا، ایثار و استقامت میں ڈھلا ہُوا وجود، مجال ہے زبان پر کسی کے خلاف کلمۂ استخفاف ہو، ایک ایسا انسان جس کا ذہن کسی کی اہانت یا کسی کی توہین کا تصوّر ہی نہیں کر سکتا تھا —— روضۂ رسول کی جاروب کشی نے ان کی آنکھوں میں قرنِ اوّل کی حیا بھر دی تھی۔

مولانا ابوالکلام سے اب تک بیسیوں ملاقاتیں ہو چکی تھیں لیکن دہلی کی چند ملاقاتیں خاصی یادگار تھیں، تفصیلات تو اُن کی سوانح عمری میں آجائیں گی جو کئی سال سے زیرِ قلم ہے لیکن دو چار باتیں ایسی ہیں کہ ان کے بغیر یہ کہانی ادھوری رہ جاتی ہے، مولانا سے ملنا بہت مشکل تھا اور مَیں اس کا مشاہدہ کر چکا تھا، بڑے بڑے آدمی ان کے ہاں آکے لوٹ جاتے، مولانا ملیح آبادی نے ان کے متعلق اپنی کتاب ذکرِ آزاد میں لکھا ہے، کہ ایک دفعہ گاندھی جی کو لوٹا دیا تھا، سردار دیوان سنگھ مفتون نے چٹان میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں مولانا سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ:

اجمل نے کہا پرائم منسٹر ہاؤس سے فون آیا ہے کہ جواہر لال آرہے ہیں، کہنے لگے انہیں روک دو، مَیں اس وقت مفتون صاحب سے باتیں کر رہا ہوں، مولانا غلام رسول مہر نے اس سے بھی دلچسپ واقعہ سنایا کہ مولانا نے انہیں دہلی بلوایا، اور وہ ہفتہ بھر ان کی کوٹھی میں ٹھہرے رہے لیکن ملاقات مشکل ہو گئی، قاضی عبدالغفار بھی وہیں مقیم تھے، مہر صاحب نے ان سے گلا کیا کہ پاکستان سے چل کر آیا اور طلبی پر آیا ہوں لیکن ملاقات نہیں ہو رہی، پُورا ہفتہ ہو گیا ہے، قاضی صاحب نے کہا، مجھے ایک ماہ ہو گیا ہے اور مَیں نے اب تک شکل نہیں دیکھی، آخر عشرہ بعد ملاقات ہو گئی، کہنے لگے چودھری صاحب

آپ کب سے آئے ہیں، مہر صاحب نے کہا ہفتہ ہو گیا ہے،

"تو خیر ایسا کریں جس کام کے لیے بلوایا تھا بعض مصروفیتوں کی وجہ سے اس کو ملتوی کر دیا ہے، دوبارہ خط لکھواؤں گا"

مولانا کی بڑی بہن بھی مہینہ بھر سے وہیں ٹھہری ہوئی تھیں، صبح نماز کے بعد پائیں باغ میں ٹہل رہے تھے کہ ان پر نظر پڑی؟

اخاہ! آپ ہیں؟ کب تشریف لائیں؟

غرض مولانا عمر بھر کم آمیز رہے، ان کا ایک ہی مشغلہ تھا ـــــ ع

فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے

یا پھر گوشۂ قفسے! کوئی خاص نیاز مند اصرار کرتا تو علی الصبح ٹہلائی کا وقت دیتے کہ آجاؤ باتیں کر لیں گے۔

انہیں قرطاس وقلم، غور وفکر اور مطالعہ ومشاہدہ کے سوا کسی شے سے دلچسپی نہ تھی، انسانوں سے ملنا ان کے لیے بہت بڑا بوجھ تھا، شیخ حسام الدین شاہ جی کی ملاقات کے لیے وقت لے آئے، اڑھائی بجے سہ پہر سے ساڑھے چھ بجے شام تک کا اور یہ شاہ جی سے ہم سخنی کے لیے کافی تھا لیکن شاہ جی گھر ہی سے چالیس منٹ لیٹ چلے، گھنٹہ بھر تاخیر سے پہنچے، مولانا کوٹھی کے دروازے پر پریشان کھڑے تھے، موٹر ان کا بگڑا ہوا تھا، ہمیں دیکھتے ہی کہا:

"ہاں تو ذرا آپ کا موٹر مجھے چھوڑ آئے اور آپ یہاں میری واپسی تک بیٹھیں"۔

شاہ جی نے آگے بڑھ کر کندھا جھکاتے ہوئے کہا،

حضرت، شانے حاضر ہیں،

"ہاں! وہ بوجھ تو اٹھائے ہوتے ہیں میرے بھائی آپ"! مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تھوڑی سی دیر میں واپس آگئے،

فرمایا :۔ وائسریگل لاج تک گیا تھا کرپس سے کہا ہے جو فیصلہ بھی کرنا ہے جلد کیجیے ؛ یہاں دہلی میں گرمی کا زور ہو گیا ہے، چنانچہ گفتگو شملہ منتقل ہو گئی ہے "

شاہ جی نے پوچھا، حضرت "غبارِ خاطر" چھپ گئی ہے ؟

فرمایا :۔ "ہاں میرے بھائی، لیکن جلد سازی مکمل نہیں ہوئی، کچھ کاپیاں ناشر نے بھجوائی ہیں، ان میں سے ایک جواہر لال کو بھجوادی ہے "

عبداللہ کو آواز دی، غبارِ خاطر کی دو کاپیاں لے آؤ،

ایک کاپی شاہ جی کو دستخط کر کے دی، دوسری مجھے، اُس پر لکھا :

"بپاسِ خاطر عزیزی عبدالکریم شورش"

یہ میرے لیے ایک بڑا افتخار تھا، شیخ حسام الدین پریشان سے ہو گئے، مولانا تاڑ گئے، ایک کاپی اور منگوا کے ان کی نذر کی، ہمارے ساتھ نوابزادہ نصراللہ خاں بھی تھے، انہیں آٹو گراف دیا،

ہے آج جو سرگذشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

اب جو ملک کے مختلف مسائل پہ باتیں چھڑیں تو گلفشانیٔ گفتار کا نقشہ کھنچ گیا، طبعِ رواں کا دریا موجیں مار رہا تھا، فرمایا :

"ملک میں غیر ملکی استبداد کا رہنا ممکن نہیں رہا، حکومت کے لیے ایک ہی چارۂ کار ہے، کہ ہندوستان کی حکومت ملکی نمائندوں کو سپرد کر کے چلی جائے اب اگر حکومت نے یہاں رہنے پہ اصرار کیا تو اس کے نتائج خطرناک ہوں گے اس کی حکمرانی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور کوئی سادامن بھی اسے پناہ دینے کے لیے باقی نہیں رہا، ساری روک اب اس بات کی ہے کہ جائیں تو کس طرح اور اختیارات منتقل کریں تو کیسے اور کیونکر ——— ؟

"لیگ سے کیسے نمٹا جائے گا"، شیخ صاحب نے پوچھا،
اور مولانا اُن کا مطلب پاگئے، فرمایا:

"لیگ سے معاملہ تو بہر حال طے ہونا ہے، رہنا تو یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو ہے، پاکستان بنا لیں تو بھی ہندوستان کے اُن مسلمانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوتا جو یہاں رہیں گے اور جن کے لیے یہاں سے اُٹھ کے جانا مشکل ہوگا، نہ تو پاکستان جو بنے گا اس کے لیے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو سمانا اور رکھنا ممکن ہے اور نہ یہ مسلمانوں کے بس میں ہے کہ آزادی کا اعلان ہوتے ہی ان کی آنکھ پاکستان میں کھُلے گی، یہ کام جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہے، کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ جناح کانگرس سے غایت درجہ بدظن ہیں، ہر چند میں نے چاہا ان سے معلوم کر دوں کہ مصالحت ممکن ہو تو کس نقطہ پر ہو سکتی ہے یا وہ کس مقام پر ٹھہر سکتے ہیں لیکن ان کے جواب سے آپ لوگ آگاہ ہیں، گاندھی نے کئی دفعہ کوشش کی، جواہر لال بھی ہو آتے، لیکن وہ پیٹھ پہ ہاتھ ہی دھرنے نہیں دیتے، ظاہر ہے ہندوستان تقسیم ہوا تو پاکستان بھی تقسیم ہوگا، جوش و غضب میں ہوش و خرد کہاں رہتے ہیں، اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہر فریق اس کوشش میں ہے کہ پاتا کیا ہے، جہاں تک اختیارات کی منتقلی کا تعلق ہے، انگریز چاہیں بھی تو روک نہیں سکتے، وہ ہندوستان کو واقعی چھوڑ رہے ہیں، کانگرس چاہتی ہے یہ کام اُس کی خواہش کے مطابق ہو، اور مصالحت اُس سے ہو، لیگ چاہتی ہے کہ اس کا موقف پورا ہو اور بہر قیمت پورا ہو، اختیارات تو کانگرس اور لیگ ہی کو منتقل ہونگے لیکن مفاہمت کے فقدان اور اس سے پیدا شدہ آویزش نے انتقالِ اختیارات کی نوعیت اور اس کا تعین حکومت کے ہاتھ

میں دے دیا ہے، ظاہر ہے فریقین راضی نہ ہوں تو فیصلہ تیسری جماعت کو دینا پڑتا ہے۔"

شاہ جی نے کہا ـــــ اس کا مطلب ہے کہ لیگ سے صلح کی ہر کوشش ناکام ہو گئی ہے، مولانا نے فرمایا، فی الحال تو ناکام ہی ہو گئی ہے آئندہ کامیابی کا امکان نہیں، بلکہ حالات اور خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ شاہ جی نے چاہا، مولانا کی طبیعت کا رُخ ادبیات کی طرف پھیر دیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ تھکے ہوئے ہیں اور ان کی طبیعت پر کوئی بوجھ ہے، البتہ دو چیزیں جو گھنٹہ بھر کی اِس صحبت میں معلوم ہوئیں یہ تھیں کہ:

(۱) صورتِ حالات سے خوش نہ تھے، ہندوستان کی آزادی کا نقشہ جو کبھی ان کے ذہن میں تھا اُدھورا رہا جا رہا تھا، آزادی آ رہی تھی مگر اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہ رہے تھے جو کچھ ان کا دل محسوس کرتا کھل کے نہیں کہتے تھے، انسانوں میں رہ کر بھی آخر تک انہیں اپنی تنہائی کا احساس اور اس پر اصرار رہا۔

(۲) اس ملاقات سے بہت پہلے ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو وزارتی مشن کا پلان ان کے ذہن میں تھا، اور وہ چاہتے تھے مسلمان اس کو من وعن قبول کر لیں، اس سے بہتر نتائج پیدا ہوں گے، مولانا کے الفاظ جو میری یادداشتوں میں درج ہیں، تقریباً یہ تھے کہ:

"جو حل میں نے تجویز کیا ہے اگر جانبین نے اس کو مان لیا تو جس انتہا پر سیاسی ہیجان ہے یا جس سطح پر حالات کھول رہے ہیں اس حل سے وہ ہیجان بھی ختم ہو گا اور حالات بھی معمول پر آ جائیں گے اس طرح ظن وتخمین، شک وشبہ، اور تکرار وتصادم کا مطلع صاف ہو جائے گا۔"

"وزارتی مشن جو سکیم پیش کر رہا ہے آپ کی ہے؟" شیخ صاحب نے پوچھا،

"نہیں بھائی! سیاسیات میں کوئی خیال، تجویز، نقشہ یا موقف کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں ہوتا، یہ چیزیں باہمی سوچ بچار اور گفت وشنید سے

وضع ہوتی ہیں، مَیں نے ایک خاکہ تجویز کیا تھا، میرا خیال ہے وزارتی مشن نے
اس پر صاد کیا ہے، اب اس کی تفصیلات اور جزئیات کا انحصار ان کے
اپنے فکر اور اپنی دسترس پر ہے کہ وہ اس کو کس طرح آخری شکل دیتے ہیں۔
——— مولانا قدرت کا عطیہ تھے لیکن

مُصحفے درمیانِ زندیقاں

پنڈت نہرو ان دنوں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوتے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن خبر لائے کہ وہ شاہ جی سے ملنا چاہتے تھے اور مَیں انہیں میر احمد حسین کی دکان پر کل پانچ بجے شام مدعو کر آیا ہوں ——— پنڈت جی وعدہ کے مطابق پہنچ گئے، شاہ جی سے معانقہ کیا ہم سے مصافحہ، میں تھا، شیخ صاحب تھے، ماسٹر تاج الدین انصاری تھے، مولانا حبیب الرحمٰن تھے اور میر احمد حسین، تعارف ہُوا، پنڈت جی کوئی سوا گھنٹہ ٹھہرے، کھُل کے باتیں کیں، ہندی سنسکرت کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا، سیاسی بات چیت میں انگریزی ضرور ٹپک پڑتی ہے، مجال ہے کسی اصطلاح یا کسی خیال میں انگریزی کا لفظ آیا ہو، صاف ستھری عجیب اُردو بولتے رہے جیسے کوئی فصیح لکھنوی ہو، خود الٰہ آباد کے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کی اپنی زبان اُردو تھی چوکس فقرے، روزمرّہ کا غازہ، محاورے کی سرخی، سلاست کا زور، دانائی کا عمق، انشا کی زیبائی، بول چال کی صفائی، غرض اُردو اُن کی زبان پر قربانت شوم کی صدا دے رہی تھی ——— پنڈت جی سیاسی، معاشی اور مجلسی مسئلوں پر گفتگو کرتے رہے، انہیں شدید احساس تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اور ہر گفتگو کے بعد مزید اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

"تقسیم ناگزیر ہو چکی ہے تو مان لیں" مَیں نے پنڈت جی سے کہا،

"بظاہر تو ناگزیر ہو چکی ہے لیکن ایک دوسرا حل بھی سامنے آگیا ہے، مولانا آزاد نے وزارتی مشن کو ایک خاکہ دیا ہے، شاید اس کے مطابق کوئی صورت نکل آئے، کرپس نے

تو مجھ سے یہی کہا ہے کہ وزارتی پلان کے لیے مولانا کی تجاویز ایک عمدہ بنیاد ہیں۔"
"وہ خاکہ کیا ہے"؟ میں نے سوال کیا۔
پنڈت جی مسکراتے "ہفتہ عشرہ میں سامنے آجائے گا، کوئی چیز بجائے خود راز نہیں ہوتی، صرف وقت کی الجھن ہوتی ہے کہ اب بیان کی جائے یا وقت پر اور جو چیز راز ہوتی ہے اس کا عوام سے تعلق نہیں ہوتا"۔
شیخ صاحب کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پنڈت جی نے کہا
"جناح کا ماننا اور ہمارا منانا دونوں بیکار ہو چکے ہیں، اپنی سی سب کوششیں کر لی ہیں۔
ماؤنٹ بیٹن پلان کے بعد بھی پنڈت جی کا یہی خیال تھا کہ بٹوارہ نہیں ہوگا، کیونکہ تقسیم کا ماننا اور چیز ہے اور تقسیم کا ہونا دوسری چیز، لیکن ملک تقسیم ہوگیا، پنڈت جی نے اس روز ایک عجیب سا "انکشاف" کیا کہ سکندر حیات نے قرارداد پاکستان کے فوراً بعد انہیں ایک خط لکھا تھا کہ وہ تقسیم کے حامی نہیں ہیں، جب ان سے پوچھا گیا آپ نے تو قرارداد لاہور کی تائید کی ہے؟
جواب دیا کہ "اسٹیج کی بات اور ہوتی ہے"
شاہ جی نے کہا وہ خط کہاں ہے؟ پنڈت جی نے کہا الہ آباد میں کہیں پڑا ہوگا آپ ذکر کرنا چاہیں تو میرا نام لے دیں، میں وہ خط آپ کو بھجوا دوں گا۔
پنجاب کا ذکر چھڑ گیا تو پنڈت جی جھنجلا گئے،
"پنجاب نے ہمیشہ ہی رکاوٹیں پیدا کی ہیں!
میں نے کہا "پنڈت جی آپ نے جو لیڈر صوبہ کے لیے منتخب کیے ہیں ان کی سزا عوام کو تو دیں۔
مسکراتے "نہیں صاحب، یہ بات نہیں اوّل تو ہم نے لیڈر منتخب نہیں کیے لیڈر

تو عوام منتخب کرتے ہیں، ہم نے تو انہیں کام سونپنا ہے، لیکن پنجاب کا مزاج ہی ایسا ہے کہ جب تک آپس میں چغلی نہ کھائیں یا ایک دوسرے کو گرائیں نہیں، ان کی طبیعت ہی آسودہ نہیں ہوتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ پنجاب کے بیشتر کام رُکے رہتے ہیں اور پنجاب کا مسئلہ ہم سب کے لیے دردِ سر بن گیا ہے، کوئی سا گوشہ اطمینان کا نہیں رہا۔"

"یہ پنجاب ہی تھا جہاں راوی کے کنارے آپ کی صدارت میں کامل آزادی کا ریزولیوشن پاس ہوا اور صدارت کا پہلا شرف آپ نے پنجاب ہی کو بخشا تھا۔" میں نے کہا

—— "یوں تو پنجاب سے میرا تعلق بہت گہرا ہے، میری والدہ پنجاب کی تھیں۔ لاہور چونے منڈی میں ان کا مکان تھا لیکن پنجاب کا سیاسی مزاج ہمیشہ قابو سے باہر رہا ہے، وہاں سیاسیات سے زیادہ ذاتیات کے جھگڑے رہتے ہیں، ہم نے بہت چاہا کہ احرار کانگرس میں شامل ہو جائیں، صوبہ کانگرس کو دو سال کے لیے معطل کر کے احرار کے حسبِ منشا ایک کمیٹی بنا دینا چاہی جو صوبائی کانگرس کے ہر کام کی انچارج ہوتی لیکن احرار ہی راضی نہ ہو سکے۔"

پنڈت جی نے یہ بات کہہ کر شاہ جی کی طرف دیکھا شاہ جی طرح دے گئے،

پنڈت جی جانے لگے تو میں نے ان سے عجیب سا سوال کیا۔

"پنڈت جی، لوگ آپ سے محبت کیوں کرتے ہیں؟"

پنڈت جی مسکرائے —— بھئی یہ بھی کوئی سوال ہے؟

میں نے اصرار کیا تو شاہ جی نے کہا "یہ لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور لوگ ان سے محبت کرتے ہیں"

پنڈت جی رُک گئے ——

"جی نہیں! وجہ یہ ہے کہ لوگ آوارہ گرد ہوتے ہیں اور میں بھی آوارہ گرد ہوں، لہٰذا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

میرا خیال ہے پنڈت جی کسی بھی اصول، موقف، عقیدے، نظریے، تصور، خیال، شے، وجود، اور تحریک سے اس لیے محبت یا نفرت نہیں کرتے تھے کہ اُس کی تردید یا تائید اُن کے آبائی مذہب سے ہوتی ہے، ان کے مخصوص ذہنی عقائد تھے، انہی کے تحت وہ محبت اور نفرت کرتے تھے، وہ پیدائشی طور پر ہندو تھے لیکن مذہبًا نہیں، ان کا معاشرہ ہندوستانی تھا، تہذیبًا وہ ہندو، مسلمان، عیسائی سب کچھ تھے، ان کے علم پر یورپ کے خیالات کی چھاپ لگی ہوئی تھی، وہ اردو بولتے، انگریزی میں لکھتے اور ہندی چاہتے تھے ان کا سیاسی نظریہ کئی نظریوں کا مجموعہ تھا۔ وہ جمہوری بھی تھے اور اشتراکی بھی، چین سے انہیں بہت اُنس تھا، چین آزاد ہوا تو اس چین ہی سے ان کی ٹھن گئی، وہ ایک بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے۔ موتی نے جواہر پیدا کیا تھا، جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوا وہ ہندو یا مسلمان ہو کر نہیں سوچتے تھے، بلکہ ایک انسان کی طرح سوچتے تھے، جونہی ہندوستان آزاد ہو گیا ہندوستان کے نقطۂ نگاہ سے سوچنے لگے، ظاہر ہے کہ قومیت و وطنیت کے تصور میں خیالات محدود ہو جاتے ہیں، وزیراعظم کا عہدہ ان کے لیے باعثِ فخر نہ تھا، وہ اس عہدے کے لیے باعثِ فخر تھے، لیکن اس عہدے نے ان کی شخصیت کو محصور کر دیا، اور وہ محدود ہو گئے۔ ہندوستان ان پر صدیوں فخر کرتا رہے گا، وہ گاندھی جی کے بعد سب سے بڑے ہندوستانی لیڈر تھے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ان کے عہد میں ہندوستانی مسلمانوں کو جانگداز حالات سے گزرنا پڑا، اور وہ ابھی تک سنبھالا نہیں لے سکے لیکن نہرو خود خنجر نہیں تھے۔ ان کے گرد و پیش خنجر ہی خنجر تھے۔

جس شخص کی وصیت یہ ہو کہ میری موت کے بعد میری راکھ ملک کے کھیتوں میں طیاروں سے پھینک دی جائے، اور میرے "پھول" ملک کے سبھی دریاؤں میں بہا دیئے جائیں، اپنے ملک سے اس کی محبت میں کسے کلام ہو سکتا ہے، ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگرس کے موقع پر ان کا ستارہ اُبھرا اور ۱۹۶۴ء میں ہندوستان کے افق سے آفتاب کی طرح

ڈوب گیا، پینتیس سال تک ان کا اقتدار رہا، بادشاہوں کی کہانیوں میں خاندانوں کی حکومت
پڑھی ہے لیکن جمہوری نظام میں خاندان کی حکومت صرف نہرو خاندان ہی کا حصہ رہی ہے
موتی لال سے کانگریس کی صدارت جواہر لال کے ہاتھ آئی اور وہ بارہا صدر بنتے رہے،
ہندوستان آزاد ہوگیا تو وزیر اعظم ہوگئے ـــــ موت تک وزیر اعظم رہے، شاستری
کے بعد یہ اختیار اُن کی بیٹی اندرا گاندھی کو منتقل ہوگیا۔

معاصرانہ چشمک

ایک چیز جس نے اس دوران میں میرے دل و دماغ پر عجیب طرز کے اثرات پیدا کیے۔ وہ لیڈروں کی باہمی چشمک تھی، نہ جماعتیں اس سے خالی تھیں، نہ افراد، رہنماؤں میں (الا ماشاء اللہ) اس مرض کو عام پایا، جنہیں فرشتہ سمجھا تھا انسان نکلے ــــــ اور بقول غالب

ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بڑے بڑے عالی دماغ دل کے بودے، اور بڑے بڑے بالا بلند حوصلہ میں کمزور نظر آتے، جن کے دماغ فہم و فراست میں ڈھل کے نکلے تھے، ان کے دل حسد و رقابت کا شکار معلوم ہوتے، دوسروں کی برائی پر خوش ہونا ولایت سے کم نہیں، بہت کم لوگ ہونگے جن کا دل دوسروں کی عزت و شہرت پر خوش ہو، معاصرانہ چشمک ایک ایسی بلا ہے کہ پناہ بخدا، کوئی دور، کوئی عہد اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہا، تاریخ انسانی میں صرف اللہ والے لوگ ایسے ہیں جو معاصرت کے فتنہ میں مبتلا نہیں ہوتے ورنہ سیاست جیسی ہو اور جس دور کی ہو اس فتنہ سے خالی نہیں رہی، حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا تھا ــــــ علماء کی صحبت سے علم حاصل کرو، لیکن معاصروں کے متعلق ان کی رایوں پر اعتناء نہ کرو کہ ان میں باہمی حسد ہوتا اور یہ مینڈھوں کی طرح ایک دوسرے سے سینگ لڑاتے ہیں۔

تاریخ کے ہر دور میں معاصرت کی یہ چپقلش موجود رہی، میں کوئی خطرہ مول لینا

نہیں چاہتا ورنہ قرونِ اولیٰ کا دور جس نے معاشرہ کے بہترین انسان پیدا کیے، معاصرت کی اس وبا سے محفوظ نہیں رہا، ابوسفیان اور اس کی اولاد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے لیکن اپنا قرض کربلا میں چکا لیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور یہاں ان کی سلطنت کے دوران معاصرت کی بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں کوئی سا عہد بھی اس سے محفوظ نہ رہا —— غالباً تلوار کی دھار پر اتنا لہو نہیں جتنا قلم کی نوک اس لہو سے گلنار ہے، حسد طافتور ہو تو یار لوگ رشک کہہ لیتے ہیں ورنہ رشک ریشم ہے، حسد گاڑھا، دونوں انسانی صفات کے لیے کفن ہو سکتے ہیں۔

حسد سے رقابت، رقابت سے عداوت، عداوت سے انتقام، پھر جانے کیا کچھ پیدا نہیں ہوتا، دیدہ و دل میں اک آگ سی لگی رہتی ہے، ایک حاسد کی زبان اس کے تحمل پر بھی اپنے دل کی لَو سے اٹھتی اور اس کی آنکھ کے اشارے خود بخود سلگ اٹھتے ہیں۔

سیاسیات میں بے شمار فتنے اصول سے کہیں زیادہ اشخاص کی رقابت سے پیدا ہوئے، تاریخ کا مزاج تک بدل گیا، پورا معاشرہ، پوری تنظیم پوری جماعت، پورا ملک پوری ملت اور پوری نسل اس سے متاثر یا ملوث ہوئی، کم مخالفتیں اصولی ہوتی ہیں، اکثر مخالفتیں شخصیتوں کے حاسدانہ جذبات سے جنم لیتیں اور اپنے خفی و جلی محرکات سے پروان چڑھتی ہیں۔

انسان دور رہ کر اس کا اندازہ نہیں کر سکتا، لیکن قریب آکر تمام راز کھل جاتے اور دیوتا بھی انسان نظر آنے لگتے ہیں، فضلاء، علماء، ادباء، شعراء، زعماء میں سے ننانوے فی صد افراد اس متعدی مرض میں مبتلا ہوتے اور اپنی نمود و نمائش کے لیے بڑی بڑی متاع کو بھی داؤں پر لگا دیتے ہیں، ان کی فضیلتیں، ان کا علم، ان کی سیادت، ان کا ادب ان کی شاعری اور ان کی وجاہتیں اپنی تمام بلندیوں کے باوجود فرش پر ہوتی ہیں، وہ زمین ہی کے لوگ ہیں جنہیں ہم آسمان پر دیکھتے ہیں اور جن کے متعلق عوام کا تصور یہ ہے کہ شاید غیر معمولی انسان

ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان میں ایک معمولی انسان بھی نہیں ہوتا۔

بڑے بڑے شاعروں کو دیکھا، ہم انہیں "پوجنا" چاہیں تو الگ بات ہے لیکن ان میں آتشِ حسد کے علاوہ خبثِ نفس بھی تھا، میر تقی میر کا وہ لطیفہ سنا ہو گا،

کسی نے پوچھا کیوں حضرت آج کل شاعر کون ہے؟ فرمایا، ایک سودا، دوسرا یہ خاکسار اور آدھے خواجہ میر درد، کسی نے پوچھا میر سوز؟ چیں بہ جبیں ہو کر بولے، میر سوز بھی شاعر ہیں؟ اس نے کہا نواب آصف الدولہ کے اُستاد ہیں، کہا خیر یہ چیز ہے تو پونے تین سہی"۔

غالب ذوق کے معاصر تھے، زمانہ کی بدمذاقی نے ان سے جو سلوک کیا، ڈھکا چھپا نہیں۔ معاصرت کا فتنہ متعاقب رہا اور انہیں کہنا پڑا۔

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

شبلی، حالی، محمد حسین آزاد، واقعی بڑے آدمی تھے ان کے قلم سے جو شہ پارہ نکلا، لافانی ہو گیا، لیکن انہیں بھی معاصرت کے زخم سہنے پڑے۔ حالی جب تک زندہ رہے، حاسدوں نے مین میخ نکالنا اپنا فرض سمجھا، اودھ پنچ نے لکھا ——

اُبتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے

میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

چونکہ حالی کسی کے حاسد اور کسی کے ناقد نہ تھے لہٰذا اتنا کہا اور چپ ہو گئے۔

حالی کو تو بدنام کیا اُس کے وطن نے

پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

شبلی اور آزاد کی چشمکیں مہدی افادی نے لکھی ہیں، ہمارے زمانہ میں جوش، احسان دانش، سیماب، جگر، حفیظ بلکہ اقبال تک حسد و رقابت کا شکار رہے، ترقی پسند تحریک کا بیشتر حصہ جہاں تک نظم و نثر کا تعلق ہے انجمن ستائش باہمی کا منت گزار رہے لیکن اس تحریک کے نمائندوں کی تنگ دامانی اور بے مائیگی جس کے تحت الشعور میں حسد و رقابت کا جذبہ

دافر تھا اور ہے، اپنے خاص مطمح نظر کی وجہ سے اثباتی ادب کی غارت زدگی کا باعث ہوئی ہے
دین میں معاصرت کی تیغ براں بڑے بڑے عابدوں اور فقیہوں کے سینہ میں گڑی ہے،
سید سلیمان ندوی مولانا آزاد کے عیبوں کی تلاش میں سرگرداں رہے، مولانا عبدالماجد دریابادی
نے مولانا آزاد کا کفن نوچنے میں حیا نہ کی، علامہ انور شاہ اور مولانا حسین احمد مدنی کی قبروں
میں انتیاز دیکھا، اول الذکر کا مزار ٹوٹ پھوٹ کر بیٹھ گیا، کوئی ڈھیری نہ بنا سکا، بریلوی اور
دیوبندی گروپ میں کشمکش کی وجہ محض عقیدہ ہی نہیں ان کا علم بھی ہے، دیوبند نے جو علماء
پیدا کیے وہ سارے ہندوستان پیدا نہ کر سکا، لیکن مدنی گروپ اور تھانوی گروپ میں اب
تک کھچاؤ چلا آرہا ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی کو لیگ نے اس لیے شیخ الاسلام کا درجہ دیا کہ
مولانا حسین احمد مدنی کو شیخ العرب والعجم لکھا جاتا تھا،

ہمارے زمانے میں سرسید پر کیا نہیں گزری، انہیں شدائد کے طوفانوں سے گزرنا
پڑا، کئی حاسدوں نے اسلام کے نام پر ان سے دو دو ہاتھ کیے۔

تحریک خلافت میں سیاسی زندگی عروج کو پہنچی لیکن یہی زمانہ سیاسی چشمکوں کے عروج
کا زمانہ تھا اور ان چشمکوں میں واضح طور پر احساس کمتری و احساس برتری موجود رہا ۔

مہاتما گاندھی نے گوکھلے اور تلک کو شہ مات دی، گاندھی جی کو کلکتہ کانگرس میں
کوئی مندوب بنانے کے لیے تیار نہ تھا، وہاں وہ ڈیلی گیٹوں کے بیت الخلاء صاف کراتے
رہے، آخر ایک دن کانگرس کے مالک ہو گئے حتیٰ کہ کانگرس ان کے بغیر کچھ نہ تھی، کبھی ان
کے لیے چار آنے کا ممبر بننا مشکل تھا، اب وہ چار آنے کے ممبر نہ تھے لیکن کانگرس کے باپو
تھے، حکومت سے کانگرس کی ٹھنتی تو زمام کار ہمیشہ ان کے ہاتھ میں ہوتی، وہ کانگرس ہائی
کمانڈ کے سپریم کمانڈر تھے، پنڈت مدن موہن مالویہ ان کے ہم عصر تھے، انہیں "پرجیہ باپو"
کا لقب دیا مگر کانگرس سے الگ رکھا، پنڈت موتی لال معاصر تھے لیکن اُن کی اَنا کو اس
طرح رام کیا کہ جواہر لال کو اپنی جگہ کانگرس کا صدر بنا دیا، اور یہ جواہر لال کی عالمگیر

شہرت کا نقطۂ آغاز تھا، اس طرح گاندھی جی کانگرس کے مختارِ کل بن گئے، سبھاش چندر بوس نے سرکشی دکھائی، تو تری پور کانگرس کے موقع پر راجکوٹ میں مرن برت رکھ کر تمام ہندوستان کی نگاہیں اپنی ذات پر مرتکز کر لیں، اور یہ حقیقت ہے کہ سبھاش چندر کو ان کی وجہ سے ہندوستان چھوڑنا پڑا، گاندھی جی مہاتما ہونے کے باوجود کانگرس میں اپنے کسی حریف کو برداشت نہیں کرتے تھے، اُنھوں نے کانگرس کو گاندھی ازم کا گہوارہ بنا دیا، قائدِاعظم جناح اور مہاتما گاندھی دونوں دادا بھائی نوروجی کے شاگرد تھے، لیکن دونوں میں ایک ایسا فاصلہ پیدا ہو گیا کہ ہم اس کو ہندوستان اور پاکستان کا فاصلہ کہہ سکتے ہیں، قائدِاعظم اور محمد علی جوہر میں چشمک رہی، سر فضل حسین اور محمد علی جناح میں ٹکراؤ رہا، قائدِاعظم نے بہمہ وجوہ ہندوستان چھوڑ دیا اور انگلستان میں بس گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے علم کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا لیکن قائدِاعظم نے مولانا کو منفی کیا۔ مولانا ظفر علی خاں کی طبیعت میں تلوّن ضرور تھا لیکن اُن کی گوناگوں قابلیتیں معاصروں کے لیے حسد و رقابت کا باعث بنی رہیں۔

احرار، جہاں تک کانگرس اور جمعیتہ العلماء کے ہائی کمانڈ کا تعلق تھا بڑے فراخ حوصلہ اور کشادہ قلب تھے لیکن کانگرس ہائی کمانڈ ان کے متعلق کھلے بندوں تنقید کرتا، جمعیتہ کے ارکان احرار میں زمانہ بھر کے عیب نکالتے اور اختلاف یہ تھا کہ اپنی الگ تنظیم قائم کر رکھی ہے، خان عبدالغفار خان کے متعلق سرحد کے بعض زعماء کو شکایت تھی کہ صوبہ کی رہنمائی اور اس کے فوائد اپنے گھر تک محدود کر لیے ہیں لیکن اس کا خیال اُنہیں مطلق نہ تھا کہ صوبہ سرحد کی خاطر مصائب کا بوجھ اور قید و بند کی لگاتار صعوبتیں بھی خان صاحب، ان کے خاندان اور ان کے پیروؤں ہی نے برداشت کی ہیں، ان معترضوں نے ان مصائب کا ذائقہ ہی نہیں چکھا بلکہ ساحل سے طوفانِ بلا کا نظارہ کرتے تھے۔ ع

وہ لوگ کنارِ ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے تھے

کانگرس ہائی کمانڈ بہترین افراد کا مجموعہ تھا لیکن سردار پٹیل اور جواہر لال میں چشمک تھی، ایک دفعہ پنڈت جی نے خود مجھ سے کہا تھا کہ میرا کانگرس کے عوام پر اثر ہے، کانگرس کی تنظیم پر نہیں، سردار پٹیل صوبائی تنظیموں میں اس قسم کے آدمی منتخب کرتے جو صرف ان کے پیروکار تھے، سردار پٹیل گاندھی جی کے پیروکار تھے بلکہ ان کی تصنیف۔ لیکن اقتدار میں آکر ان کے مخالف ہو گئے، مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانح حیات "ہماری آزادی" میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، مولانا آزاد سے بہت زیادہ حسد کیا گیا علماء نے ان کے خلاف یہ کہا کہ کسی دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل نہیں، سیاسیات میں سردار پٹیل اُن کے خلاف رہے، اپنی صدارت کے زمانہ میں مولانا نے بیان دیا کہ اکثریت کو چاہیے مسلمانوں کے لیے کانگرس کا دروازہ کھلا رکھے، سردار پٹیل نے فوراً تردیدی بیان جاری کیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اکثریت اپنے حق سے دستبردار ہو جائے —— مولانا داؤد غزنوی کانگرس کے ٹکٹ پر مخلوط نشست سے منتخب ہوئے، صدر کی حیثیت سے لاکھوں روپیہ خرچ کیا اور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہو گئے لیکن یہ ہو چکا تو کانگرس سے مستعفی ہو کر لیگ میں جا ملے، اس سے مولانا آزاد کی پوزیشن کو سخت دھکا لگا، سردار پٹیل انہیں طعن دیتے رہے۔ ؎

کہ یہ شہکار تھا تیرے ہنر کا

ایک لطیفہ یاد آگیا، مولانا داؤد غزنوی لیگ میں شامل ہو گئے تو سیٹھ سُدرشن شاہ جی کے پاس فریاد لے کر آئے کہ وہ مولانا سے کہیں، کم سے کم حساب کتاب ہی دے جائیں، شاہ جی کو سخت غصہ آیا۔ کہنے لگے :

"اوّل تو میرا کانگرس سے کیا تعلق ؟ اور اس کے روپے سے کیا واسطہ ؟ اور آپ کا حساب طلب کرنا بھی عجیب ہے، محمود غزنوی نے حساب دیا تھا کہ داؤد غزنوی حساب دیں ؟"

سبھاش چندر بوس نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کی تو گاندھی جی سے ان کی جو خط و کتابت ہوئی اس میں سب سے زیادہ مطعون مولانا آزاد کو کیا گیا، ان خطوط میں سبھاش بابو نے مولانا کو ہمیشہ مغلِ اعظم لکھا۔

یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں تھیں، عام لیڈر شپ میں رقابت، مخاصمت کی حد تک چلی جاتی ہے، چودھری افضل حق کو اس رقابت ہی نے کانگرس ہائی کمانڈ کا ممبر نہ ہونے دیا، اُن کی جگہ ڈاکٹر عالم آگئے، مولانا مظہر علی کی تصویر اس سے پہلے آچکی ہے، شیخ حسام الدین فی الواقع ایک بہادر انسان تھے، لیکن میرے بارے میں ان کا ظرف کچھ زیادہ وسیع نہ تھا، میری تعریف سے ان کے چہرے پر زردی کھنڈ جاتی، مجھے اپنے بارے میں افسوسناک بلکہ اندوہناک تجربات ہوتے رہے، میرا سب سے بڑا جرم یہ رہا کہ مجھے ایک خطیب (ORATOR) کا مقام حاصل ہوگیا، جہاں تہاں جلسہ ہوتا مجھے سب سے پیچھے موقع دیا جاتا، اور کوشش کی جاتی کہ ہر بات پہلے کہہ دی جائے، اکثر جلسوں میں مجھے بلایا ہی نہ جاتا، اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ میرے دوست مجھ سے معاصرانہ چشمک رکھتے اور میرے بارے میں حسد و رقابت کا شکار تھے، حالانکہ میں ان کے متعلق رتی برابر حسد و رقابت نہ رکھتا تھا اور نہ کسی سے معاصرانہ چشمک تھی، مجھے ہر دوست کی ترقی، شہرت اور عزت کے بڑھنے سے خوشی ہوتی ہے، اپنی تقریر میں ہمیشہ گردوپیش کے دوستوں کی تعریف کرتا اور خوش ہوتا رہا لیکن میرے دوست میرے متعلق کلمۂ خیر کہنے سے بھی پہلوتہی کرتے رہے۔

جن دوستوں کے ساتھ رہا ان میں بہت کم دوستوں اور بزرگوں کو حسد و رقابت کی خلش سے خالی پایا، مولانا آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خان، چودھری افضل حق میرے تجربے اور مشاہدے کے مطابق اس پایہ کے انسان تھے کہ ان میں کسی دوسرے کے لیے حسد تھا نہ رقابت اور نہ معاصرانہ چشمک، وہ اپنے ہی مزاج

اور اپنی ہی سرشت کے انسان تھے، انہیں دوسروں کو بڑھا کر خوشی ہوتی، ابوالکلام کے الہلال نے مجھے استقلال بخشا، مولانا ظفر علی کے زمیندار نے بالا کیا، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی معیت سمندِ خطابت کا تازیانہ ہوگئی، چودھری افضل حق نے مجھے سیاسی شخصیت بنا دیا، غرض میرا رُواں رُواں ان سب کا شکر گزار ہے، اب رہا چشمک کا سوال یا حسد و رقابت کا مسئلہ تو فطرتِ انسانی ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ حسد و رقابت اس کے ضمیر و خمیر میں داخل ہیں، انسان جتنا بنتا ہے اتنا ہوتا نہیں، ہمارے عہد کے دانشور جنہیں تہذیب کے مادی پہلو اور تاریخ کے جدلی نظریہ پر اعتماد ہے اخلاقی قدروں کو وقت کی چیز سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک ہر وہ حربہ یا ذریعہ جو انہیں ٹھیک ٹھیک منزل تک پہنچا دیتا ہے جائز ہے، ورنہ غلط، الغرض وہ کسی سچائی یا اخلاقی جواز کے قائل نہیں ہیں۔ لینن کے جگر دار ساتھی سٹالن نے ختم کیے، سٹالن مرگیا تو خروشیف نے اس کی لاش کریملن سے نکلوا کر باہر دفنا دی، بیریا گولی کی نذر ہوگیا اور یہ اس شخص کا انجام تھا جو اپنے بے شمار رفیقوں کو موت کے گھاٹ اُتروا چکا تھا، سیاست تو خیر چیز ہی ایسی ہے کہ اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی اور نہ کبھی عبقری ایک دوسرے کے مخلص ہوتے ہیں۔ لیکن شاعری جس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے وہاں بھی معاصرت کی چشمک خوبصورت چہروں کو کریہہ بنانے سے نہیں چوکتی، مذہب انسان کے سینہ میں گداز پیدا کرتا لیکن علماء ایک دوسرے سے پتنگوں کی طرح لڑتے ہیں۔

پشتو کے ایک ٹپہ میں محبوبہ کہتی ہے:

"میرے محبوب تمہیں چلم کی عادت کس نے ڈالی ہے، تیرے کاغذی ہونٹوں سے سبز دھواں نکلتا ہے۔"

خدا جانے علم، سیاست اور شعر میں حسد و رقابت کا ایندھن کہاں سے آیا ہے کہ فطرتِ انسانی اکثر وبیشتر اس کی آگ میں تپتی اور دھواں دیتی ہے۔

فسادات کا دیباچہ

وزارتی مشن رخصت ہو گیا تو فسادات کا لاوا ایک چکا تھا، لیگ اور کانگرس دونوں عبوری حکومت میں شریک تھیں، لیکن دونوں کی آستینوں میں خنجر تھے، گھٹائیں تُلی کھڑی تھیں، جل تھل ہوا چاہتا تھا، بادل اِدھر اُدھر دونوں طرف کھڑے تھے، بارش کا پہلا قطرہ ٹپکنے کی دیر تھی، یہ کہنا غلط ہو گا کہ ہندو ذمہ دار تھے یا مسلمان، دونوں ہی ذمہ دار تھے اور دونوں ہی خوفزدہ، ہر روز ایک نیا شوشہ چھیڑا جاتا، لیگ کو شدت سے احساس تھا کہ کانگرس اپنی بالادستی کے باعث مسلمانوں کو پاکستان سے محروم کرنے پر تُلی ہوئی ہے کانگرس کا خیال تھا کہ لیگ نے آزادی کا راستہ روک رکھا ہے، نفرت نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی، میرٹھ کانگرس میں آچاریہ کرپلانی کا خطبۂ صدارت انتہائی فرقہ دارانہ تھا، سردار پٹیل نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ حکومت کے پاس عوام کی حفاظت کے لیے کوئی سامان نہیں، ہر شخص مزاحمت اور مدافعت کے لیے خود تیاری کر سکتا ہے، یہ سردار پٹیل ہی کا بیان نہیں بلکہ وزیر داخلہ کا اعلان تھا، سردار پٹیل نے آزاد ہند فوج کے جنرل موہن سنگھ کو آمادہ کیا کہ وہ دیہات میں سکھوں اور ہندوؤں کو مسلح و منظم کریں، موہن سنگھ نے ڈھلوں کو بھی ساتھ ملا لیا جس سے مسلمانوں پر منظم و مسلح حملوں کی نیو رکھی گئی۔

قائداعظم سے کسی غیر ملکی نامہ نگار نے پاکستان کے وجود اور عدم وجود پر سوال کیا تو آپ نے کہا۔

"اب پاکستان ہی بنے گا، اس سے کمتر کسی حل پر ہم سمجھوتہ نہیں کر سکتے ہیں"
نامہ نگار نے کہا: "پاکستان نہ بنا تو پھر؟"

آپ نے کہا "اس کا فیصلہ وقت کر دے گا، آئندہ جو ہو گا اس کی ذمہ داری کانگرس اور برطانیہ پر ہو گی جو مسلمانوں سے دغا کرنے پر تلے بیٹھے ہیں"

ہندو اخباروں نے حسبِ عادت سر پہ آسمان اٹھا رکھا تھا، ہندو اور سکھ تیاری کر چکے تھے، مسلمان الفاظ کے نیزے لہرا رہے تھے، جہاں اقلیت میں تھے وہاں مزاحمت ایک طرف رہی مدافعت بھی نہیں کر سکتے تھے، بدقسمتی یہ تھی کہ جن ہندو صوبوں میں کانگرسی وزارتیں تھیں وہاں وزراء نے ہندوؤں کو اسلحہ سے لیس کر دیا تھا، تمام ہندو آفیسر ان کی پشت پر تھے، انگریز آفیسروں نے دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی اور جہاں ہندو اقلیت میں تھے مثلاً پاکستانی صوبے، وہاں پنجاب کا معاملہ یہ تھا کہ ٹرائی سہ رخی تھی، ہندو، سکھ، مسلمان، سکھ ریاستوں نے بے شمار اسلحہ تقسیم کیا، مسلمان ریاستوں کو اس کی توفیق ہی نہ تھی، سرحد میں خان وزارت تھی اس نے عہد کیا تھا کہ وہ کسی غیر مسلمان کا خون بہنے نہیں دیگی، پنجاب میں اس وقت خضر حیات کی وزارت تھی، خضر حیات مسلمانوں کے معتوب تھے، قائداعظم نے انہیں دھتکار دیا تھا، ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ پنجاب میں لیگی وزارت نہیں بن سکتی، سکھ کسی صورت میں بھی ہندوؤں سے الگ نہیں ہوں گے، ان کی لیگ سے گفتگو محض پاکھنڈ ہے، وہ کبھی لیگ سے کولیشن نہیں بنائیں گے، وہ ہندوؤں کے ہتھے چڑھے ہوئے اور لیگ والوں سے جو گفتگو بھی کرتے ہیں وہ کانگرس کو پہنچا دیتے ہیں، مولانا آزاد نے خضر حیات کی وزارت بنوانے سے پہلے لیگ کے صوبائی رہنماؤں سے ملاقات کی اور انہیں کولیشن بنانے کی دعوت دی لیکن قائداعظم نے صوبائی رہنماؤں کو ڈانٹ دیا، اور منع کیا کہ جب تک پاکستان کا مسئلہ حل نہ ہو، کانگرس سے کوئی سی کولیشن نہیں ہو سکتی، مولانا نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مساوی نمائندگی کا پرانا فارمولا بھی چھوڑ دیا، اور ایک زائد

وزارت کی پیش کش کی، لیکن قائداعظم راضی نہ ہوتے، لیگ کے اِس انکار کا نتیجہ یونینسٹ کانگرس کولیشن کا قیام تھا۔

خضر حیات ممکن تھا کوالیشن نہ بناتے لیکن انہیں رنج تھا کہ ان کے والد عالم نزع میں تھے، تو قائداعظم نے انہیں لیگ سے سبکدوش کر دیا، بہرحال کانگرس سے ان کی کولیشن اس مفروضہ پر تھی کہ:

(۱) پنجاب میں کوئی وزارت محض ایک فرقے یا قوم کی علیحدہ سیاست پر نہیں بن سکتی ہے:

(۲) ہندو یا سکھ فرقہ وار ہوکر بھی کسی فرقہ وار مسلمان جماعت سے اتحاد کرنے پر راضی نہیں ہیں۔

(۳) صوبہ مسلم لیگ کے نوجوان رہنماؤں میاں ممتاز دولتانہ، نواب افتخار حسین ممدوٹ اور سردار شوکت حیات سے خضر حیات کو رنج پہنچا تھا کہ اُن کی ملی بھگت کے باعث قائداعظم سے ان کا ٹکراؤ ہوگیا، وہ لیگ کے "باغی" ضرور تھے، پاکستان کے باغی نہ تھے، انہوں نے کانگرس سے کولیشن ضرور کی لیکن کانگرس کے تابع مہمل نہ تھے، وزیراعظم ہونے کے چند ہفتے بعد وہ انگلستان چلے گئے، وہاں سے ایک آدھ دفعہ استعفا بھیجا لیکن سرایون جنکنز اور نواب مظفر علی قزلباش کے اصرار پر رک گئے، ادھر ان کی والدہ برابر اصرار کر رہی تھیں کہ مستعفی ہو جاؤ، وزارت ایک ضد میں بنائی تھی، ایک لہر میں چھوڑ دی، انہوں نے گورنر کو استعفا بھیج دیا اور ممدوٹ کو بلا کر کہا:

"لیجیے نواب صاحب! میں نے وزارت سے استعفا دے دیا ہے اَب آپ شوق سے وزارت بنالیں، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ متحدہ پنجاب میں وزارت نہیں بنا سکیں گے، ہندوؤں اور سکھوں کے متعلق آپ کے اندازے اور مطالعے غلط ہیں۔"

سندھ میں لیگ کی وزارت تھی اور کھوڑو وزیر اعظم تھے لیکن سندھ کا پالیٹکس دریائے سندھ کی طرح ہمیشہ اپنی گذرگاہ بدلتا رہا ہے۔ جی، ایم سید وزارت کے دل میں کانٹا تھے، شیخ غلام حسین ہدایت اللہ چاہتے تھے کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو، انھوں نے مولانا آزاد کو اپروچ کیا اور چاہا کہ سندھ میں کانگرس سے کولیشن کر کے وزارت بنالیں لیکن مولانا راضی نہ ہوتے۔ انھوں نے میری موجودگی میں سر غلام حسین ہدایت اللہ سے کہا :

"اس سے مسلمانوں کی قومی غیرت کو دھکا لگے گا، اور فرمایا جو شخص کسی اصول پر قائم نہیں رہ سکتا وہ کہیں بھی ٹک نہیں سکتا، اقتدار کے لیے عقیدے بدلنا صحیح نہیں ہے۔"

بحالاتِ موجودہ ـــــ مولانا نے کہا مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں، ایک راستہ تو وہ ہے جو میں نے اختیار کیا لیکن مسلمانوں نے من حیث الکل اس پر چلنے سے انکار کر دیا، دوسرا راستہ وہ ہے جو ان کے لیے لیگ نے بنا دیا ہے، مسلمان میرے ساتھ نہیں چلتے نہ چلیں لیکن میری یہ خواہش ضرور ہے کہ تنظیم کی زندگی بسر کریں، ایک بھیڑ نہ رہیں، ہمیشہ قوت اور تنظیم ہی کی قدر کی جاتی ہے ـــــ

مولانا حبیب الرحمٰن ان دنوں دہلی میں تھے انہیں بلوایا اور کہا :

"آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ حالات یکسر تبدیل ہو گئے ہیں، اِدھر اُدھر کا راستہ نہیں رہا، ایک سیدھا راستہ بن چکا ہے جس سے اب انکار نہیں کیا جا سکتا، میں نے چاہا کہ مسلمان میرے ساتھ آجائیں لیکن مسلمانوں نے اعراض کیا، میری بات کچھ تو ان کی سمجھ میں نہ آئی، کچھ حالات اس طرح کے بن گئے کہ ان کے لیے لیگ ہی کا راستہ پسندیدہ ہو گیا، اب اس کے حُسن و قبح پر بحث کا سوال نہیں، اب ایک طے شدہ راستہ پر مسلمانوں کے سفر کا سوال ہے اگر ہم ہندوستان کے علاوہ مسلمانوں کے لیے بھی

سوچتے رہے ہیں تو میں آپ کو اور آپ کی وساطت سے احرار کو مشورہ دونگا کہ آپ لوگ جو پاکستان کے صوبوں میں رہ رہے ہیں لیگ میں شامل ہوجائیں تاکہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے، اور معاملہ کسی دشواری کے بغیر حل ہوجائے، دوسرا فائدہ جو اس سے پہنچے گا یہ ہوگا کہ مسلمانوں میں آپ لوگوں کا اعتماد بحال ہوجائے گا اس وقت مسلمان جذبات کے عالم میں ہیں، انہیں غصہ بھی ہے ناراضی بھی ہے اور شاید بڑی حد تک نفرت بھی' یہ سب ختم ہوجائیں گے، پاکستان بن جانے کے بعد جب انہیں سیاسی موقع پرستوں اور انگریزی حکومت کے موروثی اہلکاروں سے واسطہ پڑے گا تو ان کی طبیعتیں دوبارہ غور وفکر کی طرف لوٹ آئیں گی، اس وقت آپ ان کا ہاتھ تھام سکتے اور پاکستان کی آزادی کو اغوا ہونے سے بچا سکتے ہیں۔"

مولانا حبیب الرحمٰن متحیر ہوگئے، گویا ان کے سامنے کوئی نئی چیز لائی جارہی ہے، انہوں نے کہا:

"لیکن مسٹر جناح ہمیں قبول نہیں کریں گے۔"

"آپ مسٹر جناح کے لیے نہیں مسلمانوں کے لیے جائیے۔" مولانا آزاد نے کہا

مولانا حبیب الرحمٰن نے احرار کو مولانا کے مشورہ سے مطلع ہی نہ کیا بلکہ اس مشورہ ہی کو ہضم کر گئے، البتہ اُن کے حلقوں سے یہ بات گاندھی جی اور سردار پٹیل تک پہنچ گئی۔

پاکستان بن جانے کے بعد خان عبدالغفار خاں کے مصائب کا آغاز ہوگیا۔ خان عبدالقیوم خان نے انہیں ایک طویل عرصہ کے لیے جیل میں ڈال دیا، رہا ہوتے تو میرے ہاں ٹھہرے، میں نے اُن سے اور باتوں کے علاوہ مولانا آزاد کی شخصیت کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا، بہت سی باتیں بتاتے رہے، کہنے لگے، آخری دنوں ابھی فساد شروع نہیں ہوئے

تھے، مولانا نے مجھے بلا کر کہا :

"خاں صاحب! میرا خیال ہے، حالات اس نہج پر آگئے ہیں کہ آپ لیگ میں چلے جائیں،"

میں نے جواب دیا، مولانا! افسوس ہے کہ آپ مجھے ابھی تک سمجھے ہی نہیں، یہ بات بھی گاندھی جی تک پہنچ گئی۔

گاندھی جی نے ایک ثقہ روایت کے مطابق مولانا سے کہا کہ آپ اگر یہی سوچ رہے ہیں تو آپ کا ٹھکانا مسلم لیگ میں ہے، مولانا سوچ رہے تھے کہ پاکستان ناگزیر ہو چکا ہے، اب اگر پاکستان بنتا ہے تو جو صوبے پاکستان کو منتقل ہو رہے ہیں وہ مسلمانوں کے انتشار سے خراب نہ ہوں، ان میں کم سے کم قطع و برید ہو، پھر جن نیشنلسٹ مسلمانوں کی تحریک و تنظیم کا محور ہی پاکستان کے صوبے ہیں انہیں مسلمانوں کی خدمت گزاری کے لیے لیگ میں شامل ہو جانا چاہیے، تاکہ پاکستان بن جانے کے بعد مسلمانوں میں متروک نہ ہو جائیں، اور اپنی قربانیوں کا پھل کھا سکیں، ان کی ہمت و استعداد سے پاکستان کو فائدہ پہنچے گا، انتشار کے آلہ کار کمزور ہو جائیں گے، اور مسلمانوں کی آزادی بیرونی نہیں، تو داخلی خطروں سے ضرور محفوظ ہوگی، لیکن مولانا کی یہ خواہش بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی، بنگال کے وزیر اعظم سہروردی تھے، وہ مقابلۃً متحرک اور جاندار تھے، لاہور سے پنجابی نوجوانوں کو پولیس میں بھرتی کر کے لے گئے، انہوں نے کانگرس کی عبوری حکومت کو چیلنج کیا تھا کہ ان حالات میں وہ مرکزی حکومت کو نہیں مانیں گے۔

آخر ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا، گویا دن گنے جاتے تھے اِس دن کے لیے،

کلکتہ میں وہ دھاچوکڑی مچی کہ پناہ بخدا، طرفین دل کھول کر لڑے، پولیس نے تماشا دیکھا اور خوب دیکھا، ہندوؤں نے کہا مسلمانوں نے ہمیں بھون ڈالا ہے، مسلمانوں نے کہا ہندوؤں نے ہماری چتائیں بنادی ہیں۔ کلکتہ پہلا شہر تھا جہاں زندہ مسلمانوں کو آگ میں بھونا گیا اور سڑاند دیتی ہوئی لاشوں نے پکار پکار کے کہا ۔ ع تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشا ئیست۔

فسادات شروع ہو گئے

کلکتہ کا ردِ عمل نواکھالی میں ہوا، نواکھالی میں ۸۰ فی صد مسلمان تھے، انہوں نے ہندوؤں کو اس بُری طرح مارا کہ وہ مسلمانوں کا منشا ہو تو ہو اسلام کا منشا بالکل نہ تھا، یہ ایک خطرناک آغاز تھا، اس کے نتائج پر کبھی غور نہیں کیا گیا، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندو مُسلم فسادات مطالبۂ پاکستان سے ہندوؤں کے انکار کا طبعی نتیجہ تھے وہ ان کے اسباب و علل پر غور نہیں کرتے، فسادات پاکستان کی وجہ سے نہیں ہوئے بلکہ نفرت کے اس لہجے کی وجہ سے ہوئے جو مدّت سے پرورش پا رہا تھا، ہندوؤں کے پاس ساز و سامان تھا وہ ہندوستان کی زبردست اکثریت تھے، مسلمانوں کے پاس زبان و قلم تھے، وہ ہندوستان میں فعّال اقلیت تھے، لیکن ساز و سامان اور زبان و قلم کی لڑائی میں ساز و سامان کی جیت واضح تھی، فی الجملہ ہندو مسلم فسادات نتیجہ تھے مسلمانوں کی تلخیٔ گفتار اور ہندوؤں کی سنگینیٔ کردار کا، نواکھالی میں جو کچھ ہوا وہ اسلام نہیں تھا، نہ ہم اُس کو جہاد کہہ سکے اور نہ پاکستان ہی کا یہ منشا تھا لیکن مسلمانوں کی زبردست اکثریت نے حقیر اقلیت کو بے گناہ مارا، گھروں کے گھر اجڑ گئے، جوان قتل کر دیئے گئے، بوڑھوں کو اپاہج بنا دیا، لڑکیاں اغوا کر لی گئیں، مکانوں کو آگ لگا دی۔

مولانا آزاد کے ہاتھ، فسادات کے احوال و نتائج کی نبضوں پر تھے شیخ حسام الدین ان دنوں دہلی میں تھے، مولانا نے شیخ صاحب سے کہا، نواکھالی کا ردِ عمل بہار اور یوپی

میں شعلہ مرقص ہو کر بھڑکنے والا ہے، آپ ایک بیان میں اس کی مذمت کریں، اور دو چار امدادی دستے نواکھالی بھجوا دیں، شیخ صاحب مولانا کے ہاں حامی بھر آئے، بیان چھپوا دیا، خود دہلی ہی میں ٹکے رہے، اگلے روز مولانا نے بیان کا پوچھا تو شیخ صاحب نے کہا چھپ گیا ہے، مولانا نے فرمایا، میری نظر سے نہیں گزرا، شیخ صاحب نے کہا تمام اردو اخباروں میں چھپ چکا ہے، مولانا نے جھنجلا کر کہا، وہاں اُردو کون پڑھتا ہے میرے بھائی؟ انگریزی اخباروں کو بیان دیا ہوتا، شیخ صاحب نے کہا، میں نے انگریزی اخباروں کو بھیجا تھا کسی نے چھاپا ہی نہیں، مولانا نے اسی وقت اجمل کو بلوایا، بیان اِملا کرایا اور اے پی آئی کا رپورٹر بلوا کر اس کے حوالے کر دیا، اگلے روز یہی بیان تمام انگریزی اخباروں میں آ گیا، گاندھی جی نے خیر مقدم کیا لیکن شیخ صاحب نہ خود گئے نہ رضا کاروں کو بھیجا، مولانا اسے محسوس کرتے رہے، لیکن زبان پر نہ لا سکے، اُن کی عادت تھی کہ اپنے غم میں کسی کو شریک نہ کرتے، ہر صدمہ خود جھیلتے، کسی عزیز یا رفیق سے کوئی بات کہی، اُس نے مان لی، فبہا نہ مانی تو دوبارہ نہیں کہتے تھے، انہیں ملال ضرور ہوتا لیکن وہ اس قسم کی ذہنی اذیتیں سہنے کے عادی ہو گئے تھے،

ایک شام کچھ نیاز مندان کے پاس بیٹھے تھے کہ بہار کے وزیر اعظم سہنا آ گئے، تخلیہ چاہا، مولانا انہیں ساتھ لے کر الگ کمرے میں چلے گئے، پون گھنٹہ سہنا کے ساتھ رہے نکلے تو ان کا چہرہ قدرے پژمردہ تھا، فرمایا:

"جن باتوں کا اندیشہ تھا اب یقین کی حد کو پہنچ چکی ہیں، سمجھو کہ بہار میں فساد سُلگ چکا اور آناً فاناً بھڑکنے والا ہے۔"

مولانا بالکل بے بس تھے نہ ان کا علم کام آ رہا تھا نہ فراست اور نہ تدبّر و تبحُّر، وہ گاندھی جی نہیں تھے کہ بہار جا کر مسلمانوں کو ایندھن بننے سے بچا لیتے، نہرو نہیں تھے کہ فساد کے بیچ کھڑے ہو جاتے، پٹیل نہیں تھے کہ فساد کی طنابیں کھینچ لیتے، جناح نہیں تھے کہ مسلمانوں

پر انہیں اختیار ہوتا، وہ صرف ابوالکلام تھے، ایک دُور افتادہ صدا بہ صحرا جس میں صبح کی دلکشی بھی تھی، شام کی دلفریبی بھی، رات کا سناٹا بھی اور پچھلے پہر کے آنسوؤں کا گداز بھی لیکن ان کے الفاظ خود ان کے ماحول میں نیم ہو کے رہ گئے تھے۔

مولانا اس روز نیاز مندوں سے بعض ادبی تحریکوں پر گفتگو کر رہے تھے لیکن اس اطلاع نے انہیں چونکا دیا، اور وہ اپنے ہی خیالوں میں گم سُم ہو گئے، حتیٰ کہ محفل برخاست ہو گئی۔

دوسرے یا تیسرے روز بہار فساد کی جولان گاہ بن گیا۔ فساد دو طرفہ نہیں یک طرفہ تھا، صرف مسلمان قتل ہو رہے تھے، ان کے گھروں کو جلا دیا گیا، ان کی بستیاں تباہ کر دی گئیں اور عصمتوں کو اس طرح لوٹ لیا گیا کہ قلم اس درندگی کا احاطہ نہیں کر سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑا فساد تھا، پہلے یا بعد میں اس سے بڑا فساد کہیں نہیں ہوا، جے پرکاش نارائن نے سوشلسٹ انقلاب کے لیے جو ٹریننگ صوبہ بھر کو دی تھی وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کے قتلِ عام میں کام آگئی، تمام صوبہ فساد کی لپیٹ میں تھا، ٹپنہ، مونگھیر اور گیا کے اضلاع مسلمانوں کے خون سے لہولہان ہو گئے، ان کی حویلیوں سے دھواں اٹھا اور خاکستر رہ گیا، اتنی بھیانک تباہی تھی کہ دل لرز جاتا، گنگا بہہ رہی تھی لیکن اب اس کو یاد نہیں رہا تھا کہ کبھی اس کے کناروں پر کوئی کارواں اُترا تھا، نواکھالی نے بہار میں آ کر جبڑے کھول دیئے تھے، نواکھالی کے ایک گاؤں کا زمیندار اپنے کنبہ سمیت قتل کر دیا تھا تو گھر میں ایک پالتو کتا بچا تھا، گاندھی جی حویلی میں داخل ہوتے تو وہ کتا دوڑ کے ان کے پاؤں کو لپٹ گیا، اِس زور سے چلایا، گویا اپنی کتھا کہہ رہا ہے، گاندھی جی نے نواکھالی میں بے شمار کنیاؤں کو جن کے ماں باپ اسلام کے فرزندوں نے قتل کر ڈالے تھے سیندور لگایا تھا اور وہ اغوا ہو کر اب ان کی بیٹیاں ہو گئی تھیں، ان کے ماتا پتا بغیر چتا کے بھسم ہو گئے تھے، بہار اس ایک زمیندار اور اُن بے شمار کنیاؤں کا مہاجنی قرض تھا جو سُود در سود

وصول کیا جا رہا تھا،

فساد بھڑکا نہیں بھڑکایا گیا تھا، ایک عرصہ سے اُس کی تیاریاں کی جا رہی تھیں، مسٹر انوہ گرہ نارائن صوبہ کے فنانس منسٹر تھے، یہ سب کیا دھرا انہی کا تھا، وہ بہار میں سردار پٹیل کے معتمد تھے۔ انہوں نے فساد کا پلان خود تیار کیا اور یہ بات سری کرشن سنہا مولانا ابوالکلام سے مل کر کہہ گئے تھے،

کلکتہ کے مسلمان میئر نے لاہور کے مسلمان میئر کو تار دیا کہ مسلمان بہار کا رُخ نہ کریں اُنہیں گاڑی سے اُتار کر قتل کیا جا رہا ہے، اس وقت تک دو ٹرینوں کے مسلمان کٹ چکے تھے، اور یہ سانحہ فسادات میں پہلی مرتبہ رونما ہوا تھا، اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نہ تھی، ہندو اخباروں نے مظالم کو عادتاً گھٹا کر پیش کرنا شروع کیا، پنجاب کے اخبار اس صوبہ میں رہ کر بھی چار قدم آگے تھے، ان کے نزدیک مسلمانوں کا خون پانی تھا، "پرتاپ" نے لکھا کہ بہار کے فسادات مکافاتِ عمل ہیں، جن لوگوں نے نواکھالی میں فساد کی تخم ریزی کی وہ بہار کے ثمرات پر کیوں سیخ پا ہیں؟

تمام ملک کے مسلمان ان اضطراب انگیز خونیں خبروں پر نعل در آتش ہو گئے، قائداعظم نے بہار فنڈ کے نام سے حبیب بنک میں کھاتہ کھلوا دیا، لیگ کے رہنما امداد کے دستے لے کر روانہ ہو گئے، پٹنہ میں ایک دو کیمپ کھولے گئے، لیگ کے بڑے بڑے زعماء بہار کے سابق وزیراعظم مسٹر محمد یونس کے گرین ہوٹل میں ٹھہر گئے، وہاں ایک دن کا کرایہ تئیس روپے فی کمرہ تھا، بیس کمرے ریزرو کیے گئے، ہوٹل کی منیجر ایک انگریز خاتون تھیں۔

پنڈت نہرو (عبوری حکومت کے نائب صدر) سردار عبدالرب نشتر (وزیر مواصلات) کی معیت میں بہار گئے تو وہاں اپنی آنکھوں بزدلانہ غارتگری اور لرزہ خیز چنگیزی کو دیکھا، بروایتِ نشتر:

"پنڈت نہرو غارت زدگی کے اس منظم نظارے کو دیکھ کر مبہوت ہو گئے،

ان پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا:

سردار صاحب نے خود مجھ سے کہا کہ اس سفر میں پنڈت نہرو کو بعض جگہ مشتعل ہجوم کا شکار ہونا پڑا، عام ہندوؤں کے لئے تلقینِ امن، مجذوب کی بڑتھی، وہ ان پر ہنستے اور آوازے کستے۔ ایک سنگھٹی نوجوان نے مشتعل ہو کر پنڈت جی کی ٹوپی اتار لی اور چلایا کہ نواکھالی میں آپ کہاں تھے؟

پنڈت جی مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کے بہاری نمائندے مسٹر محمد نعمان کے گاؤں میں پہنچے تو سردار صاحب کی روایت کے مطابق ہزارہا بلوائیوں نے ان کے مکان کا احاطہ کر رکھا تھا، مسٹر محمد نعمان کا مکان قلعہ کی طرح تھا، اور مسلمان اس کے جھروکوں سے نشست باندھ کر مدافعتی فائر کر رہے تھے، پنڈت جی بلوائیوں کی یلغار سے بھڑک اٹھے، ان میں گھسنا چاہا، انسپکٹر جنرل پولیس نے جو اتفاق سے مسلمان تھا اور اس کا نام بھی محمد یونس تھا، پنڈت جی کو روک لیا، پنڈت جی نے کہا:

"ان پر گولی چلاؤ"

انسپکٹر جنرل بے حوصلہ تھا، ٹھٹھر گیا،

"سوچتے کیا ہو، گولی چلاؤ؟

"مناسب نہیں"

پنڈت جی غصہ سے لال پیلے ہو گئے، آپ لوگ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں گولی چلاتے رہے ہیں لیکن ان بلوائیوں پر گولی نہیں چلا سکتے؟

پنڈت جی نے سٹین گن اس کے ہاتھ سے چھین لی "میں حکم دیتا ہوں گولی چلاؤ"، گولی چلائی گئی لیکن فساد کو روکنا اب نہرو یا گاندھی کے اختیار میں نہیں تھا، فساد بھڑک اٹھا اور بھڑک رہا تھا، پنڈت جی کی مراجعت کے بعد سارے گاؤں کو جلا دیا گیا، رام کے بیٹے خود سیناؤں کو اٹھا کر لے گئے، بہار ایک مقتل بن گیا۔ جن رہنماؤں سے بہار تھا وہ بہار

میں نہیں تھے اور جو محض بہار کے تھے وہ مسلمانوں کا لہو جلا کر اپنے دیپک روشن کر رہے تھے۔

ملک فیروز خان نون چند دوستوں کے ہمراہ پٹنہ پہنچے، متاثرہ علاقہ میں ضابطے کا دورہ کیا، معلوم ہوا کہ ان گھروں سے چنگیز و ہلاکو گذر چکے ہیں،

مولانا آزاد نے ہمیں بلوایا اور کہا آپ لوگوں کو بہار ضرور جانا چاہیے، لیگ وہاں میں کام نہیں کر سکے گی۔ وہاں اشتعال موجود ہے۔

ہم نے آپس میں صلاح مشورہ کیا، مجلس احرار کے سالار غازی محمد حسین کو پٹنہ بھجوایا کہ حالات کا جائزہ لے کر رپورٹ کریں کہ ہم کس حد تک متاثرین کی مدد کر سکتے ہیں؛ اور امداد کے پہلو کیا ہیں؛ چنانچہ غازی صاحب چند رضا کاروں سمیت روانہ ہو گئے، انہیں دو چار دن تو وہاں ٹھہرنے کے لیے جگہ نہ ملی، ۳۲ روپے روز پر محمد یونس کے ہوٹل میں رہنا اُن کے لیے مشکل تھا، سرائے کوئی تھی ہی نہیں، سہنا سے مل کر پٹنہ کے ریسٹ ہاؤس میں جگہ حاصل کی مجھے تار دیا، میں یہاں سے ہزار روپیہ اور امدادی پارچات لے کر پچاس رضا کاروں کی معیت میں پٹنہ روانہ ہو گیا، پولیس سے پہلی مڈبھیڑ تو لاہور اسٹیشن پر ہوئی، رضا کاروں نے سرخ وردیاں پہن رکھی تھیں، پنجاب میں فوجی طرز کی وردیاں پہننا خلافِ قانون تھا، پولیس نے اعتراض کیا، ہم نے چاہا ڈٹ جائیں، پھر امدادی مشن کے خیال سے قمیصیں بدل لیں، لیکن امرتسر اسٹیشن پر دوبارہ باوردی ہو گئے، پولیس نے وہاں بھی اعتراض کیا، ہم نے طرح ہی نہ دی، اس کے بعد کسی نے پوچھا نہ گچھوایا، دہلی ریلوے اسٹیشن تک احرار کے بہی خواہوں نے ہمارا استقبال کیا۔ دہلی سے لکھنؤ تک جس اسٹیشن پر گاڑی رُکتی رضا کار نعرے بلند کرتے، لوگ خوش آمدید کہتے، لکھنؤ سے پٹنہ تک عجیب سی حالت ہو گئی؛ اِدھر عام لوگ مجلسِ احرار کے نام ہی سے ناواقف تھے، ہماری سُرخ قمیص اور ہمارے نعرے ہمارے لیے جان پہچان کا ایک عجیب عنوان بن گئے، ہم نعرۂ تکبیر لگاتے تو مسلمان عزت کی نگاہوں سے ہماری طرف لپکتے، جونہی انقلاب زندہ باد

یا ہندوستان آزاد کا نعرہ لگاتے تو مسلمان پیچھے ہٹ جاتے، ہندو تحسین کرتے، اللہ اکبر یا شہیدان بہار زندہ باد گونجتا تو ہندو کنی کترا جاتے، گاڑی چھوٹتی تو ہندو ہمارے فرقہ وارانہ روپ پر تبصرہ کرتے، مسلمان سرحد کے سرخ پوش سمجھ کر اعتنا نہ کرتے ــــ ان نعروں نے ہمیں راستہ بھر مصیبت میں ڈالے رکھا، ہم دو کشتیوں کے روایتی سوار کی طرح تھے' ــــ انگریزوں کے نزدیک حقیر مسلمانوں کے نزدیک اجیرا ور ہندوؤں کے نزدیک فرقہ پرست۔

بہار کے حدود میں تو یہ نعرے ہمارے لیے بلائے جان ہو گئے، ہندو مشکوک نظروں سے دیکھتے، مسلمان پہلے ہی متروک کر چکے تھے، پٹنہ سے دو اسٹیشن پہلے وہ اسٹیشن تھا جہاں دو گاڑیاں روک کر مسلمانوں کو قتل کیا گیا تھا، یہاں ہمارے نعروں سے ہندو برافروختہ ہو گئے لیکن بیچ بچاؤ ہو گیا ــــ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

پٹنہ پہنچے تو پلیٹ فارم پر غازی محمد حسین موجود تھے، ان کی معیت میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچے، کوائف معلوم کیے، پتہ چلا کہ لیگ کے وہ رہنما جو باہر سے آئے ہیں ان سے علیک سلیک کے روادار نہیں اور ان کی وجہ سے بہار کے عام مسلمان بدظن ہیں، ان کے علاوہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے جو رضاکار پنجاب اور سرحد سے آئے تھے وہ اس مصیبت میں بھی شوشے چھوڑتے اور لوگوں کو اشتعال دلاتے تھے' ان میں سے بعض نے ہڈیوں کے ڈھیر جمع کر رکھے تھے، جنہیں وہ اپنے ساتھ سرحد اور پنجاب میں لے جانا چاہتے تھے،

ظاہر ہے کہ نیشنل گارڈ کے رضاکار متاثرہ علاقے میں جانے سے معذور تھے اوّل تو ان میں حوصلہ نہ تھا اور حوصلہ ہوتا بھی تو بے فائدہ تھا، ان علاقوں میں مسلمانوں کا صفایا ہو چکا تھا، دوم فسادی عناصر ان رضاکاروں کو دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتے، پولیس کی معیت میں جہاں تہاں گئے وہاں تہاں مسلمانوں کا وجود مٹ چکا تھا، ان رضاکاروں کا

کام پٹنہ کے پناہ گزین کیمپ میں متاثرین کی نگرانی تھا، حکومت کی طرف سے راشن ملنا اور یہ کھانے پکوانے کے انچارج تھے، پٹنہ کیمپ مدرسہ شمس الاسلام میں تھا، اس کی عمارت دیکھ کر آدمی خوش ہوتا کہ ایک دینی درسگاہ اتنے شکوہ سے بنائی گئی ہے، دوسرا کیمپ پھلواری شریف کے جیل خانے میں تھا، متاثرین کو ہمارے خلاف یہ پٹی پڑھائی گئی تھی کہ ان سے بچو، یہ رہے سہے مسلمانوں کو ختم کرانے آتے ہیں۔

میں نے غازی صاحب سے پوچھا آپ نے وزراء کے علاوہ کسی مسلمان رہنما سے بھی بات چیت کی ہے؟ انہوں نے کہا:

"لیگی رہنما تو ملنا ہی گوارا نہیں کرتے، بلکہ یہاں کے مسلمانوں تک پہنچنے نہیں دیتے۔ اُلٹا انہیں بہکاتے ہیں، شمس الاسلام کے مدرسہ میں گالیاں دلوا چکے ہیں، مسلمان وزراء میں سے ڈاکٹر سید محمود کو ملا ہوں، عبدالقیوم انصاری سے بات کی ہے اور امور شرعیہ بہار کے امیر سے ملاقات ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ سید عزیز الرحمن (ایم ایل سی) کے ہاں گیا ہوں، لیکن ان کا معاملہ بھی ہم جیسا ہے۔

غازی صاحب نے جو کچھ بتایا وہ افسوسناک تھا، تاہم میں نے اپنے طور پر لیگ کے مقامی رہنماؤں سے ملنے کا راستہ نکالا، وہاں ایک پنجابی دوست کی معرفت "ڈان" کے مقامی رپورٹر سے ملا۔ وہ اس سے پہلے پٹنہ میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے چیف رپورٹر تھے، اور انہیں اس الزام میں سبکدوش کیا گیا تھا کہ بہار کے قتل عام کی خبروں میں "رنگ آمیزی" کی ہے، حالانکہ مسلمانوں پر جو بیتی، ایک ایسا خونچکاں المیہ تھا کہ اس کے بیان سے الفاظ بھی عاجز ہو گئے تھے، ان صاحب نے ہم سب کو اکٹھا کیا، لیگ کے رہنما پہلے تو بات کرنے سے ہچکچاتے رہے، پھر کھل گئے۔ ان کے حواس مختل ہو چکے تھے اور وہ فی الواقع خوفزدہ تھے۔ انہوں نے بہار کے فسادات سے متعلق ایک رپورٹ تیار کی تھی،

اس کی ایک کاپی مجھے دی لیکن جو کچھ اس میں درج تھا وہ اس سے کہیں کمتر تھا جو مسلمانوں کو بہار کی سرزمین میں پیش آچکا تھا، یہ اس سرزمین کا واقعہ تھا جہاں مظہر الحق کا صداقت آشرم تھا لیکن یہی صداقت آشرم مسلمانوں کو پناہ دینے سے قاصر رہا، وہاں اب گوتم بدھ مہاتما نہیں رہے بلکہ کپل وستو کے راجہ ہو گئے تھے، برگد کا وہ درخت جس کی صدیوں پرانی چھال انہیں تکا کرتی تھی اب اندھی ہو گئی تھی اس کے گرد و پیش منوں خون بہہ چکا تھا،

میں نے لیگ کے مقامی زعماء سے پوچھا:

"آپ کے نزدیک ان حادثات کا علاج کیا ہے؟"

انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ خود نہیں جانتے تھے کہ حل کیا ہے؟ ان دنوں وہاں ایک ہی نعرہ گونج رہا تھا:

ہم دکھیوں کا ایک ہی بول
مل کے چلیں گے آسن سول

آسن سول بہار کی سرحد پر بنگال کا قصبہ تھا جہاں ہزاروں بہاری لُٹ پِٹ کے جا چکے تھے۔ میں نے ان سے کہا، کیا آپ ہجرت کو ان فسادات کا حل سمجھتے اور یقین کرتے ہیں کہ اس طرح بہار کے مسلمانوں کی محصور و مجبور آبادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ انہوں نے کہا۔

"کانگرس کی حکومت سے ہمارا اعتماد اٹھ چکا ہے، وہ اس سارے قتلِ عام کی ذمہ دار ہے اور بابو راجندر پرشاد اس میں برابر کے شریک ہیں۔ میں نے کہا، آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟ انہوں نے کہا شواہد و نظائر خود سب سے بڑا ثبوت ہیں۔

میں سمجھتا ہوں وہ ایک جائز غصے کا شکار تھے، کامریڈ جے پرکاش نارائن کے متعلق بھی انہوں نے یہی الزام ٹھہرایا اور اس پر اصرار کرتے رہے لیکن ان فسادات کا یہ پہلو عجیب و غریب تھا کہ انہی علاقوں میں فسادات کا لاوا اُچھوٹا، مسلمانوں کا خون بہا اور

ان کے گھر بار جلائے گئے جہاں راجندر پرشاد، جے پرکاش نارائن اور سری کرشن سنہا کے آبائی گھر ان کا سیاسی اثر اور جماعتی پیروکار تھے، یہ کہنا صحیح ہے کہ فسادات منظم کرنے میں ان کا ہاتھ نہیں تھا لیکن فسادات سے اغماض میں ان کا ہاتھ ضرور تھا اور یہی اغماض مسلمانوں کے قتلِ عام کا باعث بنا۔ بہار کے لیگی رہنما صورتِ حال سے اتنے خوفزدہ تھے کہ اپنے قاتلوں کی نشاندہی کرتے ہوئے گھبراتے تھے، حتیٰ کہ صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں بات کرتے ان کا جی ڈولتا تھا، مبادا قاتلوں کا وہ گروہ جو سامنے بیٹھا ہے ان کے لیے مزید قتل و خون کا باعث ہو، ان کا مطالبہ جو مجھ سے بیان کیا اور میں نے سری کرشن سنہا کو پہنچایا یہ تھا کہ :

(۱) جو لوگ اس عظیم غارتگری کا موجب ہوئے ہیں انہیں قرارواقعی سزا دی جائے،

(۲) آئندہ تمام مسلمانوں کو یکجا بسایا جائے، ان کی آبادیاں مربوط ہوں، ان کے درمیان خلا یا فاصلے نہ ہوں۔

سری کرشن سنہا سے ملا تو اس خوفناک فساد کے باوجود ان کے مکان پر کوئی پہرہ نہ تھا، ایک سنتری دروازے پر کھڑا تھا اس نے اطلاع کی۔ ہم اندر چلے گئے، یہ گویا اکثریت کی بے خوفی کا ایک نشان تھا، ان کے پاس پٹنہ کے مسلمان ڈپٹی کلکٹر بیٹھے تھے اور یہ شکایت لے کر آئے تھے کہ شہر کے عام ہندو احرار رضاکاروں کے نعرہ ہائے تکبیر سے مشتعل ہو گئے ہیں، نتیجۃً فساد کا اندیشہ لاحق ہو رہا ہے، یہ شکایت نہیں امرِ واقعہ تھا، احرار رضاکار ٹرکوں پر ادھر اُدھر جاتے تو ان کے نعرہ ہائے تکبیر سے ہندوؤں کو غصہ آتا اور وہ ایک مفلوج اقلیت کے افراد کی اس نعرہ بازی کو قطعاً ناپسند کرتے تھے،

میں نے سنہا صاحب سے کھل کے باتیں کیں، وہ مانتے تھے کہ بہیمانہ قتل و خون ہوا ہے، مولانا آزاد سے ان کی ملاقات کا حوالہ دیا تو وہ اور کھل گئے تسلیم کیا کہ اس خون خرابہ کی ذمہ داری اُن کے وزارتی رفقاء پر ہے، دو شہزادوں کے اغوا پر ان کا اپنا

تاثر یہ تھا کہ میری بیٹی اغوا ہوتی تو مَیں فوراً ہی مرجاتا، یہ بات لیگ کے رہنماؤں نے بھی کہی تھی کہ فسادات میں وزیر اعلیٰ سنہا کا ہاتھ نہیں، بلکہ وزیر خزانہ انوگرا نارائن نے اس کا اہتمام کیا اور نبیوہ رکھی ـــــ وہ سنہا کی جگہ وزیر اعلیٰ بننا چاہتا تھا، ہمیشہ اپنے داؤں پر رہتا، اُس کی چالیں عموماً خطرناک ہوتیں وہ کبھی سیدھی بات نہ کرتا، وہ ایک سازشی دماغ تھا، اُس نے فساد کو اس چالاکی سے ترتیب دیا کہ اس کا اپنا علاقہ محفوظ رہا، فسادات انہی علاقوں میں ہوئے جو اس کے اور ساتھیوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں نہیں تھے۔

مَیں سنہا سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ انوگرا نارائن بھی آگیا، تعارف ہوا تو اس نے پہلا گلا یہ کیا کہ:

"آپ کے رضا کار اللہ اکبر کے نعرے لگا کر شہر کی فضا کو برہم کر رہے ہیں، انہیں منع کیجیے، پہلے ہی بہت کچھ ہو چکا ہے، جب مسلم لیگ والے اللہ اکبر نہیں لگاتے اور اُن کے رضا کار چُپ چاپ رہ رہے ہیں تو آپ ان کی تقلید کریں"۔

مَیں نے کہا، بہت بہتر، مقصد نعرہ زنی نہیں خدمت گزاری ہے، لیکن اس سے فضا کے اشتعال کا اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عاجزی کہاں تک پہنچ چکی ہے؟ وہ اللہ اکبر بھی نہیں کہہ سکتے۔

انوگرا نے کہا ـــــ یہ سب نواکھالی کا ردّعمل ہے، پٹنہ کے لوگ ابھی پُرسکون نہیں ہیں۔ مَیں نے لیگی رہنماؤں کے دونوں مطالبوں کا ذکر کیا تو اس نے کہا:

(۱) فسادات کے مرتکبین کو پکڑنا مشکل ہے۔ اوّل تو اجتماعی فساد میں افراد کی گرفتاری ممکن نہیں، دوسرے اس سے حالات کے اور خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے،

(۲) رہا مسلمانوں کو یکجا آباد کیے جانے کا سوال، تو یہ ناممکن ہے، اپنی جگہ کون چھوڑتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک کو اٹھا کر دوسرے کو لانا ہوگا، اور یہ محض افراد کا

تبادلہ نہیں بلکہ زمینوں اور مکانوں کا تبادلہ ہوگا۔ کہہ لینا آسان ہے کرنا مشکل، اور اس طرح کسی ایک قوم کے افراد کو مربوط کر دینے سے مسئلہ بگڑتا ہے، بنتا نہیں، مَیں نے انوگرا سے کہا :

"کیا مسلم لیگ کا یہ دعویٰ سچا ثابت نہیں ہو رہا کہ ہندو مسلمانوں کو ہندوستان سے مٹا دینا چاہتے ہیں اور کانگرس کی آزادی کے معنی مسلمانوں کی غلامی کے ہیں؟ بہار نے انگریزوں کے اس دعویٰ کو بھی سچا ثابت کیا ہے کہ وہ ہندوستان سے گئے تو خونریزی ہوگی۔"

انوگرہ نے کہا، جو کچھ ہوا ناگزیر تھا ہم اس کو ٹال ہی نہیں سکتے تھے، بہار بنگال کا پڑوسی ہے جب نواکھالی اور کلکتہ کے واقعات یہاں پہنچے تو یہ ایک قدرتی ردِعمل تھا۔

مَیں نے کہا —— افسوسناک پہلو صرف اتنا ہے کہ لاکھوں انسانوں کے قتلِ عام پر آپ کا نظم و نسق مفلوج رہا۔

انوگرا نارائن جو کچھ ہوا، اس کی خرابی تسلیم کرتے لیکن ساتھ ہی جواز پیش کرتے، اُن کے استدلال سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ اس خون خرابہ کے محرک و مسئول ہیں۔ ان ملاقاتوں سے اگلے روز مَیں نے پٹنہ کے متاثرہ مضافات کا دَورہ شروع کیا، بہار شریف گیا چھپرا دیکھا، گیا پہنچا، بھاگل پور پھرا، سبھی علاقے یکساں انداز میں نشانۂ ستم ہوتے تھے، تمام برباد گاؤں ایک دوسرے سے مشابہ تھے، مثلاً ہم پٹنہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں گئے، سارا گاؤں آباد و شاد نظر آیا، کھیت لہلہا رہے تھے، درخت سنتریوں کی طرح کھڑے تھے، پرندوں کی چہچہاہٹ سننے میں آ رہی تھی، کمسن بچے اُڑتے پھر رہے تھے، لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے، کنیائیں چوپال کے نزدیک زادیے بن رہی تھیں، سب کے چہرے ہشاش بشاش تھے، کسی کے چہرہ پر کسی صدمہ کا نشان تک نہ تھا کہ یہاں کوئی حادثہ ہوا ہے۔ ہم ایک حویلی پر رُک گئے، باہر سے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس

پر کیا بیتی ہے ؛ اندر قدم رکھا تو ویرانی ہی ویرانی تھی، تمام چوبی دروازے نکال لیے گئے تھے، سامان لوٹ لیا گیا تھا، دیواروں پر لہو کی دھاریں تھیں، کپڑوں کو آگ لگا دی گئی تھی، معلوم ہوتا تھا، تماش بین ایک عفیفہ کو لوٹ کر اُسے ننگا کر گئے اور اس کے جسم پر زخموں کی چھینٹ پڑی ہے، میں اس لرزہ خیز حالت کو دیکھ کر سہم گیا، اور جب گاؤں کا مسلمان محلہ دیکھا تو میرے بدن کا انگ انگ کانپ اُٹھا، جنگ کی تباہ کاریوں کا نقشہ یاد آگیا کہ فاتح فوجیں کس طرح آبادیوں کو برباد کرتی ہیں، برقعوں میں دوڑتی ہوئی لڑکیوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے، پستانوں کا ڈھیر، انگلیوں کی پوریں، سروں کا انبار، منجمد چہروں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں، ادھ جلی ہوئی لاشیں، کتابوں کی راکھ، ٹوٹے پھوٹے برتن، پھٹی ہوئی دیواریں، چھتوں کے بڑے بڑے شگاف، مکانوں سے تہہ خانوں تک، زنانے میں کنواں، اور کنوئیں میں تعفن، انسان کے گوشت کی سڑاند، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا بجھا ہوا الاؤ، آگ کے ہاتھوں ساز و سامان پر کٹی پھٹی عبارتیں، فضا میں نالۂ ناکشیدہ اور ہوا میں آہ نارسیدہ، شقاوت، بربریت، تعدی، استبداد، ہلاکت، بے رحمی، سنگدلی اور خونریزی کی منہ بولتی تصویریں، کیلوں سے ٹھکے ہوئے بچے، مقتول سہاگنوں کا لُٹا پٹا سہاگ، مردہ چہروں پر خون آلود لٹیں، سورۂ واللیل کا نالۂ اضطراب، بچوں کے پنجر، آنگنوں میں حیا کی آخری ہچکی کا انجماد، جان چھپاتی ہوئی عصمتوں کے پیازی آنسو، اور آنسوؤں میں خون کی ملاوٹ، کٹے ہوئے کانوں میں ٹھری ہوئی بالیاں اور ٹوٹے ہوئے ہاتھوں میں پٹی ہوئی تالیاں، یہ سب کچھ دیکھا تو میرے ہوش پرّاں ہو گئے۔ سیاست کا طوفان اس خوفناک حد تک چلا گیا تھا کہ خود خوفِ خدا تھرا رہا تھا، ہندو اس المیہ پر ہنستے اور مسلمان اس سانحہ پر روتے تھے۔ مرنے والے کون تھے، کسان، مزارع، مزدور، محنت کش، کمیرے اور ان کی مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بیویاں، جگر پارے، نورِ نظر۔ برباد کون ہوا تھا، ان کے سہاگ، ان کی عزتیں، ان کے ناموس، ان کی

جنت۔ ایک آگ تھی جو پہلے سلگائی گئی، پھر بھڑکائی گئی، آخر بجھا دی گئی، لیکن بقول غالب — ع

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اُس رات مجھے ایک ثانیہ کے لیے بھی نیند نہ آئی، جاگتا رہا اور سوچتا رہا انسان اتنا درندہ ہو گیا ہے کہ صرف اختلافِ مذہب کی بنیاد پر آبادیاں قتل کی جا سکتی ہیں، محسوس ہوتا تھا میں انگاروں پر لوٹ رہا ہوں، مجھے کوئی سوئیاں چبھو رہا ہے، میرے دل میں نشتر رکھ دیئے گئے ہیں، میرے دماغ میں کیلیں ٹھونکی جا رہی ہیں، مجھے احساس نے صلیب پر لٹکا دیا ہے، یہ رات گویا میری آخری رات ہے، صبح مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا، آنکھ تھی کہ لگتی ہی نہیں تھی، رہ رہ کر ان چہروں کا تصور تڑپاتا، جن کی حیا پر خنجر تانے گئے اور جن کی عفت نیزے کی انی تک پہنچ گئی، میں دیکھ رہا تھا میرے سامنے کتنی ہی عصمتیں ہیں جنہیں بیچا جا رہا ہے، سورۂ نور اپنی آیتوں کے اختلاج پر کراہ رہی ہے، خزف ریزوں نے آبگینوں کو ہتھیا لیا ہے، موتیوں کو سیپیاں کھا گئی ہیں، پناہ گزینوں کے کیمپ میں پھرنے کے بعد میں نے سیاسی طالع آزماؤں کو آڑے ہاتھوں لیا، اُن سے کہا آپ مسلمانوں کا گوشت بیچنے آئے ہیں یا ان کی خدمت کرنے؟ راشن تو انہیں سرکار دے رہی ہے لیکن جو کپڑا ان ستم زدوں کے لیے آیا تھا، مثلاً حیدر آباد کے رؤسا ہی نے دو گاڑیاں بھر کے بھیجا تھا وہ کہاں ہے؟ کن لوگوں میں تقسیم ہوا؟ کون لے گیا؟ دیہات میں آپ لوگ جا نہیں سکتے کہ ان کے مکانوں کی خبر لیں، یہاں آپ ان کی مدد نہیں کر رہے، صرف انہیں استعمال کر رہے ہیں، اس قیامتِ صغریٰ میں بھی آپ اختلاف کا بغض لیے پھرتے ہیں، کیا ملے گا آپ کو؟ مدرسہ شمس الاسلام کے کیمپ میں ان شرارتی لوگوں نے ہم پر، آوہو آوہو یا ہاہی ہی کے آوازے کسواتے تھے، لیکن ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ان بولیوں سے ہم اپنا کام نہیں روک سکتے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں؟ ہمیں ہیں جو ان کی خدمت کر سکتے ہیں، آپ لوگ محض سیاسی

کھلنڈرے ہیں، جو کچھ ان کے لیے ملک بھر میں اکٹھا ہوا وہ آپ انہیں دے نہیں رہے، اور سرکار سے جو راشن انہیں ملتا ہے اس میں آپ خود شریک ہیں؛ یا پھر بتیس روپے روز کے کمرے ہیں جہاں آپ کے رئیس مزاج رہنما ٹھیرے ہوتے ہیں، خدمت اس طرح ہوتی ہے؟ ہماری گھُرکی کام آگئی، جمعہ کا دن تھا ہم سب نے مدرسہ شمس الاسلام کی مسجد میں نماز ادا کی، پھر جلسہ کیا، مَیں نے پناہ گزینوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کا حوصلہ بلند کیا، انہیں قرنِ اوّل کے مسلمانوں کی یاد دلائی، صحابہؓ کا اُسوہ اور تابعین و تبع تابعین کی نظیریں پیش کیں، اسلاف کا ذکر کیا وہ دن یاد دلائے جب مسلمانوں کا قافلہ اسی گنگا کے کنارے اُترا تھا، ان کے اُترے ہوئے چہروں پر کچھ دیر کے لیے رونق آگئی، وہ ایک جاندار آواز سُن کر جوان ہوگئے۔ عوام کی نفسیات ہی یہ ہیں کہ وہ آنکھوں سے زیادہ کانوں سے محبت کرتے ہیں۔ جو کچھ ان کے کانوں میں ڈالا جاتا اپنے دلوں پر نقش کر لیتے ہیں، گویا تقریر نام ہے کانوں کے راستے دل میں اُتر جانے کا۔ مَیں نے اعلان کیا جس گاؤں میں کسی کی بیٹی رہ گئی ہو یا اس کا سامان محفوظ ہو اور وہ لانا چاہتا ہو، ہمارے کیمپ میں آجائے، ہم مقدور بھر خدمت کے لیے تیار ہیں، ہمیں کسی صلے کی ضرورت نہیں اور نہ کسی سے کچھ چاہتے ہیں، بحمداللہ مسلمان ہیں اور پنجاب سے اسی خدمت کے لیے آئے ہیں، ہمارے راستہ میں جس کسی نے روڑا اٹکایا، خواہ حکومت ہی کیوں نہ ہو، ہم اس سے بھڑ جائیں گے، اس کلمہ نے بلا کا اثر کیا، وہ سادہ دل لوگ جنہیں ہمارے خلاف سیاسی قصّابوں نے بھڑکایا تھا بڑھ بڑھ کے مصافحہ کرنے لگے، اکثر بہنیں اپنی اپنی مغویہ بیٹیوں کے لیے تصویرِ فریاد بن کر ہمارے سامنے کھڑی ہوگئیں، ہم نے ان کے نام اور پتے نوٹ کر لیے۔ مردوں سے کہا صبح کیمپ میں تشریف لائیں، حکومت نے بلا کے اس جاڑے میں انہیں صرف ایک ایک کمبل دے رکھا تھا جس سے اُن کی سردی رکتی نہیں تھی، مَیں نے لوٹ کر سنہا سے کہا تو انہوں نے دو دو کمبلوں کا انتظام

کرا دیا مسلم لیگ نے جو لحاف جمع کیے تھے وہ ابھی ان میں تقسیم نہیں کیے تھے، یہی حشر بہار ریلیف فنڈ کا ہوا، ستر پچھتر لاکھ روپیہ جمع ہوا لیکن متاثرین میں تقسیم نہ ہو سکا جبیب بنک میں ڈیپازٹ رہا اور اس کے لیے ریڑھ کی ہڈی بن گیا، ۱۹۶۴ء میں سارا روپیہ ایوب خاں کے اختیارات کو منتقل ہو گیا کہ وہ اس کو قومی معاملات میں اپنے صوابدید پر خرچ کر سکتے ہیں،

پاکستان بنا تو بڑے لوگ اُٹھ کے یہاں آ گئے، چھوٹے لوگ وہیں غفرلہٗ ہو گئے، جو باقی رہ گئے جی رہے ہیں کمال کرتے ہیں۔

سنہا وزارت نے بہتیرا چاہا کہ اپنے کیمپ کے لیے ہم اس کے خیرات خانہ سے اشن لیں لیکن ہم نہ مانے نعبت تک وہاں رہے اپنے پیسوں سے روٹی خریدتے اور کھاتے تھے،

اگلے روز ہمارے پاس لوگوں کا ایک ہجوم ہو گیا، سب سے پہلے ہم نے مغویہ لڑکیوں کی ایک فہرست تیار کی اور بعض ایسی لڑکیوں کو ہفتہ عشرہ کی محنت سے برآمد کیا جو پٹنہ کے ہوٹلوں میں ہر شب فروخت ہو رہی تھیں، سنہا کی کابینہ میں دو مسلمان وزیر تھے ڈاکٹر سید محمود اور عبدالقیوم انصاری، لیکن دونوں بے بس تھے، مسٹر عبدالباری صوبہ کانگرس کے صدر تھے، اِن تینوں سے مَیں نے کہا کہ جو کچھ یہاں ہوا ہے اس کے خلاف بطور احتجاج مستعفی ہو جائیں، لیکن ان کا استدلال یہ تھا کہ اس سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو گا بلکہ مسلمانوں کی مشکلات اور بڑھیں گی، مسٹر عبدالباری نے مسلمانوں کے قتلِ عام کی داستان اور پلان کو ایک رپورٹ کی شکل میں مرتب کیا وہ گاندھی جی پر زور دے رہے تھے کہ بہار آئیں، لیکن بعض لوگوں نے انوگرہ نارائن کے اشارہ پر عبدالباری کو اکیلا پاکر قتل کر دیا ـــــ قصبہ مسوڑھی میں مسلمانوں کے بڑے بڑے گھر تھے اور وہاں کے مسلمان مقابلۃً خوشحال بھی تھے، بلوائیوں نے اس قصبہ کا ایک ایک فرد چُن چُن کر قتل کیا، اب ان کے قلعہ نما مکان ہمیشہ کے لیے خاموش کھڑے تھے، مولانا آزاد وہاں پہنچے تو لاشوں

کا ڈھیر دیکھ کر آدھ گھنٹہ ساکت کھڑے رہے، پھر ایک چوکور میدان کھدوا کر شہدا کو دفن کرا دیا، مولانا نے فاتحہ پڑھی اور ضلع کانگرس کمیٹی کے صدر سے مصافحہ کیے بغیر لوٹ گئے، یہاں تک کہ مقامی عہدیداروں کو شرف باریابی نہ بخشا، ان سے صرف اتنا کہا کہ "تم نے اہنسا کی لاج رکھ لی ہے، واقعی تم ستنیہ وادی ہو" اور وہ مولانا آزاد کے اس طنز سے بوکھلا گئے۔

مسوڑی میں دس سال کا ایک مسلمان بچہ اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا، وہی ایک بچ گیا تھا، پوچھا کیا کرتے ہو؟ بولا "میری ماں اور میرے باپ کی یہ اکٹھی قبر ہے اس کی حفاظت کرتا ہوں۔"

"کھاتے کیا ہو اور کہاں سے کھاتے ہو؟"

"چمپالال چمار کا بیٹا منی لال میرے ساتھ پڑھتا تھا، اب مجھے دو وقت کی روٹی دے جاتا ہے۔"

اب تو واقعات ہی ذہن سے اُتر چکے ہیں، اور صحیح طور پر نام و مقام بھی محفوظ نہیں رہے، کسی گاؤں (غالباً مونگھیر) کا ایک سیّد نوجوان ماجد میاں ہمارے پاس آیا اور کہا کہ وہاں ہماری تعلقہ داری تھی، مَیں اپنے قصبہ کی لیگ کا جنرل سکرٹری تھا، فساد اٹھا تو کسانوں نے اکٹھے ہو کر کہا "حجور ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے، آپ کی پرجا ہیں، بے فکر رہیں، ہم بلوائیوں کو یہاں کبھی آنے نہیں دیں گے" لیکن جب فساد جوان ہو گیا تو اِن کسانوں ہی نے چُن چُن کے قتل کیا، سب سے پہلے والد کو قتل کیا، پھر بھائیوں کو، بہن آنکھوں سامنے اُٹھا کر لے گئے، بچا کون؟ مَیں، میری بیوی، میرا معصوم بچہ، والدہ اور ایک سالی، باقی سارے کا سارا گاؤں قتل کر دیا گیا، پٹنہ سے اس کا گاؤں سو یا ڈیڑھ سو میل تھا، وہ چاہتا تھا کہ ہم اُس کے ساتھ چلیں، وہاں دیوار میں اس کا سونا محفوظ پڑا ہو گا، مل گیا تو آئندہ زندگی آسانی سے بسر ہو گی، ہم نے ہامی بھر لی، اُس کی ماں اور

بیوی دونوں روکتی رہیں کہ میاں جہاں اور چیزیں چلی گئیں، گھر بار لُٹ گیا، زمینیں نہ رہیں سب سے بڑی بات کہ اَبّا قتل کیے گئے، بہنیں چھن گئیں، وہاں سونا بھی جانے دو۔ ماجد نہ مانا، آخر ہم اس کو سرکاری ٹرک میں ساتھ لے کر رات نو بجے روانہ ہو گئے، دُور دراز کا سفر، راستہ کے نشیب و فراز، سڑکوں کا پیچ و خم، اندھیروں کا سناٹا، جگہ جگہ برساتی نالے ان پر کشتیوں کے پل، اِدھر اُدھر کھڈ، پہیہ کھسکے تو سب ہلاک، ہمراہ ایک عجیب طرح کا خوف تھا، مَیں احتیاطاً ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا، اس کی نگرانی کرتا رہا، رضاکاروں نے کالی اور لمبی رات بِتانے کے لیے پنجابی گیت چھیڑ دیئے، جن میں خدا و رسول، قرآن و اسلام اور صحابہ و تابعین کا ذکر تھا، جب کسی بستی سے گزرتے تو رضاکار نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے، شہدائے بہار زندہ باد پکارتے، ایک خطرناک کھڈ کے قریب ڈرائیور کا مزاج برہم ہو گیا، وہ ایک ہندو راجپوت تھا، کہنے لگا، براہِ کرم انہیں نعرہ لگانے اور گیت گانے سے روکیں، ورنہ ٹرک کو کسی کھڈے میں گرا کر خود بھی ہلاک ہو جاؤں گا اور انہیں بھی لے مروں گا، مَیں نے اس کو جھُوٹ موٹ سمجھایا بجھایا کہ بھئی ہم لوگ خود کانگرسی ہیں، ہمارا تعلق سرحدی گاندھی کی سرخپوش جماعت سے ہے، ہم مہاتما جی کے ایما پر یہاں آتے ہیں، اُس نے کہا "سب ٹھیک ہے لیکن میں یہ نعرے اور یہ گیت نہیں سُن سکتا، میرے جذبات مشتعل ہوتے ہیں"۔ مَیں نے جُوں تُوں کر کے اس کا ذہن پلٹا اور وہ قدرے راضی بھی ہو گیا، لیکن دل مضطرب رہا۔ ایک جگہ کسی بہانے ٹرک رکوا کر مَیں نے اپنے ساتھ سالار معراج دین اور نائب سالار محمد رفیق کو بٹھا لیا، رفیق ڈرائیونگ جانتا تھا، اس نے باتوں باتوں میں ہینڈل پکڑ لیا، رضاکاروں کو نعرے لگانے اور گیت گانے سے منع کر دیا اور وہ چوکنا ہو گئے۔

ڈرائیور نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا:

"جناب آپ نہیں جانتے یہ ہنگامہ کیوں ہوا ہے؟ یہ نواکھالی کا جواب ہے، یہ اُن تقریروں کا بدلہ ہے جو یہاں کی جاتی رہی ہیں، ہم پاگل

نہیں تھے ہم نے اپنے کانوں سُنا ہے "جیسے لیا تھا ہندوستان ویسے ہی لیں گے پاکستان"۔ مَیں راجپوت ہوں، یہاں بڑی آبادی راجپوتوں کی ہے، ہم وہ سُن ہی نہیں سکتے جو آپ کے لیڈر یہاں کہتے رہے ہیں کہ اکبر کو بیٹی دینے والے ہمارے مُنہ آتے ہیں۔ بھلا اس میں کیا تک ہے کہ ہندو اور مسلمان میں وہی فرق ہے جو دھوتی اور پاجامے میں، وہ آگے سے کھلتا اور یہ پیچھے سے کھلتی ہے، یہ سیاست ہے؟ یہ راج نیتی ہے؟

۱۹۴۲ء کی تحریک میں جو مہاتما جی نے "ہندوستان چھوڑ دو" کے نام پر شروع کی، یہاں دیش بھگتوں کو جان سے مار دیا گیا، ان کے پیٹ چاک کیے گئے، ان کی مقعد میں سلاخیں دی گئیں، منچلے نوجوانوں کے سر کاٹ کے درختوں پر لٹکائے گئے"۔

مَیں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

"لیکن اس میں مسلمانوں کا قصور کیا ہے"؟

"جن اضلاع میں یہ سب کچھ ہوا وہاں بڑے بڑے آفیسر مسلمان تھے، پولیس کا انسپکٹر جنرل مسلمان تھا"۔ ڈرائیور نے جواب دیا۔

"لیکن مسلمان عوام اس کے ذمہ دار نہیں"! مَیں نے کہا۔

وہ بولا "جنگ کی حالت میں یہی ہوتا ہے، لیڈر یا جرنیل نہیں مرتے، مرتے ہیں تو شاذ و نادر، ہلاک ہوتے ہیں سپاہی یا عوام"۔

راستہ میں ہم ایک ایسی جگہ ٹھہر گئے جہاں گورہ فوج کے سپاہی پہرہ دے رہے تھے، معلوم ہوا کہ یہاں کی فضا مکدر ہے۔ رات کا ایک حصّہ ہم نے وہیں آرام کیا، صبح اُٹھے، چنوں اور گڑ سے پیٹ بھرا، ٹرک میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے، وزارت نے ہدایت جاری کی تھی کہ ہماری حفاظت کی جائے، ورنہ جہاں سے ہم گزرے وہاں قتل ہونا مشکل

نہ تھا، ہم ایک ایسے گاؤں میں جا رہے تھے، جو حقیقت میں قاتلوں کا گاؤں تھا، یوں بھی متاثرہ علاقوں میں مسلمانوں کے لیے جانا ناممکن تھا لیکن ہم لوگ اس کے باوجود جا رہے تھے، ہمیں معلوم تھا کہ حکومت کے اعوان و انصار ہی قاتلوں کے اعوان و انصار ہیں بالآخر ہم ماجد میاں کے گاؤں پہنچ گئے، کھڑی فصلیں اپنے مالک کا انتظار کر رہی تھیں، اور لٹا ہُوا مالک سہمی ہوئی روح کے ساتھ اپنے مکان میں داخل ہو رہا تھا ــــ میں سوچتا رہا:

"جس دھرتی پر قدرت اتنی فیاضی سے مسکرا رہی ہے وہاں انسان کا خون کس طرح بہا ہو گا، کیا ان فصلوں کے لیے زہر نہیں بنا ہو گا؟"

ماجد کا مکان زمینداروں کے روایتی ٹھاٹھ کی غمازی کر رہا تھا لیکن اب وہاں کچھ نہیں بچا تھا، دیواروں میں دراڑیں تھیں، اور اینٹوں پر دھوئیں کی تہیں، ماجد بلکنے لگا، اس کو والد یاد آ گئے، جو یہاں اس کو مجو میاں کے نام سے پکارا کرتے تھے، بہنیں یاد آ گئیں جو انہی شاخچوں میں گم ہو گئی تھیں، ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی ڈھائیں مار مار کے رونے لگا، ہم نے اس کو دلاسا دیا لیکن وہ پچھاڑیں کھا رہا تھا، کہنے لگا:

"میرے ابا کو نمک حرام نوکر نے یہیں ڈھیر کیا تھا۔

وہ ہمیں اپنے رئیسی مکان کی دیواریں دکھاتا اور مختلف کمروں میں گھماتا ہُوا اس کمرے میں لے گیا جہاں اس نے ماہِ عسل گزارا تھا، جہاں وہ اور اس کی بیوی رہتے تھے، جہاں اس کی بچی نے جنم لیا تھا، اس نے کہا

"یہ میرے ابا جان کا کمرہ ہے، بہشتی زیور کی جلی ہوئی جلدیں لو دے رہی تھیں، حقے کی نے ٹوٹی ہوئی تھی، یہ میری بڑی بہن کا کمرہ ہے، یہ میری منجھلی بہن کا کمرہ ہے، اس کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں کہہ رہی تھیں، ــ ع

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

اور یہ میری چھوٹی بہن کا کمرہ ہے، اس کے ہاتھوں کی مہندی کا کٹورہ

اوندھا پڑا تھا، اس نے کہا میرے کمرے کی دیوار کے اُس طرف شگاف ڈالو۔"
ایک رضاکار کے شانوں پر دوسرا اور دوسرے کے شانوں پر تیسرا چڑھ گیا، ایک چھوٹی سی کُدال سے شگاف کیا، دو چار اینٹیں اِدھر اُدھر کیں، پلستر اتارا، ایک طاق اُبھرا، اُس میں سے ایک صندوقچی نکالی، لگ بھگ پانچ سیر طلائی زیورات تھے، اتنے میں گاؤں والوں کو خبر ہو گئی، ہُو گونجی، دیکھتے آنکھوں لوگ ہی لوگ اکٹھے ہو گئے، قاتل نوکر نے مجو میاں کے ہاتھ کو بوسہ دیا، گویا قتل کی رسید دے رہا ہے، منشی نے رونا شروع کیا، ماجد بابو یتیم ہو گئے آپ؟ پھر جانے کس طرح اُن کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی کہ سونا نکالنے آتے ہیں، ایکا ایکی آنکھیں پھیر لیں، ابھی آنکھیں بچھا رہے تھے، ابھی آنکھیں دکھانے لگے، بلم، گنڈاسے چھریاں اُٹھا لاتے، جے رام اور ہر ہر مہادیو، گونجنے لگا۔
"جو کچھ نکالا ہے ہمارے حوالے کرو۔"
رفیق کے پاس زیورات کا بکس تھا، وہ بکس لے کر کھسک گیا اور ٹرک کے انجن میں چھپا دیا، رضاکاروں نے قریب تھانے میں جمعدار (تھانے دار) کو اطلاع کی، اس نے کہا:
"آپ نے یہاں آنے کی جسارت کیسے کی؟ رضاکار سیانے نکلے، انہوں نے کہا، ہم لیگ کے رضاکار نہیں خدائی خدمتگار ہیں، سرحد سے آئے ہیں، ہمارا تعلق کانگرس سے ہے، تب کہیں تھانیدار کا غصہ ٹھنڈا پڑا، لیکن اس نے پلٹ کر جواب دیا:
"آپ ایک لیگی کی مدد کو آئے ہیں؟"
ہمیں مہاتما گاندھی اور راجن بابو نے بھیجا ہے۔ وہ مطمئن ہو گیا اور ساتھ آ گیا، اُن لوگوں نے کہا:
"یہ لوگ سونا نکال کر لیے جا رہے ہیں۔"
تھانیدار نے پھر آنکھیں بدل لیں، میں نے جیل میں جتنی ہندی سیکھی تھی صرف کر ڈالی، نہ تھانیدار مانا، نہ وہ لوگ مانے، ہم میں سے ایک ایک کی تلاشی لی گئی، ٹرک روانہ ہوا تو

ان لوگوں نے پتھراؤ کیا، چند رضا کاروں کو چوٹیں آئیں، ہم بڑے حوصلے سے جان بچا کر چلے آئے، یہ کوئی معمولی کام نہ تھا، ہم نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اور موت کے عمیق غار سے نکل کر آئے تھے لیکن ماجد میاں جو ہمارے رضا کاروں کی دلیری اور خلوص کا گرویدہ ہو چکا تھا، سالار معراج الدین سے کہنے لگا، آپ کا شکر گزار ہوں، آپ نے جس پامردی سے دیوار میں شگاف ڈالا، یہاں تک پہنچایا اور اُن لوگوں سے جس طرح نپٹا اُس نے مجھے بےحد متاثر کیا ہے، آپ احرار کو چھوڑ کر لیگ میں آجائیں تو میں اپنی سالی کی شادی آپ سے کرنے کو تیار ہوں۔"

معراج الدین کی ہمّت اور غیرت ہم سب کی رہبر تھی اس نے جواب دیا۔

"میری ہمّت تمام تر احرار کی پروردہ ہے، میری غیرت کو انہی نے سرسبز کیا ہے، آپ کی محبّت کا شکریہ، میری شادی ہو چکی ہے ہم نے یہ کام کسی صلے کی غرض سے نہیں کیا۔ اسلام کے رشتے سے کیا اور خدمت کے جذبے سے کیا ہے۔"

رفیق کے پاس بکس محفوظ تھا، پٹنہ میں ماجد کو بکس دیتے وقت مَیں نے کہا:

"اپنے زیور گن لیں، اور رسید دے دیں" ماجد نے کہا وہ صبح آکر تشکر نامہ لکھ دے گا، ہم نے کہا تشکّر کی ضرورت نہیں، آپ کے نام اور رتبہ کی ضرورت ہے؟ اگلی صبح اُس نے گُل کھلایا کہ اس کے پانچ سیر سونے میں سے چھ ماشے کی ایک انگوٹھی کم ہو گئی ہے، ہم نے کہا بھئی آپ کے سامنے صندوقچی نکالی، انجن میں رکھی، پھر سب سے معتمد آدمی کو چُنا اور اس کے حوالے کی، یہاں آپ نے خود اس کی بندش توڑی، اب آپ کا کہنا جچتا نہیں، آپ بے شک اعتراف نہ کریں، ہمیں کسی تحریر کی ضرورت نہیں، رفیق کو غصّہ آگیا اُس کے ہاتھ میں تولہ بھر سونے کی انگوٹھی تھی وہ اُتار کر اس کی طرف پھینک دی۔ وہ سخت شرمندہ ہُوا، معافی چاہی، انکار کیا، بار بار کہتا رہا کہ آپ بلا وجہ خفا ہو گئے ہیں،

لیکن رفیق نہ مانا، انگوٹھی دے کر ہی دم لیا، سیاست کی اس بدمزگی سے ہمارا جی کھٹا ہوگیا، لیکن پناہ گزینوں میں چونکہ ہمارے نام کی دھوم مچ گئی تھی اس لیے ہم نے خدمت کا جو ڈول ڈالا تھا اسے جاری رکھا، صبح و شام ان کی خدمت کرتے رہے۔

"عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو"

قاتلوں کے اس نگر میں کچھ چہرے روشن بھی تھے، پھلواری شریف کے ہندو ایم ایل اے نے اپنے گاؤں کی بارہ مسلمان دوشیزاؤں کو بچایا تھا، بلوائیوں کو معلوم ہوا تو اس کے گھر میں گھس گئے، اس نے ان لڑکیوں کو سوروں کی باڑھ میں اوندھے منہ لٹا کے چھپا دیا، بلوائی چاروں طرف ڈھونڈ ڈھانڈ کے چلے گئے، اگلے دن ان لڑکیوں کو مدرسہ شمس الاسلام میں پہنچا دیا، ان لڑکیوں سے میں نے ملاقات کی تو وہ خود اس کی سپاس گزار تھیں، ان کے ہونٹوں پر بے شمار دعائیہ کلمات تھے، میں نے معاً محسوس کیا، کاش یہ شخص اس قوم میں نہ ہوتا!

پاس ہی ایک اور گاؤں تھا جس کے چاروں طرف پانی کا جوہڑ تھا، بلوائیوں کے خدشہ سے گاؤں والوں نے دو فرلانگ کا راستہ جو گاؤں کو شاہراہ سے ملاتا تھا اس طرح کاٹا کہ غرقاب ہوگیا، بلوائیوں نے حملہ کیا تو راستہ نہ تھا، گاؤں کے مسلمان لیس کانٹا ہو کر تیار تھے، انہوں نے مردانہ وار فائر کیے، بلوائیوں نے کچھ دیر تو مقابلہ کیا لیکن پھر اُلٹے پاؤں بھاگ گئے، کیونکہ انہیں مقررہ مدت کے اندر اندر صفایا کر کے فساد ختم کر دینا تھا۔

میں نے لیگ کے لیڈروں سے کہہ دیا تھا کہ سری کرشن سنہا اور انوگرا نارائن مسلمانوں کی مربوط بستیاں بسانے پر راضی نہیں، نہ مسلمانوں کو فراخدلی سے لائسنس دینا چاہتے ہیں اور نہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دینے کی نیت ہے حسن امام نے کہا، دیکھا آپ نے یہ لوگ آپ کی بات نہیں مانتے تو ہماری کب مانیں گے؟

میں نے اس جواب کو پہلو دار سمجھا، ان سے کہا:

"ہمارے ساتھ ان کی رشتہ داری نہیں کہ ہماری بات مانیں، اس خرابی کے ذمہ دار آپ لوگ ہیں، آپ نے قوم کا ایک مزاج بنایا، آتشبار تقریریں کیں، جواباً اس قوم نے تیاری کی اور معاملہ یہاں تک پہنچا۔ جب آپ کو معلوم تھا یہی ہوگا تو آپ نے یہ خطرہ کیوں مول لیا؟ کیوں نہ توازن قائم رکھا؟ آپ نظری تنظیم کرتے رہے وہ عملی تنظیم کر گئے، نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ راجندر پرشاد، دیو سے دیبی پرشاد گھسیارے تک کے ہاتھ آپ کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف آپ انہی سے انصاف مانگتے ہیں، آپ خود تو شاید پاکستان میں چلے جائیں لیکن ان مفلوک الحال مسلمانوں کا کیا بنے گا، جو قاتلوں کے اس نگر میں بے دست و پا ہیں، خون بہا حاصل کرنے کے لیے ہمت چاہیے، اور اگر اس خون کو سیاستہً استعمال کرنا ہے تو پھر ع

دامنِ یار خدا ڈھانپ لے پردا تیرا،

میرا لہجہ تھوڑا سا تلخ ہوگیا، اُن سے کہا کہ یہاں حکومت میں کتنے مسلمان آفیسر ہیں، کسی نے احتجاجاً استعفیٰ دیا؟ آپ لوگ اسمبلی سے کیوں مستعفی نہیں ہوتے؟ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے تو استعفیٰ ہی دے دیتے کہ ہم قاتلوں کے ساتھ بیٹھنے کو تیار نہیں؛ حسن امام نے کہا اس سے کیا بنتا ہے، ہم اقلیت میں ہیں، ہندوؤں کی اکثریت ہے۔

مَیں نے ذرا ترشی میں کہا، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ پاکستان کا مطالبہ بھی تو یہی اقلیت کر رہی ہے، آپ جانتے ہیں پاکستان یہاں نہیں بنے گا، اس کے حدود یہاں سے بہت دُور ہیں، ایمان و عمل اقلیت و اکثریت کے محتاج نہیں ہوتے، وہ خود سب سے بڑی طاقت ہوتے ہیں، اور ضرورت ایمان و عمل ہی کی ہے، تذبذب و تردّد کی نہیں، کوئی احتجاجی قدم اٹھائیے، مَیں آپ کے ساتھ شریک ہوتا ہوں، بلکہ کانگرس کے مسلمان وزراء کا بھی ذمہ

لیتا ہوں کہ وہ احتجاجاً مستعفی ہو جائیں گے، لیکن اُن کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی، چلّاتے بھی تھے اور ڈرتے بھی تھے، ڈان کے نمائندے کی معرفت پٹنہ کے ڈپٹی کلکٹر، ڈپٹی کمشنر، سے ملاقات ہوتی ان کے مکان پر اور بھی دو چار مسلمان آفیسر موجود تھے، مَیں نے ان سے بھی یہی کہا کہ احتجاجاً مستعفی ہو جائیں، صُوبہ کا انسپکٹر جنرل پولیس مسلمان تھا اس کی رٹیائرمنٹ میں تین چار ماہ باقی تھے وہ ہندو پولیس آفیسروں کو اس ذبحِ عظیم کا مرتکب قرار دے کر وزارت کی چشم پوشی پر احتجاجاً مستعفی ہو سکتا تھا، اِس سے نہ صرف صوبہ کی حکومت بدنام ہوتی بلکہ مرکزی حکومت کو بھی لینے کے دینے پڑ جاتے لیکن کسی کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی، سب یہی کہتے تھے کہ وزارت نے مروایا ہے، راجن بابو ذمہ دار ہے، جے پرکاش قاتل ہے لیکن کوئی فرد بھی کسی ایثار کا ثبوت دینے کو تیار نہ تھا، سب کے دل میں خوف بیٹھا ہوا تھا —

مَیں نے پٹنہ چھوڑنے سے پہلے جلسۂ عام کو خطاب کیا، جلسہ میں ہندو بھی تھے، اور مسلمان بھی، جو کہہ سکتا تھا کہا اور کھرے کھرے لفظوں میں کہا، اس تقریر سے میری دھاک بیٹھ گئی، ہندوؤں نے پنجاب کا "جے پی بابو" کہا، مسلمان خوش ہو گئے کہ بُت کدہ میں اذان دی گئی۔

صبح لوٹنا تھا، شام کا بیشتر حصّہ گنگا کے کنارے گزارا، گنگا پٹنہ کے ساتھ ساتھ بہتی ہے، عظیم آباد مر چکا، پٹنہ جیتا پر تھا اور پاٹلی پتر دوبارہ زندہ ہو رہا تھا —— ہمارے ایک دوست نے گنگا کے کنارے انتہائی سوز میں اقبال کا ترانہ چھیڑا اور اس شعر نے ہم سب کو ہلا ڈالا ؎

اَے آبِ رُودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مَیں سوچتا رہا، یہی وہ گنگا ہے جس نے ہمارے قافلوں کا خیر مقدم کیا تھا جس کی

ہرن بیکاری اذانیں اُتر گئی تھیں، جس کے پانیوں سے ہم نے وضو کیا تھا، گنگا نے بڑی دیر بعد اس کا انتقام لیا، ہمارا منوں خون اس میں بہ گیا، اور مقدس گنگا پہلے سے زیادہ مقدس ہوگئی یا پھر اس کی پوترتا کو ملیچھوں کا خون چاٹ گیا، کتنی صدیوں سے یہ بہ رہی ہے اور کتنی صدیوں تک بہتی رہے گی، ہماری تاریخ نے اس کو اُجلا کیا، ہمارے لہو نے اس کو جلا دی، یہ رشیوں کی گنگا ہے، یہ ویدوں کا سرچشمہ ہے، یہاں سے رام گزرے تھے، یہیں سے گوتم بدھ اٹھا تھا، ہزاروں رشی اس کی لہروں میں اپنے بجرے ڈال چکے ہیں، وید اسی کے کناروں پر تصنیف کیے گئے۔ کتنی تہذیبیں اس کے دامن سے وابستہ ہیں اور کتنے تمدن اس کی آغوش میں جوان ہوئے اور مر گئے۔ عمر رواں کی طرح بہے جا رہی ہے تاریخ کی نظر میں بوڑھی ہے لیکن نگاہ کے لیے ہر لحظہ جوان، الھڑ، کنیا، دوشیزہ، عفیفہ، سیتا، دروپدی۔ یہاں کتنے کورو مرے اور کتنے پانڈو جیتے ہونگے؟ کتنے پیمان ابھرے ہونگے اور کتنی ناکامیاں ڈوب گئی ہونگی۔

گنگا ہر آن بہتی ہے اس وقت بھی بہ رہی تھی، اس نے مسلمانوں کا خون اپنے اندر جذب کر لیا تھا، وہ لوگ جو اس کے کناروں پر اُترے تھے، ایک ایک کر کے ڈوب گئے، لیکن گنگا اسی طرح اتھری چلے جا رہی تھی، شفق نے اپنا سونا اس کے پانی میں ملا دیا تھا، رات اس شفق کو گرہ لگا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سونے کو تانبا ٹرپ کر رہا ہے، اور تانبا گل سڑ کے لوہا بن جائے گا، گنگا بہتی رہے گی، گنگا بہ رہی ہے لیکن انسان رخصت ہو رہا ہے، انسان رخصت ہو چکا ہے، وہ تمام سفینے ڈوب گئے ہیں جو مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے، میں نے گنگا سے گفتگو کرنی چاہی لیکن گنگا لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی بڑھی جا رہی تھی، اس کا دل ہین وسیار کے حادثوں اور سانحوں سے بے نیاز تھا، اس نے ایک ہی فن سیکھا تھا کہ ہر حال میں بہے چلو، رکو نہیں، رک جانا موت ہے۔

گاندھی جی بہار میں

میں نے مسلم لیگ کے زعماء سے وعدہ کیا کہ گاندھی جی کو بہار بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ گاندھی جی اُن دنوں نواکھالی اور اس کے مضافات کا دورہ کر رہے تھے، انہیں بہار کے متعلق دھوکا دیا جا رہا تھا کہ وہاں فسادات نہیں ہوئے، صرف چند جگہ جھڑپیں ہوتی ہیں، ان کے پاس وفد بھیجے گئے کہ نواکھالی ہی میں رہیں، مسلمانوں کا واویلا صرف اس لیے ہے کہ ان کی توجہ نواکھالی سے ہٹا لیں، میں پٹنہ سے دہلی پہنچا، مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا، تمام واقعات بہ تفصیل بیان کیے، فرمایا، اسی ترتیب سے لکھ دو، میں نے ساتھ تجزیہ بھی کر دیا، مولانا نے کہا جو کچھ ہوا غیر متوقع نہیں تھا، میں خود گھوم پھر کے دیکھ آیا ہوں، فرمایا کہ احرار کی ایک اور جمعیت بھجوا دو، خود لاہور چلے جاؤ اور آزاد کی ادارت سنبھالو، میں یہاں سے خان عبدالغفار کو بھیجتا ہوں وہ گاندھی جی کو صحیح اطلاع دے کر بلوا سکتے ہیں۔

میری رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا:

(۱) مسلمانوں کے قتلِ عام کا منصوبہ باہمی صلاح مشورہ سے بنایا گیا، جن علاقوں میں فساد کرانا مقصود تھا وہاں کے ذاتی معتمدین کو پٹنہ طلب کیا گیا، جہاں انو گرا نارائن کے ہاں سارا پروگرام طے ہوا، پھر اس پروگرام کو انتہائی رازداری کے ساتھ کارکنوں تک پہنچایا گیا، علاقہ وار کمان کی فسادان لوگوں کے سپرد کی گئی جو کانگرسی اور سوشلسٹ

ہونے کے باوجود غالی ہندو تھے ۔

(۲) جہاں فساد مقصود تھا وہاں مسلمانوں کے مکانوں پر حملہ کرنے سے ایک روز پہلے رات کے وقت کراس کا نشان لگا دیا گیا ۔

(۳) جن گاؤں میں مسلمانوں کو لوٹا اور کاٹا گیا وہاں مقامی باشندوں کو اجتماعی یلغار میں مطلقاً شریک نہ کیا گیا بلکہ دوسرے گاؤں کے لوگ ان پر یلغار کرتے رہے۔ ان لوگوں کو بہت دنوں پہلے اس غرض سے ٹریننگ دی گئی ۔

(۴) حملہ آوروں کو کئی کئی دستوں میں تقسیم کیا گیا، ایک دستہ سامنے سے فائر کرتا، ایک پیچھے سے مکانوں میں نقب لگاتا، ایک آگ لگاتا، ایک قتل کرتا، ایک لوٹتا، ایک اغوا کرتا، فسادیوں نے آپس میں تقسیم کار کی ہوئی تھی ۔

(۵) حملہ آور ہزاروں کی تعداد میں جلوس بنا کر چڑھائی کرتے، گاؤں سے باہر کھلے میدان میں پڑاؤ ڈال دیتے، بلم لہراتے، تلواریں چمکاتے، نیزے اچھالتے، برچھیاں گھماتے، بندوقیں تانتے، نعرۂ بجرنگی گونجاتے، چولھے دہکاتے، کڑاہیاں گرم ہوتیں، پوریاں پکتیں، شکم سیر ہو کر ہلہ بولتے، پہلے فائروں کی بوچھار کرتے، پھر قلیل التعداد مسلمانوں کو سامنے سے تھکا کر پیچھے سے دیوار پھاڑتے اور اندر گھس جاتے، عورتوں کو عمر کے لحاظ سے صف آرا کر لیا جاتا، بوڑھیاں قتل کر دی جاتیں، جوانوں کو اٹھا کر لے جاتے، مردوں کو تہ تیغ کیا جاتا، بچوں کے کلیجے چیر دیئے جاتے، بوڑھوں کو اپاہج کر کے سسک سسک کر مرنے کے لیے پھینک دیتے ۔

(۶) ہفتہ پہلے ہندی میں اشتہارات تقسیم کیے گئے کہ نواکھالی میں ان کی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ مسلمانوں نے زنا بالجبر کیا ہے، ان کا بدلہ لینا ہر ہندو کا دھرم ہے۔

(۷) ہر گاؤں کے مکانات کی بیرونی دیواروں کو قائم رکھا گیا، لیکن اندر تمام سوختت کر دیا گیا، چوکھٹوں اور کھڑکیوں کی لکڑی سے مکینوں کو جلایا گیا، قرآن مجید خاکستر

کیے گئے ۔

(۸) ہر مکان سے سونا چاندی روپیہ پیتل تانبہ لوٹا گیا، لیکن کسی مکان کی کراکری کو ملیچھ ہونے کی وجہ سے ہاتھ نہ لگایا گیا بلکہ توڑ تاڑ کر وہیں پھینک دیا۔ کپڑوں اور لاشوں کو ایک ساتھ جلا دیا گیا۔

(۹) مسلمانوں کے مکان اس طرز پر تھے کہ شروع میں پھاٹک، پھاٹک کے اندر بیٹھک، پھر دیوار، دیوار میں دروازہ، اس دیوار اور دروازہ کے پیچھے کھلا صحن، اس میں کوئی نہ کوئی درخت، بیچ میں کنواں، سہ طرف کمرے، ایک طرف گندم کی کوٹھیاں، حملہ آوروں نے ان کوٹھیوں کو جلا دیا تھا۔

(۱۰) عام مکانوں کی کچی دیواروں میں خون سرایت کر چکا تھا، جن مکانوں کے بستر جلائے نہیں تھے وہ خون سے تر بتر تھے، لیکن خون خشک ہو چکا تھا۔

(۱۱) خواتین نے دیکھا کہ ان کے بچنے کی کوئی سی امید نہیں رہی ہے تو اکٹھی ہو کر چوڑیاں توڑیں، پھر کنوئیں میں چھلانگ لگا دی، اکثر مکانوں میں کنوئیں کی دیواروں پر چوڑیاں ٹوٹی ہوئی پڑی تھیں، اور خواتین کی لاشیں کنووں میں بدبو دے رہی تھیں، ان لاشوں کو ڈبونے کے لیے چارپائیاں باندھ کر ان پر پتھر رکھ دیئے گئے تھے، عورتوں کے قتل کا منظر انتہائی ہولناک تھا ان کے بال اور کھوپڑیاں سڑاند دے رہی تھیں، ایک جلے ہوئے برقع کی آنکھ سے نوعمر بچی کے ڈیلے نظر آ رہے تھے۔

(۱۲) مسوڑی کی مسجد میں شیر خوار بچوں کو کیل ٹھونک کر محراب کے ساتھ گاڑا گیا تھا۔ اس قصبہ ہی میں ٹرین روک کر مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، آبادی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور بیس مربع فٹ کے احاطہ میں پانچسو افراد دفن کیے گئے ــــــ یہاں صرف ایک مسلمان بچہ باقی رہ گیا تھا،

میں نے اس سے کہا "ہمارے ساتھ چلو گے؟"

اُس نے کہا "یہاں میرے ابا ہیڈ ماسٹر تھے، اب سامنے کے کنوئیں میں ان کی لاش بدبُو دے رہی ہے اور میری بہن پاس کے گاؤں میں ہریا چمار کے ہاں ہے۔

"ہریا چمار؟"

"جی ہاں!"

مسوڑی سے مشرق کی سمت دو میل کے دائرہ میں انسانی ہڈیوں اور ——— انسانی کھوپڑیوں کے ڈھیر لگے تھے، جنہیں درندوں، چرندوں اور پرندوں نے بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

(۱۳) اس قصبہ میں پُورے فساد کے سرانجام دینے کا ذمّہ دار مقامی سوشلسٹ لیڈر تھا، مَیں نے اس سے بعض تفصیلات معلوم کرنا چاہیں، اُس نے انکار کر دیا، کہنے لگا، یہ مکافاتِ عمل ہے، نواکھالی کا جواب۔

(۱۴) بعض سوشلسٹ لیڈر اس کو گوریلا جنگ کی ریہرسل قرار دیتے تھے۔

(۱۵) ایک گاؤں کے مویشی دوسرے گاؤں میں دے دیئے گئے، اور فصلیں کاٹ کر ان کے دام ری ہرسل کا صرفہ ہو گئے۔

(۱۶) نوجوان لڑکیوں کو خاندانی حدبندی کے تحت تقسیم کیا گیا، اُونچے گھروں کی بیٹیاں نیچے گھروں میں تقسیم کی گئیں، اکثر فروخت کر دی گئیں، بیشتر دلال خرید کر لے گئے کئی چھ سات روزہ عشرت کے بعد گنگا بُرد کر دی گئیں۔

(۱۷) تمام مکانوں کی دیواریں پھاڑ کر اُن کا سونا نکالا گیا، اور پنچایت میں تقسیم کیا گیا۔

(۱۸) ان گھرانوں میں ننانوے فی صد کتابیں دینیات اور اسلامیات پر تھیں، انہیں قرآن مجید کے نسخوں سمیت جلا دیا گیا۔

(۱۹) بعض دیہات یا قصبات میں مسلم لیگ کے دفتر کی عمارت پر لہو سے پوچا

کیا گیا، اور بورڈوں کے نیچے دو دو بچوں کے پنجر کیل ٹھونک کر لٹکاتے گئے، ان کے نیچے درج تھا۔

"لے کے رہیں گے پاکستان"

(۲۰) ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ فساد شروع ہونے کے تین دن پہلے انگریز گورنر مہینہ بھر کی چھٹی پر چلا گیا، یہی بنگال کے گورنر نے کیا، لیکن جب قتلِ عام ہو چکا تو گورنر نے چھٹی منسوخ کرالی، بھاگم بھاگ پٹنہ پہنچا، وزیروں کو بلایا اور کہا کہ آج رات تک فساد بند نہ ہوا تو کل شام تک صوبہ فوج کے حوالے کر دیا جائے گا، نتیجۃً فساد بند ہو گیا۔ اور یہ تھا بہار کے خونچکاں زہرہ گداز، بھیانک اور قیامت خیز فسادات کا خلاصہ۔

مولانا نے فوراً میری رپورٹ کا ترجمہ انگریزی میں کرایا، اور اس کی کاپیاں کانگرس ہائی کمانڈ کو بھجوا دیں، ایک کاپی گاندھی جی کو بھیجی اور ایک کاپی خان عبدالغفار خاں اپنے ساتھ بہار لے گئے، تاکہ خود دیکھ کر تصدیق کر سکیں کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ کہاں تک درست ہے اور درست ہے تو بہار وزارت کے پاس اس کا جواب کیا ہے؛ ظاہر ہے کہ اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

لاہور پہنچ کر میں نے حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کو سارا واقعہ سنایا، میں ان کی مجلس میں ذرا تیزی سے باتیں کر رہا تھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن نے ٹوکا۔ حضرت نے فرمایا، نہیں اس کو بولنے دو، سچائی ہمیشہ کڑوی ہوتی اور اسی لہجہ میں بولی جاتی ہے۔

میری آمد کے دوسرے یا تیسرے روز مجلسِ احرار کے سکریٹری سیّد مخدوم شاہ نوری اور اُس وقت رکنِ عاملہ ماسٹر تاج الدین انصاری بہار چلے گئے کہ امدادی مہم کو مفید بنا سکیں اور متاثرین کو اُن لوگوں کے چنگل سے بچائیں جو ان کے لہو سے اپنی سیاست کے عارضِ گلگوں کو چمکا رہے تھے۔

خان عبدالغفار خاں پٹنہ پہنچے تو پلیٹ فارم پر ان کے استقبال کے لیے سری کرشن سنہا،

کابینہ کے ارکان اور کانگرس کے رہنما موجود تھے، وہ انہیں فرسٹ کلاس میں ڈھونڈتے رہے، وہ تھرڈ کلاس سے اُترے، بدن پہ کھدّر کا لمبا کُرتا، نیچے کھُلی شلوار، پاؤں میں چپل، بغل میں بستر، رضاکاروں نے بستر اٹھانا چاہا، روک دیا کہ میں اپنا بوجھ خود اُٹھا سکتا ہوں، سیّد مخدوم شاہ بنوری نے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ ٹھیریں لیکن وہ صداقت آشرم میں ٹھیرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، البتہ وعدہ کیا کہ صبح سے شام تک ان کے ساتھ رہا کریں گے۔ اگلے دن صبح ہی بادشاہ خان احرار کیمپ میں پہنچ گئے، اور گھاس کے فرش پر نشست جمالی تھوڑی سی دیر میں عوام کی بھیڑ لگ گئی، بادشاہ خان نے سنہا سے کہا کہ وقت ضائع کرنے میں فائدہ نہیں، کل صبح ہی سے وہ متاثرہ علاقے میں جانا چاہتے ہیں —— وزارت نے ان کے لیے دو کاریں، دو جیپیں اور ایک چھوٹا ٹرک مہیّا کیا، جس میں خوراکہات و مشروبات تھے، بعض وزارتی نمائندے بھی ساتھ جانا چاہتے تھے انہیں روک دیا اور سامان خورونوش لوٹا دیا مخدوم شاہ بنوری، سرخپوش سالار اور اے پی آئی کے مسلمان نمائندے کو جیپ میں ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔

سنہا اور راٹوگرا نے کھانے پینے کی چیزیں لے جانے پر زور دیا تو اُن سے کہا:

"ان کی ضرورت نہیں، میرے لیے گڑ اور چنے کافی ہیں، اور وہ میں ہر وقت ساتھ رکھتا ہوں، اس تعیّش کا بڑے آدمیوں کے لیے انتظام کیجیے، میں خدائی خدمتگار ہوں، مٹھی بھر چنے اور گڑ کی بھیلی میرے لیے کافی ہیں۔"

جس گاؤں سے بادشاہ خان کی جیپ گزرتی، عوام استقبال کرتے، نعرے لگاتے پھول بتاشے لٹاتے، بادشاہ خان ان سے کہتے، انسانوں کے خون سے ہولی کھیل کے اب یہ ناٹک کھیل رہے ہو، پہلے ہی گاؤں کی بربادی دیکھ کر وہ سکتہ میں آ گئے، ممکن تھا غش کھا کے گر پڑتے، مخدوم شاہ نے انہیں سہارا دیا اور وہ ساتھیوں کے شانوں پر ہاتھ

رکھ کر چلتے رہے اتنے آزردہ خاطر اور دل برداشتہ ہوئے کہ ان کا سکون بالکل ناراج ہو گیا، انہوں نے ساتھیوں سے کہا مجھے معلوم ہوتا ہے میں انسانوں کی بستی میں نہیں درندوں کی بستی میں پھر رہا ہوں۔

واپس آکر سنہا اور انوگرا کو بلوایا اور کہا:

"آپ لوگ گاندھی وادی ہیں، یہ آپ کے صوبہ میں ہوا ہے، یہ ہنسا اور اہنسا کی نشانیاں ہیں؟ کیا مسلمان یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب نہیں کہ انہیں جڑواں قصبات میں آباد کیا جائے، جہاں ان کا گھر بار اجڑ گیا ہو، اور اعزہ قتل کیے گئے ہوں، وہاں انہیں کیسے آباد کیا جاسکتا ہے۔ ان بقیۃ السیف کو آپ پھر مقتل کی طرف بھیج رہے ہیں؟ یہ فطرتِ انسانی کے خلاف ہے، رہ گئی ریلیف تو ریلیف کا کام محض اشک شوئی ہے، اس کام کو دو حصوں میں بانٹ دیں، ایک عارضی ریلیف مثلاً کیمپوں کا انتظام اور خوراک وغیرہ کی بہم رسانی، دوسرا مستقل ریلیف، جو انہیں دوبارہ آباد کرنے کے متعلق ہے۔"

—— بادشاہ خان نے گاندھی جی کو تار دیا، گاندھی جی نے تار ملتے ہی بہار آنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان نے وزارت میں کھلبلی مچا دی، ہندو اخبار چلّا اٹھے، ان پر زور دیا جانے لگا کہ وہ نواکھالی کے بے آسرا ہندوؤں کو نہ چھوڑیں، بعض سنگھٹنی اخباروں نے یہاں تک لکھ دیا کہ نواکھالی کے متاثرین کو بدترین حالات میں رکھنے کے لیے عبدالغفار خاں نے چال چلی ہے، خود نواکھالی کی عورتوں کو اکسایا گیا کہ باپو کے چرنوں کو پکڑ لیں کہ وہ انہیں بھی ساتھ لے چلیں یا پھر یہیں رہیں، لیکن گاندھی جی اس قسم کے جذبات سے بالکل معرّیٰ تھے، جب کوئی فیصلہ کر لیتے تو بدلتے نہیں تھے، ان کے بعض فیصلوں سے عمر بھر کے ساتھیوں کو اختلاف ہوتا لیکن وہ اپنے ضمیر کی آواز پر جھکتے اور اسی کے ہو جاتے

تھے، انہیں صرف اپنے دل اور دماغ پر اعتماد تھا، وہ اس صدی میں ہندو قوم کے سب سے بڑے فرزند تھے، اس قوم نے ان کی پُوجا کی لیکن وہ اس کی منشا کے خلاف بھی ڈٹ جاتے، اور پھرتے نہیں تھے، انہیں کوئی ذاتی غرض نہ تھی، نتائج حسبِ منشا پیدا ہوتے تو ساری قوم متمتع ہوتی، خسارہ ہوتا تو صرف انہی کا ہوتا، وہ تکلیف خود جھیلتے، یا اُن کے پیروکار اور فائدہ پُوری قوم یا پُورے ملک کو ہوتا، وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیتے، انہوں نے ۱۹۳۱ء میں تحریک لاتعاون واپس لینے کے بعد اعلان کیا تھا کہ ان سے ہمالیہ جتنی غلطی ہوئی ہے۔

ان کا ایک عہد تھا جو تقریباً نصف صدی کو محیط رہا، وہ بہت بڑے سیاستدان تھے لیکن اُن کی سیاست کا رنگ روغن عام سیاستدانوں سے مختلف تھا، وہ حکومتوں سے نبرد آزما ہونے کی ایک نئی تکنیک یعنی عدم تشدد کی اساس پر ستیہ گرہ کے بانی تھے۔ وہ بیک وقت مجموعۂ اضداد تھے، کہیں سیاستدان، کہیں مُدبّر، کہیں سپہ سالار، کہیں مفکر، کہیں مصلح، کہیں مہاتما اور کہیں موہن لال کرم چند گاندھی۔

اُن کی زندگی کے بعض پہلو انتہائی دلچسپ اور نہایت دلفریب تھے، ہندو انہیں بالمیک رشی کے بعد سب سے بڑا انسان سمجھتے، تحریکِ خلافت کے بعد مسلمان انہیں اپنا دشمن نمبر ایک سمجھنے لگے لیکن پالٹیکس ایک ایسا کھیل ہے کہ جھوٹ اور سچ میں امتیاز نہیں رہتا، حتیٰ کہ بازارِ اختلاف میں سیاسی ہتھکنڈوں کا انبارہ سچائیوں کا دشمن ہو جاتا ہے تاہم سچائیاں ایک دن اُبھرتی ضرور ہیں۔

گاندھی جی سیاسیات کی بدتمیزی کا شکار ہو گئے ورنہ بعض جزوی اختلافات کے باوجود وہ ہندوستان کی قومی تحریک کا مظہر تھے ـــ ہندوستان کی قومی تحریک پر عملاً ہندو بورژوازی کا قبضہ رہا اور اس بورژوازی ہی کی فسطائی ذہنیت کا ردِعمل مسلمانوں میں ہوا، لیکن اس کی سزا گاندھی جی کو ملی اور وہ آزادی کے پہلے ہی سال شہید ہو گئے۔

—— گاندھی جی کا بہار پہنچنا تھا کہ وزارت کی قلعی کھل گئی، تمام اعیانِ حکومت اپنے گناہوں سے کانپ رہے تھے، گاندھی جی نے پہلے متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا تو اصل حقیقت سے واقف ہو گئے، کابینہ کے ارکان سے کہا:

"تم اس پر فخر نہیں کر سکتے، تم نے ستیہ کو ذبح کیا اور اہنسا کو آگ میں جھونکا ہے، میں تم سے خوش نہیں، مجھے بعض چہرے قاتلوں کے چہرے نظر آ رہے ہیں۔"

لیکن ہندو قوم کو پراپاگنڈہ مشنیری میں جو کمال حاصل تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گاندھی جی تھوڑے ہی دن ٹھیر کر نواکھالی چلے گئے —— اپنا کام اُنھوں نے بادشاہ خان کے سپرد کیا جن کے ساتھ سرخپوش سالاروں کے علاوہ سیّد مخدوم شاہ بنوری، ماسٹر تاج الدین انصاری، اور مس مردولا سارا بائی کام کر رہے تھے، مس مردولا سارابائی احمد آباد کے ایک بڑے مل اونر کی صاحبزادی تھیں، انہوں نے سانحہ بہار سے تقسیم تک تقسیم سے شیخ عبداللہ کے ابتلا تک مسلمانوں کی خدمات انجام دیں، وہ بلاشبہ عظیم عورت تھیں۔ تاریخ نے جگہ دی تو اس باب میں اُن کا چہرہ خوب روشن نظر آئے گا۔

مردولا ایک زمانے میں پنڈت نہرو سے بیاہ کرنے کی متمنی تھیں، ان کے پتا کی اور کوئی اولاد نہ تھی، اس نے پنڈت جی کو بیٹی کی خوشی میں ایک کروڑ روپیہ کی پیشکش کی لیکن پنڈت جی نے جواب دیا "میرے لیے کملا کی یاد ہی کافی ہے۔"

غور طلب پہلو یہ تھا کہ فساد اکثر انہی صوبوں اور ضلعوں میں ہوتے، جہاں گورنر اور ڈپٹی کمشنر انگریز تھے، عبدالرب نشتر نے اُس زمانے ہی میں کہا تھا کہ انگریز ہندوستان کو اس کی آزادی کا مزہ چکھا کے جانا چاہتا ہے اور یہاں سے نکلنے کے لیے اُس کنواری لڑکی کی طرح بے تاب ہے جو اپنی ناجائز دوستی کے نتیجہ کو جلد سے جلد ضائع کر دینے کے درپے ہو۔

اس دوران میں یو پی کے علاقہ گڑھ مکتیشر میں بھی فساد ہو گیا، یہ فساد گو ایک قصبہ میں ہوا تھا لیکن اس درجہ مہلک تھا کہ پورا صوبہ لرز اٹھا، بعض نامور خاندانوں کی لڑکیاں اٹھا کر گوڑگاؤں کے ضلع میں فروخت کی گئیں، یو پی کے چیف سکرٹری مسٹر بنیرجی نے حکومت پنجاب کو لکھا کہ صوبائی حکومت ان لڑکیوں کو برآمد کرنا چاہتی ہے اس غرض سے پولیس کی مدد درکار ہوگی، آپ کب تک ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں؟" خط کانفیڈنشل تھا۔ پنجاب کا چیف سکرٹری نسلاً ہندو اور مذہباً عیسائی تھا، وہ کچھ نہ کر سکا ۔ مسٹر بنیٹ انسپکٹر جنرل پولیس نے اس خط پر لکھ دیا کہ ہمارے پاس اس مقصد کے لیے کوئی سی فورس نہیں، میکڈانلڈ ہوم سکرٹری نے "فضول خط" یہی دو لفظ لکھ کر داخل دفتر کر دیا۔

مسٹر شریف فاروق ان دنوں سکرٹریٹ میں کلرک تھے وہ یہ خط ہوم برانچ سے اڑا لائے۔ ایک دوسرا اعزیز پنجاب میں فساد کی تیاریوں پر ضلعی حکام کا تبصرہ اور جائزہ اٹھا لایا، ان مراسلوں پر گورنر، انسپکٹر جنرل پولیس، ہوم سکرٹری وغیرہ کے عجیب وغریب نوٹس تھے، میں یہ دونوں کاغذات لے کر دہلی پہنچا، وہاں مولانا آزاد کو دیئے۔ انہوں نے کہا، صبح آکر واپس لے جانا، اگلے دن حاضر ہوا تو فرمایا یہ کاغذ جہاں سے لیے ہیں وہیں رکھوا دو، اور نتیجہ کا انتظار کرو، جواہر لال نہرو نے گورنر جنرل سے کہا کہ فسادات کی اصل بنا انگریز آفیسر ہیں، وہ جانے سے پہلے یہ تماشا دکھانا چاہتے اور اس طرح کی خرابیاں پیدا کر رہے ہیں، مولانا نے ملک خضر حیات کو دہلی بلوایا، خضر ابھی دہلی میں تھا کہ بنیٹ اور میکڈانلڈ نے ہاتھ دکھایا، ایکا ایکی مسلم لیگ نیشنل گارڈ پر پابندی لگ گئی۔ اور وہ تمام آہنی ٹوپیاں صوبائی دفتر سے قبضہ میں کر لیں جو ملٹری سے ردی ہونے پر خرید کی گئی تھیں۔

بنیٹ اور میکڈانلڈ کا یہ عاجلانہ اقدام دراصل بالائی احتساب کا خود سرانہ جواب تھا، اس کے پس منظر میں واضح اور مخفی شرارت تھی، بنیٹ ایک بدمعاش آفیسر تھا، اس کا

چال چلن بعض سکھ خاندانوں کے ساتھ انتہائی مشکوک تھا، میکڈانلڈ گورہ تھا اور مضطرب تھا کہ پنجاب ابھی تک خاموش کیوں ہے ؟ ان دونوں نے ملی بھگت کر کے مسلم لیگ کو چھیڑا، میاں افتخارالدین کانگرس سے نکل کے آئے تھے، انہیں موقع ہاتھ آگیا، آؤ دیکھا نہ تاؤ، لیگ کے تن آسان لیڈروں کو پیچھے پھینکا، سول نافرمانی کا ڈول ڈالا، آناً فاناً تحریک کا آغاز ہوگیا، وہ لوگ جو اب تک محلوں میں تھے اور اس قسم کے ہنگامے کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے بلکہ ان کے لیے حرم سراؤں کے تصور سے مختلف کوئی تصور ہی نہ تھا، منچلے افتخار کی بدولت جیل خانہ چلے گئے، صوبہ بھر میں رونق پیدا ہوگئی، خضر حیات بھاگم بھاگ لاہور پہنچا، افسروں سے اُس کی بدمزگی ہوگئی، آٹھ دن کی تحریک کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ خضر نے نیشنل گارڈ سے پابندی ہٹا لی اور ان تمام گرفتار شدگان کو جن میں ملک فیروز خان نون بالقابہ بھی شامل تھے رہا کر دیا، لیکن یہ ایک متوقع طوفان کا پیش خیمہ تھا۔
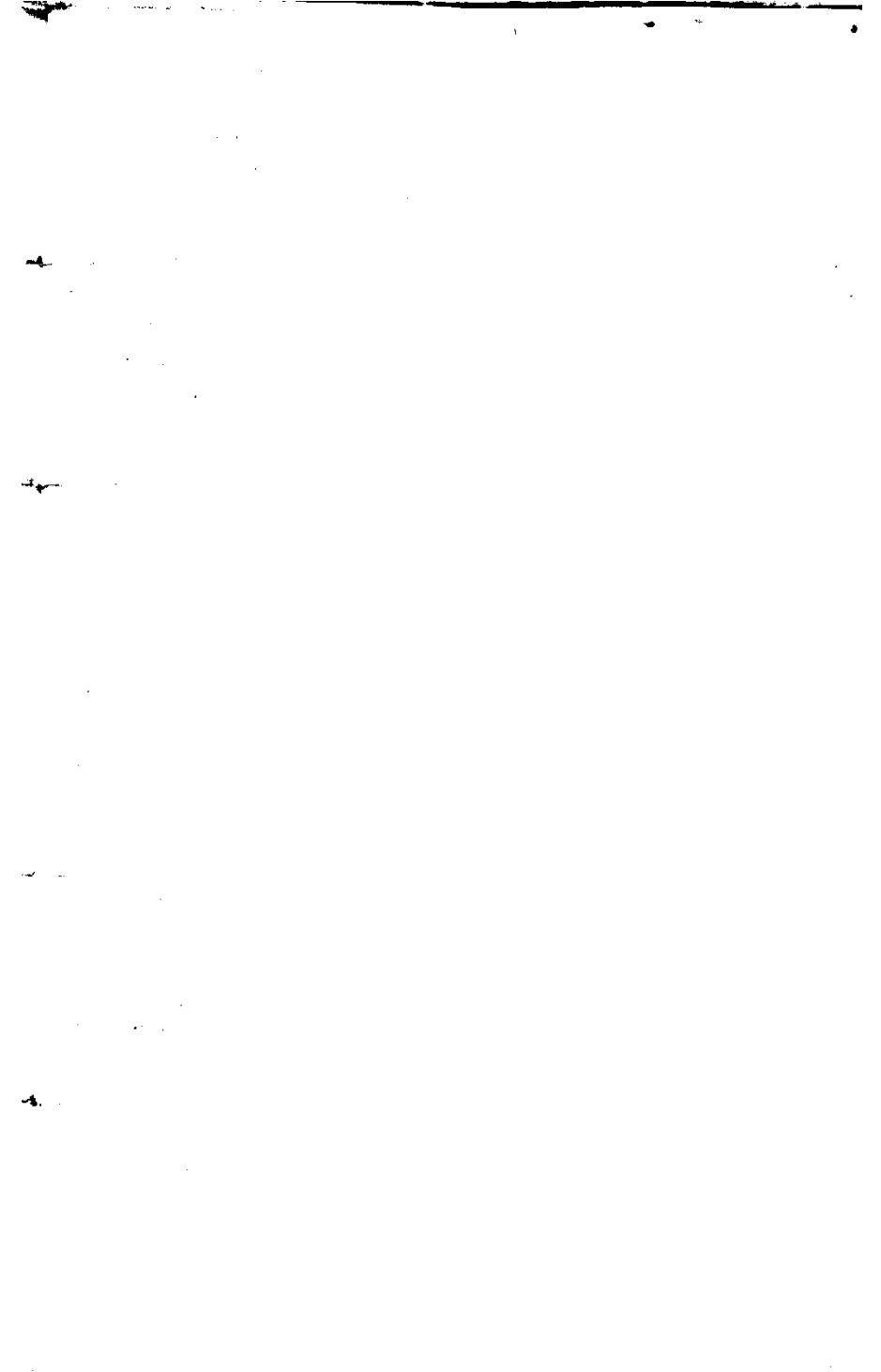
مُسلم لیگ کی سِول نافرمانی

میاں افتخار الدین کانگرس کے تربیت یافتہ تھے، خضر وزارت کی پسپائی سے اور دلیر ہو گئے، انہوں نے اس ہشت روزہ تحریک کے بعد سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ کا مطالبہ کر دیا، حتیٰ کہ "خضر وزارت توڑ دو" کا نعرہ بلند کیا، سارے صوبہ میں ہلچل مچ گئی لاہور دیوانہ ہو گیا، اس زناٹے کی تقریریں ہونے لگیں کہ حکومت کا وقار جاتا رہا، ایک رات حکومت نے لیگ کے تمام بڑے بڑے لیڈروں کو پکڑ لیا، صوبہ میں ایک طوفان آگیا، سول نافرمانی شروع ہو گئی، لوگ پہلے ہی قربانی و ایثار کے مظاہروں کی تلاش میں تھے اور لیگ اُن سے نا آشنا تھی، اس اقدام نے احتجاج کا بازار گرما دیا۔

اس تحریک میں لیگی رؤسا کے حوصلے کچھ زیادہ بلند نہ تھے (الاماشاءاللہ) لیکن عوام نے جان کی بازی لگا دی، باوجودیکہ تحریک بالواسطہ کانگرس کے ردِعمل کا نتیجہ تھی، لیکن مسلمانوں نے کمال ضبط اور بڑے تحمل کا ثبوت دیا، سی آئی ڈی نے چاہا کہ تحریک کو ہندو مسلم فساد میں بدل دے، بیڈن روڈ پر ایک نوجوان عبدالمالک کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا، لیکن کسی شخص نے زبان سے ایسا کلمہ تک نہ نکالا، جو ہندوؤں کے لیے دل آزاری کا باعث ہو، تمام جوش و خروش کا نشانہ ملک خضر حیات تھے، لعنت کی ہر گالی ان پر صرف کی گئی، ہر سیاسی تحریک میں منچلے نوجوان اسی نقطۂ اشتعال پر چلے جاتے ہیں، غرض پسماندہ سے پسماندہ ضلع میں ایک آگ سی لگ گئی، معلوم ہوتا تھا،

جیسے کوئی برقی رَو دوڑ گئی ہو، گرفتاریاں ہوتی تھیں لیکن وزارت میں مزاحمت کا حوصلہ نہ تھا، راتوں رات عزّت مآب حرّیت مآب بن گئے۔ سروں، نوابوں، خان بہادروں اور خطاب یافتوں کا ایک بڑا گروہ جیل چلا گیا، مسلمان لڑکیوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، سکرٹریٹ پر جھنڈا لہرایا، عوام میں فی الحقیقت انقلاب آگیا۔

جینکنز، میکڈانلڈ اور رنبیٹ چاہتے تھے، تحریک کو حکومت کے روایتی تشدّد سے دبا دیں لیکن خضر حیات کسی طرح راضی نہ ہوتے، کانگرسی وزیر خضر کے سامنے ویسے ہی دم نہیں مارتے تھے، انگریز آفیسر چون وچرا کرکے چپ ہو جاتے، اصرار کرتے تو خضر استعفا کی دھمکی دیتے، معاملہ اٹکا ہوا تھا، کہیں کہیں تشدّد کیا گیا، لاٹھی چارج ہوا، آنسو گیس چھوڑی گئی، انبالہ میں گریوال نے گولی چلادی، لیکن اس تحریک کا وہ رنگ نہ بنا جو عام سیاسی تحریکوں کا شعار رہا یا جن مصائب وشدائد سے انہیں گزرنا پڑا اس تحریک کے خاص خاص پہلو یہ تھے۔

(۱) تحریک مرکز کی ہدایت کے بغیر اتفاقیہ شروع ہو گئی اور میاں افتخار الدین کے نعرہ مستانہ کا نتیجہ تھی۔

(۲) اس تحریک کا تمام تر محاذ ملک خضر حیات اور ان کی وزارت کے خلاف تھا اور انہی سے استعفیٰ مانگا جا رہا تھا۔

(۳) ہندوؤں کے خلاف کوئی ایسا کلمہ نہ کہا گیا جو ان کی دل آزاری یا ان کے خلاف قہر وغضب کا باعث ہو، انگریزوں کے خلاف بھی کوئی خاص نعرہ نہ لگایا گیا، شرارت کی اصل جڑ جینکنز تھا لیکن لیگ کے صوبائی لیڈر اُس وقت اِس پر کسی حد تک اعتماد کرنے لگے تھے۔

(۴) حکومت کے مسلمان آفیسر (بعض کالی بھیڑوں سے قطع نظر) تحریک کی معاونت کر رہے تھے، اُسی طرح جس طرح ہندو آفیسر کانگرس کی مدد کرتے تھے۔

(۵) تحریک میں تشدّد کا ادنیٰ سا مظاہرہ بھی نہ کیا گیا، حالانکہ امرتسر اور لاہور کے منچلے نوجوان آزاد ہند فوج کے ہنگاموں سے متاثر تھے اور وہ اس قسم کے برگ و بار پیدا کرنا چاہتے تھے۔

(۶) میاں افتخار الدین نے بعض نوابوں اور سروں کی بزدلی کے باوجود تحریک کو واقعی عوامی تحریک بنا دیا تھا۔

سچی بات کہنا ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن تاریخ کے لیے سچی بات کہنا ضروری ہے، خضر حیات نے افسروں اور وزیروں کے زور دینے پر بھی تحریک کو کچلا نہیں، اور یہ ان کے لیے ممکن بھی نہ تھا، اس نے ایک دوست سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

"یہ لوگ میرے ہاتھوں میری قوم کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں، میں اپنی قوم کا دشمن نہیں، جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے مجھے منظور ہے لیکن ہندو اخبار جو چاہتے ہیں وہ کبھی نہ ہو گا۔ وہ مجھ سے ہمدردی نہیں کر رہے ہمدردی کر رہے ہیں۔ مسلمان میرے نام کے دشمن ہو گئے ہیں، انہیں حق حاصل ہے جتنی گالیاں بھی دینی چاہیں دے لیں، میں خوش ہوں لیکن میں ان کا زور کبھی ٹوٹنے نہ دوں گا، بینیٹ کہتا ہے فلاں فلاں معافی مانگنے کے لیے تیار ہے، ایسا کبھی نہ ہو گا، میں اس سے پہلے مستعفی ہو جاؤں گا ——"

غرض خضر حیات پنجاب کی سیاست میں تن تنہا تھا کہ سب اُس کی جان کے دشمن تھے، وہ ایک ہوشربا المیہ ہو گیا تھا، اُس نے آنکھیں کھولی تھیں، تو وہ ایک آقائے ولی نعمت تھا۔ وہ اپنے باپ جنرل سر عمر حیات کا اکلوتا بیٹا تھا، اُس کا باپ انگریزی کا پشتینی وفادار اور ملکہ وکٹوریہ کا فرزند دلبند تھا۔ اسی عمر حیات نے سکندر حیات کو وزیر اعظم بنانے پر گورنر سے کہا تھا آپ لوگ ہم پر لونڈیوں کے بچے مسلط کر رہے ہیں،

خضر نے کچھ ایسے ہی ٹھاٹھ دیکھے تھے وہ ایک جاہ و جلال میں جوان ہوا، دوسرا جاہ و جلال اس کے ہمرکاب تھا، اس کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ عوام کیا ہوتے ہیں، اور وزارت کس بلائے بے درماں کا نام ہے، اس نے ساتھی وزراء سے مشورہ کیے بغیر والدہ کی تحریک پر استعفاء لکھا، اور لے کر سیدھا گورنر کے پاس چلا گیا، گورنر نے بہتیرا چاہا کہ استعفاء نہ دے لیکن راضی نہ ہوا، وہ استعفاء دے کر گھر آ گیا، ساتھی وزراء کو بلا کے انہیں مطلع کیا وہ ششدر رہ گئے، پھر خان ممدوٹ کو بلوایا اور ان سے کہا :

"نواب صاحب، لیجیے مَیں نے وزارت سے استعفاء دے دیا ہے
آپ شوق سے وزارت بنائیے، مَیں اور میرے رفقاء ہر حالت میں آپ سے
پُورا پُورا تعاون کریں گے، لیکن میرا خیال ہے آپ وزارت نہ بنا سکیں گے
سکھوں اور ہندوؤں کے متعلق آپ کے اندازے اور مطالعے غلط ہیں۔"

۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو خضر نے استعفاء دے دیا، ۱۷۵ کی اسمبلی میں خضر حیات کے رفقاء سمیت کل ۸۶ مسلمان تھے، لیگ کو دو نامسلمان ممبر ملنا مشکل ہو گیا، استعفاء کی خبر ریڈیو نے ملک بھر میں گونجا دی، نواب ممدوٹ کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے، لیگ کے لیڈروں نے شہر کا چکر لگایا، لوگوں نے گولے چھوڑے، آتشبازی چلائی، مسلمان اخباروں نے خبر دی کہ آج شام تک لیگ کی وزارت بن جائے گی، لاہور جو کل تک خضر حیات پر تبرّا تول رہا تھا آج اس نعرہ سے گونج اُٹھا تھا ــــــــ

"تازہ خبر آئی ہے !

خضر ہمارا بھائی ہے"

صوبہ جو دو روز پہلے مغلظات کی جھاڑ بنا ہوا تھا اب ستائش و تبریک کا گلکدہ تھا، یہ ذکر کرنا مَیں بھول گیا کہ لیگ کے رہنما خضر حیات کے مستعفی ہونے سے دو ایک

روز پہلے رہا کر دیئے گئے اور جانے کیوں اس غلط فہمی میں تھے کہ وہ سکھوں سے سمجھوتہ کر کے وزارت بنالیں گے، انہوں نے بے شمار جتن کیے: قائد اعظم نے ماسٹر تارا سنگھ کو پیش کش کی کہ وہ ان سے ملاقات کریں اور بتائیں کہ ان کے مطالبات کیا ہیں؛ لیکن سب اپیلیں اور دلیلیں اکارت گئیں۔

خضر حیات نے پبلک بیان میں کہا:

"مجھے اندیشہ ہے کہ پنجاب کا روایتی اطمینان جو اسے صدیوں سے حاصل ہے ہمیشہ کے لیے غارت ہو جائے گا، اب یہاں کے لوگوں پر شاذ ہی چین کی رات یا چین کا دن آئے گا، لیگ کے لیے وزارت سازی کا دروازہ ضرور کھلا ہے لیکن وزارت بنانا اس کے بس میں نہیں"

چنانچہ سب سے پہلے جن اشخاص نے اسمبلی چیمبر کے باہر کرپان لہرائی وہ سکھ رہنما تھے انہوں نے اعلان کیا کہ مسلم لیگ ہماری لاشوں سے گزر کر اپنی وزارت بنا سکے گی، ہندو اخباروں کے ایڈیٹروں نے ایک دستخطی بیان جاری کیا کہ گورنر جینکنز لیگ کی وزارت نہ بنائیں، اگر وزارت بنی تو ہندو اخبار اس کا بائیکاٹ کریں گے، اسی دن کانگرس نے کپور تھلہ ہاؤس میں جلسہ کیا، سردار پرتاپ سنگھ کیروں (آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ممبر) جلسہ کے صدر تھے۔ جن مقرروں نے تقریریں کیں انہوں نے طوفان برپا کر دیا، معلوم ہوتا تھا کانگرس کا جلسہ نہیں جن سنگھ کا جلسہ ہے، بنیادی نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ ہم پنجاب میں اسلام کا راج برداشت نہیں کریں گے، اگر اسلام راج قائم کیا گیا تو صوبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، ملاپ کے مہاشہ یشپال نے مسلمانوں کو ننگی گالیاں دیں، معلوم ہو رہا تھا، گویا ابھی غدر مچا چاہتا ہے۔

گیانی کرتار سنگھ نے اسمبلی چیمبر سے ایک جلوس نکالا، اس جلوس نے شہر میں گھوم پھر کر

پاکستان مُردہ باد کے نعرے لگاتے، حتیٰ کہ ہندو نوجوانوں نے مسلمان راہگیروں پر پتھر پھینکے، ظاہر ہے کہ فساد ہر وقت ہو سکتا تھا لیکن لیگ کے لیڈر اس خیال سے کہ ایک آدھ ثانیہ میں وزارت بننے والی ہے، مسلمان عوام کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔

تیسرے روز جینکنز نے ٹکا سا جواب دے دیا، اُسی روز شاہ عالمی دروازہ میں ایک مسلمان راہگیر قتل ہو گیا، افواہ پھیل گئی کہ مسلمان خواتین کو بے عزت کیا جا رہا ہے، آناً فاناً آگ سُلگ اُٹھی، شہر میں ہر طرف اِکا دُکا حملے شروع ہو گئے۔ حکّام نے دفعہ ۱۴۴ اور کرفیو لگا دیا، لیکن یہ سب پیش بندیاں آگ پر تیل کا چھڑکاؤ تھیں۔

بعض سچے نیشنلسٹ ہندو دوستوں سے قبل از وقت پتا چل گیا کہ ہندوؤں اور سکھّوں کے عزائم کیا ہیں؟ مسلمانوں کے پاس زبان تھی یا ایمان لیکن ساز تھا نہ سامان۔ بہر حال طرفین کے سورما ایک ہی دن میں کمر بستہ ہو گئے۔

فساد شروع ہو چکا تھا، جھڑپیں ہو رہی تھیں، صرف جنگل کی آگ بن کر پھیلنے کا مرحلہ باقی تھا اور وہ مرحلہ آ گیا۔

پنجاب کا فساد

پنجاب کا فساد بہار کے فوراً بعد پک چکا اور فصل کٹنے ہی والی تھی، اس کی ابتداء سکھوں اور ہندوؤں نے کی، انہیں زعم تھا کہ وہ مسلح ہیں اور اس سے عہدہ برا ہونے کی تربیت حاصل کر چکے ہیں ——— ۲ مارچ کو خضر نے استعفا دیا، ۵ مارچ کے شمارے میں "ہندوستان ٹائمز" دہلی نے لکھا:

"سکھ مسلمانوں سے زیادہ ہتھیار بند اور ان سے زیادہ منظم ہیں، ایک افسر کا بیان ہے کہ جو تحریک مسلم لیگ نے شروع کی، اگر سکھ شروع کرتے تو حکومت کے لیے چار گونہ زائد تکلیف دہ ہوتے، جب سے سکھوں نے سول وار کا خطرہ محسوس کیا اس وقت سے وہ مسلم مذہبی دیوانگی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں، انہوں نے مہاراجہ پٹیالہ کی قیادت میں سکھ ریاستوں کی ایک فیڈریشن بنانے کا فیصلہ کیا جس کا ہر جگہ خیر مقدم کیا گیا جو سکھ راجے مہاراجے پنتھ سے زیادہ قریب نہ تھے پنتھ کے پجاری ہو گئے، مہاراجہ کپورتھلہ کے دس سالہ لڑکے نے ایک شاندار تقریب میں امرت پیا، یہ سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ پنجاب کے مختلف فرقوں میں قوت کی آزمائش ہوئی تو سکھوں کا پلڑا بھاری رہے گا، سکھوں کو بڑی امداد راشٹریہ سیوک سنگھ سے بھی ملے گی، کیونکہ وہ ہندوؤں کے

حقوق کی حفاظت کے لیے پُوری تیاری میں مصروف ہیں "

(ماخوذ شاہراہِ پاکستان از چودھری خلیق الزمان صفحہ ۱۰۳۶)

امرتسر میں سکھوں کا دربار ان کا تیرتھ تھا، جتنے سکھ یہاں رہتے اور کہیں نہ تھے، گرد و پیش سکھوں کے قصبے اور ضلع تھے، انہیں زعم تھا کہ وہ مسلمانوں پر چڑھ دوڑینگے لیکن انہیں جلد معلوم ہو گیا کہ وہ ادھورے خواب دیکھ رہے تھے، مسلمان نہتا ہونے کے باوجود ان سے کہیں زیادہ طاقتور نکلے، سکھوں کو اپنے دست و بازو، جتھہ بندی، اسلحہ پر بڑا ناز تھا، ہندو سمجھتے تھے وہ دولت و رسوخ اور فہم و فراست میں مسلمانوں سے بہت آگے ہیں، مگر پہلے ہی معرکہ میں (۱۴ اگست ۴۷ ۱۹ء تک) وہ ہار گئے، ہندوؤں میں تو سامنے آکر لڑنے کا حوصلہ ہی نہ تھا، سکھوں نے بھی پیٹھ دکھائی اور اس بُری طرح پٹے کہ گورنر جینکنز نے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ "سکھ ٹوٹا ہوا کانا ہیں"۔

امرتسر میں اکالیوں نے ایک دیوان منعقد کیا، مقرروں نے بڑی بے باکی سے فساد انگیز تقریریں کیں، شہر میں منادی کی گئی، جس میں مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی گئی۔

ایک مسلمان نوجوان نے سکھ منادسے کرپان چھین کر اس کو وہیں ڈھیر کر دیا،

گلوالی دروازہ کے باہر گوجر پورہ کے علاقہ میں جتھیدار ادھم سنگھ ناگوکے نے ایک بڑا جتھہ لے کر اُدھم مچایا، ان کے مقابلہ میں مسلمان بالکل نہتے تھے، انہوں نے فوری تدبیر سے کام لے کر غلیل بنا لیے، اور دروازہ سے باہر ایک ٹیلہ پر چڑھ گئے، گھمسان کا رن پڑا اور صرف غلیلوں سے ناگوکے کی فوج پسپا ہو گئی، یہی دن تھا جب راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کے سورماؤں نے رات کے وقت آگ لگانے کا آغاز کیا، جہیل سنگھ کے کٹڑے میں مسلمانوں کی بڑی بڑی دوکانیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جلا ڈالیں، شیخ حسام الدین کا کشمیر ہاؤس (کپڑے کی دوکان) بھی خاکستر ہو گیا، جہیل سنگھ کے کٹڑے کی معاشی تباہی کے بعد دوسرا اندوہناک حادثہ پراگداس کے چوک میں مسلمانوں کی

بربادی کا تھا، یہ علاقہ نیشنلسٹ یا احراری مسلمانوں کا تھا، یہاں مسلمانوں کو سکھوں اور ہندوؤں نے جس طرح ذبح کیا فی الجملہ وحشت کی انتہا تھی، اس حادثہ نے ثابت کر دیا کہ ہندو اور مسلمان واقعی دو قومیں ہیں، مسلمان نوجوانوں کو جھٹکا دیا، بڑھوں کو ذبح کیا، بچوں کا مُثلہ کر ڈالا، کئی سورماؤں نے ایک نوجوان خاتون سے مُنہ کالا کیا، اس کی حیا سوُرج کر غبارہ ہو گئی، کئی گھروں کو آگ لگا دی گئی، چوک کی مسجد کو ڈھایا اور جلایا گیا، دس بارہ سال کے ایک بچّہ نے اپنے کنبہ کے افراد کو قتل ہوتے دیکھا تو نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے، سوُرماؤں نے اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں سے کاٹ دیئے، وہ اس پر بھی اللہ اکبر پکارتا رہا، حتیٰ کہ ہسپتال میں بھی اُس کا یہی شعار رہا، لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے دیکھا تو کانپ اُٹھی:

"تم کیا چاہتے ہو بچے؟"

"دو ہاتھ۔"

لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے مصنوعی ہاتھ بھجوانے کا وعدہ کیا، لیکن بعد میں بھُول گئیں، وہ بچہ اب پاکستان میں جوان ہو چکا اور غازی کہلاتا ہے، اسے کوئی صلہ نہیں ملا! شروع میں دہلی دروازہ کے باہر ریڑھی لگا کر ہر مال چھ پیسے میں بیچتا تھا، اتفاق سے وہ لڑکا اور بعض دوسرے مجروحین احرار ہی کے ہمدرد تھے۔

مَیں دہلی دروازہ کے چوک میں غازی کے پاس کھڑا خیریت پوچھ رہا تھا، ایک سپاہی نے موٹی سی گالی لڑھکائی، "او بے ٹنڈے آگے بڑھا ریڑھی" —— غازی نے اس کے بعد ریڑھی بند کر دی، وہ ٹنڈا تھا ہی، غنڈا بھی ہو گیا، وہ کہتا تھا مجھے پاکستان نے ان دو کٹے ہوئے ہاتھوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔

نچلے یا درمیانے درجہ کے لیگی کارکن ہمیشہ تنگ نظر اور تنگ دل رہے ہیں ان کا ذہن آج تک صاف نہیں ہو سکا انہیں اپنے متعلق گمان ہے کہ لیگ کوئی

شاہی خاندان تھا اور یہ اس کے شہزادے ہیں، ان کے لیے جیل خانہ کی ہفت روزہ پکنک بھی قربانی اور استقامت کا عظیم مظاہرہ تھا، جس نوجوان نے بھی اس زمانہ میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا وہ اپنے آپ کو خالد بن ولید سے کم نہیں سمجھتا تھا، حتیٰ کہ وہ نوجوان بھی جو ان دنوں ابھی پیدا ہوئے تھے، اپنے آپ کو عبداللہ ابن زبیر سمجھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ لیگ کے نوجوان کسی سیاسی تربیت سے بہرہ مند نہیں ہوئے، انہوں نے خالی خولی نعروں سے سیاسی زندگی کا آغاز کیا اور انہی نعروں پر ان کی زندگی ختم ہوگئی، لیگ نے پاکستان ضرور حاصل کیا لیکن قائد اعظم کے الفاظ میں وہ صرف ان کی جدوجہد اور ایک ٹائپ رائٹر کی مدد سے حاصل کیا گیا، ان مصنوعی ساونتوں کی جدوجہد کا طول وعرض زندہ باد یا مُردہ باد کے نعروں تک محدود تھا۔

امرتسر محض پراگداس کے چوک کا نام نہیں تھا اور نہ کٹڑہ جیمل سنگھ ہی اس کا طول وعرض تھا، امرتسر نام تھا جلیانوالہ باغ کا، گلوالی دروازے کا، جہاں اُردو زبان کا سب سے بڑا خطیب عطاء اللہ شاہ رہتا تھا، لیکن اس وقت جلیانوالہ باغ دوبارہ شہید ہو چکا تھا، عطاء اللہ شاہ کی خطابت عالمِ نزع میں تھی، لوگ پاگل ہو گئے تھے اور انسان ان دنوں مر چکا تھا، ہندو زندہ تھے، مسلمان زندہ تھے، سکھ زندہ تھے اور تینوں ایک دوسرے کی طرف اس طرح لپک رہے تھے کہ تینوں شیر ہیں اور تینوں اپنے شکاری کو کھا جانے کی فکر میں ہیں۔

خواجہ جمال الدین بٹ مقامی احرار کے سرگرم کارکن تھے، وہاں امرتسر میں ان کی ٹرانسپورٹ تھی، انہوں نے چوک پراگداس کے بقیۃ السیف کو نکالا، وہاں کی مسجد کو آباد کیا اور اگلے روز خون کے اس فرش پر کھڑے ہو کر اذان دی۔ حی علیٰ الفلاح، حی علیٰ الصلوٰۃ، اللہ اکبر، اللہ اکبر

یہ غلط ہے کہ انسان عظیم ہے، عظیم صرف اللہ کی ذات ہے، انسان عظیم ہوتا

تو وہ نہ کرتا جو اس نے پراگداس میں کیا، یا نوا کھالی سے لے کر بہار میں کر چکا تھا، پراگداس کے بندہ بیراگیوں میں ایک سکھ گورونانک کا پیرو بھی تھا، اس نے تین مسلمان لڑکیوں کو جو اس کی بیٹی کے ساتھ پڑھتی تھیں اپنے مکان میں چھپا لیا، سورما ان کی تلاش میں تھے، ڈھونڈھتے ڈھانڈھتے اس کے مکان پر آگئے —— نکالو لڑکیاں۔

"میرے پاس کوئی لڑکی نہیں!"

"ہم تلاشی لیں گے۔"

"تلاشی نہیں دی جائے گی۔"

سورماؤں کا غصہ تیز ہوگیا، اس نے کہا

"لڑکیاں میرے پاس ہیں، تمہارے حوالے نہیں کرونگا، صرف میری جان سے کھیل کر ہی لے جا سکتے ہو، پہلے میری لڑکی اٹھاؤ، پھر یہ لڑکیاں لے جانا۔"

وہ ٹکا سا جواب پاکر مغلظات بکتے ہوئے چلے گئے، اگلی صبح لڑکیوں کو ان کے مسلمان ورثاء کے ہاں پہنچا دیا گیا، ایک ثقہ روایت کے مطابق ان سردار صاحب کو اکالیوں نے اسی جرم میں قتل کر دیا۔ امرتسر میں حملہ آور سکھ تھے، اُن کی مزاحمت احرار رضاکاروں نے ضرور کی، کسی کو قتل نہ کیا نہ مال لوٹا جس نے قتل کرنا چاہا اس کو ڈھیر کر دیا۔ "ڈان" نے پراگداس کے سانحہ پر تبصرہ کرتے ہوئے طنزاً لکھا: "اس علاقے کے باشندے تقریباً احراری تھے، پنجاب کے دو بڑے لیڈر کچھ دنوں بعد "سیاحت" کے لیے پراگداس گئے تو انہوں نے بھی یہی فقرہ کسا، حالانکہ اُس وقت لاہور، امرتسر، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، جالندھر، اور لدھیانہ میں مدافعت کے فرائض بڑی حد تک احرار رضاکار ہی سرانجام دے رہے تھے۔

امرتسر کی غارت زدگی کے باوجود لاہور ابھی تک پُرسکون تھا، ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ امرتسر کے منچلوں نے لاہور والوں کو چوڑیاں بھیجی ہیں، یہ گویا تعریض تھی کہ

مرگئے یا عورتیں ہوگئے ہو؟ یہ پہلا چھینٹا تھا جس سے جل تھل ہوگیا، ادھر راولپنڈی میں فساد کا تنور دہکنے لگا، ماسٹر تارا سنگھ کہوٹہ کے رہنے والے تھے، ان کے مکان کو آگ لگا دی گئی، ان کی بوڑھی ماں کی ٹانگیں چیر کر ہلاک کر دیا گیا، شہر میں ہندوؤں کے محلے اس بیدردی سے لوٹے گئے گویا غازیوں کا لشکر کافروں کی بستی پر ٹوٹ پڑا ہو بالکل بہیمانہ طرز عمل تھا، ہندو اس طرح پٹ رہے تھے جس طرح نردیں پٹتی ہیں، اور سکھ اس طرح مر رہے تھے جس طرح موت چنگے بھلے آدمی کو چٹ کر جاتی ہے۔

آخر لاہور کا فساد بھڑک اٹھا، اور جنگل کی آگ بن گیا، برانڈرتھ روڈ پر رام گلی ہندوؤں کا منظم و متمول محلہ تھا، یہاں کے غنڈوں نے دو راہگیر مسلمانوں کو گولی سے مار ڈالا، سرکلر روڈ پر ایک مسلمان نوجوان کی آنتیں نکال دیں، راج گڑھ کے علاقے میں سنگھٹیوں نے رات کو حملہ کر کے مسلمانوں کو زندہ جلا ڈالا، وہ سو رہے تھے اُن پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی، غرض ایک طوفان بھڑک اٹھا، ایک الاؤ روشن ہوگیا، ایک جنگ چھڑ گئی، پھر کیا تھا، لاہور کے بیشتر حصے برلن کے بازار ہو گئے، مسلمانوں نے بھی لنگر لنگوٹ باندھ لیے، قانون کی موجودگی میں پولیس کے علی الرغم انسانوں کے اکا دکا قتل شروع ہو گئے، کوئی علاقہ نہ تھا جہاں اکثریت کے لوگ اقلیت کے لوگوں کو کھا جانے کی تگ و دو میں مشغول نہ ہوں، وقت کا یہ سب سے بڑا جہاد تھا جس کی کمان غنڈوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی، مسلمانوں کے لیے ہندوؤں کی بیٹیاں مالِ غنیمت ہو گئی تھیں، اور ہندوؤں کے لیے مسلمانوں کا خون خون نہیں رہا پانی ہو گیا تھا، ضلعی حکام بالکل الگ تھلگ بیٹھے تھے انہیں کہنا یا نہ کہنا برابر تھا۔

راولپنڈی کے واقعات نے سارے پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کو بدحواس کر دیا، سردار سورن سنگھ جو کچھ راولپنڈی میں دیکھ آئے تھے اس سے ان کے حواس ہی بجا نہ تھے، خوف اور غصہ ان کے لہو میں رچ بس گیا تھا، نیشنل گارڈ کے رضاکار

بہار سے اپنے ساتھ بچوں کی ہڈیاں اور عورتوں کے بال لائے تھے، ان چیزوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا، وحشی لوگ اور وحشی ہو گئے، اُمراء ہر حال میں بچ جاتے، کوئی تاوان ٹاوان مارا جاتا ہے البتہ ان کے گناہوں کا کفارہ غرباء ادا کرتے ہیں، چنانچہ آس پاس کے دیہات جلا دیئے گئے، لوگوں کو تھوک کے حساب سے قتل کیا گیا، اکثر موت سے گھبرا کر مسلمان ہو گئے، عورتیں اغوا کر لی گئیں، سکھوں کی ڈاڑھیاں مونڈھ دی گئیں، لیکن یہ بہار کے خوفناک حادثہ کا عشر عشیر بھی نہ تھا، تاہم جو کچھ ہوا وحشیانہ تھا، بہیمانہ تھا، اور اس کا تعلق اسلام سے بالکل نہ تھا، ان لوگوں سے تھا جو اسلام کے نام پر قاتل ہو گئے تھے جنہیں انسان کے خون کا چسکا پڑ گیا تھا جن کے نزدیک فساد، جہاد ہو گیا تھا اور جو اپنے اس کیے دھرے پر فخر کر رہے تھے کہ انہوں نے اسلام یا پاکستان کی خدمت کی ہے ——

یہ مسلمانوں کا فعل نہیں تھا یہ ڈاکوؤں کا فعل تھا، ان لوگوں کی روسیاہی تھی جن کے دل سیاہ ہو چکے تھے، جنہیں سیاست کے ناخداؤں نے گمراہ کر دیا تھا، جو شرفاء کے ہاتھوں سے نکل کر غنڈوں کے طائفے میں شامل ہو گئے تھے۔

راولپنڈی کے اس حادثہ فاجعہ کی تصویریں "راولپنڈی کی عصمت دری" (RAPE OF RAWALPINDI) کے نام سے صوبائی کانگرس کی ایک کمیٹی نے چھاپی، یہ کتابچہ تمام ملک میں تقسیم کیا گیا، کانگرس کے ہائی کمانڈ کو ملا تو جواہر لال بھاگم بھاگ لاہور آئے، دیوان رام لال کے ہاں ٹھہرے، میں نے اپنے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر اسلم چشتی کو بھیج کر اُن سے وقت لیا تاکہ ان کے سامنے تصویر کا ایک ہی رُخ نہ رہے، وہاں پہنچا تو پنڈت جی اس وقت ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور سردار سورن سنگھ سے ملاقات کر رہے تھے، ان دونوں نے اس طرح محسوس کیا گویا ہم اچانک آ گھسے اور وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں، اتنے میں میاں افتخار الدین بھی آ گئے، میاں صاحب مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے لیکن وہاں سر پر وہی گاندھی ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ اور کھدر کی اچکن پہن کے آئے تھے

پنڈت جی باہر نکلے تو میاں صاحب نے ہاتھ ملانا چاہا، لیکن پنڈت جی نے گریز کیا اور ہمیں ساتھ لے کر کمرہ میں چلے گئے۔

مَیں نے پنڈت جی سے پیش آمدہ واقعات بیان کیے، کہا کہ جو لوگ آپ سے دکھڑا بیان کر رہے ہیں پنجاب کے اصل قاتل وہی ہیں، خضر وزارت کے مستعفی ہونے پر انہوں نے جلسہ کیا، جلوس نکالا، کرپانیں لہرائیں اور اشتعال انگیزی کی، آپ ان کے ساتھ شوق سے راولپنڈی جائیں، قتل نواکھالی میں ہو یا بہار میں، فساد امرتسر میں ہو یا راولپنڈی میں، بہرحال قابلِ نفرین و لائقِ مذمت ہے، لیکن اس کے ذمہ دار فرقہ پرستوں کی بہ نسبت وہ قوم پرست ہیں جنہوں نے دوغلہ پن کیا، اور ملک بھر میں آگ لگا دی، نتائج کتنے ہی بھیانک سہی لیکن اسباب ان سے بھی بھیانک ہیں، مَیں نے پنڈت جی کو کانگرسی لیڈروں کے بیانات، تقریروں کے متن ہندو اخباروں کے تراشے اور راولپنڈی کی "عصمت دری" نام کا خوفناک کتابچہ پیش کیا، پنڈت جی نے کہا مَیں ان حالات سے بڑی حد تک واقف ہوں، یہاں کوئی کانگرسی یا کوئی نیشنلسٹ نہیں، جو کچھ پیش آیا وہ متوقع تھا اور جو پیش آ رہا ہے وہ متوقع ہے ____ پنڈت جی نے کہا فکر نہ کریں جو کچھ دیکھنے ملا، وہ نتائج ہی نہیں اسباب بھی ہیں، میری اپنی آنکھیں بھی ہیں، دوسروں کی آنکھ سے دیکھنا میری عادت نہیں۔ بیچ میں دیوان چمن لال آ گئے اور کہنے لگے "میاں افتخار الدین پانچ منٹ مانگتے ہیں۔"

پنڈت جی نے کہا "کیا خیال ہے تمہارا؟"

"ملاقات میں تو ہرج نہیں، لیکن اوّل درجے کا جھوٹا ہے، یہاں کچھ کہے گا، باہر کچھ اور۔"

پنڈت جی نے انکار کر دیا "کہہ دو وقت نہیں ہے" مَیں نے پنڈت جی سے کوئی سوا دو گھنٹے ملاقات کی، لیکن اگلے ہی روز لیگی اخبارات میں نمایاں خبر یہ تھی کہ "میاں افتخار الدین

نے پنڈت نہرو سے طویل ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ صوبہ کے فسادات کی اصل وجہ کانگرس کے ہندو مہاسبھائی لیڈر ہیں اور انہی کی وجہ سے صوبہ کے حالات تباہ ہوتے ہیں

پنڈت جی اگلے روز راولپنڈی چلے گئے، واپس آتے تو لالہ بھیم سین سچر کے ہاں ٹھہرے۔ سچر صاحب نے مجھے اور فیض الحسن شاہ کو بلوا بھیجا، سردار سورن سنگھ اور دوسرے کانگرسی رہنما بھی وہاں موجود تھے، سچر ایک سچے دیش بھگت تھے، ان کا سینہ آئینہ تھا، وہ ان آلودگیوں سے صاف تھے جو اکثر کانگرسی لیڈروں کو سردار پٹیل کی ہندو ذہنیت نے ودیعت کی تھیں، وہ دل سے چاہتے تھے کہ فسادات بند ہوں اور جو کچھ ہو چکا ہے لوگ بھول جائیں، لیکن پنجاب کے کانگرسی نیتا نہ بھولنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ پنڈت جی نے بڑے تحمل اور تدبر سے گفتگو کی، انہوں نے کہا:

"حالات قابو سے باہر ہو چکے ہیں، انسان وحشی ہو جائے تو اُسے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے، ہندوستان کی سبھی قومیں پاگل ہو گئی ہیں یہ جنون ایک دن ضرور ٹلے گا لیکن بڑی قیمت وصول کر کے ——
طوفان آچکا ہے، بند ٹوٹ گئے ہیں، لوگ کہتے ہندو اور مسلمان مارے جا رہے ہیں، میں کہتا ہوں انسان مارے جا رہے ہیں، پاگلوں کو سمجھانا کسی کے بس میں نہیں، ہمیں غصے میں نہیں آنا چاہیے، ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم ان حالات پر کیسے قابو پا سکتے ہیں، اس مرض کا علاج کیا ہے؟"

سورن سنگھ نے کہا:

"ایک ہی علاج ہے، ملک تقسیم ہو جائے، بٹوارہ ہو اور ضرور ہو، اب ہم مسلمانوں کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔"

میں نے کہا:

"پنڈت جی! اب تو ان کی زبان پر بھی تقسیم کے الفاظ آ گئے ہیں، اگر یہ

مسلمانوں کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں تو مسلمانوں نے پہلے ہی سے الگ ہونے کا فیصلہ کر رکھا ہے"

سورن سنگھ نے مجھ سے پوچھا:

"آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا،

"مسلمان"

پنڈت جی نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر محفل برخاست کر دی، کہنے لگے غصّہ تھوک دیجیے، اس غصّہ ہی نے نفرت پیدا کی ہے اور نفرت نے ملک کو یہاں تک پہنچا دیا ہے۔

میں نے آزاد میں سخت سے سخت اداریئے لکھنا شروع کیے، ہندو نیشنلزم کی قلعی کھولی، خود میرے ساتھی مجھ سے ناراض ہو گئے، ہندوؤں اور سکھوں کی اس لڑائی میں صرف آزاد تھا جو پہلے پندرہ دن، پھر ایک ماہ کے لیے بند کیا گیا، مجھ پر سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمہ چلایا گیا، کہ میں نے سکھوں اور ہندوؤں کے خلاف سخت تنقید کی اور اس طرح صوبہ کا امن خراب کیا ہے۔ یہ مقدمہ تقسیم تک چلتا رہا، پاکستان بنا تو عدالت نے خارج کر دیا۔

۴ مارچ کو فسادات شروع ہوئے تھے، اواخر اگست بلکہ ستمبر کے پہلے ہفتہ تک پنجاب ان کی آگ میں جلتا رہا، سارے صوبہ میں چھروں، چاقوؤں، پستولوں، خنجروں، ریوالوروں اور ان کے علمبرداروں کا دَور دورہ تھا، چوبیس چوبیس گھنٹے کا کرفیو، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں سکھ اور ہندو مارے جا رہے تھے، جہاں ہندو اور سکھ اکثریت میں تھے وہاں مسلمان قتل ہو رہے تھے، سارا صوبہ خون اور آگ کی لپیٹ میں تھا۔ باہمی مشورہ کر کے ہم نے لاہور کے عوام کی خدمت کا بیڑا اٹھایا، احرار رضا کاروں کو

کمربستہ کیا، لوگ کئی کئی دن سے مکانوں میں بند پڑے تھے، شیخ عزیز احمد سکرٹری ڈسٹرکٹ
ٹرانسپورٹ لاہور اور چودھری محمد فاضل کھال مرچنٹ سے ہم نے سواریاں مانگیں انہوں نے
انتظام کر دیا، ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ریلوے اسٹیشن لاہور سے مسافروں کو اٹھا کر ان کے
گھروں میں پہنچایا، پھر ہندوؤں کے نرغے سے مسلمانوں کو نکالا، اور مسلمانوں کے نرغہ سے
ہندوؤں کو، ہم محلوں میں پھر پھر کر لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے، ان کے لیے سودا سلف
لاتے، ہمارا یہ سلوک مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں سے یکساں تھا، ہم نے سینکڑوں ہندوؤں
اور سکھوں کی جانیں بچائیں، اطلاع ملی کہ لاہور موہنی روڈ پر ایک ہندو دوشیزہ رہ گئی ہے
اور مسلمان اس مکان کو آگ لگانے کے درپے ہیں، میں رضاکاروں کا دستہ لے کر وہاں
پہنچ گیا، مسلمان سخت طیش میں تھے، ایک لمحہ پہلے نہ پہنچتا تو مکان خاکستر ہو چکا ہوتا اور
اٹھارہ سال کی وہ کنیا جل بھی ہوتی، میں نے ہمت کی، اپنی بیوی کو ساتھ لیا، ہجوم کو
ہاتھ جوڑ کر راضی کیا، پھر اس دوشیزہ کو دوسرا برقع اوڑھا کر نکال لایا، اور رامیشوری نہرو
کے سپرد کیا، اس طرح اچھرہ میں سچر صاحب کی ایک عزیزہ رہ رہی تھیں اُن کو نکالا اور
پہنچایا۔ کئی جگہ ہندو دیویوں نے ہمارے مقابلہ میں ہندو رضاکاروں کے ساتھ جانے سے
انکار کر دیا۔ ہم انہیں نکالتے اور پہنچاتے رہے، پنڈت نہرو لاہور آئے تو رامیشوری
نہرو نے میرے شانوں پر شاباش کا ہاتھ رکھتے ہوئے اُن سے کہا کہ شورش نے بے شمار
ہندو خاندانوں کی عزت بچائی ہے، روزنامہ "جے ہند" نے انہی واقعات سے متاثر
ہو کر اداریہ لکھا، احرار رضاکار زندہ باد، "پرتاب" جیسا مہا سبھائی اخبار بھی تعریف
کرنے پر مجبور ہو گیا، مہاشہ خوشحال چند خورسند مدیر ملاپ کے بیٹے بدھ دیر کو میں نے
لاہور ریلوے اسٹیشن پر قتل ہونے سے بچایا، ٹریبیون نے میری تعریف میں ایک
نوٹ لکھا کہ اندھیری شب میں شورش کاشمیری کے نام سے ایک شمع روشن ہے۔ جے پرکاش
نارائن لاہور آئے تو ان اخباروں کے تراشے اپنے ساتھ لے گئے۔

مقامی نیشنل گارڈ کے رضاکاروں نے ہمیں دیکھا تو انہیں بھی احساس ہوا، لیکن انہیں بند و محلوں میں جانے کا یارا نہ تھا کہ وہاں سے مسلمانوں کے غیر محفوظ خاندانوں کو نکال لائیں، یا مسلمانوں کے گھروں میں پہنچ کر ان کی ضرورتوں کے خریدنے میں ہاتھ بٹائیں، وہ حالات کی سنگینی کے سامنے بے بس تھے، آگ کا یہ طوفان اُن کے قابو سے باھر تھا۔ پولیس والے اپنے ہی اسٹیشنوں کے ہو کے رہ گئے تھے، کوئی فریادی ان کے پاس جاتا تو وہ احرار کا پتہ دیتے کہ ان کے رضاکار تمہارے کام آسکتے ہیں، بھاٹی دروازہ لاہور کے مشہور لیگی پہلوان محمد شفیع ایک نوجوان عورت کو لے کر کوتوالی پہنچے کہ اس کے والدین کا سوتر منڈی کے کوچہ بلی شاہ میں مکان ہے وہاں اس کی ماں اور بہن پچھلے چوبیس گھنٹے سے دم بخود پڑی ہیں، کوئی پُرسانِ حال نہیں اور آج رات ان کے قتل ہو جانے کا اندیشہ ہے، پولیس ہمارا پتا دے کر طرح دے گئی، شفیع پہلوان خود نیشنل گارڈ کا سالار تھا، مَیں نے اس سے کہا اپنے رضاکاروں کو ساتھ لے کر نکال لاؤ وہ چپ ہو گیا، اس لڑکی سے پوچھا:

"تمہارے گھر میں کوئی مرد ہے؟"

"میرا شوہر ہے، میرا باپ ہے!"

"وہ کہاں ہیں؟"

"گھر میں"

"اور تم اکیلے چلی آئی ہو؟"

"کیا کروں، میری ماں اور میری بہن کا سوال ہے ان کی محبت کھینچ لائی ہے! اتنا کہہ کر وہ رونے لگی، مَیں نے اسے تسلی دی، اور دیر تک سوچتا رہا، مرد کتنا خود غرض ہے اور عورت کتنی باوفا، اس وحشت میں بھی بیٹی اور بہن ہی ماں اور بہن کی تلاش میں نکلی ہے مَیں نے اس سے کہا، بہن تم پہلوان کے ساتھ نماز مغرب کے بعد دفتر احرار میں آجانا،

ان شاء اللہ ہم انہیں نکال لائیں گے ؛
سٹی انسپکٹر سے بات کی تو اس نے کہا:
"سُوتر منڈی میں آج مسلمان سپاہیوں پر تیزاب پھینکا گیا ہے، اور
اب شہر کے اندر فوج کے بغیر جانا محال ہے "
لڑکی کا دل ٹوٹ گیا، لیکن میں نے اُس کو تسلّی دی، لوہاری منڈی کا تھانیدار
ہندو تھا، ایک مسلمان اسسٹنٹ انسپکٹر (خدا اس کا بھلا کرے) ہمارے ساتھ جانے پر
راضی ہوگیا، لیکن کوئی کانسٹیبل ساتھ جانے پر راضی نہ تھا، آخر منّت سماجت سے ہم نے
ایک دو کو راضی کر لیا، ہندو سب انسپکٹر روکتا رہا، کئی فریب دیئے لیکن ہم کہاں مانتے تھے
آٹھ بجے شب بیس باوردی رضا کار جن کے سروں پر آہنی خود تھے، اپنے ساتھ لے کر
لوہاری گیٹ کے تھانے پہنچ گئے، اسسٹنٹ سب انسپکٹر کوئی نو بجے آیا، ایک نقشہ بنا
لیا، آگے آگے میں، اسسٹنٹ سب انسپکٹر اور شفیع پہلوان، پیچھے پیچھے بیس رضا کار اُن
کے بیچوں بیچ وہ لڑکی ہمارے آگے تیس گز کے فاصلہ پر پولیس کا مختصر دستہ، ہوائی فائر کرتا چلا
جا رہا تھا، کرفیو کا سناٹا، دہشت کا دبدبہ، بازار پتھراؤ سے پُر، کہیں کہیں سڑکوں پر تیزاب
کے چھاخ، گھُپ اندھیرا، اسسٹنٹ سب انسپکٹر کسی کھڑکی کو کھُلا پاتا تو آواز دیتا،
"مہاراج! کھڑکی بند کر لو، پیچھے گورہ فوج فائر کرتی آ رہی ہے"
آواز آتی ——— پنڈت جی نمستے، وہ اسے ایس آئی کو انچارج تھانیدار سمجھتے
رہے، وہ ان سے یہی کہتا، ڈرو نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔
غرض اس خوفناک فضا اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کو ہم مغالطہ دے کر گزر رہے تھے،
سُوتر منڈی کے نکڑ پر ہم کوچہ بیلی شاہ کے نزدیک وسطی چوک کی مسجد تک پہنچے، تو ایک ہندو
نوجوان تلوار لیے مسلمانوں کے مکانوں پر کراس لگا رہا تھا، شفیع نے ہمت کر کے اس کی تلوار
چھین لی، لڑکی نے گلی میں داخل ہوتے ہی بہن کو پکارا،

"جیراں، جیراں، جیراں"

جیراں کہاں بولتی؟ وہ موت کے انتظار میں دم بخود پڑی تھی، جب بہت سی آوازیں گونجیں تو اس نے کھڑکی کے اندر سے کہا، "زینب؟"

زینب نے کہا، "جیراں میں ہوں۔"

جیراں نے پھر بھی دروازہ نہ کھولا، بہن کے ساتھ آدمیوں کا غول دیکھ کر گھبرائی یا جہاں چھپ کے پڑی تھی وہاں سے اٹھنے کا حوصلہ نہ کیا۔ کہیں سے آواز آئی:

"سردار جی شکار جا رہا ہے، مسلمان آ گئے ہیں۔"

پولیس نے دھڑا دھڑ فائر شروع کر دیئے۔ ہم نے بہتیرا غُل کیا لیکن اُس نے دروازہ نہ کھولا، ایک کانسٹیبل نے زینب سے کہا "واپس چلو، دروازہ نہیں کھلتا، ہمیں کیوں مرواؤگی؟ آخر ہمارے ایک بہادر رضاکار علاؤ الدین فلسطین نے مکان پر کمند پھینکی، اوپر چڑھا، کھڑکی توڑی، اندر گھسا، پورا مکان جاگ اٹھا، سارے محلہ میں ہلچل مچ گئی، سات گھر اور پیدا ہو گئے، وہ پچھلے آٹھ پہر سے موت کی راہ دیکھ رہے تھے، ہم نے ان سب کو گھیرے میں لیا اور ایک جیراں کی وجہ سے سات گھروں کے بیسیوں افراد بچ گئے۔ جیراں کی بوڑھی والدہ کو علاؤ الدین نے پیٹھ پر لاد کر اتارا، دوسرے مکان میں ایک بوڑھا اونگھ رہا تھا، محمد رفیق رضاکار اس کو تیسری منزل سے لایا، ایک ہولناک نظارہ تھا، قیامت کی تصویریں، محشر کا نقشہ، ماں، بہن، بیٹی، دادا، باپ، بھائی اور بیٹیاں سب اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔

غرض ان کشتگانِ خوف کا لٹا پٹا قافلہ سپاہیوں اور رضاکاروں کے گھیرے میں آہستہ آہستہ چلا، مسجد میں ایک درویش پڑا تھا، ہم نے اس کو اٹھایا، وہ مسجد اور قرآن کی حفاظت کے خیال سے ٹھہرنے پر مصر تھا، ہم نے کہا میاں! مسجد کو اللہ کی حفاظت میں دو اور تم ہمارے ساتھ چلو،

برہنہ پا اور برہنہ سر عورتیں سہمی سمٹی چلی جارہی تھیں، مَیں نے اس سے پہلے ایسا دردناک منظر کبھی نہ دیکھا تھا، خوف، دہشت، سراسیمگی، حسرت اور یاس ایک قافلے کی شکل میں جارہے تھے، محسوس ہوتا تھا زندہ قبریں چل رہی ہیں۔

ہندو سب انسپکٹر نے دیکھا تو اس کو افسوس ہوا کہ ہم موت کے جنگل سے نکل آتے ہیں، ہم نے اس سے کہا کہ جبراں، اس کی ماں اور بہن کو بھاٹی دروازے پہنچانا ہے، آپ ان کے ساتھ دو سپاہی کر دیں، لیکن اس کے تحت الشعور میں صدمہ یا غصّہ تھا کہ اس کی قوم کے ہاتھوں شکار نکل گیا ہے، اس نے کہا لوہاری دروازہ سے سید مٹھا اور تحصیل بازار کے راستہ بھاٹی کو چلے جائیں، مَیں نے کہا تینوں عورتیں ہیں، اور راستہ پیچدار ہے، یہ تو آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا والی بات ہو گی، وہ نہ مانا تو ہم نے سب سے پہلے ویگن میں انہی کو پہنچا دیا۔ باقیماندہ تیس پینتیس عورتوں، مردوں اور بچوں کا قافلہ لے کر ہم دفتر احرار میں چلے گئے، راستہ میں گوردارجن نگر کے قریب ہم پر بم پھینکا گیا، ہم بال بال بچ گئے، چودھری محمد فاضل ہمارے لیے سخت فکرمند تھے، دیکھا تو بہت خوش ہوئے، دفتر سے اوپر کی منزل پر چودھری افضل حق کی اہلیہ اور دو بچیاں رہتی تھیں، دونوں گریجوایٹ تھیں، انہوں نے اسی وقت چُولہا دھکایا، دال بھات تیار کی، اور جو تیار ہو سکا حاضر کیا، وہ لوگ ۴۸ گھنٹوں سے بھوکے تھے سب چٹ کر گئے، اچانک ایک عورت کی چیخ نکل گئی، اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا، معلوم ہوا کہ اپنا ایک سالہ بچہ بستر ہی پہ چھوڑ آئی ہے، ہم نے اس کے خاوند کو ساتھ لیا اور اپنے موٹر میں سوار ہو کر وہاں پہنچے، بچہ نہایت اطمینان سے سو رہا تھا، ہم نے اٹھا لیا، لالے سر ہو گئے، انہوں نے پتھراؤ کر کے موٹر کے عقبی شیشے توڑ دیئے، اس پورے محلہ کی عقبی دیواروں کو آگ لگا دی، ماں بچہ کو پا کر باغ باغ ہو گئی، اس صبح ہم ذرا دیر سے اٹھے دیکھا تو سارا قافلہ غائب تھا، ان کے مرد اُڑتے جا رہے اور آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے، کہاں آ گئے ہو، یہ تو خود ہندوؤں سے ملے ہوئے ہیں۔

اُن کے کان میں یہ رس ایک دراز ریش بزرگ نے گھولا تھا جو علاقہ کے نوجوانوں سے ہندوؤں کے مکان لٹواتا اور ان کا اثاثہ سمیٹ کر ہر روز گھر لے جاتا تھا، اب یہ محض فسادات نہیں تھے۔ بلکہ ایک اعلانِ جنگ یا میدانِ جنگ تھا، ہندوؤں کا مسلمانوں کے خلاف اور مسلمانوں کا ہندوؤں کے خلاف۔ ہندوؤں کی تیاریاں مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت قوی تھیں، انہوں نے مشرقی پنجاب کے اضلاع میں قیامت بپا کی ہوئی تھی۔ وہاں گاڑیاں روک کر لوگوں کو قتل کیا جا رہا تھا، ایک دن ڈاکٹر ذاکر حسین جالندھر ریلوے اسٹیشن پر نرغہ میں آگئے ان کے سر پر کرپان اٹھی ہی تھی کہ ایک سکھ کیپٹن نے پہچان لیا اور اس طرح ان کی جان بچ گئی، دوسرے تمام مسافر قتل کر دیئے گئے، اس ناٹک کا آغاز پہلے بہار سے ہُوا، پھر امرتسر میں شریف پورہ کے مسلمانوں نے کیا، اب صوبہ بھر میں یہی کھیل رچایا جا رہا تھا، سردار سجن سنگھ مرگند پوری ایم ایل اے مشرقی پنجاب میں پراونشل سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکرٹری تھے، انہوں نے ۱۹۵۱ء کی پہلی ششماہی میں بہ عنوان "کانگرس راج کے تین سال" ایک کتاب لکھ کے شائع کی، اس میں ان تمام بہیمانہ واقعات کا تذکرہ تھا، جو پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کے اعلان پر زور پکڑ گئے اور غایت درجہ وحشیانہ تھے، انہوں نے لکھا

(۱) جالندھر میں ایک نوجوان لڑکی شمیم بی اے کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا آخر اس کو نذرِ آتش کر دیا، اور اُس سے کہا کہ یہ راستہ پاکستان کو جاتا ہے،

(۲) فیروزپور کے ایک گاؤں سے دو غنڈوں نے ایک لڑکی کو اٹھایا اُس کی تقسیم پر راستہ میں جھگڑا ہو گیا، کسی نے کہا آپس میں لڑنا بے وقوفی ہے۔ آؤ اس قضیہ ہی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں، چنانچہ تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔

(۳) امرتسر کے بازار بکروالاں میں مسلمان عورتوں کو برہنہ کر کے ان کا جلوس نکالا گیا۔

(۴) فیروزپور کے ایک گاؤں لکھوکے کے نزدیک ایک پاکستانی قافلہ روک کر اس کے زیورات لوٹے گئے، نقدی چھینی گئی، خوبرو عورتوں کو چن چن کر اٹھایا گیا، پھر

جن عورتوں نے مزاحمت کی انہیں وہیں ڈھیر کر دیا، بعض عورتوں کی گود میں سال دو سال کے بچے تھے انہیں وہیں پھینک دیا، ان بچوں کو رات کی تاریکی میں گیدڑ اور کتے کھا گئے۔

پروفیسر ملک راج چڈھا اُس وقت مشرقی پاکستان میں اسمبلی کے ممبر تھے، آجکل گورنمنٹ کالج جالندھر کے پرنسپل ہیں انہوں نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا کہ وہ قاتلوں کی اسمبلی میں بیٹھنا نہیں چاہتے، عزیزوں میں ان کی ایک ہمشیرہ نے ایم اے کیا تھا، وہ راولپنڈی سے اٹھالی گئیں، مَیں نے اسے ایک ادھیڑ عمر کمہار کے ہاں سے برآمد کر کے مرڈولا سارابائی کے حوالے کیا تھا۔

ہمارے ایک دوست جسونت سنگھ انتہائی مخلص، سچے نیشنلسٹ اور بالطبع فیاض انسان تھے، بھاٹی دروازے کے باہر اُن کا موٹروں کی کمانیاں بنانے کا کارخانہ تھا، خود موہنی روڈ پر رہتے تھے۔ وہ بھاگے تو ان کی والدہ مکان میں رہ گئی تھیں، انہوں نے انارکلی کے تھانیدار کو ایک لاکھ روپیہ رشوت دے کر والدہ کو نکلوانا چاہا، تھانیدار راضی ہو گیا، چنانچہ ان کی والدہ تھانیدار کے ہمراہ گھر سے نکلیں تو سونے کا بکس بھی ساتھ لائیں، بکس دیکھ کر تھانیدار کی نیت بد ہو گئی، اس بوڑھی کو بدرو کے کنارے گولی سے ٹھنڈا کر دیا ——— میری ماموں زاد بہن اور سالی اختر کے میکے پٹیالہ میں تھے، ان کے خُسر کو پیغام بھیجا کہ پٹیالہ چھوڑ دو، لیکن وہ ایک گاؤدی شخص تھا، مہاراج پر اعتماد تھا، اعزہ پر نہیں ہُوا یہ کہ سارا کنبہ قتل ہو گیا، کچھ لڑکیاں رہ گئی تھیں وہ اغوا ہو گئیں، آج تک پتہ نہ چلا کہ زندہ ہیں یا شہید ہو چکی ہیں ؛

کئی سچے ہندو نیشنلسٹوں نے زور دیا تھا کہ اپنے اعزہ نکال لو، مَیں نے امرتسر، گورداسپور، انبالہ پیغام بھیجا کہ چلے آؤ، لیکن جواب ملا کہ احراری ہو اس لیے حوصلے پست کرتے ہو، انہیں یہی تاثر دیا گیا اور اُن کا خیال تھا کہ لدھیانہ تک کا علاقہ پاکستان میں ہوگا، ہمارے رہنماؤں کو معلوم تھا کہ امرتسر اُن کا نہیں، اور گورداسپور ان کے ہاتھ سے جا رہا ہے،

سیاست کے دیدے اس حد تک پٹم ہو گئے تھے کہ سرینگر اور جموں میں دو نامور رہنماؤں کی بیٹیاں اغوا کر لی گئیں، مردولا سارا بائی نے بڑی تگ و دو کے بعد انہیں برآمد کیا، سردار پٹیل ہر دو لڑکیوں کو بطور یرغمال رکھنا چاہتے تھے، مولانا ابوالکلام آڑے آ گئے، پنڈت جواہر لال نہرو کی مداخلت سے واپس کی گئیں، راجہ غضنفر علی خاں کی منہ بولی بیٹیاں بھی جواہر لال ہی نکال کے لائے، بلکہ راستہ میں پولیس سے ان کی ٹکر ہو گئی، پولیس مسلمانوں کو پٹوا رہی اور حملہ آوروں کو شہ دے رہی تھی۔

ہندوستان کی تقسیم کے اعلان (۳ جون) سے فسادات کا نقشہ بدل گیا، جن علاقوں کو ہندوستان میں رہنا تھا وہ مسلمانوں کے لیے جہنم ہو گئے، اور جو اضلاع پاکستان میں آ گئے وہ ہندوؤں کے لیے نرک بن گئے، دونوں طرف کی اقلیتوں کا حوصلہ ۳ جون ہی کو ٹوٹ گیا، لاہور میں ہندوؤں کا سب سے بڑا قلعہ شاہ عالمی دروازہ تھا، اس قلعہ کو سر کرنا مشکل تھا، یہاں سارے لاہور کی دولت سمٹی ہوئی تھی، شاہ عالمی کا بازار ریوڑیوں کی طرح تھا، ارد گرد کے بڑے بڑے محلے اور دائیں بائیں کے بازار سب ہندوؤں کے تھے البتہ رنگ محل سے داخل ہوتے وقت شاہ عالمی دروازہ کے بائیں شانہ کی پشت پر مسلمانوں کے مکان بھی تھے ــــــ ایک مسلمان آفیسر جو مسلمانوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے اکا دکا حملوں سے پریشان اور ان وارداتوں سے عاجز آ چکا تھا، اکثر مسلمان نوجوانوں کو گولیاں سپلائی کرتا، اسی نے شاہ عالمی دروازہ کا علاقہ زیر کیا، ایک رات کرفیو میں پو پھٹنے سے پہلے پہلے شاہ عالمی دروازے کا پون میل لمبا علاقہ شروع سے آخر تک صاف ہو گیا، تمام مکان اس طرح دھواں دے رہے تھے گویا سقوطِ برلن کے بعد دوسرا سانحہ ہے۔ اس حملہ سے ہندوؤں اور سکھوں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ لاہور سے بھاگ نکلے، اکثر لوگ راتوں رات مالا مال ہو گئے۔

احرار رضا کاران دنوں جو خدمات انجام دے رہے تھے اس کا ایک کے صُوبائی

رہنماؤں کو اعتراف تھا، لیکن لیگ کا کچرا اپنی سیاسی بے حوصلگی کے باعث سخت پریشان تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ احرار کا نام ہو، احرار کو نام کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ کام ضرور کرنا چاہتے تھے، اور وہ کام یہی تھا کہ خدمتِ خلق کریں، اس مرحلہ میں مسلمانوں کو جن جن خطروں سے احرار نے نکالا اور جس جس موڑ پر جا کر ان کی آبروؤں کو بچایا اس کا اجر اللہ کے پاس ہے اور وہی علّام الغیوب ہے، لیکن میرا یقین ہے کہ احرار کی بخشش کے لیے خدمتِ خلق اور خدمتِ اسلام کا وہ دَور کافی ہے۔

بعض دوستوں کی خواہش تھی کہ اس مرحلہ میں جبکہ پاکستان بننے کا اعلان ہو چکا ہے احرار اور لیگ کے درمیان سمجھوتہ ہو جاتے، ہم نے صاد کیا لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی لیگ کو بجا طور پر زعم تھا کہ وہ پاکستان کی فاتح ہے، مجلسِ احرار واقعی ایک شکست خوردہ سیاسی جماعت تھی، اس سے بات کرنا یا اس کو برابر کا درجہ دینا یا اپنے ساتھ کرسی پر بٹھانا زعمائے لیگ کی نوابی شان کے خلاف تھا، وہ خود تو کسی سوشل خدمت کے لیے سامنے نہ آتے لیکن خان بہادر مولوی غلام محی الدین قصوری کو بیچ میں ڈالا، ہم اُن کی کوٹھی پر گئے، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک بھی ساتھ تھے، دیر تک مبادلۂ افکار ہوتا رہا، ہم یہ احساس لے کر اُٹھے کہ وہ ہم سے کام تو لینا چاہتے ہیں مگر اس طرح گویا ہم ان کے کمیرے ہیں، مولانا مہر نے کہا، اپنے طور پر خدمت کیے جاؤ، لیگ سے مزید گفتگو پانی رڑکنے والی بات ہے، نواب ممدوٹ اور راجہ غضنفر علی خاں سے بھی ان دنوں ملاقات ہوئی، راجہ صاحب کا لہجہ طنزیہ تھا، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے کہا:

"آپ پٹرول ہم سے لیں اور فلاں فلاں جگہ آگ لگوا دیں"

مَیں نے کہا:

"بات آپ کی ٹھیک ہے لیکن غریبوں کے محلوں میں آگ لگانے

سے کچھ نہ ہوگا، بہتر ہے کہ سول لائن کے علاقے کو چھپڑا جائے، یہاں ہندؤں اور سکھوں کے بڑے بڑے بنگلے، بنک، انشورنس کمپنیاں اور تجارتی ادارے ہیں۔"

ارشاد ہوا:

"لیکن اس سے تو ہم بھی محفوظ نہیں رہیں گے، وہ لوگ ہماری کوٹھیوں اور اداروں کو بھی آگ لگوا دیں گے۔"

"تو پھر عوام کے خون سے ہولی کھیلنا کوئی معنی نہیں رکھتا، آپ خواص کی حفاظت کرتے ہیں اور عوام کو جوئے کا داؤ بناتے ہیں"۔۔۔ میں نے کہا

"تو پھر آپ کیا لینے آتے ہیں؟" ۔۔۔ راجہ صاحب نے فرمایا

"نواب صاحب نے یاد کیا تھا"

"نواب صاحب کو درباری سُننا ہے، راجہ صاحب بولے

"جی نہیں اس کے لیے تو آپ موجود ہیں، بھلا آپ سے بہتر کون گا سکتا ہے"، قاضی احسان احمدؒ نے کہا،

قہقہہ پڑا اور ختم ہوگیا، امراء کو بھی احساس ہوگیا کہ عزتِ نفس بڑی چیز ہے، اتنے میں میاں افتخار الدین آگئے۔ ہمیں دیکھا تو پیشانی پر شکنیں آگئیں، ہم اور یہاں؟ قاضی صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے میاں صاحب نے کہا،

"قاضی صاحب کیسے تشریف لائے؟

"راجہ صاحب سے درباری سننے، پھر وہیں سُنا چکے ہیں۔" راجہ صاحب کو پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا، اُٹھ کے چلے گئے۔

عوام پر احرار کا اثر بالکل نہیں رہا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ عادتاً خدمت کیے جا رہے تھے، لاہور میں لوگوں کے گھروں سے فضلہ تک صاف کیا، بعض علاقوں

میں زبردست دفاع کیا، امرتسر میں اکالی سورماؤں کے دانت کھٹے کیے، پاکستان بن جانے کے بعد بھی لدھیانہ میں امدادی کیمپ جاری رکھا، ماسٹر تاج الدین انصاری آخری مسلمان تھے جو لدھیانہ سے پاکستان آئے۔ ایک مسلمان کرنل کا "زمیندار" میں خط چھپا کہ لدھیانہ میں پناہ گزین مسلمانوں کی ایک ہی شخص خدمت کر رہا ہے اور وہ بوڑھا تاج الدین انصاری ہے، ادھر گوجرانوالہ اور سیالکوٹ میں احرار رضا کاروں نے جان جوکھوں میں ڈال کر مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر لوگوں کو بچایا، نوابزادہ نصراللہ خاں، خان گڑھ کے سب سے بڑے زمیندار تھے، وہاں ایک سکھ ڈاکٹر تعینات تھا، مسلمانوں نے مار دینا چاہا، نواب صاحب نے خطرہ مول لیا اور پناہ دی، مسلمانوں نے بہتیرا شور مچایا، ہنگامہ کیا، لیگ کے مجاہدین احراری ہونے کا طعن دے کر چڑھ دوڑے، نواب صاحب ڈٹے رہے، اور دو ماہ تک اُس کو بالاخانہ میں محفوظ رکھا، آخر ہندو لیڈران آفیسر کو بلوا کر ان کے ساتھ روانہ کیا، دفتر احرار کے ساتھ ریوالی برادرز کے سیٹھ رہتے تھے، مجاہدین نے مارنا اور لوٹنا چاہا، اس تاک میں تھے کہ حملہ کریں، ایک رات دروازہ توڑ ڈالا لیکن ہم نے دفتر احرار سے نکال کے انہیں محفوظ جگہ پہنچا دیا، سیٹھ کا لڑکا میو ہسپتال میں بیمار تھا اس کے لیے دو وقت کھانا گھر سے جاتا تھا، فسادات کی وجہ سے رُک گیا، کچھ دنوں اس کا بھائی اچکن اور جناح کیپ پہن کر کھانا لے جاتا رہا لیکن جب حالات بالکل ہی بے دست و پا ہو گئے تو یہ ڈیوٹی ہم نے لی، اور اس کے تندرست ہونے تک انجام دی، فسادات واقعی خوفناک تھے، اتنے خوفناک کہ بھیانک خواب بھی اتنے خوفناک نہیں ہوتے، لیکن اس طویل اندھیری رات میں جس نے سارے پنجاب کو گھیر رکھا تھا بعض شخصیتوں کے چہرے روشن رہے، ایسے ہندو سکھ اور مسلمان موجود تھے جو ایک دوسرے کے افراد اور ان کی آبرو کو سر دھڑ کی بازی لگا کر بچا رہے تھے، مثلاً ہندوؤں میں لالہ پنڈی داس (دو ہیرا ہوٹل) اور لالہ بھیم سین سچر بے داغ انسان تھے،

کمیونسٹوں کی تنظیم کمزور تھی لیکن وہ بھی اِدھر اُدھر ہندوؤں اور مسلمانوں کو بچانے میں لگے ہوئے تھے، سوشلسٹوں نے بھی عوام کی خدمت اپنا شعار بنا لیا تھا، لیکن فسادات کا سیلاب بے قابو تھا، البتہ اس ہمہ گیر فساد میں کوئی گوشہ محفوظ تھا تو وہ ـــــ

(۱) اُمراء تھے جن کی کوٹھیاں اور بنگلے حتیٰ کہ گھروں کے نگہبان تک محفوظ تھے

(۲) غنڈوں کا طائفہ تھا جس کا نصب العین لوٹنا اور مارنا ہو گیا تھا۔

(۳) سول لائن کے علاقے کی مخلوط کلبیں محفوظ تھیں، جہاں ان راتوں میں بھی شاہد بکنار اور رجام بدست حکام اکٹھے ہو کر مہاتما گاندھی کی فراست اور قائداعظم کے تدبّر پر تبصرہ کرتے تھے۔

(۴) پولیس کی چوکیاں تھیں، جہاں ہندو تھانیداروں کو مسلمان سپاہی اور مسلمان تھانیداروں کو ہندو سپاہی سلوٹ کرتے تھے۔

(۵) فسادات صرف ان ضلعوں میں ہو رہے تھے جہاں ڈپٹی کمشنر انگریز تھے اور اُن کا ارشاد تھا ـــــ "ہم نہ کہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ آزادی کے قابل نہیں"۔

(۶) سب سے محفوظ چکلہ تھا جہاں کسبیوں کے گاہک ٹوٹ گئے لیکن طوائفوں کے خانہ ساز آشنا صبح و شام وصلِ یار کے مزے لوٹ رہے تھے۔

اتفاق سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے ہاتھ اس قسم کا تحریری مواد آگیا جس سے اس بات کا ثبوت ملتا تھا کہ فسادات کی جڑ کیا ہے؟ اس کے پس منظر میں کون لوگ ہیں؟ انگریز آفیسر کیا کر رہے ہیں؟ کانگرسی ہندوؤں نے اب تک کیا گل کھلائے ہیں؟ اسلحہ کہاں سے آتا اور ریاستوں کا طرزِ عمل کیا ہے، اس مواد ہی میں کانگرس کے بعض رہنماؤں کے علاوہ آزاد ہند فوج کے جنرل موہن سنگھ اور کرنل ڈھلوں کے خطوط بھی تھے، مزید برآں اسلحہ کی وصولی، اسلحہ کی تقسیم اور اسلحہ کے استعمال کی رسیدات و ہدایات بھی تھیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن یہ کاغذات لے کر سیدھا دہلی چلے

گئے سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے، انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا:

"مولوی صاحب، یہ سب کچھ میرے علم میں ہے، بہرحال موسمی ہوائیں ہیں گزر جائیں گی، اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو ناگزیر تھا۔ ہونے پر تعجب نہیں، ایسا نہ ہوتا تو ضرور تعجب ہوتا، کسے خبر نہیں کہ حالات بے قابو ہو چکے تھے اور طبیعتوں میں فساد موجود تھا اب اگر اس کے برگ و بار پیدا ہو گئے ہیں تو حیران یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، دن سبھی طرح کے نکل جاتے ہیں، یہ بھی نکل جائیں گے، البتہ ایک چیز جو صاف ہو گئی ہے وہ بعض لوگوں کی دماغی تربیت ہے، میں ان کے بارے میں کبھی خوش رائے نہیں رہا، میں نے ان کی طبیعتوں کا شروع ہی سے اندازہ کر لیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ آخر کار ننگا ہو جائیں گے، سو ان کے چہروں کی نقاب الٹ چکی ہے اب ان حالات میں ان چیزوں کو انہی لوگوں کے سامنے رکھنا گویا اپنی کمزوریوں کو جو پہلے ہی رسوا ہو چکی ہیں اور رسوا کرنا ہے، ——— توقف کیجیے اور طوفانوں کی طرح یہ طوفان بھی تھم جائے گا —"

مولانا حبیب الرحمٰن مولانا آزاد سے اُٹھ کر پنڈت نہرو کے ہاں چلے گئے، اپنی بپتا سُنائی، اُن سے کہا، کیا ہم نے اسی دن کے لیے کانگرس کا ساتھ دیا تھا کہ اپنے گھروں ہی میں نہ رہ سکیں، لدھیانے میں سب سے پہلے جس مکان کو آتشزنی کے لیے چُنا گیا، میرا مکان تھا، جہاں سے کبھی فرقہ واری کی ہوا تک نہیں گزری، ضلع کے حکام فسادیوں کے ساتھ ملے ہوتے ہیں، بلوائیوں کو خود کانگرس کے لیڈر دعوت دیتے اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں، مسلمانوں کے لیے لدھیانہ میں سانس لینا مشکل ہو گیا ہے، سردار منگل سنگھ تو جو کچھ تھے، آپ جانتے ہیں لیکن آزاد ہند فوج کے جنرل موہن سنگھ اور کرنل ڈھلوں آتشزنی

لوٹ مار اور اجتماعی بلووں کی تربیت دے رہے ہیں، میں نے بہت چاہا لدھیانہ محفوظ رہے لیکن دیش بھگتوں نے سُنی اَن سُنی ایک کر دی، بلکہ اُلٹا ہمارے خاندان کو سزا دی کہ سب سے پہلے ہمارے خاندان ہی کے مکانوں کو لوٹا اور جلایا گیا، ہم نے اس دن کے لیے آزادی کا سفر شروع کیا تھا کہ اس کے ہاتھوں سب سے پہلے ہمارے سینہ میں خنجر بھونکا جائے گا؟

پنڈت جی سر جھکائے مولانا کی باتیں چُپ چاپ سُنتے رہے۔ جب مولانا اپنا غصہ ٹھنڈا کر چکے اور جو کچھ ان کے دل میں تھا، زبان پر آگیا تو پنڈت جی نے کہا۔

"مولانا، میرے پاس ندامت کے سوا کچھ نہیں، میں شرمندہ ہوں، انسان پاگل ہو گیا ہے، ہم پاگل ہو گئے ہوں۔ کسی شخص میں تحمل نہیں رہا اور — ع

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

آپ ہمیں معاف کر دیں اور پنڈت جی کا چہرہ اشکبار ہو گیا۔

مولانا اگلے روز گاندھی جی سے ملنے گئے،

گاندھی جی مُسکرائے، "آ گئے مولوی صاحب؟ لڑائی باندھنے آئے ہیں آپ؟ کیسے آئے؟"

"مہاتما جی، یہ ہے وہ سوراج، جس کے لیے آپ نے اٹھائیس یا اُنتیس سال لڑائی کی اور ہم اس دن کے لیے سالہا سال جیل میں رہے، ع

"دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے"

ہم نے مسلمانوں کی اجتماعی خواہش کو ٹھکرا دیا، کانگرس کے ہو گئے، اس کے لیے قید و بند کی صعوبتوں کو لبیک کہا، گھر بار اور بچوں کے مستقبل کو تباہ کیا، آزادی آئی تو سب سے پہلے ہمارے گھر لوٹے گئے، گاندھی بھگتوں نے قاتلوں کی سرپرستی کی، عام مسلمانوں کو اس لیے سزا ملی کہ وہ لیگ کے ساتھ تھے، ہمیں اس لیے سزا دی گئی کہ لیگ

میں نہیں تھے اور کانگرس کے ساتھ تھے، عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں رہیں، انہیں اس طرح ڈھایا گیا جیسے مسجدیں نہیں مذبح تھے۔

گاندھی جی نے سُنا تو انہیں ملال ہُوا، لیکن مُسکراتے، پھر قہقہہ لگایا:

"مولوی صاحب، مجھے افسوس ہے مَیں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا، آپ نے ہمارے لیے قید کاٹی؟ غلط ہے، قید تو آپ نے دیش کی سوتنترتا (آزادی) کے لیے کاٹی ہے اور اپنا گھر آپ نے موت کے خوف سے چھوڑا ہے، مسجدوں کی توہین کے ذمّہ دار آپ ہیں، ان کے لیے مٹ جاتے، آپ کی عزت مسجدوں سے ہے، اگر آپ وطن کے لیے قید کاٹ سکتے تھے تو کیا خانۂ خدا کے لیے مر نہیں سکتے تھے؟ آپ نے مذہب کی رُوح کو نہیں سمجھا، آپ کو مر جانا چاہیے تھا، لیکن خدا کا گھر چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔"

مولانا وہاں سے اُٹھ کر سردار پٹیل سے ملنے گئے تو وہ اس وقت کوٹھی کے لان میں ٹہل رہے تھے، ان کی بیٹی منی بہن بھی ساتھ تھیں۔ مولانا نے یہی رام کہانی سردار کو سُنائی، پٹیل کسی احساس یا تاثر کا اظہار کیے بغیر سُنتے رہے ——— سردار نے وہ تمام کاغذات جو مولانا ساتھ لے گئے تھے اُن سے لے کر اپنی بیٹی کو پکڑا دیئے، اور کہا:

"——— مَیں فرصت میں ان کاغذات کو دیکھوں گا، آپ جانتے ہیں کانگرس نے جناح کو راضی کرنے کے لیے ہر جتن کیا، عزتِ نفس تک کھو دی، گاندھی جی بار بار جناح کے دروازے پر گئے، لیکن ان کے کانوں پہ جُوں تک نہ رینگی۔ اس فساد کی ذمّہ دار لیگ ہے، آغاز اس کی طرف سے ہُوا، ڈائریکٹ ایکشن کا اعلان اس نے کیا، چنگیز و ہلاکو بن جانے کی دھمکی دی، مسلمان من حیث الکل آزادی کی تحریک سے الگ

رہے، بلکہ روڑے اٹکائے، ہم نے حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے بل
پر لڑائی مکمل کی ہے اور ہندو عوام کی وجہ سے یہ آزادی ہمیں ملی ہے
آپ چاہتے ہیں کہ ہم حصولِ آزادی کے بعد ان ہندوؤں پر گولی چلائیں
انہیں قتل کریں، یا قتل ہوتا دیکھیں؟ یہ ناممکن ہے۔ ہم لوگ احرار لیڈر
نہیں کہ قربانی بھی کریں، قوم سے گالیاں بھی کھائیں اور سارے ملک میں
تماشا ہو کر رہ جائیں۔ جس قوم نے ہمیں اقتدار دیا ہے اُس سے بدعہدی
ہو گی بلکہ غداری کہ آزادی کے بعد اس جماعت کے لیے ہم اس پر گولی
چلائیں، جو آزادی کی دشمن رہی ہے، اور جس نے فساد کی نیو رکھی ہے۔"

پاکستان بن گیا

ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو، اور پاکستان بنے، وزارتی مشن کے پلان کو مسلم لیگ نے تسلیم کر لیا تھا، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا، انہوں نے ۱۰ر جولائی ۱۹۴۶ء کو ایک بیان میں کہا کہ ہم نے کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں صرف اس لیے شرکت کی ہے کہ وہ ایک خود مختار ادارہ ہوگا اور وہاں جو کچھ ہمارا جی چاہے گا کریں گے، اپنے بیان کے بین السطور میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی وزارتی مشن کے پلان میں بھی ترمیم کر سکتی ہے ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کے لیے جو علیحدہ پاکستان سے دستبردار ہو چکی تھی یہ اعلان سخت قابلِ اعتراض تھا، وہ تمام جھگڑے جو وزارتی مشن کی آمد سے وزارتی مشن کے پلان تک ہو چکے اور اب خوفناک فسادات کی شکل اختیار کر رہے تھے ایک نئی شکل اختیار کر گئے نتیجۃً وزارتی مشن کے پلان کا ذہنی خاتمہ شروع ہو گیا، لنڈن ٹائمز نے ۲۸ نومبر ۱۹۴۶ء کے شمارہ میں لکھا کہ:

"حکومتِ برطانیہ دوسروں کے حقوق نظر انداز کر کے کسی ایک سیاسی پارٹی کو ذمہ داری تفویض نہیں کر سکتی اور نہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو مرکز میں ہندو اکثریت کے سپرد کیا جا سکتا ہے، اگر فریقین میں اسٹیٹ پیپر پر اعتماد نہیں ہو سکتا تو ہندوستان کی وحدت کو جو

گذشتہ صدی کا بڑا شاندار کارنامہ ہے، ایک عظیم مقصد اور انصاف کی خاطر لامحالہ قربان کر دینا ہوگا۔"

اسی سال ۶ دسمبر کو لارڈ اٹیلی نے مسٹر جناح، جواہر لال نہرو، نوابزادہ لیاقت علی اور سردار بلدیو سنگھ کو لندن بلوایا تاکہ جانبین اسٹیٹ پیپر قبول کر لیں، لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی، وہاں مسٹر جناح کو یقین ہو گیا کہ برطانوی حکومت تقسیم ملک پر تیار ہے کانگرس نے وائسرائے کو لکھا کہ مسلم لیگ کو کابینہ سے خارج کر دیا جائے، کیونکہ اس نے کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے، وائسرائے نے اس درخواست پر غور ہی نہ کیا، لیگ نے ۵ فروری ۱۹۴۷ء کو مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد کر کے کانگرس کو جواب دیا کہ اس کو اس قسم کے اعتراض کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم لارڈ اٹیلی نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ۱۶ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے ہندوستان چھوڑ دیگی، کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی متحدہ طور پر کوئی دستور بنا لے ورنہ برطانوی حکومت مجبور ہوگی کہ وہ متحدہ ہند کی گورنمنٹ کو حکومت سپرد کرے، یا تاریخ مقررہ پر ملک کے کچھ حصوں یا موجودہ صوبائی حکومتوں یا اسی قسم کے کسی اور ذریعہ سے جو ہندوستانی عوام کے مفاد میں ہو اقتدار تفویض کر دے،

۲ مارچ کو خضر حیات لیگ کی تحریک سے عاجز آ کر اٹیلی کے بیان کی آڑ میں مستعفی ہو گئے ۔۳ مارچ کو فساد کا چولھا گرم ہو گیا، ۸ مارچ کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے قرارداد پاس کی کہ تقسیم ناگزیر ہو گئی ہے تو پنجاب کے ان اضلاع کو جہاں ہندو اور سکھ اکثریت میں ہیں علیحدہ کر دیا جائے، ملک خضر حیات نے ۲۵ مارچ پھر ۹ اپریل کو ایک بیان دیا کہ پنجاب کی تقسیم اس کی عدیم المثال وحدت کے لیے ہلاکت کا باعث ہو گی، ملک فیروز خاں نون نے ۶ مئی کو اس بیان کی تائید میں ایک بیان دیا کہ ہم مسلمان پنجاب کی ایک انچ زمین بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اس طرح پنجاب کا آبپاشی نظام

تباہ ہو جائے گا، اور مستقل جنگ کی بنیاد پڑ جائے گی، دونوں حصے اپنے تحفظ کے لیے مسلح رہنے پر مجبور ہونگے، جو وسائل اس کی اقتصادی ترقی کے لیے ہیں وہ دفاع کے غیر سود مند اخراجات پر ضائع ہونگے، لیکن چودھری خلیق الزماں کے الفاظ میں پنجاب یا بنگال کا بٹوارہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پر تھا۔

لارڈ ویول کو لارڈ اٹیلی سے اختلاف کی بنا پر سبکدوش ہونا پڑا، ان کی جگہ ۲۲ مارچ کو لارڈ مونٹ بیٹن کامل الاختیار گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان پہنچے، انہوں نے مسٹر اٹیلی کے بیان کا اعادہ کیا، گاندھی جی نے کہا "برطانوی حکومت مسٹر جناح کو متحدہ ہندوستان کے تمام اختیارات سونپ کر چلی جائے لیکن ماؤنٹ بیٹن طرح دے گیا، ۸ مئی ۱۹۴۷ء کو ماونٹ بیٹن برٹش گورنمنٹ کو صورتِ حال سے مطلع کرنے کے لیے لندن چلا گیا، ۳۱ مئی کو تقسیم ہند کی رضامندی حاصل کر کے لوٹا، اپنی تجاویز سے ہندوستانی زعماء کو اس شرط کے ساتھ مطلع کیا کہ وہ انہیں تسلیم کر لیں گے، اور اپنی اپنی جماعت سے بھی منظور کرائیں گے، چنانچہ طرفین نے ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے کی برطانوی تجویز پر صاد کیا، اور اس طرح برطانوی سلطنت کا وہ قصر دل آرا، اس کے ہاتھ سے نکل گیا جس پر اس کی عظمت و شکوہ کا انحصار تھا اور جس کی آزادی کے مسئلہ پر سر ونسٹن چرچل نے جنگ کے دوران کہا تھا کہ انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری برٹش امپائر کو ختم کرنے کے لیے نہیں لی ہے۔

کانگرس پچاس سال کی ایک وطنی تحریک، ایک آزمائش شدہ قومی طاقت اور بہترین سیاسی دماغوں کے مجموعہ کا نام تھا، لیگ مسلمانوں کی مضبوط قوتِ ارادی، قائد اعظم کی بے لچک قیادت اور حالات کے موافق نتائج کا نام تھا، پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے صوبائی رہنما ہل گئے لیکن اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا، سہروردی متحدہ بنگال کے خواہاں اور اس کے لیے کوشاں تھے، انہوں نے شیام پرشاد مکرجی سے باتیں بھی کیں، لیکن ناکام رہے،

بعض لوگوں نے سہروردی کی اس کوشش کو پاکستان کے خلاف قرار دیا ہے لیکن چودھری خلیق الزماں نے اپنے سوانح حیات "شاہراہِ پاکستان" میں لکھا ہے کہ سہروردی کی اسکیم کامیاب ہو جاتی تو پنجاب کا بٹوارہ نہ ہوتا، اور اس طرح یہ دونوں صوبے سالم و کامل پاکستان کو مل جاتے، حالات ہی ایسے تھے کہ قائداعظم کے لیے بنگال و پنجاب کی تقسیم قبول کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا، لیگ کی مجلس عاملہ چودھری خلیق الزماں کے الفاظ میں جی حضوریوں کا ایک مجموعہ تھی اس میں کم لوگ تھے جو پورے ملک کے مسئلہ کا فہم رکھتے اور مسائل پر گفتگو کر سکتے تھے، خود انگریزوں کے لیے بھی ہندوستان کی وحدت سے کہیں زیادہ اُس کی تقسیم میں فائدہ تھا، جہاں تک کانگرس کے اندرونی نظام کا تعلق تھا جواہر لال کی بہ نسبت سردار پٹیل کو زیادہ رسوخ اور طاقت حاصل تھی، سردار پٹیل قلباً مسلمانوں کا مسئلہ اسی طرح ختم کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ان کا الگ وجود اور الگ آواز نہ رہے ـــــ پاکستان کے علاقوں سے انہیں کبھی انس نہیں تھا، انہیں خان عبدالغفار خان کے متعلق گمان تھا کہ وہ کانگرس کی قومی حیثیت اور ملکی طاقت سے فائدہ اٹھا کر ایک الگ ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں، سندھ بھی ان کے لیے قابلِ اعتناء نہیں تھا، پنجاب سے پوری ورکنگ کمیٹی بیزار تھی، بنگال سے بھی اسے کوئی لگاؤ نہ تھا وہ پہلے سبھاش بابو، پھر سرت بوس کو اپنے لیے کانٹا سمجھتی رہی ـــ اس زمانہ میں ایک ہندو اخبار نے لکھا کہ قائداعظم نے تو پنجاب و بنگال کے اضلاع کی قربانی دے کر مسلمانوں کے لیے ایک سلطنت بنائی ہے لیکن سردار پٹیل نے پاکستان پر اس لیے مہر لگائی ہے کہ وہ بنگال میں مارواڑی غلبہ قائم رکھنا چاہتے اور پنجاب میں سکھوں کو تقسیم کرا کے انہیں سرحد کی فوجی طاقت کے طور پر برتنے کے خواہاں ہیں، جو کچھ ہو رہا تھا اُس کا صحیح اندازہ خود ان رہنماؤں کو نہ تھا، تمام رہنما شطرنج کی بازی بد کے بیٹھے تھے، زیادہ سے زیادہ انہیں اپنے مہروں یا اپنے پتوں کا علم تھا لیکن کسی مرحلے میں عوام کو اپنے اعتماد میں لینے

کے لیے تیار نہ تھے۔

ایک دن مولانا غلام رسول مہر مدیر انقلاب نے مجھے فون کیا کہ ملک خضر حیات یاد کرتے ہیں، ان سے مل لو، مَیں خضر سے کچھ زیادہ واقف نہ تھا، دو ایک دفعہ کی سرسری ملاقات تھی، بہر حال اُن سے ملا تو انہوں نے مجھے کئی روز پہلے ۳ جون کے پلان سے مطلع کیا کہ مسٹر جناح اس حد تک پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر راضی ہو چکے ہیں، لیکن نہ تو انہوں نے ابھی تک اپنی ورکنگ کمیٹی کو بتایا ہے اور نہ عوام ہی کو اصل حقیقت سے آگاہی ہے مَیں نے لیگ کے زعماء سے پُوچھا تو اُنہوں نے لاعلمی ظاہر کی اور اصرار کیا کہ پنجاب کی تقسیم کبھی نہیں ہو گی، اور نہ وہ ایسا ہونے دینگے، لیکن ۳ جون کا پلان ہو بہو وہی نکلا جو ملک خضر حیات مجھے بتا چکے تھے اور مَیں نے بہت پہلے روزنامہ آزاد میں شائع کر دیا تھا۔

۳ جون کے پلان سے پنجاب اور بنگال کے عوام اپنی اپنی جگہ سے ہل گئے، ریڈ کلف ایوارڈ نے مسلمانوں کی مایوسیوں کے معاملہ میں رہی سہی کسر پُوری کر دی، مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود گورداسپور کا ضلع ہندوستان کو دیکر کشمیر کا قضیہ پیدا کر دیا۔ لیگ کے صوبائی لیڈر یہاں تک خالی الذہن تھے کہ انہیں آخر وقت تک معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی آخری سرحد حرف واگہ ہے، وہ مسلمانوں کو امرتسر سے لدھیانہ تک بہلاتے رہے، پرتاپ نے لکھا، کہ لاہور ہندوؤں کو ملے گا، مَیں نے متوقع نتائج کا ذکر کرتے ہوتے لکھا کہ لاہور مسلمانوں کے پاس رہے گا، اور کلکتہ ہندوؤں کے پاس، لیکن میرا یہ لکھنا بھی جرم ہو گیا، اگر تین جُون کے پلان کا اعلان ہوتے ہی لیگ کے صوبائی رہنما مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو جھُوٹی تسلیاں نہ دیتے تو شاید اتنا بڑا جانی نقصان نہ ہوتا جتنا نقصان بعد میں ہُوا، لُطف یہ کہ مشرقی پنجاب کے مسلمان لیڈر اور مغربی پنجاب کے ہندو لیڈر گھروں سے بھاگ کر محفوظ جگہوں پر چلے گئے تھے۔

سر فضل حسین کا مشہور لطیفہ ہے کہ انگریز کسی مسئلہ پر برسوں پہلے سوچتا ہے، اس نے

سوچا اور ہندوستان خالی کر گیا، ہندو مہینوں پہلے سوچتا ہے اس نے پاکستان کو ناگزیر سمجھا قبول کر لیا، ہندوؤں سے ان کے رہنماؤں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ حکومت ان کی حفاظت نہیں کر سکے گی، اپنی حفاظت وہ خود کریں، مسلمان عین موقع پر سوچتا ہے جیسا کہ تقسیم ہو گئی لیکن اس نے مشرقی پنجاب میں پٹائی سے پہلے مغربی پنجاب کا قصد نہ کیا، سکھ وقت گزر جانے کے بعد سوچتا ہے، جیسا کہ اس نے ہندوؤں کا ہراول دستہ بن کر پنجاب میں اپنا سب کچھ گنوا دیا۔

ماؤنٹ بیٹن پلان کے بعد مسلمانوں کا مشرقی پنجاب میں رہنا، مسلم لیگ کے رہنماؤں کا کانگرس کے رہنماؤں سے کشیدگی قائم رکھنا، قائداعظم کا مولانا ابوالکلام سے کھچا رہنا میری ناچیز رائے میں بہت بڑی سیاسی اور اجتہادی غلطی کے مترادف تھا، جن لیگی رہنماؤں نے مسلمانوں کو ستلج تک پاکستان بن جانے کا یقین دلایا تھا وہ نرے گاؤدی نکلے، باہر سے انہیں حالات کا علم ہی نہ تھا۔

مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ ہر سیاسی تنظیم اور ہر سیاسی تحریک میں جذبات کی مخلوق رہے، اُن کی صحیح سیاسی تربیت بہت کم ہوئی تھی وہ بعجلت اکٹھا ہوتے اور بسرعت بکھر جاتے ہیں، انہوں نے مدت سے سوچنا ترک کر دیا تھا، وہ تاریخ سے زیادہ سیاست کے اور سیاست سے زیادہ صحافت کے کھلاڑی رہے، انہیں نصب العین سے کہیں زیادہ نعروں سے زیادہ دلچسپی رہی، انہوں نے اصولوں سے زیادہ شخصیتوں پر انحصار کیا اور ہمیشہ اس انتظار میں رہے کہ انہیں کب کوئی شخصیت حرکت میں لاتی ہے، اس ضمن میں ایک بڑی ہی المناک حقیقت یہ ہے کہ آخری آٹھ دس سال میں جن مسلمان رہنماؤں کے پاس اخلاص و ایثار تھا ان کے پاس خود مسلمانوں کے لیے کوئی الگ سیاسی نصب العین نہ تھا اور جو قربانی و ایثار سے محروم تھے ان کے پاس سیاسی نصب العین ضرور تھا لیکن مسلمان عوام سے ملتے جلتے نہیں تھے بلکہ ان کے نام پر خود اقتدار حاصل کرتے تھے،

قائدِاعظم نے سکھوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بہتیرے جتن کیے لیکن سکھ کسی طرح بھی راضی نہ ہوسکے، وہ اپنی جسمانی طاقت منوانے پر تُلے ہوئے تھے، انہیں زعم تھا کہ وہ پنجاب کو سکھ ریاست بنا سکتے ہیں، نتیجۃً گھر کے رہے نہ گھاٹ کے، پاکستان کی سرحد پر وہ ہندوستان کی حکومت کے تابع مہمل ہیں۔

اوّل تو اور چند برس تک ہندو سماج انہیں ہضم کر لے گا، ورنہ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ پاکستانی سرحد پر ایک ایسی مارشل قوم کی رہ جائے گی جو انگریزوں کے عہد میں بھی تنخواہ پر لڑتی رہی ہے، "سکھ صُوبہ" ان کی اَنا کو رام کرنے کے لیے ایک سٹنٹ ہے، سکھوں کی خرابی کا اصل سبب ان کی لیڈرشپ کا بے مغز وجود یا پھر اپنے بارے میں احساسِ برتری کے بعض مفروضے ہیں۔

وہ مذہبًا ہندوؤں سے مختلف ہیں، لیکن معاشرۃً ہندوؤں کا حصّہ ہیں، ان کی تہذیب، ان کا تمدّن، ان کا طرزِ بود و ماند ہر چیز ہندو معاشرے کی ہے، وہ گورو نانک سے زیادہ گورو گوبند سنگھ کے پیرو ہیں، اس رعایت ہی سے مسلمانوں کے معاملہ میں وہ نفرت کی ایک تاریخ بنا چکے ہیں جو ان کے شعُور و لاشعور میں رچ بس گئی ہے۔

ان کی جراُتوں اور جسارتوں کا چرچا گوردوارہ تحریک سے ہوُا، اس تحریک میں انہوں نے بڑی جاں سپاری کا ثبوت دیا اور کامیاب ہوگئے، لیکن ان کے بعد ان کا شیوہ ہوگیا کہ سیاسی حقوق کے مسئلہ میں مسلمانوں کو آنکھیں دکھائیں، کمیونل ایوارڈ آیا، تو ماسٹر تارا سنگھ نے دھمکی دی کہ خون کی ندیاں بہا دیں گے لیکن مسلمان راج قائم نہیں ہونے دیں گے، سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری نے جواب دیا، ماسٹر جی آپ یہ دھمکی کس قوم کو دے رہے ہیں؟ اس قوم کو جو خون کے قلزم میں تیرتی اور پیرتی رہی ہے؟

——— اکالی سیاست حقیقۃً چوُں چوُں کا مُربّا تھی، وہ کانگرس کے ساتھ بھی تھے اور مخالف بھی، سکندر حیات سے معاہدہ کیا، خضر حیات سے الگ ہوگئے،

خضر حیات سے ناطہ جوڑا، مسلم لیگ سے رابطہ رکھا، کبھی کانگرس کی جھولی میں پڑے رہے کبھی اس سے بگڑ گئے، اپنے بازوؤں پر انہیں غلط یا صحیح بھروسہ تھا، لیکن اپنی ذات پر قطعاً بھروسا نہیں تھا، اگر قائداعظم کی بات مان لیتے تو یقیناً فائدہ میں رہتے لیکن قائداعظم کی بات نہ مان کر انہوں نے اپنا نقصان کیا، مسلمانوں سے ان کی مفاہمت ہو جاتی تو شاید پاکستان کا پالیٹکس ایسا گدلا ہوتا کہ سنبھالا لینا مشکل ہو جاتا، گاندھی جی نے اکالی پارٹی کو کبھی منہ نہ لگایا، وہ سخت خلاف تھے۔ مولانا آزاد نے اکالی پارٹی کو ملک کی مضرتوں میں سے ایک مضرت سمجھا، اس کے حق میں حُسنِ ظن رکھنے سے احتراز کرتے رہے انہیں جنگ کے دوران ان کے عزائم کا بخوبی علم تھا لیکن واقعات اس طرح رونما ہو رہے تھے کہ ان کا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھ رہا تھا، صرف اس وجہ سے کہ ان دونوں کا سیاسی تعلق اکالیوں سے استوار تھا۔ مولانا عمر بھر ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کے موافق نہ ہو سکے، ان دونوں کو اسی باعث اُن سے کد رہی، اور اکالی تو مولانا کے خلاف ہمیشہ شُدنی و ناشُدنی باتیں کرتے رہے۔

پنجاب میں خاکساروں کا یونینسٹ وزارت سے تصادم ایک بڑا ہی اندوہناک المیہ تھا۔ یہ واقعہ تھا کہ اکالی اندرخانہ سکھ ریاست بنانے کی تیاریاں کر رہے تھے، ماسٹر تارا سنگھ نے سکندر حیات سے معاہدہ کر کے سکھوں کو محفوظ کر لیا، لیکن خاکساروں نے وزارت سے ٹکرا کر اپنے ہی قلعہ کو پاش پاش کر ڈالا، حالانکہ وہ قلعہ آڑے وقت میں مسلمانوں کے لیے مفید ہو سکتا تھا۔

پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہو گیا لیکن فسادات کا سیلاب رُکا نہیں، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور قائداعظم کی اپیلوں کے باوجود اور اس واضح حقیقت کے باوصف کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی ڈھائی ماہ بعد دونوں مملکتیں آزاد ہو جائیں گی، مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے قتل و غارت کی خبریں برابر آ رہی تھیں، دردناک پہلو یہ تھا کہ دونوں طرف نوجوان لڑکیاں اٹھائی جا رہی تھیں، عام مقتول

میں ان کا وجود تجارتی جنس ہو گیا تھا، حقیقت اتنی تلخ ہو تو افواہیں اور بھی تلخ ہو جاتی ہیں،
فطرتِ انسانی ہے کہ وہ سچائیوں پر کم توجہ کرتی اور افواہوں سے زیادہ لگاؤ رکھتی ہے،
اور افواہیں کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوتی ہیں، انسان اُن چیزوں پر جلدی ایمان لے آتا
ہے جن کی سرے سے بنیاد ہی نہ ہو، بات جتنی کمزور ہو گی اتنی عوام کے ذہن میں
راسخ ہو گی۔

حالات اتنے بے قابو ہو چکے تھے کہ بایدوشاید، ہم آزادی کی طرف ضرور جا
رہے تھے لیکن ہمارے ساتھ وحشتوں کا ایک کارواں بھی قدم ملا کے چلا جا رہا تھا اس
قافلہ کا پرچم دوشیزاؤں کے آنچلوں سے تیار ہوا، نوجوانوں کے خون سے رنگا گیا اور
ریڈکلف ایوارڈ کی تجویز کردہ سرحدوں پر گڑ چکا تھا۔
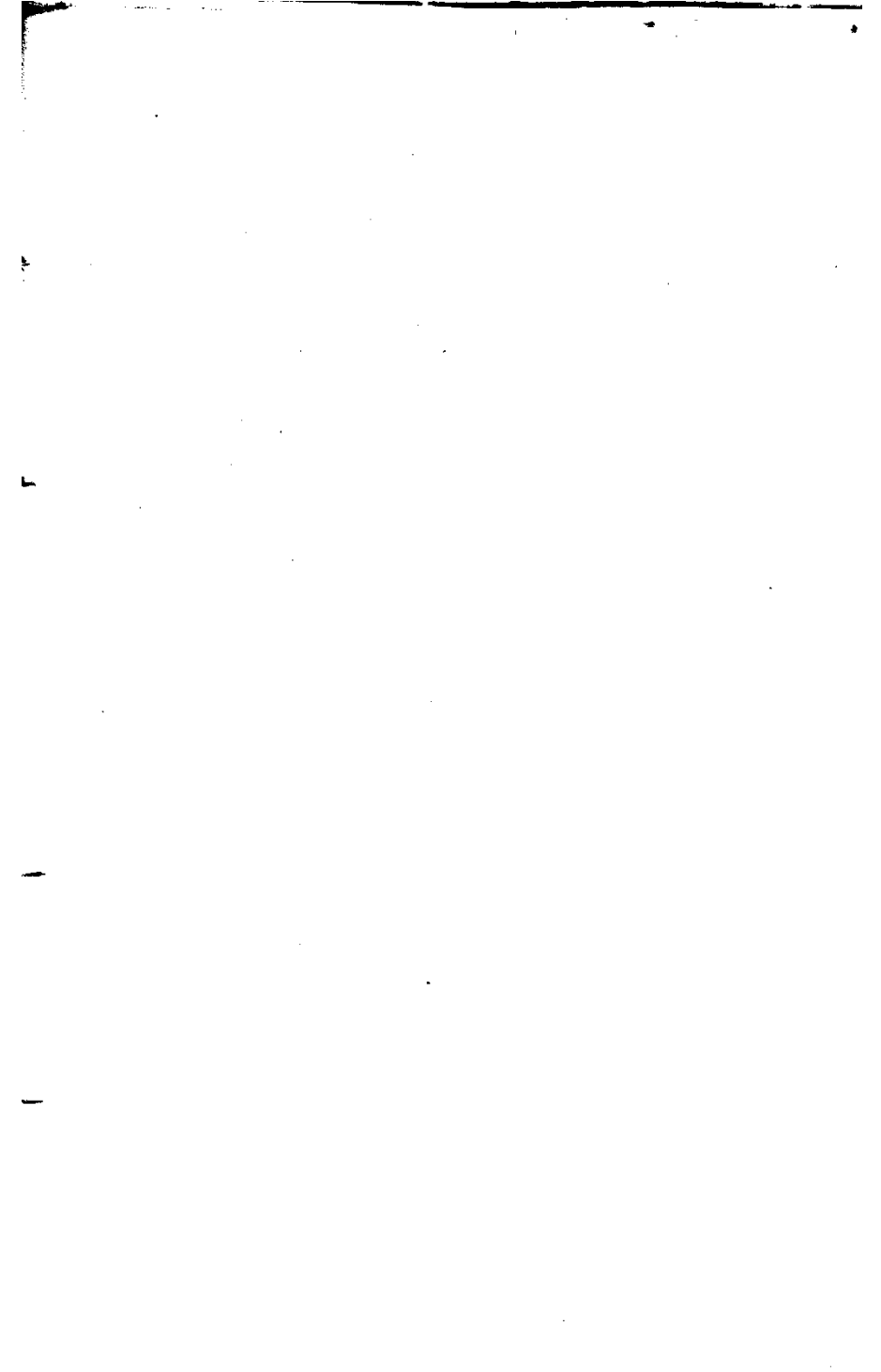
ہم آزاد ہو گئے

برِعظیم پاک و ہند یکایک آزاد نہیں ہوا بلکہ اس کی آزادی ایک طویل جدوجہد کا نتیجہ تھی، جس رفتار سے یہ آزادی سلب ہوئی تھی اسی رفتار سے یہ آزادی واپس آئی، اس آزادی کے لیے مختلف دائروں اور مختلف مرحلوں میں جان توڑ کوششیں ہوتی رہیں، ہندوستان میں پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) سے اس المیہ کا آغاز ہوا اور مغلیہ سلطنت (۱۸۵۷ء) کے خاتمہ پر غلامی کا پٹہ مکمل ہو گیا، اس طرح ایک ایسی سلطنت ختم ہو گئی جس کے پیشرو ابن قاسم، اور ظہیرالدین بابر تھے، اور جس کے پس رو بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ تھے، یہ کہنا غلط ہو گا کہ مسلمانوں کی سلطنت کا زوال کسی فوری حادثے کا نتیجہ تھا، قوموں اور ملکوں کی زندگی میں جو چیز سب سے مشکل ہوتی ہے وہ اس بات کا پتا لگانا ہے کہ اس قوم یا ملک کا انحطاط ٹھیک ٹھیک کب شروع ہوا، مرض کی طرح زوال بھی بتدریج رونما ہوتا اور یکایک حادثہ بن جاتا ہے، یہاں اس بات کا تجزیہ کرنا بے محل ہو گا کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی سلطنت کیونکر کھوئی اور وہ کون سے اسباب و علل تھے جو ان کی بادشاہت کا سفینہ ڈبو گئے۔ لیکن اس حقیقت کا اظہار بے محل نہ ہو گا کہ اورنگ زیب کے جانشینوں اور صوبائی اُمراء نے اس کی نیو رکھی، نتیجۃً مغلیہ سلطنت اور اس کے علاقائی وارثوں کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں، اس طرح ایک آفتاب طلوع ہو کر ڈوب گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ایک پسماندہ طاقت رہ گئی تھی، اس نے اپنا تاریخی رول ادا کر لیا تھا، اب زمانہ جس نہج سے اُبھر رہا تھا مسلمان اس کے موافق حال نہ تھے، ان کی جگہ ایک ایسی طاقت آ رہی تھی جس کے پاس جمود نہیں حرکت تھی، پرانے نظریوں کی جگہ نئے نظریے تھے، شاعرانہ ذہن کی جگہ سائنسی ذہن تھا، فی الجملہ مسلمان اپنا سانچہ خود توڑ چکے تھے، وہ ایک لُٹی پٹی طاقت کا دمِ واپسیں تھے۔

مغلوں کے آخری انحطاط سے پہلے ٹیپو سلطان کی شہادت (۱۷۹۹ء) واقعی "شمشیر گم شدہ" کا تتمہ تھی، ۱۸۵۷ء کا آغاز اصلاً ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی سے ہوا، حتیٰ کہ بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلّط ہو گیا، قومی عروج ہو یا قومی زوال، دونوں یکایک نہیں آتے ان کا ظہور بتدریج ہوتا اور طلوع بسرعت ہو جاتا ہے۔

لاہور میں رنجیت سنگھ کا قبضہ ۱۷۹۹ء میں ہوا، دہلی پر انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں قبضہ کیا، اورنگ زیب نوے سال کی عمر میں (۱۷۰۷ء) فوت ہوا، اس کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حکومت کا آخری نشان جو دہلی کے قلعۂ معلیٰ میں تھا ختم ہو گیا، آغا محمود بیگ راحت نے نتائج المعانی (بحوالہ رودِ کوثر) میں لکھا ہے۔

> "محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار میں بخشی محمود خاں نے زوالِ سلطنت کا ذکر کرتے ہوئے کہا چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کیا ہے، اولاً طبیب جنہوں نے فرمانروایانِ بیدار مغز کو مقویات کھلا کر عشرت طلب بنا دیا، ثانیاً کلاونت جنہوں نے شاہانِ حکومت اور شہزادگانِ سلطنت سے رشتے پیدا کر لیے انہیں رقص و سرود میں لگا دیا، شرفاء ذلیل ہو گئے، اور ڈوم ڈھاڑی مدار المہام، ثالثاً کثرتِ ازواج و عیال جس نے اندرونِ

سازشوں کا راستہ صاف کیا، رابعاً مشائخ اور پیرزادے جنہوں نے
تصوّف کی چادر بچھا کر شجاعت کا خون نچوڑ لیا، خود ما فوق البشر بن
گئے نتیجتہً حکومت جاتی رہی"۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزندوں کا وجود متوقع انحطاط کے خلاف علمی احتجاج
تھا، سیّد احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل کا جہاد جماعت مجاہدین کے کارنامے اور علمائے صادق پور
کے مقدمات، برطانوی عملداری کے خلاف جد وجہد ہی کے سلسلے تھے۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہندوستان میں برطانوی استعمار کے خلاف پہلا نعرہ احتجاج
تھا، سرسیّد نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا، علی گڑھ نے مسلمانوں کو بچایا،
دیوبند نے اسلام کو! ورنہ ممکن تھا مسلمان اسپین کی طرح صاف کر دیئے جاتے، اور
یہ سب ہندوستان میں آزادی کی تحریک کے احیاء کا احساس تھا، پہلی جنگ عظیم نے ساری
دنیائے اسلام کو اکھاڑ دیا، اس کی وجہ سے ہندوستان میں تحریک خلافت چلی، یہ ایک
خارجی صدمہ تھا لیکن داخلی اضطراب کے اظہار کا ذریعہ بنا جس نے برطانوی حکومت پر
واضح کر دیا کہ اس کے متعلق ملک کا عام ذہن کیا ہے؟ اس کے بعد ہندوستان میں بہت
سی تحریکیں اٹھیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تحریکیں بھی اور علیحدہ بھی، انہی تحریکوں
کی ضرب برطانوی حکومت کے لیے جان لیوا ہو گئی، اور اس کو رخصت ہونا پڑا۔

"تاریخ اور صحافت یکساں نہیں، ان میں فرق ہے، اخبار نویسی بسا اوقات ایک
مقدس جھوٹ اور مصلحت آمیز سچائی ہوتی ہے، لیکن تاریخ ایک بے لوث سچائی اور
بے رحم صداقت کا نام ہے، ہندوستان یا پاکستان کو آزادی ملی تو یہ کسی فرد واحد کی تنہا
ہمّت یا فراست کا کمال نہیں، یہ ملک کے اجتماعی ضمیر اور قومی انا کا صدقہ تھا، اس
ملک کی آزادی جس سے ہم ۱۴ اگست کو متمتع ہوئے ان نوے سال کی جد وجہد کا ثمرہ
ہے، محض مسلم لیگ اس برات کی دولہا نہیں، بے شک پاکستان کے مطالبہ پر اصرار

مسلم لیگ نے کیا اور پاکستان جس شکل میں بھی ملا وہ قائداعظم کی رہنمائی میں ملا لیکن پاکستان یا ہندوستان کی آزادی کا وارث کوئی تنہا شخص نہیں، ہم سب ہیں، اور سب سے زیادہ حصہ اُن لوگوں کا ہے جنہوں نے گھر بار لٹا دیا جن کی گمنامی سے ہم نے نام پایا، جنہوں نے کسی شخصی خواہش کے بغیر قید و بند کو لبیک کہا، جو تختہ ہائے دار پر لٹک گئے، جن کی جوانیاں قید خانوں کے لمحوں میں تحلیل ہو گئیں، جن کا لہُو خنجر کی دھار پر لوٹتا رہا، یہ غلط ہے کہ پاکستان صرف مسلم لیگ نے بنایا ہے، پاکستان حاصل اس نے کیا لیکن اُس کی نیو سیّد احمد شہید نے رکھی۔

لیگ کے عام رہنما آزادی کے ہیرو بن کر سامنے آتے ہیں تو ہنسی آتی ہے، حتیٰ کہ تاریخ کی فطرت بھی اباکرتی ہے، ان کا ملک کی آزادی میں ہیرو بننا بالکل ایسا ہے جیسا قائداعظم کے ورثہ پر اُن لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا جنہوں نے ملک معظم کی حکومت سے حلف اٹھایا تھا کہ اس کی پُشتیبانی کے لیے وہ اپنی جانیں وقف کرتے ہیں، جو آخر تک اس کی بقا اور استحکام کی خاطر ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر لڑتے رہے، جن کا خمیر ضمیر دونوں برطانیہ کے لیے گندھے ہوئے تھے۔

انقلاب عوام برپا کرتے ہیں جو ہمیشہ خواص کے خلاف ہوتا ہے۔ ہر انقلاب میں تلواروں کی اصل زد حکمرانوں کی کھوپڑیوں پر پڑتی ہے لیکن اس انقلاب میں جو ہندوستان اور پاکستان میں ہو رہا تھا اگر کوئی طبقہ محفوظ تھا تو وہ حکمران تھے، ۱۸۵۷ء کا غازی نگر انگریز ۱۹۴۷ء میں آزادی کا معطی ہو گیا تھا، یہ ایک "پُرامن انقلاب" تھا، جس میں عوام کے خلاف سب سے زیادہ بدامنی تھی، کسی ملک کے انقلاب کی تاریخ کبھی اس طرح مرتب نہیں ہوئی جس طرح برِ عظیم کی تاریخ مرتب ہو رہی تھی، مقتولوں نے قاتلوں کو ہدیۂ تبریک پیش کیا، اور اپنے قبیلے کے سر کاٹ کے خود ان کے پاؤں میں ڈھیر کر دیئے، یہ آزادی کا وہ ارمغان تھا جو ہندو اور مسلمان اظہارِ تشکر کے طور پر ویلزلی اور

اور کلایو کے جانشینوں کو پیش کر رہے تھے، کانگرس نے کوکناڈا کانگرس (محمد علی جوہر) کے خطبۂ صدارت سے لے کر رام گڑھ کانگرس (ابوالکلام آزاد) کے خطبۂ صدارت تک کو آگ لگا دی، اس کے لیے یہ سب کاغذ کے بیکار پُرزے تھے، گویا سردار پٹیل نے مختار احمد انصاری کا وہ گھر جلوا دیا جو کبھی کانگرس کی مجلس عاملہ کے اجلاسوں کا مرکز رہا تھا، لیگ نے سید احمد شہید سے لے کر عطاء اللہ شاہ بخاری تک سب کی جدوجہد آزادی کو تارپیڈو کر دیا، قائد اعظم نے لیگ سے باہر سب کی قربانی کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ انہیں فخر تھا کہ پاکستان ان کے علاوہ ان کے ٹائپ رائٹر نے حاصل کیا ہے اور بس۔

۱۴ اگست پاکستان کا یوم آزادی ضرور تھا اور واقعی یوم آزادی تھا، لیکن عجیب انقلاب تھا کہ عوام مر رہے تھے اور خواص عیش کر رہے تھے۔ راس کماری سے امرتسر تک اور سلہٹ سے ڈھاکہ تک، یا پھر کلکتہ سے دہلی تک اور لاہور سے خیبر تک سارا بر عظیم لہو لہان تھا، فی الجملہ ایک مذبح عظیم تھا۔

۱۵ اگست کو ——— رات بارہ بج کر پانچ منٹ پر ہندوستان کی آزادی کا سرنامہ پڑھا گیا، جواہر لال کے ساتھ خلیق الزمان نے بھی ترنگے کو سلام کیا، وفاداری کا حلف اٹھایا، لیکن ابوالکلام جس نے وزارتی مشن سے پروانۂ آزادی حاصل کیا تھا اپنی اقامت گاہ کے تخلیہ میں چُپ چاپ پڑا تھا، اس کا دل ڈوب رہا تھا وہ سوچ رہا تھا ——— ع

دن گنے جاتے تھے اِس دن کے لیے ؟

اس کا نطق مُہر بلب ہو گیا تھا، وہ ابوالکلام نہیں رہا کچھ اور ہو گیا تھا، اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا، اس کی شیوہ بیانی نے تحت الشعور میں اعترافِ شکست کر لیا تھا، اس کی خوشیاں مصنوعی ہو گئی تھیں، اس کے تبسّم کو غم کی چاشنی نے مجروح کر دیا تھا، وہ اپنے احساسات کی قبر میں لیٹ گیا تھا، پارلیمنٹ کے باہر ہزاروں سادھو

سنکھ بجا رہے تھے لیکن ابوالکلام تنہائی میں آنسو بہا رہا تھا، لاکھوں ہندو ملک میں اچھل کود رہے تھے، اُن کے ساتھ نیشنلسٹ مسلمانوں کا ایک ہجوم بھی کھوکھلے قہقہے لُٹا رہا تھا۔ لیکن کروڑوں مسلمان اس صبح کے خوف سے دل گرفتہ تھے جو ان کے لیے دشنہ و خنجر لے کر طلوع ہو رہی تھی۔

ہندوستان اور پاکستان میں سب سے بُرا حال ان مخلص اور مُفلس نیشنلسٹ مسلمانوں کا تھا جو ہندو کی نگاہ میں مسلمان تھے اور مسلمانوں کی نگاہ میں ہندو، ان کی قربانیاں چتا کی راکھ ہو گئی تھیں، ان کی استقامت پر تیری کسا جا رہا تھا، ان کے حوصلے ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے تھے، ان کا وجود کہیں کا نہ رہا تھا، وہ چوبِ مسجد کی طرح سوختنی تھے نہ فروختنی، ہندوستان نے انہیں پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا جس کی آزادی کے لیے وہ انگریزوں سے لڑتے رہے، حتیٰ کہ اپنی قوم کے قہر و غضب کا شکار ہو گئے، اس آزادی کا شمہ بھی ان کو نہیں ملا تھا، وہ اُس دُورافتادہ صدا کی طرح تھے جو صحراؤں میں بلند ہو کر ریت کے تودوں میں اُتر جاتی ہے، پاکستان ان کے لیے ایک سیاسی یتیم خانہ تھا جس کا عام ذہن ان سے نفرت کرتا اور شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، وہ آزادی کی خوشبوؤں سے یکسر محروم ہو چکے تھے، ۱۴ اگست کا عظیم دن واقعی عظیم دن تھا جسے وہ اپنے گھروں کی چار دیواری میں گزار رہے تھے، لیگ نے انہیں اچھوت بنا دیا اور ہندوستان میں وہ سیاسی ہریجن ہو گئے تھے، ہندوستان میں سنکھ پھونکے گئے، پاکستان میں نقارہ پیٹا گیا، آل انڈیا ریڈیو نے آزادی کا اعلان بندے ماترم اور پاکستان ریڈیو نے کلام اللہ کی تلاوت سے کیا، لیکن دن چڑھے دونوں طرف کی اقلیتوں کو آزادی کے نام پر قتل کیا جانے لگا، اٹھارہ مہینے کی لڑائیاں ۱۴ اور ۱۵ اگست کو یک طرفہ ہو کر شدید ہو گئیں، ہندوستان میں مسلمان گاجر مولی ہو گئے، پاکستان میں ہندو اور سکھ کٹنے لگے، اب فساد فرقہ وارانہ نہیں رہا، بلکہ اکثریت کے ہاتھوں

اقلیت کا قتلِ عام ہوگیا، اُمراء بھاگ رہے تھے، غربا مر رہے تھے، لڑکیاں کیلے کی پھلیاں ہوگئیں، انہیں اس طرح ننگا کیا جا رہا تھا گویا چھلکا اُتارا جا رہا ہے، نوجوان باداموں کی طرح توڑے جا رہے تھے، بوڑھوں کو سوکھی لکڑیوں کی طرح جلایا جا رہا اور اَدھیڑوں کو اُپلوں کی طرح دَھکایا جا رہا تھا، لیکن اندھیری رات کے ان عمیق غاروں میں بھی جگنو کی روشنیاں موجود تھیں۔

پاکستان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے ہندو اور سکھ خاندانوں کی اسی طرح حفاظت کی جس طرح وہ اپنی حفاظت کرسکتے تھے، ہندوستان میں بھی وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے مسلمانوں کو بچانے کا تہیہ کرلیا تھا، صوبہ سرحد میں سرخپوشوں نے بڑا کام کیا اور ہزارہا ہندوؤں کی جانیں بچائیں۔ ہندوستان میں اگر پٹیل اور کرپلانی، مہارانا پرتاپ اور رانا سانگا ہو گئے تھے تو گاندھی اور نہرو مسلمانوں کے لیے ڈھال بنے ہوئے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو ہندو مصیبت زدگان کو دیکھنے ہردوار گئے، یہ وہ لوگ تھے جو اپنی اولادیں اور والدین گنوا کے پاکستان سے وہاں پہنچے تھے، ان شرنارتھیوں میں سے اُن نوجوانوں نے پنڈت جی کو گھیر لیا جن کے والدین کٹ چکے یا جن کی بہنیں اور بیٹیاں پاکستان میں رہ گئی تھیں ——— پنڈت جی نے ان سے کہا "ہندو اور مسلمان کی بحث فضول ہے، یہ سوچو کہ اتنے انسان پاکستان میں مارے گئے ہیں اور اتنے انسان ہندوستان میں ہلاک ہوئے ہیں۔" ایک نوجوان کو انسان کی اس بحث پر غصہ آگیا، اُس نے پنڈت جی کو زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ یہ ہندوستان کے وزیراعظم کے مُنہ پر طمانچہ تھا لیکن پنڈت جی کا حوصلہ قابلِ داد تھا کہ انھوں نے اس سے کچھ نہ کہا، بلکہ اس کے شانوں پر پیار کا ہاتھ رکھ دیا، وہ نوجوان چلایا، میری ماں مجھے دیجیے، میری بہنیں لا دیجیے۔ پنڈت جی آبدیدہ ہوگئے، انھوں نے کہا: "تمہارا غصہ سچّا ہے لیکن پاکستان ہو یا ہندوستان بپتا ایک ہی ہے جو سب پر بیت رہی ہے،

کہانی واحد ہے جو سب کو درپیش ہے۔

خود میرے سامنے وہ لڑکیاں تھیں جن پر کئی مرد بیت چکے تھے، میں جانتا تھا کہ ان سیتاؤں کو شرعی شہدوں نے نکاح کے چھوہاروں کی طرح بانٹا ہے لیکن میں انہیں دیکھتا اور کانپتا تھا، ایک ہندو لڑکی جس پر مردوں کا کارواں گزر چکا تھا، میں نے غاصبوں سے حاصل کر کے لاجپت رائے بھون پہنچائی تو اس کی مدھ بھری آنکھوں کی اُداسیاں اور گہری ہو گئیں، اُس نے مجھے اس طرح تاکا گویا میں کوئی مسلمان نہیں، اُسے فریب دے رہا ہوں، مسلمان ہوتا تو اس کا ذائقہ چکھتا جس طرح مجھ سے پہلے بیسیوں دانشور اس کا مزہ چکھ چکے تھے ——

ہندوستان کے بعض شہروں، قصبوں اور گاؤں میں سینکڑوں مسلمان لڑکیاں کنوؤں میں کود کر ختم ہو گئیں، امرتسر کے ہال بازار میں برہنہ لڑکیوں کا جلوس پھرایا گیا، پھر خیرالدین کی جامع مسجد میں جہاں حوض میں آگ کا الاؤ بھڑک رہا تھا، اُن سے کہا گیا کہ یہ ہے پاکستان کا راستہ! انہوں نے یک دم چھلانگیں لگا دیں، اور بھسم ہو گئیں یہ اس شہر کا حال تھا جہاں کبھی جلیانوالہ باغ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون ایک ساتھ بہا تھا اور وہ جنرل ڈائر کے حکم سے اکٹھے پیٹ کے بل رینگے تھے، مغربی پنجاب نریموہیڈ کے ایک قصبہ میں ہندوؤں کو مسلمانوں نے یقین دلایا کہ ان کی لاشوں سے گزر کر ہی کوئی انہیں نقصان پہنچا سکے گا، لیکن جب ہندوستان کے لٹے پٹے قافلے پنجاب میں داخل ہوتے اور جانبین نے گاڑیاں روک روک کر ایک دوسرے کو ہلاک کرنا شروع کیا تو قصبہ کے سربرآوردہ لوگوں کی نیتوں میں فتور آگیا، تمام ہندو ایک حویلی میں جمع تھے، وہاں سینکڑوں من لکڑی جمع کی گئی، اس میں منوں اناج ڈالا گیا گھی کے سینکڑوں کنستر انڈیلے گئے، الاؤ روشن کیا گیا، پھر اس میں اپنی جوان بیٹیوں کو اٹھا اُٹھا کر پھینکا گیا۔ ایک لڑکی ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی، باپ پیچھے دوڑا، لڑکی نے جناب

میں چھلانگ لگا دی، اِس طرح ایک اور سوہنی (ساوتری) اس کی موجوں کا لقمہ ہو گئی،
سونے اور چاندی کے زیورات اور ریشمی پارچات آگ میں ڈال دیئے گئے، جب
الاؤ جوبن پر آ گیا تو ان لوگوں نے اکثریت کے رستموں کو للکارا، آؤ ہمیں قتل کرو، غنڈوں
نے جو ڈھول اور تاشے پیٹتے ہوئے قریب آ گئے تھے تلواریں اٹھائیں، گردنیں اڑا
دیں، پھر اس عظیم چتا کے ڈھیر میں سے سونا تلاش کرنا شروع کیا، انگلیاں کاٹ لیں
کان کتر لیے، ہنسلیاں توڑ دیں، یہ تھا ستی ہونے کا دوسرا دور جس میں کنواریاں
بھی ستی ہو گئی تھیں۔

دونوں طرف کے غنڈے لوٹ رہے اور دونوں طرف کے شرفاء لٹ رہے تھے،

چودھری خلیق الزمان اپنی سوانح عمری "شاہراہِ پاکستان" کے صفحہ ۱۰۸۳ پر لکھتے ہیں کہ:

"(مسلمان) جس توازن کے متمنی تھے وہ بالکل بگڑ گیا تھا"

شہید سہروردی کی یہ رائے بالکل صحیح تھی کہ دو قومی نظریے نے مسلمان اقلیتوں
کے لیے ہندوستان میں ایک مہیب شکل اختیار کر لی تھی جس سے ان کا مستقبل اس ملک میں
تاریک ہو گیا، اگست و ستمبر کے مہینے سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے جانکنی کے
مہینے تھے، کلکتہ مسلمانوں کو ایک لحظہ کے لیے بھی بخشنے کو تیار نہ تھا، دہلی میں خون کا بدلہ خون
کے نعرے لگ رہے تھے، دہلی کے نواح میں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ آبادیوں کی آبادیاں
قتل ہو گئیں، جو باقی رہے وہ جبراً ہندو بنا لیے گئے، ان کو مجبور کیا گیا کہ اپنی لاشوں
کو دفنائیں نہیں بلکہ جلائیں، انہیں اپنی جوان بیٹیاں نیچ ذات کے ہندوؤں سے بیاہنے پر
مجبور کیا گیا، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے پاس الور اور بھرت پور کے مسلمانوں کا ایک
وفد فریاد لے کر آیا کہ ہم قتل تو ہو رہے ہیں لیکن ہم سے دو چیزیں نہیں ہو سکتی ہیں، ایک تو
ہم اپنے اقرباء کی لاشیں جلانے سے معذور ہیں، دوسرے اپنی لڑکیوں کو کس جی گردے
کے ساتھ ہندوؤں سے بیاہ دیں، زمین پھٹ جائے تو ہم اس میں غرق ہونے کو تیار ہیں،

چودھری خلیق الزمان نے اپنے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ بھرت پور کے تین ہزار مسلمان جو بلوائیوں کے نرغہ میں گھرے ہوئے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کی وجہ سے بچ گئے، ورنہ موت ان کے سروں پہ منڈلا رہی تھی، چودھری صاحب نے اپنی اس کتاب میں شہید سہروردی کا ایک خط نقل کیا ہے جو انہوں نے ۱۰ ستمبر ۴۷ء کو تھیٹر روڈ کلکتہ سے ان کے نام لکھا تھا ـــــ اس خط کا ترجمہ چودھری صاحب ہی کے قلم سے من وعن درج کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ غور و فکر کا دائرہ احوال و وقائع کی روشنی میں کہاں پہنچ گیا تھا،

۴۰ تھیٹر روڈ، کلکتہ

۱۰ ستمبر ۴۷ ۱۹ء

مائی ڈیئر خلیق الزماں صاحب

ہم اس وقت اس پر غور و خوض کر رہے ہیں کہ ہندو اکثریتی صوبوں میں اقلیتوں خصوصاً مسلم اقلیت کے لیے کیا ہونا چاہیے؟ میں نے اس مسئلہ پر اس سے پہلے غور نہیں کیا تھا، کیونکہ ہم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ صوبہ بنگال کا بٹوارہ ہو گا اور مسلمان بنگال کے کسی حصہ میں اقلیت ہو جائیں گے، میرا خیال ہے کہ فلیگ (جھنڈے) کے سلسلہ میں آپ کی تقریر بہت بصیرت افروز تھی، کیونکہ اس میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ سے ہماری وفاداری سے متعلق ہندوؤں کے دلوں میں یقیناً شکوک اور شبہات پیدا ہوتے، یہاں آج کل ہندوؤں اور مسلمانوں میں اچھے احساسات ہیں اور ہم امید کر سکتے ہیں کہ یہ قائم رہیں گے، جس کی بڑی وجہ ہمارا انڈین فلیگ کو قبول کرنا اور جے ہند کے نعرے کو اپنانا ہے، اس کے باوجود کہ ہمیں مسلمانوں کے مستقبل کی پالیسی کے متعلق غور کرنا ہے، اور اس سوال کا جواب اس پہ منحصر ہے کہ کیا ہم ہندو حکومتوں پر اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارے مفاد کا لحاظ کریں گی، یا وہ اہم موقع پر اس کو نظر انداز کر دیں گی؟ ہمارے سامنے حسبِ ذیل راہیں کھلی معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) ہم اپنی اسلامی روایات کے مطابق بہترین اسلامی تخیلات پر قائم رہ کر دونوں ساتھ میں تھوڑی بہت پیروی کریں، مگر اس راستہ کے لیے ہم کو بہت مضبوط اور منظم ہونا ہے اور قربانیوں کے لیے تیار رہنا ہے، اور اس سلسلہ میں ہم کو پاکستان سے امداد کی توقع رکھنا ہوگا، اس طرح ہم ہندوؤں کی نظر میں باعزت ہو سکتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ان کا غیظ و غضب بھی قائم رہے گا وہ کوشش کریں گے کہ ہم مضبوط نہ ہو سکیں اور مجھے شک ہے کہ پاکستان اس میں ہماری مدد کر سکے گا؟ ہوسٹیج (یرغمال) کا اصول ختم ہو گیا ہے، اس خوف سے کہ پاکستان میں ہندوؤں کی جان کو خطرہ ہوگا، ہندوستان کے ہندوؤں کو مسلمانوں کی جان لینے سے گریز نہ ہوگا، کیونکہ جب انسان مجنون ہو جاتے تو یہ سوالات اس کے پیش نظر نہیں رہتے، علاوہ ازیں حکام اعلیٰ کی کوششوں کے باوجود امن و امان کے محافظ عمّال خود بہت فرقہ پرست ہیں، وہ مسلمانوں کے خلاف جذبات رکھتے ہیں اور کسی مسلمان کے خون یا اس کے مال کی لوٹ میں ذرا بھی مداخلت نہ کریں گے، ان وجوہات سے میں علیحدگی کے تخیّل اور دو قومی نظریہ کے موافق نہیں ہوں۔

(۲) بحیثیت ایک ہندوستانی شہری کے ہم اپنے ہندو ہمسایوں کے ساتھ دوستانہ طریقہ پر رہیں، میرے نزدیک یہ سب سے اچھا راستہ ہے مگر اس میں دقتیں یہ ہیں:

(الف) ہندو ہم کو عام شہری کی طرح قبول بھی کرے گا یا اپنی وجاہت کا اظہار کر کے مسلمانوں کو ذلیل کرے گا؟

(ب) وہ آپ کے ساتھ خلوص برتے گا یا نہیں؟ مجھے جو چیز گاندھی جی سے وابستہ کرتی ہے وہ ان کا اس امر پر اصرار ہے کہ ہندو قوت اور اقتدار کے جذبہ کا اظہار کر کے اقلیتوں کو احساس کمتری نہ دلائیں، وہ کہتے ہیں کہ "اقلیتوں کو اپنے حقوق لینے کے لیے جان دینے سے بھی گریز نہ کرنا چاہیے" —— ہندوؤں کے مزاج کو اس رنگ پر ڈالنے کے لیے بہت پروپاگنڈا کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے کافی وقت درکار ہوگا مجھے خوف ہے

کہ کیا وہ آپ کی عزّت کریں گے؟ اگر آپ میں کوئی قوت نہ ہوگی، یعنی یہ کہ اگر آپ اپنی عصبیت کو خیر باد کہہ دیں، پھر دوسری طرف یہ سوال ہے کہ جب آپ قوت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کے دلوں میں آپ کی وفاداری کے متعلق شکوک پیدا ہوں گے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ قوت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کے دلوں میں آپ کی وفاداری کے متعلق شکوک پیدا ہوں گے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا رویّہ ہندوؤں کی جانب کیا ہوگا؟ کیا ہم اس طریقہ سے عمل کریں جیسے مسلم لیگ اور کانگریسی اختلاف، یا ہم ایک متحدہ پارٹی ہندو اور مسلمانوں کی بنائیں، اگر ہم مسلم ہی بن کر رہنا چاہیں تو وہ ہم سے الگ رہیں گے جیسے کانگریس! اور مخلوط انتخاب سے ہم میں مسلم نیشنلسٹ ایسی قوم پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(۳) ایک راستہ یہ ہے کہ ہم بالکل ان میں ضم ہو جائیں جیسے کہ کچھ مقامات پر بہار میں ہندوؤں کا یہ نظریہ مسلمانوں کے متعلق ہے، اس کے روکنے کے تین طریقے ہیں۔

۱۔ ہم اپنا مضبوط بلاک بنائیں، اس غرض کے لیے ہم ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے پوری سعی کریں، اس میں ہماری بچت ہے اور یہ ہماری ثقافت کے لیے بھی ضروری ہے۔

۲۔ انتقالِ آبادی جب تک کہ وہ جاری رہ سکے، حالانکہ پنجاب میں ہم کو دل شکن سبق ملا، پھر بھی میرا خیال ہے کہ انتقالِ آبادی بالکل ناممکن ہے یہ بھی مشکوک ہے کہ جو لوگ ادھر سے اُدھر ہوئے ہیں وہ کتنے دن بچیں گے؟ میرا خیال یہ ہے کہ ہم کو تمام خطرات برداشت کر کے اپنی جگہ ٹھہرے رہنا چاہیے۔

۳۔ موت یہ نہایت بھیانک خیال ہے محض اپنے لیے نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں کے خیال سے کیونکہ اس کے بعد پھر قتلِ عام کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ جاتا۔

لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ اب ہم کو کرنا کیا ہے؟ ان مسائل پر آپ نے بہت غور کیا ہوگا کیونکہ آپ کے سامنے یہ مسائل بہت پہلے سے پیش آرہے ہیں، میں ان

معاملات میں آپ کی ہدایت چاہتا ہوں، میرا ذاتی خیال ہے کہ پاکستان نے ان مسلمانوں کے لیے جو اُن حصّوں میں رہتے ہیں ایک آزاد وطن دے دیا ہے مگر ہندی مسلمانوں کے لیے کوئی ہوم لینڈ نہیں ہے، انڈین یونین کے مسلمان بے یار و مددگار رہ گئے ہیں، اور ان کو اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنا ہے، اس لیے ہم کو سوچنا ہے کہ ہم اپنا نظام کس سانچے پر ڈھالیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اب ایک پاکستان گورنمنٹ ہے جس سے مسلمانوں کی کچھ اہمیت ہو جاتی ہے، مگر دوسری طرف اسی وجہ سے وہ زیادہ موجبِ عتاب بھی ہوتے ہیں اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کونسی راہ اختیار کریں، میرا ذاتی خیال ہے کہ مُسلم اقلیت کو صوبوں میں اپنا راستہ خود متعیّن کرنا ہے ــــ قائدِ اعظم اور مسلم لیگ پاکستان میں . . . . . مشغول و مصروف ہیں، میرے نزدیک ایک حل یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک اپنی اپنی اقلیتوں کو اپنا لیں، جس سے اکثریت کا احساسِ برتری ختم ہو جائے، اس مسئلہ میں پُوری قوت صرف کرنی پڑے گی، اور ہماری خوش بختی یہ ہے کہ اس تحریک کو مہاتما گاندھی آگے بڑھا رہے ہیں، اسی راستہ میں صلح، امن، اور انسانی عزت پرورش پا سکتی ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ کہ ہم کچھ لوگ پہلے مل کر مشورہ کریں اور اگر اس کے بعد ضرورت ہو تو صوبوں کی مُسلم اقلیّت کے نمائندوں کا ایک کنونشن بلائیں؟ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں میں آپ کی ہدایت کا متمنّی ہوں۔

آپ کا مخلص

شہید سہروردی

وہ مسلمان جو اب ہندوستان میں رہ گئے یا رہنا چاہتے تھے یا پھر جن کے لیے کوئی راہِ فرار نہ تھی ان کے لیے ہندوستان تنگ تھا کہ دارالحکومت دہلی میں کوئی جگہ نہ تھی، حال یہ تھا کہ:۔

(۱) مسلم لیگ کے چھوٹے بڑے رہنما انہیں کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ان کا لیگ کے گھرانہ میں کوئی دستگیر نہ رہا تھا۔

(۲) اُمراء کی پوری جماعت چلی جا رہی تھی ایک بڑا حصہ جا چکا اور جو رہ گیا تھا وہ تیار بیٹھا تھا (الّا ماشاءاللہ)

(۳) مسلمان افسروں میں میاں عظیم حسین جیسے آدمی کو چھوڑ کر کہ وہ اپنے والد مرحوم سر فضل حسین کی وجہ سے ایک خاص مزاج رکھتے تھے، تقریباً تمام مسلمان افسر ادنیٰ و اعلیٰ پاکستان دوڑ آئے تھے، نتیجۃً مسلمان عوام کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

(۴) قائداعظم نے چودھری خلیق الزمان سے کہا کہ وہ ہندوستانی پارلیمنٹ میں مسلمانوں کے لیڈر بن جائیں، چودھری صاحب نے نواب اسمٰعیل خاں میرٹھی پیش کر دیا، قائداعظم نے کہا کہ وہ مقرر نہیں، اگلے روز مسٹر چندریگر نے کہا، قائداعظم نے انہیں کہا ہے کہ وہ (چندریگر) لیڈر بن جائیں، چودھری خلیق الزماں نے کہا کہ میں نواب اسمٰعیل خاں کی تائید کر آیا ہوں اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے، لیکن جب انتخاب کا مرحلہ آیا تو چودھری صاحب لیڈر ہو گئے ——— چودھری صاحب نے ہندوستان سے وفاداری کا حلف اُٹھایا، ہندوستانی جھنڈے کو سلام کیا لیکن چودھری صاحب ۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لارڈ اسمے کے ساتھ کراچی آگئے، قائداعظم سے ملے اور یہیں رہ گئے، اسی طرح چندریگر بھی آگئے، نواب اسمٰعیل میرٹھی کے بچے تو یہاں آگئے لیکن خود وہیں رہ گئے، حتیٰ کہ گوشہ نشین ہو کر رحلت فرما گئے، ذبیح ان کا تخلص تھا، عیدالاضحیٰ کے دن انتقال کیا، تخلص سے اُن کی تاریخ وفات نکلتی ہے،

(۵) لیگ کے پاس جتنے فنڈ تھے، مثلاً بہار فنڈ کا ۵، لاکھ اور لیگ فنڈ کا ۸۳ لاکھ وہ سارا روپیہ پاکستان منتقل ہو گیا، یہاں اپنے زمانۂ اقتدار میں اس روپیہ پر

صدر ایوب قابض ہو گئے۔

(۶) اُمراء کا ایک بڑا حصہ جنہیں اربابِ حل وعقد کہتے ہیں وہ اپنی جائیدادوں کو ٹھکانے لگا کے آیا یا پاکستان پہنچ کر ان کا سودا کر لیا لیکن غرباء کے لیے دونوں حالتوں میں اکثر وبیشتر کوئی پُرسانِ حال نہ رہا۔

(۷) بعض نواب زادے داشتاؤں اور کُتّوں کو بھی پاکستان لے آئے، ان کا بال تک بیکا نہ ہوا لیکن غرباء کے لیے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو ساتھ لانا اجیرن ہو گیا۔

جیسا کہ عرض کیا اس حال میں ہندوستانی مسلمان کٹے ہوئے پتنگ کی طرح تھے ان کا کوئی والی وارث ہی نہ رہا تھا، جمعیتہ العلماء کے اکابر مسلمانوں کو سہارا دے رہے تھے، یا بعض جگہ مقامی نیشنلسٹ مسلمانوں نے ڈھارس بندھانی چاہی مگر روگ اتنا عظیم تھا کہ ان کے پاس اس کا علاج ہی نہ تھا، مسلمانوں کو صاف صاف کہا جا رہا تھا، بھاگ جاؤ، نہیں تو ہندوؤں کا موقف تھا انہیں لوٹ لو، مار ڈالو، جلادو، اور قافلے تھے کہ لُٹ پٹ اور اور کٹ پھٹ کر آ رہے تھے، دہلی کا مسلمان بالکل ہی اکھڑ گیا، گاندھی جی کی تحریک پر ۲۴ گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا لیکن بے سُود، شرفاء کے گھرانے بھاگ دوڑ کر ہمایوں کے مقبرے اور مغلئی عہد کے دوسرے کھنڈروں میں پناہ گزیں ہو گئے، گاندھی جی کو ان کے بیٹے رام داس گاندھی نے خط لکھا کہ ایک زمانہ میں کوہاٹ کے بلوے پر مولانا شوکت علی نے آپ کو خط لکھا تو آپ پالیٹکس چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے، اب مسلمانوں کو سبق سکھانے کا موقع ملا ہے تو آپ مرن برت کی دھمکی دے رہے ہیں، آپ کا وجود ہندو جاتی کے لیے سخت نقصان دہ ہے، یہ بیٹے کا خط باپ کے نام تھا، دوسرے ہندوؤں کا جو حال تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔

چودھری خلیق الزماں راوی ہیں کہ انہیں بھی گاندھی جی نے کہا تھا۔

"میں اس مسئلے میں جان کی بازی لگا دوں گا لیکن مسلمانوں کا ہندوستان

کی سڑکوں پر رینگنا کبھی گوارا نہ کروں گا ان کو یہ اطمینان سڑکوں پر چلنا
نصیب ہونا چاہیے۔"

گاندھی جی نے تار دے کر آزاد ہند فوج کے جنرل شاہنواز کو ان کے گھر سے بلوایا اور اُن کے سپرد یہ کیا کہ وہ دہلی کی ویران مسجدوں کو، جنہیں بیت الخلاء بنا دیا گیا ہے، صاف کرائیں، اور آباد کریں، اس کے علاوہ دہلی کے مسلمانوں کو سہارا دیں انہیں روکیں کہ وہ بھاگیں نہیں اور نہ اپنے گھروں کو چھوڑیں، گاندھی جی نے ان سے کہا:

"شاہنواز! دہلی سے مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے، تو پھر ہندوستان
میں کہیں ٹِک نہ سکیں گے"

گاندھی جی نے سردار پٹیل کو پے در پے خط لکھے کہ وزیر داخلہ کی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کی آبرو، جان اور جائیداد بچانا ان کا فرض ہے لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا، بیس کروڑ روپیہ جو معاہدۂ تقسیم کی رُو سے پاکستان کو ملتا تھا وہ پٹیل نے روک لیا، گاندھی جی نے جلسۂ عام میں مذمت کی اور وہ روپیہ دلوایا، انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق سردار پٹیل کو نومبر ۱۹۴۷ء میں لکھا کہ:

(۱) مفلوک الحال مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد یہاں برلامندر سے قریب پڑی ہے، اِن سب کے لیے یہاں ٹھہرنا مشکل ہے، ضرورت ہے کہ ان کے لیے بہت جلد کسی کیمپ کا انتظام کرو۔

(۲) حکومت کی طرف سے اعلان ہونا چاہیے کہ مسجدوں کا تحفظ کیا جائے گا، اور انہیں عبادت کے سوا کسی دوسرے کام میں نہیں لایا جائے گا، اور اگر کسی مسجد کو نقصان پہنچا تو اس کے نقصان کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔

(۳) حکومت کی طرف سے کسی مسلمان کو انڈین یونین سے زبردستی

خارج نہیں کیا جائے گا۔

(۳) وہ تمام ناجائز معاہدات اور معاملات جو مسلمانوں کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے کیے گئے ہیں، کالعدم سمجھے جائیں گے، تاکہ ان کے مسلمان مالک ان میں آباد ہو سکیں۔

جنرل شاہنواز نے اپنے بعض ہندو اور مسلمان ساتھیوں کو لے کر بعض تاریخی مسجدوں کو صاف کرنا شروع کیا، زینت المساجد اس وقت بول و براز کا سٹور بنی ہوئی تھی، شاہنواز نے مجھ سے بیان کیا کہ فضلہ اور میلا اتنا تھا کہ مسجد کی صفائی میں دو دن لگ گئے وہ خود سر پر ٹوکریاں اٹھا کر صفائی کرتے رہے، جب ارد گرد کے نیک دل ہندوؤں اور سکھوں کو معلوم ہوا کہ جنرل شاہنواز خاکروبی کر رہا ہے تو وہ بھی آکر شریک ہو گئے۔

گاندھی جی شاہنواز کو ساتھ لے کر خواجہ بختیار کاکی کے عرس پر گئے، وہاں ہزارہا مسلمانوں کا ایک کیمپ تھا، سجادہ نشین یہ کہہ کر پاکستان بھاگ آئے کہ انہیں حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا ہے کہ ہم پاکستان جاتے ہیں تم بھی پاکستان چلو، گاندھی جی نے رسومات پوچھ پاچھ کر مزار کو غسل دیا، سورۃ فاتحہ پڑھی پھر دعا مانگی۔

"اے اللہ کے نیک بندے میری قوم نے تیری قوم پر جو ظلم ڈھائے ہیں میں ان کی معافی مانگنے آیا ہوں تو انہیں معاف کر دے۔"

وہاں سے گاندھی جی ہمایوں کے مقبرے پر گئے تو سینکڑوں پناہ گزیں مسلمان ان کے پاؤں پڑ گئے، اکثر ڈھائیں مار مار کر رونے لگے۔ گاندھی جی نے اُن کو تسلی دی اور کہا،

"تم مسلمان ہو اور مسلمان ایک اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا، سجدہ صرف اللہ کو ہے، اس طرح جھک کر تم گناہ کر رہے ہو، حوصلہ

قائم رکھو اللہ تمہاری مدد کرے گا ۔

واپس آکر گاندھی جی نے شاہنواز سے کہا :

"مسلمانوں کی حالت واقعی خراب ہے ، مجھے بتاؤ کہ شہر کے اندر ان کی عام حالت کیسی ہے ؟

شاہنواز نے کہا :

" مہاتما جی ! مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم ہے ، پنجاب کے سکھ کوٹھوں کی چھت پر چڑھ جاتے اور ان کی پردہ دار خواتین کے سامنے الف ننگا ہو کر کہتے ہمیں مکان خالی کر دو ورنہ یہ (عضو کی طرف اشارہ کر کے) گھسیڑ دیں گے ۔"

"شاہنواز تم سچ کہتے ہو ؟"

" بالکل سچ ہے مہاتما جی !"

گاندھی جی نے کہا :

" شاہنواز اگر حالت یہ ہے تو پھر گاندھی کے لیے زمین کی پیٹھ سے ملی کا پیٹ بہتر ہے ، اس سے مر جانا اچھا ہے ۔" چنانچہ گاندھی جی نے آناً فاناً مرن برت رکھنے کا اعلان کر دیا ۔

سردار پٹیل ناراض ہو کر بمبئی چلے گئے ، کانگرس میں کھلبلی پڑ گئی ، کانگرسی رہنماؤں نے بہت جھوٹ بولا کہ ہم امن قائم کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں ، لیکن گاندھی جی راضی نہ ہوتے انہوں نے کہا سوال اب صرف ذمہ داری کا نہیں ، اصل سوال امن قائم ہو جانے کا ہے ۔

ہائی کمانڈ نے کہا امن قائم ہو گیا ہے ،

گاندھی جی نے شاہنواز کی طرف دیکھا اور کہا ، شاہنواز ، یہ لوگ سیاستدان ہیں اور سیاستدان ایسے موقعوں پر سچائی سے ہاتھ اٹھا لیا کرتے ہیں ، تم سپاہی ہو ، بتاؤ یہ ٹھیک

کہتے ہیں، کیا واقعی مسلمانوں کو اطمینان نصیب ہو گیا ہے؟

شاہنواز نے انکار کیا، ہائی کمانڈ کے بعض افراد ناراض بھی ہو گئے لیکن گاندھی جی نے برت چھوڑنے سے انکار کر دیا، اس انکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی گرتی ہوئی دیوار ٹھہر گئی اور وہ بھگدڑ جو مچی ہوئی تھی رُک گئی، انہیں جانے یا ٹھہرنے کے لیے سکون ہو گیا۔

چودھری خلیق الزمان اپنے سوانح و افکار میں لکھتے ہیں کہ:

"سیاسی عقائد جب رنگ پکڑ لیتے ہیں تو عوام و خواص دونوں کے دماغوں سے ٹھوس حقیقتیں بیگانہ ہو جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا کوئی سوال نہ تھا، مگر جب صحیح حالات کا اندازہ ہوا تو ہندو اکثریتی صوبوں کے مسلمان مستقبل کے افکار میں گرفتار ہو گئے وہ یاد کرتے تھے کہ پاکستان کا عقیدہ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے قائم کیا گیا ہے کیونکہ شمال مغربی اور مشرقی مسلم حصّوں میں، تو یُوں بھی مسلمان کہیں ستّر اور کہیں پچپن فی صد تھے، جن کے لیے تحفظات کی ضرورت نہ تھی، پھر جب ان حصوں سے مُسلم اقلیّتوں کا کوئی سروکار نہ رہ جائے گا تو وہ اقلیّتیں بالکل بے بسی ہو جائیں گی، اسی لیے ۳ جون کے بعد ان کے ذہن پر ایک بڑا بوجھ پڑ گیا، اور وہ اس کے نیچے دبنے لگے، ان پر یاس طاری ہونے لگی، دوسری طرف پاکستانی حصّوں کے ہمارے ساتھی اپنا اپنا مستقبل بنانے کی فکر میں لگ گئے، اور قدرتاً ان کو ہم سے صلاح مشورہ کرنے میں دقّتیں محسوس ہونے لگیں، جو کل تک ہمارے ساتھی سپاہی تھے وہ آج کچھ بیگانہ ہو گئے، ادھر ملک میں دو قومی نظریے نے تفرقہ ڈال دیا، اور جو لوگ پاکستان بنوانے کی سعی میں پیش پیش تھے ان سے سخت عناد ہو گیا تھا (صفحہ ۱۰۵)۔"

احرار کا سیاسی مستقبل ختم ہو گیا، امرتسر میں فسادات کا آغاز ہوا تو شاہ جی

بچوں سمیت لاہور آگئے، اور دفتر احرار میں ٹھہرے رہے، انہوں نے ۱۴ اگست کے بعد جالندھر میں رہنے کا ذہنی فیصلہ کر لیا، مولانا حبیب الرحمٰن اور ماسٹر تاج الدین انصاری لدھیانے بیں تھے، اوران کے کسی دوسری جگہ رہنے کا سوال ہی خارج از بحث تھا شیخ حسام الدین کا گھرانہ امرتسر میں تھا اور وہیں رہنا چاہتے تھے۔ مولانا محمد علی جالندھری ملتان میں بس گئے۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادکے تھے، ان دونوں بزرگوں نے دفتر احرار کو ملتان لے جانے اور وہاں تبلیغی کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا، فیض الحسن شاہ گدی نشین تھے، ان کے اعزہ حکومت میں تھے یا لیگ میں، انہیں جماعت کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا، نوابزادہ نصراللہ خاں کے لیے نقل مکانی کا سوال ہی نہ تھا وہ خان گڑھ کے سب سے بڑے زمیندار تھے، ایک لے دے کر میں تھا جو لاہور میں پڑا تھا اور لاہور ہی میں رہنا چاہتا تھا، اخبار آزاد مالی مشکلات کے بوجھ سے بند کر دیا گیا اور اب شاید اُس کی ضرورت ہی نہ رہی تھی،

شاہ جی کے سوا تقریباً سب لوگ ہفتہ پہلے گھروں کو چلے گئے لیکن ۱۲ اگست کو معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا، امرتسر پولیس کے مسلمان اہلکار ہانپتے کانپتے آگئے، انہوں نے بتایا کہ ہندو اور سکھ افسروں نے ان سے اسلحہ چھین لیا اور کہا ہے کہ پاکستان چلے جاؤ، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی نال اکھڑ گئی ہے وہاں کوئی مسلمان نہیں رہ سکتا۔ سب سے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن لاہور آگئے، پھر شیخ حسام الدین، آخر میں ماسٹر تاج الدین انصاری، عجیب انقلاب تھا کہ لوگ پناہ مانگتے تھے اور انہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔ تقدیر پلٹ گئی اور تدبیر الٹ گئی، چودھری خلیق الزمان نے پاکستانی صوبوں کے جن ساتھیوں کی بے اعتنائی کا ذکر کیا ہے ٹھیک ایسا ہی گلہ صوبہ سرحد کے خان بھائیوں کو کانگرس سے تھا کہ اُس نے بیچ منجدھار کے انہیں چھوڑ دیا ہے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خان عبدالغفار خان کی ملاقات قائد اعظم سے کرادی تھی، قائد اعظم نے ان سے میل ملاپ

کا وعدہ بھی کر لیا تھا، لیکن خان عبدالقیوم خان اور اس کے ہمنواؤں نے قائداعظم کی رائے کو مکدر کر دیا، کننگھم نے اس رائے کو اور برہم کیا، ظاہر ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد لیگ کے شہزادے یہ نہیں چاہ سکتے تھے کہ خان عبدالغفار خاں یا ان کے ساتھیوں کا اقتدار رہے یا وہ قائداعظم سے قریب ہو جائیں، قائداعظم جیسے قانونی اور دستوری آدمی نے خان وزارت کو اس کی واضح اکثریت کے باوجود توڑ دیا، یہ پہلا آئینی حملہ تھا جو برِعظیم کے سب سے بڑے دستوری رہنما اور پاکستان کے گورنر جنرل نے ایک آئینی وزارت پر کیا، اور اس کی جگہ ارکانِ اسمبلی کی واضح اقلیت کا لیڈر عبدالقیوم خاں جو صرف اقتدار کا پجاری تھا، صوبہ کا وزیراعلیٰ بنا دیا اُس شخص نے صوبہ سرحد کو پاکستان کے لیے پرابلم بنا دیا، قائداعظم کے ذہن کو اتنا آلودہ کیا کہ انہوں نے اپنا وعدہ ترک کر دیا۔ خان عبدالغفار خان سے قائداعظم نے وعدہ کیا تھا کہ سرحد آکر وہ سرخپوشوں کے مرکز سرور باب جائیں گے، لیکن کننگھم اور قیوم نے ان سے کہا کہ سرخپوش انہیں قتل کرنا چاہتے ہیں، قائداعظم سرحد گئے تو سرخپوشوں نے ان کے استقبال کی عظیم الشان تیاریاں کی ہوئی تھیں، قائداعظم نے انہیں دھتکار دیا، اور کننگھم پارک میں تقریر کرتے ہوئے سرخپوشوں کو پاکستان دشمنی کا الزام دیا، خان عبدالقیوم نے اس کے بعد سرخپوشوں پر جو مظالم کیے، بھابڑہ فائرنگ سے لے کر قاضی عطاء اللہ کی موت تک وہ پاکستان کے اندرونی سانحات میں سے ایک المیہ تھا، اس المیہ کے بعد خان عبدالقیوم نے لیگ کے سبھی مقتدر رہنماؤں کو ذلیل کیا، پنجاب کے سیاسی خوردہ فروشوں نے اسے مردِ آہن کا لقب دیا، لیکن جونہی اس مردِ آہن کا اقتدار ختم ہوا تو سرحد سے بھاگ کر لاہور میں آگیا اور جب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے قید ہوا تو آن واحد میں معافی مانگ کر رہا ہو گیا، لیکن یہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بہت بعد کی باتیں ہیں ۔

ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی لوٹ مار کا بازار گرم تھا صبح وشام آگ لگتی، گولیاں چلتیں، انسان مارے جاتے اور ادھر اُدھر کے اسٹیشنوں پر گاڑیاں روک کر قتلِ عام کیا جاتا، مشرقی پنجاب سے ڈاکٹر کچلو کو بھی نکلنا پڑا، وہاں کسی جماعت کے لیے جگہ رہ گئی تھی تو وہ صرف قادیانی تھے، جن کے متعلق ایک کانگرسی رہنما نے لکھا تھا کہ وہ دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ سچے ہندوستانی ہیں کہ ان کا نبی عرب سے نہیں، ہندوستان سے ہے، سکھوں اور ہندوؤں کے بعض رہنماؤں کا خیال تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں جب کبھی اشتراک یا انضمام کا موڑ آیا تو قادیانی جماعت ہی بہترین ذریعہ بن سکتی ہے کیونکہ اُن کی وفاداری ایک تو عرب اسلام سے نہیں دوسرے انہیں دنیا کے مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں، یہ انہیں کافر سمجھتے ہیں، تیسرے وہ مدینہ سے کہیں زیادہ قادیان کے وفادار ہیں۔

انسان کیا ہے اور کیا نہیں ؟ یہ سوال ہمیشہ معمہ رہا ہے، اس بات کی ٹوہ لگانا بڑا مشکل ہے کہ اس کے خیر وشر کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ملک کی تقسیم بلاشبہ ایک انقلاب تھا لیکن اس کے ساتھ ہی المیہ بھی تھا، ہر انقلاب ایک المیہ ہوتا اور اس کے نتائج بڑے سنگین ہوتے ہیں، انقلاب آتا ہے تو خود انقلابی قوتیں حیران رہ جاتیں اور ان کا ایک بڑا حصہ اس کے برگ و بار سے خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ یہ وہ تو نہ تھا جو ہم چاہتے تھے، لیکن انقلاب بہر حال ایک نظام کی اجتماعی موت اور اُس کے مظاہر کو تہس نہس کر دینے کا نام ہے۔

پاکستان کی تحریک کے نتیجے وہی ہو سکتے تھے جو برآمد ہوئے، عوام کبھی کسی انقلاب کے برگ و بار سے واقف نہیں ہوتے وہ محض قومی ولولوں کی منظم قوت کا نام ہیں، لیکن جب انقلاب برپا ہوتا تو سب سے زیادہ لرزہ براندام وہی عوام ہوتے ہیں جن کی طاقت اس انقلاب کی خالق ہوتی ہے، ایک بڑے سے بڑا اور اچھے سے اچھا

انقلاب بھی اگر قبل از وقت اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ نتائج و آثار دکھا دے تو شاید بہت سے انقلاب رُک جائیں، لیکن انسان بہر حال انقلاب کا خواہاں رہتا اور انقلاب چاہتا ہے اور یہ انقلاب تو ایک قدرتی ردِّ عمل تھا۔

پاکستان کے قیام کی خاطر جو خون خرابہ ہُوا اور مسلمانوں کو جو قیمت ادا کرنی پڑی وہ غیر متوقع نہیں بلکہ متوقع تھی۔ قوموں کی زندگی انہی حادثوں سے بنتی ہے، ایک کا خون دوسرے کے چہرہ کا غازہ ہوتا اور ایک کی ہڈیاں دوسرے کے سہرے کا پھول ہوتی ہیں، شاخیں کاٹنے ہی سے پھول کھلتے اور ٹہنیوں کا حسن نکھرتا ہے ــــ پاکستان بلاشبہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہر نوعی قربانی کا نام تھا، نعرے ہمیشہ طربناک ہوتے ہیں، مظاہرے خطرناک اور مجاہرے اندوہناک، پاکستان کے سفر کو عوام اگر گلگشتِ چمن سمجھے تھے تو یہ ان کا حسنِ ظن تھا جو قومی سیاست میں جذباتی نعروں کی وجہ سے عموماً پیدا ہو جاتا ہے، اگر سات آٹھ لاکھ مسلمانوں کی بے دریغ قربانی سے پاکستان میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہو جاتی تو کوئی قیمت نہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ رہنماؤں کے وعدے روز بروز دو شنبہ کی کہہ مکرنی ہوتے گئے، مَیں نے روزنامہ آزاد میں لکھا تھا کہ اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمان اور پاکستان میں اسلام نہیں رہے گا، ہندوذہنیت کوشاں ہوگی کہ ہندوستان کے مسلمان مرتد ہو جائیں، قتل ہو جائیں یا مفرور ہو جائیں، مسلمانوں کو پاکستان میں رفتہ رفتہ جن لوگوں سے واسطہ پڑے گا وہ اسلام کے عائد کردہ فرائض سے پہلوتہی کریں گے، وہ پاکستان میں اسلام کا ایک نیا تجربہ کریں گے، ان کی اندرخانہ کوشش ہوگی کہ پاکستان ایک سیکولر اسٹیٹ بن جائے جو اُمراء کے ہاتھ میں دست پناہ ہو لیکن یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ پاکستان اسلام کی ریاست بنے یا عوام کی ریاست ہو، پاکستان واقعی ایک تاریخی ضرورت کا اظہار تھا اس کے نتائج میں کمی رہی یا آثار میں خرابی پیدا ہوئی تو اس کے وجوہ ہیں، مثلاً:

اوّلاً: اس قسم کی تحریکوں میں عوام چلتے نہیں دوڑتے ہیں یا بیٹھ جاتے ہیں۔

ثانیاً، جب کوئی بھی تحریک کسی فکری آمریت کے حوالے ہو جاتی ہے تو اس کا نتیجہ بہت سے دماغوں کی سوچ کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

ثالثاً، جب عقلیں خود سپردگی کے عالم میں آجاتی ہیں اور جوش بے قابو ہو جاتا ہے تو قدرتی ردِ عمل منفیانہ ہوتا ہے۔

رابعاً، تحریکِ پاکستان ایک حکمران استبداد سے کہیں زیادہ ملک کی ہندو اکثریت کے غلبہ و استیلاء کے خلاف مسلمان اقلیت کا بے پناہ احتجاج تھا اس کا اصل نشانہ وہ لوگ تھے جو انگریزوں سے نبرد آزما رہے، اور جن کی سیاسی جدوجہد ہم سے زیادہ کڑے مرحلوں میں سے گزر چکی تھی اور ہم سے زیادہ اُن کا مزاج سیاسی ہو چکا تھا۔

خامساً، لیگ نے قائد اعظم کے سوا ہر شخص پر اعتماد کو متزلزل کر دیا تھا جو ان کے ساتھ تھے وہ صرف انہی کے نائب تھے ان سے الگ ہو کر ان کی شخصیت صفر ہو جاتی تھی، اور جو ان کے ساتھ نہیں تھے وہ مسلمانوں میں متروکاتِ سخن ہو گئے تھے۔

سادساً، جن لوگوں نے تحریکِ پاکستان کو جوش و غضب اور قربانی و ویرانی کے اس مقام تک پہنچایا تھا وہ اپنی تحریک کے اسباب و علل کی تبلیغ میں نتائج و حوادث سے بیگانۂ محض تھے۔

مرحوم میاں بشیر احمد (سابق سفیر ترکی) نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ لیگ نے عبوری حکومت میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا تو ہم نے قائد اعظم سے کہا کہ وہ بھی شریک ہوں، کیونکہ کانگرس کی بڑی بڑی توپیں شامل ہو گئی ہیں، قائد اعظم نے کہا:

"لیگ کو کس کے حوالے کر دوں؟"

ہم نے کہا آپ کے خادم موجود ہیں۔

قائداعظم نے کہا میرے سوا قوم کسی پر اعتماد نہیں کرتی! اس فقرہ کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے لیکن ایک سوال واضح ہے کہ جس مجلس عاملہ کے متعلق قائداعظم کا اپنا خیال یہ تھا عوام اس کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتے تھے ؟ مسلمان عوام محبت کرتے ہیں تو انسانوں کو خدا بنا دیتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں تو یہود کی طرح اپنے ہی پیغمبروں کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

چودھری خلیق الزمان نے اپنی سوانح عمری میں لیگ کی مجلس عاملہ کو جی حضوریوں کا طائفہ لکھا اور کئی باتوں کو اخفا میں رکھا ہے، عبدالماجد دریا آبادی نے انہیں ایک خط میں لکھا ہے اور یہ خط اُردو ایڈیشن میں موجود ہے۔

"ڈر رہا تھا کہ جناح صاحب کے ذکر میں بڑی ہی تلخی ہو گئی، الحمدللہ کہ یہ بات بھی نہ ملی، مسائل پر تنقید دوسری شے ہے اور لہجہ کی بلاوجہ تلخی دوسری شے" (صفحہ ۵۵)

چودھری صاحب نے بنیادی اختلافات کی بعض نظیریں حوالۂ قلم کیں اور بعض قلمزد کر دی ہیں، مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ:

(۱) عبوری حکومت میں خواجہ ناظم الدین اور نواب اسمٰعیل خاں کا نظر انداز کیا جانا اور اس کی جگہ جوگندر ناتھ منڈل کو شریک کرنا جبکہ وہ کانگرس کو اُس کے اپنے کوٹے میں سے کسی غیر لیگی کی نامزدگی کا حق دینے کو تیار نہ تھے، دوسری وجوہات کے علاوہ دو قومی نظریے کے بھی خلاف تھا۔

(۲) یہ مسئلہ آج بھی مابہ النزاع ہے کہ مسٹر جناح نے گورنر جنرل کے عہدہ کا مطالبہ کر کے پاکستان کے لیے کوئی اچھا اقدام کیا یا نہیں؟ اس ہولناک دور میں اتنی عظیم ذمہ داری اپنے سر لے کر مسٹر جناح نے قیامِ امن کے بار کو اُن کے سر سے اُٹھا کر اپنے سر لے لیا اور نادانستہ طور

کو آزاد کر دیا کہ وہ اطمینان سے بیٹھ کر دیکھتا رہے۔

(۳) ریڈ کلف کو باؤنڈری کمیشن کا سربراہ ماننے اور ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل نہ بنانے کے دو متضاد فیصلوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان سے گورداسپور کے انقطاع نے ہندوستان کے لیے کشمیر پر قبضہ کا راستہ ہموار کر دیا۔

بہر حال جو کچھ ہُوا وہ ناگزیر تھا، دونوں قومیں برطانوی ہندوستان میں اپنے اختلافات کو اس حد تک لے گئی تھیں کہ ان میں متحدہ قومیت کے آثار کا پیدا ہونا ناممکن تھا، لیکن فرقہ وارانہ سیاسی تحریکوں کی اصل چونکہ اخلاقی قدروں پر نہیں ہوتی اور ان میں عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے مذہب کو صرف فائدہ اٹھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا مذہب کے نام پر جو کچھ ہُوا یا جو کچھ ہو رہا تھا وہ مذہب کے خلاف تھا، غنڈوں نے مذہب کو اپنی مرضی کا نام دے دیا تھا ــــــ ان لوگوں نے ہندو مت، سکھ دھرم اور دین اسلام کے نام پر اتنے مظالم کیے تھے کہ شرفاء کو مذہب کا نام لیتے ہوئے حجاب آتا تھا، وہ ہندو، سکھ اور مسلمان سے بالا رہ کر انسان کی بات کرتے تھے لیکن حقیقتاً ان کے اندر سے اخلاق، مذہب اور انسانیت کا جنازہ اٹھ چکا تھا۔

لوگوں کو مفت کی دولت اور لوٹ کی عصمت کا چسکا پڑ گیا تھا، بڑے بڑے لوگوں نے ہاتھ رنگے، اعلیٰ سے اعلیٰ قابلِ افسروں کی کوٹھیوں میں چلے گئے، بڑے بڑے بنگلوں کا سامان ان کے بنگلوں میں پہنچ گیا، لڑکیاں تبرک کی طرح تقسیم ہو گئیں، بزازی کی بڑی بڑی دوکانوں کے تالے تڑوا کر قیمتی کپڑوں کو بیگمات نے اُڑا لیا، کئی افسروں نے لوٹ کے اس مال سے اپنے بچوں کی شادیاں کیں، فرنیچر کی دوکانوں کا مال بعض سرکاری بنگلوں کی رونق ہو گیا، بعض مالدار علاقوں کے تھانیداروں نے دولت سے ہاتھ رنگے، ان کے پاس منوں سونا جمع ہو گیا، کئی مجاہد مدتوں کافر لڑکیوں پر مشق کرتے رہے، وہ طائفے بنا کر دوکانوں اور مکانوں کو لوٹتے، رات شام کے جھروکوں سے جھانکتی تو بالاخانوں

میں چلے جاتے اور اس روپے سے دادِ عیش لیتے، بعض سیاسی ٹارزن اپنی بیویاں چھوڑ کر بازاری امرتیوں کے ہو گئے، ان لوگوں کا چسکا کیونکر ختم ہو سکتا تھا ایک دفعہ خون منہ کو لگ جائے تو عمر بھر ہی ذائقہ لگا رہتا ہے۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر"اُس بازار" کی مخلوق نے شبخون مارنے شروع کیے کئی لڑکیاں اور اکثر عورتیں جو مشرقی پنجاب کے درندوں سے بچ کے آئی تھیں کلمہ گویوں کے ہتھے چڑھ گئیں، ہمدردی کے نام پر بازاریوں نے گُل کھلاتے، نائکہ عورتیں امداد کے لیے آتیں اور بیداد کے لیے لے جاتیں، والٹن ٹرینگ کیمپ میں اس طرح کے سینکڑوں حادثے ہو گئے، کمسن بچیوں کا ایک غول تھا جن کے والدین راستہ میں کٹ گئے یا جنہیں ستلج اور بیاس کے پانی نے اپنی آغوش میں لے لیا یا جنہیں ٹرینوں سے اُتار کر قتل کر دیا گیا، ان کی اولادیں"سرمۂ مفت نظر" کے طور پر بک گئیں، مَیں نے"اُس بازار میں" (تاریخ فحاشی) ان لڑکیوں کے انٹرویو دیئے ہیں، نیلم کی کہانی ایک ایسی ہی دُکھیا لڑکی، اس کی مجبور بہنوں اور اندھے باپ کی کہانی ہے، پٹیالہ سے مہاجر ہو کر نکلے، لاہور پہنچ کر پناہ گزین کہلائے، اُس بازار میں فروختنی ہو گئے، مشہور موسیقارِ اور پلے بیک سنگر نسیم بیگم ایک ایسی ہی لڑکی تھی جس کو اس کی اعزازی ماں نے چند روپوں میں اس کے بدنصیب ماں باپ سے خریدا تھا، اس وقت اس کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی، اس نے امرتسر کی مشہور ڈیرہ دارنیوں (شمشاد، امتیاز، ممتاز اور شہناز) کے ہاں پرورش پائی، تاناری ری سیکھی، اور ایک نامور مغنیہ ہو گئی، لیکن بدیوں کے اس طوفان سے متعاقب نیکیوں کا ایک ریلا بھی چلا آ رہا تھا، انسان مرا نہیں انسان زندہ تھا، اور محسوس کر رہا تھا کہ ہم آگ اور خون کے جس دریا کو عبور کر رہے ہیں وہ ہمارے حوصلوں کو توڑ نہیں سکتا، نیکیاں قدرت کا عطیہ ہیں، ہم ان سے بدعہدی نہیں کر سکتے، ہم اس آگ کو گلزار بنا سکتے ہیں، ہم اس دریا کو پار کر سکتے ہیں، ہمارے ارادے ہماری کشتیاں

ہیں اور ہمارے بازو ہمارے چپّو۔

دفتر ٹھاپان تقسیم سے پہلے ایک ہوٹل تھا۔ ہم نے سارھستی کے اِس زمانہ میں اس کے دروازے مہاجرین پر کھول دیتے تھے، شب برات تھی، مَیں جنرل شاہنواز اور مخدوم شاہ بنوری کے کمرے سے نکل کے گھر واپس جا رہا تھا کہ میرے کان ایک نسوانی قرأت کی طرف پلٹ گئے، قرأت میں بلا کا سحر تھا، دروازہ اندر سے بند تھا، عفیفہ خاتون بڑے گداز کے ساتھ کلام پاک کی تلاوت کر رہی تھی، محسوس ہوا کہ وہ رو بھی رہی ہے، اس کی ایک بیٹی تھی چھ سات برس کی، انتہائی خوبصورت، گویا کسی نے شہد، دودھ، مکھن اور بالائی کا آمیختہ تیار کیا ہے۔ مَیں اکثر اس کو اپنی بیٹی شائستہ کا ہم شکل پا کر اٹھا لیتا، اور دیر تک پیار کرتا، یہ لوگ یوپی کے کسی شہر سے آئے تھے، مہذّب، نستعلیق اور شائستہ ایک دن اُس بچّی نے کہا میری امّی بلاتی ہیں، مَیں دروازہ پر جا کر رُک گیا، اُس نے کواڑ کی اوٹ سے مجھے کہا،

اُس بچّی کے ابّا مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں، جاتی دفعہ مجھے ایک شخص کے حوالے کر گئے تھے کہ اِس کے ساتھ کچھ دیر رہ کر ریل ادا کرنا اور جہاں سینگ سمائیں چلے جانا، وہ شخص میرے ساتھ دو راتیں گزار کر کچھ دیئے بغیر چلا گیا ہے، اب میرے پاس کچھ نہیں" اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"کہاں گئے ہیں اِس کے ابّا؟

"وہ سامنے کے اُس کمرے کی آوارہ عورت کے ساتھ اُڑنچھو ہو گئے ہیں، اور جاتی دفعہ میرے میکے کا زیور بھی لے گئے ہیں۔"

اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ مَیں نے اس کو دلاسہ دیا، بل کا فکر نہ کرو، یہاں رہو، آئندہ کوئی غیر نہیں آئے گا، جس چیز کو جی چاہے بیرے کو کہہ کر منگوا لو، انشاءاللہ ایک

دو روز میں کوئی بہتر شکل بن جائے گی۔"

میں نے یہ ساری کہانی جنرل شاہنواز اور مخدوم شاہ بنوری کو سنائی، وہ ششدر رہ گئے، لیکن اگلی ہی صبح اس کا خاوند بھی آ گیا، معلوم ہوا جس بازاری عورت کے ساتھ بھاگ کے گیا تھا وہ زیور لے کر چمپت ہو گئی ہے، شاہنواز نے اس کے خاوند کو بلایا، اس سے حقیقتِ حال پوچھی، اس نے تسلیم کیا، شاہنواز ایک فوجی تھا، غصہ میں آ کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور ہنٹر اٹھا کر اس بُری طرح پیٹا کہ اس کی چیخیں دُور دُور تک سنائی دینے لگیں، اتنے میں وہ عورت جو واقعی گلاب کا پھول تھی بیقرار ہو کے باہر آ گئی، چہرے پہ گھونگھٹ تھا۔

"آپ ان کو معاف کر دیں، میرے میاں ہیں۔"

شاہنواز نے اس کے خاوند سے پوچھا:

"یہ تمہاری بیاہتا ہے، تم نے اس کے ساتھ نکاح کیا تھا؟"

"جی ہاں"

"یہ بچی تمہاری ہے؟"

"جی ہاں"

"اس کے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"قتل ہو گئے ہیں"

"اچھا اس کے پاؤں پر سر جھکاؤ، پیروں کو بوسہ دو، توبہ کرو، اور قرآن پہ حلف اٹھاؤ کہ آئندہ ایسا نہیں کرو گے۔"

اس عفیفہ نے کہا ـــــ "میرے میاں ایسے نہیں تھے ان سے غلطی ہو گئی ہے میں ان سے معافی مانگتی ہوں، اور آپ سے بھی آئندہ کبھی ایسا نہیں کریں گے میرا دل گواہی دے رہا ہے۔"

شاہنواز کب مانتے تھے، اُس کو عفیفہ کے پاؤں پر جھکایا، قرآن پر چھوایا اور عہد لیا کہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت کا تصور بھی نہیں کرے گا ایک ہفتہ کے اندر اندر مَیں نے لاہور کے ڈی آر سی سے مل کران کو ایک بھرا پُرا مکان لے دیا، پھر وہ کراچی چلے گئے، اب سُنا ہے لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔

۱۳ اگست کی رات بہر حال ختم ہو رہی تھی، اور یہ تھا ۱۴ اگست کا سر آغاز۔ نصف شب بارہ بج کر ایک منٹ پر ریڈیو نے پاکستان بن جانے کا اعلان کیا۔ کلام اللہ پڑھا گیا، ظفر علی خاں کی نعت گوائی گئی، پھر — ع

اَے قائداعظم تیرا احسان ہے ہم پر

گایا گیا، ہم لوگ جو آزادی کے لیے سالہا سال جیل میں رہے اور جن کا ایک ہی نصب العین تھا کہ اس ملک پر انگریزوں کا کوئی حق نہیں ہے، اس طرح چھپتے پھر رہے تھے جس طرح ایک بیوہ اپنے آنسوؤں کو بھائیوں کے خوف سے آنچلوں میں چھپاتی اور رُندھے ہوئے گلے میں جذبات دفن کر کے ٹوٹی پھوٹی قبر ہو جاتی ہے۔

ابھی پَو نہ پھٹی تھی کہ "الصلوٰۃ خیر من النوم" کی دلفریب صدا بلند ہو رہی تھی، اَللہ بڑا ہے کا اعلان ہو رہا تھا ——— مَیں نماز پڑھ کر سو گیا، دوبارہ اٹھا تو ریڈیو بج رہا تھا" یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے، قاری قرآن پاک کا ترجمہ سنا رہا تھا:

"ان کو مُردہ مت کہو، جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔

کراچی سول ہسپتال
۲۱ اگست ۱۹۶۸ء
چار بجے شام

شورش کاشمیری
(یہ ایّامِ اسیری)

قید و بند کی
دو اور کہانیاں
● ــــ المیے
● ــــ حزنیئے
● ــــ سانحے
تمغۂ خدمت
چھ ستمبر ۱۹۶۶ء کو ایوب خان کی حکومت نے شورش کاشمیری کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر کے ساہیوال میں نظر بند کر دیا، پھر ۲۳ دسمبر ۱۹۶۶ء کو میو ہسپتال لاہور سے رہا کر دیا۔ ع
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
شورش کاشمیری نے اس روزنامچہ میں انہی دنوں کے محسوسات قلمبند کئے اور بعض مُہر بلب واقعات کو زبان مہیا کی ہے۔
ــــ قیمت ساڑھے تین روپے
موت سے واپسی
اسیری کے ۲۳۲ دن
یہ کتاب ایوب خان کی آمریت کے دم واپسیں کا تجزیہ و تصویر ہے
وہ دن جب ہائیکورٹ کی توہین کی گئی
● شورش کاشمیری موت کی سرحد تک پہنچ گئے
★ جب نظر بندی کے آٹھ مہینے پھیل کر آٹھ صدیاں ہو گئے تھے،
انہی دنوں کی کہانی ــــ قیمت دس روپے

جب برطانوی سامراج کا آفتاب نصف النہار پر تھا،
— انقلاب زندہ باد کہنے سے گلا اور اس کے جانشینوں کی
نلیاں انکی قبروں میں چھننے لگی تھیں۔
— راست بازوں کے لئے اندھا قانون اور بے خوف
انسانوں کے لئے کوڑے انصاف تھا۔
— نارسیان سرکاری اپنے سینوں پر تمغے وفاداری لگائے پھرتے تھے۔
— فدایان حریت کے بے ملتے ہائے زنجیر یا زرہ ہائے تعزیر۔
— طلبگاران آزادی کی بے سروسامانی پر فرزندان سلطنت کے جتیا قہقہے گونجتے تھے۔
— رضاکاروں کے بدن کا گوشت روئی کے گالوں کی طرح اڑتا تھا۔
— پیکران عفت کے چہروں پر طمانچوں کی مہریں ثبت تھیں۔
یہ انہی دنوں کی کہانی ہے
شورش کاشمیری کے قلم سے
پسِ دیوارِ زنداں
شورش کاشمیری نے اپنی دس سالہ قید کے مشاہدات و محسوسات کو اپنے ہوئے لکھا ہے — ادیب کا قلم
شاعر کی زبان، خطیب کا لہجہ، قیدی کی سرگزشت، جذبات کا طلوع و غروب — خیالات کا اتار چڑھاؤ
— ساتھیوں کے چہرے — راہ نماؤں کے خاکے
ایک کہانی نہیں کئی کہانیاں
قیمت
پندرہ روپے
مکتبہ چٹان ○ ۸۸ میکلوڈ روڈ ○ لاہور